Subscribers' No. C 11

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کے

اغراض و مقاصد

۱۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا۔

۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔

۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا

۴۔ ریسرچ کا کام کرنے والے اداروں اور یونی ورسٹیوں سے تعاون کرنا۔

۵۔ ایک جامع کتُب خانہ قائم کرنا۔

۶۔ مختلف کتُب خانوں کی فہرستیں مرتّب کرنا۔

۷۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور اُنھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۸۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء جو خالص علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔

اس میں اُردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے اُنھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اُردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ بر سرِ عام لایا جائے گا۔

رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

رسالہ ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

—— نمائندہ خصوصی ——

فہرست مضامین نوائے ادب بمبئی

جنوری تا اکتوبر ۱۹۵۴ء

جلد پنجم

(ب)

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ماہ جنوری ۱۹۵۴ء

جلد ۵ شمارہ ۱

چندہ سالانہ تین روپے } علاوہ محصول ڈاک
" ششماہی دو روپے }

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

فہرست مضامین

شذرات

اِدھر متعدد شماروں سے نوائے ادب کے شذرات صدائے کرب اور نالۂ دل سوز کی صدائے بازگشت ہوکر رہ گئے ہیں، کوئی سہ ماہی ایسی نہیں ہوتی جس میں ہم آسمان علم و فضل کے کسی نہ کسی ستارہ کے غروب اور کسی نہ کسی شمعِ تحقیق کے خاموش ہونے پر ماتم نہ کرتے ہوں، لیکن اِس مرتبہ ہمارے درد و کرب، اور رنج و غم کی شدّت کی انتہا نہیں کہ ہم نے اِس سہ ماہی میں نہ صرف یہ کہ متعدد درخشاں ستاروں کو جو عرصہ سے دُنیائے علم و تحقیق کو سنوار اور بزم فضل و کمال کو روشن کر رہے تھے غروب ہوتے دیکھا بلکہ اِسی نامبارک سہ ماہی میں ہم نے نہ صرف پاکستان و ہندستان بلکہ اسلامی اور علمی دُنیا کے آفتاب کو بھی ڈوبتے دیکھا! یہ آفتاب مشرق (بہار) میں طلوع ہوا، صوبۂ متحدہ میں نصف النہار پر پہونچا، اور مغرب (سندھ) میں ہمیشہ کے لئے آنکھوں سے اوجھل ہوگیا! تمام روشنی یکایک غائب ہوگئی مجلس میں سناٹا چھاگیا اور اس تاریکی نے ہم کو اس بات کا احساس دلادیا کہ شاید عرصہ تک ہماری مجلسِ علم پھر اس درخشندگی اور تابناکی سے منوّر نہ ہوسکے گی۔

علامہ سید سلیمان ندوی رح کی ذات جامع الصفات تھی، وہ ہر حیثیت سے مشرق و مغرب، قدیم اور جدید کا خوش گوار اور دل کش سنگم تھے۔ ان کی تصانیف خواہ وہ کسی موضوع پر ہوں اپنے اندر وہ تمام اوصاف رکھتی تھیں، جو ایک بہترین تصنیف کے لئے ضروری ہیں، اسلامی علوم و تاریخ کا شاید ہی کوئی ایسا اہم شعبہ ہوگا جس سے متعلق ان کی وسیع تحقیقات کے نتائج ہمارے سامنے نہ ہوں اُردو زبان و ادب سے متعلق بھی جو کچھ انھوں نے کہا اور لکھا ہے وہ برسوں ہمارے لئے ہدایت و رہنمائی کا کام دے گا اس کے ساتھ ہی سیاست، تمدّن، تہذیب، تعلیم اور سماجی اصلاح سے متعلق انھوں نے جو راستہ بھی اختیار کیا آگے چل کر وہی صحیح ترین راستہ ثابت ہوا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ گو ہندوستان کی مردم خیز زمین نے سات سو برسوں میں بڑے بڑے محدّث، مفسّر، فقیہ، متکلّم، ادیب، مورّخ، سوانح نگار، نقّاد، انشاپرداز، مدرّس اور خطیب و مقرّر پیدا کئے اور انفرادی حیثیت سے ان میں سے بہت سے

اپنے علم و فن میں بہت بلند ہوں، لیکن مجموعی حیثیت سے علامہؒ کا درجہ کسی سے بھی کم نہیں تھا۔ ان کی تصانیف میں متعدد ایسی کتابیں ہیں جن میں سے ہر ایک اُن کو غیرفانی بنا سکتی ہیں؛ سیرت النبیؐ، ارض القرآن، سیرۃ عائشہ، خیام ان میں سے چند ہیں۔ اتنا ہی نہیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ علم و فن، سیاست اور دوسرے عملی میں ان سے بڑھ کر لوگ پیدا ہوئے ہیں تو بھی ان کی بعض ذاتی خصوصیات ایسی ہیں جو ہر اس شخص کو جو اُن سے قریب ہوتا جاتا تھا اپنے اندر ان کے لئے عزت و احترام اور محبت و شیفتگی کے جذبات کا طوفان اُمنڈتا پاتا تھا ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کے ضمیر کی بلندی اور پاکی ہے جس چیز کو بھی صحیح یا غلط سمجھ لیتے تھے اس سے متعلق ان کا رویہ بہت صاف ہوجاتا تھا اور وہ اس کے اظہار میں بے باک ہوجاتے لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ان کو اپنے کسی خیال یا تحقیق کے متعلق پتہ چلتا کہ وہ غلط تھا تو بڑی آزادی اور خوشی کے ساتھ اس کی اصلاح کرلیتے؛ انھوں نے کبھی کسی قیمت پر اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبایا۔ ان کی دوسری مابہ الامتیاز خصوصیت ان کا وہ ایثار تھا جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے بلا کسی جھجک کے کرتے تھے، دارالعلوم ندوہ پھر الہلال اور پھر دکن کالج پونہ کی سرکاری ملازمت سے علیحدگی اور دارالمصنفین کے قیام کے ابتدائی صبر شکن ایام اس کا بیّن ثبوت ہیں؛ اُن کی تیسری خصوصیت اُن کی انتہائی شریفانہ فطرت ہے؛ وہ انتہا سے انتہا اشتعال انگیز موقع پر بھی ضبط و خاموشی کا وہ مظاہرہ کرتے تھے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے، آج تک انھوں نے کسی کو بھی کوئی خفگی کا جملہ اونچی آواز سے نہیں کہا، وہ۔ بڑے صلح جو اور سکون پسند تھے اور اس کے حصول کے لئے بھی انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں، ان کی چوتھی اور سب سے بڑی خصوصیت ان کی ہمہ گیر محبت تھی، خواہ وہ اپنے گاؤں میں اپنے چھوٹے بڑے عزیزوں کے درمیان ہوں یا کسی شہر کی بڑی سے بڑی کانفرنس میں اپنے نیازمندوں میں ہوں یا اپنے مخالفوں میں، ان کا چہرہ محبت و الفت کا آئینہ ہوتا تھا، وہ بچوں میں معصوم بچے جوانوں میں زندہ دل نوجوان اور بزرگوں میں محترم بزرگ ہوتے تھے؛ شاید اب ان صفات کا حامل کوئی دوسرا نہ ملے۔

خاکسار کو ۱۹۰۹ء سے اُن کے آخری وقت تک، ان کی محبت و شفقت ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کی سعادت رہی ہے اس لئے سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے متعلق کیا لکھا جائے اور کیونکر لکھا جائے۔

وہ دیسنہ ضلع پٹنہ (بہار) میں ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے ان کا اصلی نام ابو نجیب تھا، اُن کے والد حکیم ابوالحسن ایک بڑے حکیم اور صوفی تھے۔ ابتدائی تعلیم وطن اور پھلواری شریف میں حاصل کرنے کے بعد ندوہ گئے وہاں تعلیم سے فراغت پاکر ادب کے اُستاد مقرر ہوئے اور اس سلسلہ میں اُن کی پہلی تصنیف دروس الادب ہے، ندوہ کی مُدرّسی کے زمانہ ہی میں انھوں نے الندوہ والبیان کی اشاعت کی خدمت اور ادبی تحقیق کا کام شروع کیا، چنانچہ ان کی پہلی ادبی و علمی تصنیف 'لغات جدیدہ' ہے جو ندوہ کے اس اجلاس کے موقع پر شائع ہوئی جبکہ علامہ رشید رضا، مصر سے صدارت کے لئے تشریف لائے تھے؛ اس کے بعد جب سیرۃ کا کام شروع ہوا تو وہ مدرّسی سے الگ ہوکر اس کام میں مصروف ہوگئے، پھر الہلال سے وابستہ رہے اس کے بعد دکن کالج پونہ کے اُستاد مقرر ہوئے اور مولانا شبلیؒ کی وصیت پر اس ملازمت کو ترک کرکے اعظم گڈھ آگئے۔ اس کے بعد انھوں نے جو عظیم الشان علمی، ادبی، مذہبی، سماجی تعلیمی اور اصلاحی خدمات انجام دیں اس سے کون واقف نہیں، شاید خدمت کا یہی شوق تھا جس نے اُن کو کبھی مشرق میں کلکتہ، کبھی دکن میں پونہ اور کبھی شمال میں لکھنؤ اور اعظم گڈھ تک پہنچایا۔ اور بالآخر مغرب میں پہنچ کر اس نے اسی کے لئے جان دیدی۔ یہ تو ہندوستان کے سفر کا حال تھا ورنہ انھوں نے اسلامی ممالک کے سلسلہ میں یورپ، مصر، حجاز تک کا سفر کیا تھا؛ آخری دنوں میں خدا و رسولؐ کی محبّت نے اُن کے دل کو گداختہ کردیا تھا اور آخر اسی بیماریٔ دل نے ان کا کام تمام کیا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

اگر ہم ان کی خدمات کی قدر کرتے ہیں اور خدمت کی رُوح کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو ہمارا یہ اوّلین فرض ہے کہ اُن کے دل و جگر، دارالمصنّفین، اور دارالعلوم ندوہ کو جس قیمت پر بھی ہو قائم رکھیں کہ ان ہی کی بقاء میں اس رُوح کی بقا ہے۔

اس سہ ماہی کا دوسرا غمناک حادثہ جو اس سے کسی صورت سے کم نہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ سبق آموز ہے، جناب عبداللہ یوسف علی کی وفات ہے (علامہ) عبداللہ یوسف علی، صوبہ بمبئی کے رہنے والے تھے، اُن کے والد بمبئی

کے مشہور بیرسٹر خان بہادر یوسف علی تھے، عبداللہ یوسف علی، ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے، بمبئی ولسن کالج سے انھوں نے بی۔اے کیا اس کے کیمبرج سے علمی اور لندن سے قانونی سندیں حاصل کرنے کے بعد اس وقت کی سب سے معزز ترین ملازمت انڈین سول سروس کے رُکن ہوگئے، اس حیثیت سے انھوں نے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں کام کیا، مرکزی حکومت سے بھی وابستہ رہے۔ اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی سرکاری اور غیر سرکاری خدمات انجام دیتے رہے، سیاسی خدمات کے علاوہ مذہبی، تعلیمی اور سماجی دُنیا میں بھی ایک باا‌ثر ہستی کے مالک تھے۔ وہ دو مرتبہ اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے تھے۔ انھوں نے متعدد بار نہ صرف یورپ، ایشیا، بلکہ ساری دُنیا کا دورہ کیا، ہر جگہ مختلف موضوع پر تقریریں کیں۔ ان سب سے بڑھ کر ان کی وہ خدمات تھیں جو انھوں نے مذہب اسلام، اس کی تاریخ، اس کے تمدّن اور اُس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق کی، اسی سلسلہ میں نفس مذہب اسلام سے متعلق ان کی تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوتی ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن شریف کا وہ عجیب وغریب ترجمہ اور اس سے متعلق حاشیہ ہے جو کچھ سال پہلے اشرف برادرز نے شائع کیا تھا، اور اس طرح ان کا خاتمہ یوں بالخیر ہوا۔ ہندوستان کے انگریزی داں مسلمانوں میں جن میں امیر علی، چراغ علی تک شریک ہیں، کسی نے اسلام کی اتنی ٹھوس اور اتنی معقول و مفید خدمت نہیں کی ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں ہم ان سے متعلق ایک مفصّل نوٹ شائع کریں گے۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ اسی سہ ماہی میں ہماری جماعت کے ایک اور معزز و نامور ادیب، مورّخ اور محقق نے ہم کو داغ جُدائی دیا؛ حکیم سیّد شمس اللہ قادری (حیدرآبادی مرحوم) ہیں، تقریبًا نصف عُمر سے وہ تاریخی، علمی اور ادبی مضامین لکھ رہے تھے، تاریخی حیثیت سے بھی اُن کا مذاق بہت وسیع تھا اور اس میں سکّے اور کتبے بھی شریک تھے، انھوں نے ایک قاموس مشاہیر بھی مُرتّب کرنا شروع کی تھی، اس کے علاوہ ہندوستان کے یوم آزادی اور پنڈت جواہر لال کی برس گانٹھ کے موقع پر انھوں نے دو مصوّر مجموعے بڑی شان سے شائع کئے تھے، ان میں ہندوستان کے اکثر مشاہیر کے مضامین تھے، ادبی حیثیت سے بھی ان کی سب سے بڑی خدمت تاریخ اُردوئے قدیم ہے، اور در اصل یہ کتاب

دوسرے نوجوانوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتی رہی ہے۔ مرحوم اپنی وضع کے پکے خاموش اور باخلاق بزرگ تھے، ان کی موت نے اُردو ادب و تاریخ کو ایک بڑے کارکن کے فیوض سے محروم کردیا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی آغوش میں جگہ اور ان کے فرزندوں کو توفیق دے کہ وہ اپنے پدرِ بزرگوار کے اہم کاموں کو تمام کرسکیں۔

ان بزرگوں کی وفات کے ساتھ ہی ساتھ ہم کو ایک نوجوان فن کار ادیب کا بھی ماتم کرنا ہے؛ پروفیسر عبدالقیوم، حیدرآباد کے علمی حلقوں میں ہی اچھی طرح رُوشناس نہ تھے بلکہ اُردو کی دُنیائے شاعری اور موسیقی کے عالم میں بھی ممتاز تھے، اگر اُن کی زندگی وفا کرتی تو ادب وفن کی بہت سی توقعات جو ان کے ملنے والوں کو اُن سے پیدا ہوگئی تھیں پوری ہوتیں۔ مگر آہ ثم آہ،

ہماری یہ آہ وبُکا صرف اِس لئے نہیں ہے کہ علامۂ سید سلیمان ندوی نے ہم کو دائمی داغ مفارقت دیا، علامہ عبداللہ یوسف علی کا انتقال ہوگیا، حکیم شمس اللہ قادری اس دُنیا سے رُخصت ہوگئے اور پروفیسر عبدالقیوم ہم کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے، بلکہ ہمارا دل جس چیز پر آنسو بہارہا ہے وہ یہ ہے کہ ہم میں کوئی ان کے برابر کا کیا اُن سے بدرجہا کم بھی حوصلہ بخش رہنا نہیں رہا ہے یاس و قنوطیت کی فضا تیزی سے پھیل رہی ہے ہم بزدلی کا شکار ہورہے ہیں، بے بسی کی خاموشی ہمارا شعار بنتا جارہا ہے اور ہماری عملی دُنیا سنسان و ویران ہورہی ہے۔ اس کا اگر صحیح نقشہ دیکھنا چاہیں تو نومبر کی آل انڈیا اورنٹل کانفرنس ہمارے سامنے ہے، احمدآباد کے تاریخی شہر میں اس کا اجلاس ہوا، دوسری قوموں کے علم دوست اصحاب ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے اور انھوں نے علمی حصّہ لیا، لیکن جہاں تک عربی، فارسی، اسلامک کلچر وغیرہ کا تعلق تھا، سارے ہندوستان کے نمائندوں کی تعداد نصف درجن سے زیادہ نہ تھی۔ اُردو کا تو شعبہ ہی سرے سے نہیں تھا۔ تاہم جن لوگوں نے ان شعبوں میں حصّہ لیا اس میں بنگال سے لے کر پنجاب اور دہلی سے لے کر احمدآباد تک کے ہندو فضلا تھے۔

اللہ پاک ہم میں صحیح علمی ذوق اور بےغرضانہ ادبی خدمت کا شوق عطا فرمائے۔

سیّد شاہ فقیر محی الدّین مقبلؔ میسوری رحمتہ اللہ علیہ

(از جناب محمد سخاوت مرزا بی۔ اے ال ال بی (عثمانیہ)

حضرت مقبلؒ یوں تو میسور کے مشہور بزرگ تھے، ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان کی علمی دُنیا میں اُس وقت سے متعارف ہیں جب کہ آپ کے جدّ امجد شاہ کمالؒ کا دیوان مخزن العرفان آج سے چالیس سال قبل، آپ کے ایماء سے مولوی محمد اسحٰق تاجر کُتُب نے ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں بنگلور سے چھپوایا اور ضمناً آپ کی دو غزلیں اور تاریخی قطعہ طباعت دیوان بھی درج کیا، اُس کے بعد شاہ صاحب مرحوم کے دوسرے مُرید اور مُعتقد حاجی محی الدّین بنگلوری نے آپ کا مترجمہ اُردو منظوم خطبات ابن نباتہ عربی بنگلور میں اور اُردو مُسدّس سراپا رسُولِ اکرم مطبع فخر المطابع لکھنؤ میں ۱۹۱۴ء میں چھپوا کر روشناس کرایا۔

ایک مختصر تذکرہ شعراء میسور الموسوم بہ میسور میں اُردو، مؤلفہ محمد سعید عبد الخالق ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد سے شایع ہوا ہے۔ جس میں مقبلؒ کا نہایت مختصر طور پر ذکر ہے، حتیٰ کہ نام بھی غلط طور پر "فقیر الدّین" درج کیا ہے، نمونتہً دو ایک شعر بھی لکھے ہیں، غالباً اس کا ماخذ کتاب "غازی اعظم" مولفۂ مولوی ابو الحسن ادیب میسوری ہے۔ البتہ مولوی محمد خاں میسوری نے اپنے ایک مقالہ شعراء میسور میں جو اُردو کانفرنس ۱۹۴۱ء منعقدہ بنگلور میں پڑھا تھا جو رسالہ انجمن ترقی اُردو اکتوبر ۱۹۴۲ء میں چھپا ہے، اس طرح تعارُف کرایا ہے، اور یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ مقبلؒ کا وصال ہوکر دس بارہ سال گذر چکے تھے غرض محمد خاں صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

سیّد شاہ فقیر محی الدّین مقبل عرف مقبل شاہ مرحوم میسوری کسی تعارف کے محتاج نہیں زبان کی سلاست، محاورہ بندی اور شان و شکوہ الفاظ اس خاندان کی میراث ہیں، آپ کے دادا سیّد کمال الدّین شاہ صاحب متخلّص بہ کمال المتوفی ۱۸۰۹ء بیک وقت سودا، انشاء غالب و ذوق تھے، اور میرا اجتہاد ہے کہ غالب اور ذوق نے ان کے کلام سے استفادہ کیا ہے، اس اجمال کی تفصیل کے لئے ایک مستقل مجلس چاہیئے، انشاءاللہ پھر کبھی اس امر پر روشنی ڈالی جائے گی، اب آپ مقبل مرحوم کا کلام سُنئے اور ملکی شعراء کے کلام پر بجا طور پر فخر کیجئے ؎

خاکِ رہِ شاہِ بطحٰی ہوں — چشمِ مردم میں طوطیا ہوں
مدّاحِ رسولؐ دوسرا ہوں — اس منہ سے کسی کو کیا سرا ہوں
کھاتا ہوں غمِ نبی کی نعمت — ہر روز مزے اُڑا رہا ہوں
کب تک سہوں صدمے روؤں کب تک — کب تک تڑپا کروں کرا ہوں
رحمت کی نظر ادھر بھی للّٰہ — میں منتظر اک نگاہ کا ہوں
یہ وقت مدد ہے میرے والی — سو رنج و بلا میں میں گھرا ہوں
سو جان سے حبیبِ حق پہ مقبلؔ — قربان ہوں نثار ہوں فدا ہوں

شمعِ سحر ہوں میں کہ سرشک چکیدہ ہوں — دم بھر کی زندگی کے لئے آفریدہ ہوں
ہوش اپنا کہہ رہا ہے کہ مُرغِ پریدہ ہوں — یہ قول صبر کا ہے غزالِ رسیدہ ہوں
صیاد کا خطر نہ مجھے بیم دام کا — باغِ زمیں پہ بلبلِ رنگِ پریدہ ہوں
اے گُل تجھے دکھاؤں ٹھکانا مرا کہاں — گُلزارِ بے ثبات میں بادِ وزیدہ ہوں
صیاد کیا غرض ہے رہائی سے اب مجھے — قیدِ حیات سے مری میں وارہیدہ ہوں
بھاتی نہیں ہے مجھ کو شمیمِ گل اے بہار — میں جیسے بوئے دامنِ گل روشمیدہ ہوں
مقبلؔ ہے مکر قحبۂ دُنیا کا مجھ کو ڈر — ہر چند سرد و گرمِ زمانہ چشیدہ ہوں

لُطفِ تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

اے ماہِ مدینہ تری رحمت کی صبا سے — سورج کی کلی کِھلتی ہے گلزارِ صبا میں

غرض محمد خاں صاحب نے بھی آپ کی تصانیف اور تعداد دواوین اور تاریخ وفات اور شاعری میں تلمذ وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ شاہ کمالؒ کے متعلق ہمارا ایک مضمون رسالہ اُردو اپریل ۱۹۳۹ء میں یعنی اُردو کانفرنس میسور کے دو تین سال قبل چھپ چکا تھا مگر غالب اور ذوق نے شاہ صاحبؒ کے کلام سے کس قسم کا استفادہ کیا تھا، خالص صاحب کے پاس اس کے متعلق کیا سند ہے ہم لاعلم ہیں، غالب کا کلام اور مکتوبات میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ اور نہ ذوق کے حالات میں اس کا ذکر ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مقبل شاہؒ کے دو اور دیوان ہیں۔ ایک نعتیہ اور دوسرا غزلیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ جو اس وقت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ کے نبیرہ سیّد

شاہ احمد پیر بنگلوری، مدیر رسالہ ساغر کے پاس محفوظ ہیں، سید قادر علی بادشاہ صاحب کڑپوی جو مقبل شاہ مرحوم کے بنی اعمام سے ہیں، جن کا علمی ذوق قابل تعریف ہے، میرے حسب ایماء ایک مختصر دیوان نعت اور منتخب کلام شاہ مقبلؒ اور ان کے مختصر حالات روانہ فرمائے ہیں، ہم ان کی مدد سے مقبل شاہ رحمۃ اللہ کے متعلق کچھ جامع حالات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں، تاکہ اس باکمال شاعر اور عارف باللہ کا کلام منظرِ عام پہ آجائے۔

نام و نسب

اسم گرامی، فقیر محی الدین، تخلص مقبل، تخلص ہی سے مقبل شاہ مشہور تھے۔ وطن آبائی قصبہ محل ضلع چتور، (مدراس) ابن سید شاہ جلال الدین اکمل المعروف بہ سید یوسف علی شاہ المتوفی ۱۲۷۰ھ۔ ابن سید شاہ کمال الدین گرم کنڈوی المتوفی ۱۲۲۴ھ ابن سید شاہ جمال الدین رائچوٹی المتوفی ۱۱۶۲ھ ابن سید شاہ کمال الدین اوّل ابن از اولاد حضرت مخدوم جہانیان جہاں گشت قدس سرہٗ ۷۸۵ھ۔

پدر بزرگوار

شاہ اکملؒ کے دو صاحبزادے تھے، بڑے سید شاہ علی مراد افضلؔ، اور چھوٹے سید شاہ فقیر محی الدین مقبلؔ، صاحب زیر ترجمہ۔

ولادت

حضرت مقبل شاہ قصبہ محل، تعلقہ چیتور (کڑپہ) یعنی آندھرا دیس، جیسے دور دراز مقام میں ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نُما پائی۔ ابھی آپ پندرہ سولہ سال کے تھے کہ والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا، بڑے بھائی شاہ افضلؔ کے ہاتھوں تعلیم و تربیت پائی۔ علوم ظاہری و باطنی میں کمال حاصل کیا اور اُن ہی کے مبارک ہاتھوں سے خرقۂ خلافت پہنا ــــ خاندانی سلسلۂ چشتیہ۔ حضرت شاہ برہان الدین جانم بیجاپوریؒ سے اور نقشبندیہ و مجددیہ بتوسط والد ماجد شاہ اکملؒ، حیدرآباد کے مشہور بزرگ شاہ رفیع الدین قندھاری (دکن) خلیفہ حضرت شاہ رحمت اللہ نیلوریؒ المعروف بہ نایب رسول اللہ المتوفی ۱۱۹۶ھ سے ملتا ہے۔

میسور کی سکونت :-

بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ افضلؔ علی اور شاہ مقبلؔ دونوں بھائیوں نے بعض خانگی وجوہات

---

۱ سید علی مراد شاہ تخلص افضل جامع علوم ظاہری و باطنی تلمیذ مولوی علام قادر مدراسی، مصنف صراط النجات وغیرہ۔ خلیفہ والد ماجد ــــــــ آپ نے چونکہ ایک عقد مدراس میں بھی کرمانی خاندان میں کیا تھا اس لئے مدراس سے سسرالی تعلق

(باقی اگلے صفحہ پر)

کی بناء پر وطن عزیز کو خیرباد کہا، اور قبل ۱۲۸۰ھ میسور چلے آئے، کئی سال کے بعد شاہ افضل تو اپنے وطن واپس آگئے، جن کا وصال ۱۳۱۰ھ ہی میں کڑپہ میں ہوا۔ جہاں وہ دریائے پنار کے کنارے اپنے خاندانی قبرستان کی ایک چوکھنڈی میں آسودہ ہیں، اور شاہ مقبلؒ نے میسور ہی کو اپنا مستقل وطن بنالیا اور یہیں کے ہو رہے۔

حُلیہ

بقول شاہ سید مخدوم حسینیؒ مفتی جامعۂ نظامیہ حیدرآباد، جنھوں نے حضرت مقبل کو دیکھا تھا، بلند قامت، گندم گوں، عریض الصدر تھے۔ طویل العمر ہونے کی وجہ سے آخر عمر میں اونچا سننے لگے تھے اور قدیم وضع قطع کے پابند تھے۔

ازدواج

شجرۂ خاندانی میں لکھا ہے کہ آپ سے آپ کے حقیقی چچا سید شاہ جمال اللہ عرف دادا پیر حسینی کی صاحبزادی یعنی سید جلال الدین عرف حاجی صاحب بخاری کرنولی ابن سید ابراہیم بخاری ابن سید امام شاہ بخاری منسوب تھی مگر مولوی سید قادر علی بادشاہ کڑپوی کا بیان ہے کہ یہ فقیر محی الدین بخاریؒ، کوئی اور شخص ان کے ہم نام تھے، اور آپ کی شادی اپنے کفو میں نہیں ہوئی تھی۔

عادات و اطوار شریفہ

حضرت مقبل علیہ الرحمہ، سخت متشرع، خلیق، منکسر المزاج، عارف باللہ تھے، اہل بدعت اور فرقۂ اہل حدیث سے نوک جھونک رہتی تھی، شاہ صاحب اُن لوگوں میں سے ہیں جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) تھا، انتقال بھی مدراس میں ۱۳۱۰ھ میں ہوا۔ کڑپہ میں مدفون ہوئے۔ لاولد تھے۔ حلقہ میں مقبل شاہ اور سید عبدالحق شاہ میر کڑپوی تھے۔ معاصرین عزت کرتے تھے۔ مدراس سے کڑپہ واپس ہوئے تو ایک عالم نے صرف ایک شعر لکھ کر بھیجا تھا ؎

اے افضل و اکمل یگانہ بادا کرم تو جا و دانہ

بہت آبدیدہ ہوئے۔ تصنیفات یہ ہیں: (۱) ردّ مہدویہ اُردو نثر (۲) خطباتِ افضل، دیوان مرتب نہیں کیا (۳) متفرق غزلیات اُردو فارسی موجود ہیں۔ (۴) تربیت نامہ (نثر فارسی) حکایات و قصص میں ہے۔ انتخاب دیوان مخزن العرفان شاہ کمال الموسوم بہ "جواہر گراں بہا" وغیرہ۔ نیز اپنے جدّ امجد کی بعض کتابیں طبع اور شائع کرائیں (۱) رحیا بطرز کریما سعدی (۲) معدن محاسن بطرز پندنامہ عطار (۳) نصاب شاہ کمالؒ (۴) چہل حدیث اربعین فارسی۔ جو بزمانہ قیام بنگلور و مدراس طبع ہوئی ہیں۔

انگریزی لباس کو بعض معاصرین علماء سر سید احمد خاںؒ کی طرح کفر جانتے تھے۔ چنانچہ آپ کا ایک شعر ہے ؎

کب مسلماں ہے وہ پہنے جو لباس انگریز کا
حشر اوس بیدین کا نصرانیوں کے ساتھ ہو

دہریوں، بدعتیوں اور غیر مقلدین پر چوٹ کی ہے ؎

دہری دودلا، بدعتیاں غیر مقلد
دربار شہ دیں سے نکلوائے ہوئے ہیں عقاید۔

شاہ مقبولؒ سُنی اور حنفی المذہب تھے، اور مسائل تصوف میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے پیرو اور وحدۃ الوجود کے قایل تھے۔ ان کا مسلک اپنے اجداد اور محققین صوفیاء اسلام کے قدم بقدم تھا۔ آپ کے جدّ امجد شاہ کمالؒ نے فرمایا تھا ؎

عافیت دو میں ہے آفت ایک میں
پھر سلامت ایک میں دو میں بلا

بقول محققینِ اسلام "السلامت فی الوحدت والآفت بین الاثنین الخ" شاہ کمالؒ کا ایک اور شعر اسلامی وحدۃ الوجود کی توضیح میں بڑا محققانہ ہے فرماتے ہیں ؎

لا الٰہ بولے سے ہوں اگر کافر تو راست
عبدہٗ و رسولہٗ سے ہوں مسلمان تو صحیح

بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم "ھُوَ عبدہٗ" درجۂ کمال اور شعار اسلام ہے۔ شاہ مقبولؒ نے اپنے جد کی تتبع فرمائی ہے ؎

دو میں نجات اور سلامت ہے ایک میں
کیا آفت ایک میں نہیں دو میں بلا نہیں

دوئی محمود بھی ہے اور مذموم بھی ہے، بقول میر حیات میسوریؒ ع

لے رجال اللہ سے اس کا سبق

رویت حق

یہ بھی ایک بڑا معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اس کی مفصل توجیہ دیکھنا ہو تو دُور کیوں جاؤ شرح عقاید جامیؒ۔ منسوب بہ مولانا شاہ عبدالحق مخدوم ساوی میلاپوری (مدراس)۔ دیکھو، جو اس خاندان میں متداول رہی ہے بقول محققین، دیدار الٰہی خواہ وہ تنزیہی ہو یا تشبیہی، بصارت سے یا بصیرت سے بغیر حجاب کے محال ہے۔ کسی محقق کا شعر ہے ؎

ظہور معنی نازک بود ز پردۂ لفظ
نظارۂ رخ او بے نقاب نتواں کرد

اور شاہ مقبولؒ کا شعر یہ ہے ؎

ہرگز کسی کو وہ نظر آئے نہ بے حجاب
ایسا کوئی دو کون میں صاحب ضیاء نہیں

مسائل ذات و وجود

دو ذات دو وجود کے معتقدین میں علماء ظاہر اور متکلمین اور ایک ذات ایک وجود کے عام قائلین وحدت الوجود اور دو ذات ایک وجود کے محققین اسلام شامل ہیں شاہ مقبولؒ کا عقیدہ دو ذات ایک وجود پر ہے۔ اور اسی کو دکن کے صوفیاء کا ایک خاص طبقہ "قابل صحیح" کہتا ہے آپ کے جد امجد شاہ کمالؒ نے اس کی سند میں مولانا جامیؒ کی ایک رُباعی کا ترجمہ کرتے ہوئے محققین کے نظریہ کی اس طرح توجیہہ فرمائی ہے۔

خورشید بذاتہ ہے روشن بے شک 		پرتو سے اوس کے مقتبس ماہ فلک
دو ذات ہیں یک وجود سے یوں موجود 		پس شرع حقیقت سے کہاں ہے منفک

شاہ مقبولؒ نے بھی اسی کا پرچار کیا ہے ؎

مُلحد کے اعتقاد سے اللہ کی پناہ 		وہ ناسزا، دو ذات کا قایل ہوا نہیں

مسئلہ ارتقا، فنا بقا، تجدد امثال، بھی ایک معرکتہ الآرا مسئلہ ہے۔ جدید سائنس بھی اس کی موید ہے اُن کے جدّ امجد شاہ کمالؒ نے بہت سے شعر اور غزلیں اس خصوص میں کہی ہیں ایک شعر میں کہتے ہیں کہ یہ حُسن و جمال کی نفسیاتی کیفیت ہے اور جو حسین و جمیل ہوتا ہے اُس کو ہردم ایک ہی ادا بھاتی نہیں چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہے جمال خو بردیاں کا نہایت یہ کمال 		جو دکھادیں لحظہ لحظہ آپنا کچھ اور طور

کل یوم ھو فی شان، مرزا غالب دہلوی کا بھی ایک شعر ہے جو اسی خیال کی ترقی یافتہ شکل معلوم ہوتی ہے ؎

آرایش جمال سے فارغ نہیں ہنوز 		پیش نظر ہے آئینہ دایم نقاب میں

مگر شاہ مقبولؒ کا سیدھا سادھا شعر ہے ؎

کون سی شئے ہر نفس منقبل نہیں پاتی بقا 		کون سا قالب ہے جو ہر دم فنا ہوتا نہیں

مخالفین کو اپنے جد امجد کی طرح تنبیہ اور تہدید بھی کرتے ہیں ؎

کمالؒ ؎

مُلحد کی خستگی نہ ہوئی دفع گرچہ ہم 		مرہم دئے علاج کئے زخم کو سیے

مقبول ؎

مانے نہ مانے کوئی مگر بات تو یہ ہے 		حق ہیں ہمارے وقت میں کوئی رہا نہیں

غرض شاہ مقبولؒ، حضرت خواجہ میر درد دہلویؒ، میرزا مظہر جان جاناں اور میر

شمس الدین فیض حیدر آبادی و منشی میر امداد علی علویؒ وغیرہ کی طرح اُردو غزل گوئی میں عاشقانہ شاعری کے علاوہ، صاحب ولایت اور اہل دل تھے، دیوان میں آپ کے دادا کی طرح تبلیغ عرفان کا عنصر بھی ہے۔ مگر اس کی کثرت یعنی محض عرفان نہیں اور یہ چیز آپ کو ورثہ میں ملی ہے۔ اور یہ خاندان دو ڈھائی سو سال سے اُردو زبان کی خدمت کرتا چلا آرہا ہے۔ بعض تصوف کے اشعار یہ ہیں :-

شاہ مقبلؒ ؎

عالم سے وہ الگ نہیں اور سب میں کیا نہیں ۔۔۔ عین الوریٰ نہیں کہ وراء الوراء نہیں
کب جلوہ گر وہ پیش نظر زاہدا نہیں ۔۔۔ پر دن دہاڑے تجھ کو ذرا سوجھتا نہیں

فیض حیدر آبادیؒ ؎

دکھلا رہے ہیں جلوے خلا اور ملا میں آپ
ہر چند ہیں مقام وراء الوراء میں آپ

شاہ مقبلؒ ؎

گُل آپ ہیں رنگ آپ، کلی آپ، ثمر آپ ۔۔۔ برگ آپ ہیں شاخ آپ ہیں بیخ آپ شجر آپ
یہ آپ ہیں، وہ آپ ہیں اس آپ ہی میں تو ۔۔۔ یاں آپ ہیں واں آپ ادہر آپ اودھر آپ

قمر غاساؒ دہوی ؎

ہر شئے میں آپ کا ہے ظہور آپ کا ہے نور ۔۔۔ دل میں، جگر میں، تار نفس میں، نظر میں آپ
پایا قمر نے بعدِ فنا آپ کا پتہ ۔۔۔ دہلی میں چھپ کے بیٹھے تھے چشتی نگر میں آپ

معاصرین :-

بنگلور و میسور میں آپ کے جد امجد شاہ کمالؒ کے دیکھنے والوں اور ان کے والد ماجد شاہ اکملؒ کے معاصر، حضرت میر حیات میسوریؒ[1] ابن میر یوسف حسینی کولاری المتوفی ۱۸۷۵ء ہیں جن کی ایک تصنیف مصباح الحیات دکھنی اُردو میں مشہور ہے اور بمبئی میں چھپ چکی ہے۔ دوسرے شاہ غلام محی الدین ویلوریؒ[2] المعروف بہ قطب ویلور قدس سرہٗ المتوفی ۱۲۸۹ھ ہیں جن کی اس خاندان میں رشتہ داری بھی تھی، اور شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب جواہر السلوک فارسی میں شاہ مقبلؒ کے جدِ امجد کی اُردو

۱؎ رسالہ اُردو اکتوبر ۳۲ء (انجمن ترقیٔ اُردو دہلی)

۲؎ مطلع النور مطبوعہ بنگلور مولفہ شاہ عبدالحئی بنگلوری (کتب خانہ شاہ سراج الدین ویلوری)

غزلیں سنداً نقل فرمائی ہیں، اُن کے خاص شاگرد اور خلیفہ مولانا شاہ عبدالحی[1] احقر بنگلوری کے فضل و کمال سے بنگلور میں کون واقف نہیں۔

---

[1] شاہ عبدالحی بنگلوری المتخلص بہ احقر۔ ۱۲۳۴–۱۳۰۱ھ مولوی حامداللہ صاحب ندوی کا ایک تفصیلی مضمون احقر مرحوم کے متعلق رسالہ نوائے ادب بمبئی اپریل ۱۹۵۲ء میں چھپا ہے۔ صاحب موصوف کی نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی تصنیف مطلع النور مطبوعہ بنگلور نہیں گذری، جس کی وجہ سے کچھ اہم فرد گذاشتیں ہوگئی ہیں جن کو ہم یہاں واضح کرنے پر مجبور ہیں، ہمارا مقصد کسی کی تنقیص یا عیب جوئی نہیں ہے:- حامداللہ صاحب ندوی نے لکھا ہے کہ

> "شاہ عبدالحی بنگلوری ولادت ۱۲۳۴ھ ابتدائی تعلیم کچھ والد ماجد سے اور کچھ مقامی اساتذہ سے حاصل کی، بغرض تعلیم انھیں آٹھ سال کی عمر میں دیلور بھیج دیا گیا۔ قطب دیلور عبداللطیف محی الدین ثانی شیدا نے... .. خوب چمکایا۔ دس سال کے اندر اندر وہ اس قابل ہوگئے کہ زبان اثر میں ڈھلی ہوئی دل غیبی الہامات کا مرکز اور دماغ علمی ذخیروں کا ایک بھرپور خزانہ تھا... .. انیس ۱۹ سال کی عمر میں انھوں نے تبلیغ وارشاد کا سلسلہ شروع کیا جو زبان و قلم دونوں کے ذریعہ زندگی بھر جاری رہا الخ"

مگر مشکل یہ ہے کہ موصوف کا بیان خود صاحب زیر ترجمہ شاہ عبدالحیؒ کے بالکل خلاف ہے مطلع النور میں اُن کے خود نوشتہ حالات منظوم ہیں، جس کا ملخص یہ ہے:-

> "بنگلور میں میرے والد نے مجھے شاہ سجاد کے پاس تحصیل علم کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ میری عمر اس وقت پندرہ سال کی تھی، تین سال تک حضرت نے مجھے بہت توجہ سے پڑھایا، اور حضرت مجھ سے قطب دیلور کے فضائل بیان کیا کرتے تھے، ۱۲۵۳ھ میں شاہ سجاد کا وصال ہوگیا عرصہ تک میں سخت پریشان رہا ایک رُوز شیخ دیلورؒ کو خواب میں دیکھا اور ہم کلامی اور فیض سے مُستفید ہوا پھر مجھے صبر و قرار باقی نہ رہا، اور ۱۲۵۵ھ میں دیلور گیا، وہاں بیعت کی تین ۳ سال تک وہاں فیض حاصل کرتا رہا عجیب عجیب نکات اور حال و قال کی باتیں معلوم ہوئیں وغیرہ الخ۔"

اس لحاظ سے مولوی حامداللہ ندوی کا بیان غلط ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحب آٹھ سال کی عمر میں دیلور گئے تھے اور دس سال تک قطب دیلور سے علم حاصل کرتے رہے۔ اور اس طرح انیس ۱۹ سال کی عمر میں سلسلہ تبلیغ و ارشاد شروع فرمادیا۔ بموجب بیان شاہ صاحب مغفور جب ۱۲۵۸ھ میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

ایک اور مشہور بزرگ میسور کے قاضی سید شاہ عبدالقدوس[۱] قدسی بنگلوری المتوفی ۱۳۲۲ھ تھے جن کا وصال شاہ مقبل سے ۲۲ سال قبل ہوا۔ اور تمام علماء ہند نے تعزیت نامے لکھے، اور اُن کے صاحبزادے قاضی عبدالغفار قادریؒ کا نام لیا جاتا ہے، اس خاندان کا تعلق بھی سلطان ٹیپوؒ سے رہا ہے۔ مشاہیر میسور کا کوئی تذکرہ ہماری نظر سے نہیں گذرا مولوی محمد خاں میسوری نے اپنے ایک مضمون[۲] میں اشارہ کیا ہے کہ صاحب موصوف نے دو ڈھائی سو علماء شعراء کے حالات جمع کئے ہیں مگر وہ اب تک شائع نہیں ہوئے۔

شعراء معاصرین میں عبدالرحیم ممتاز تلمیذ امیر مینائی، اور تلامذہ داغ میں، عبدالعزیز خاں بیکش۔ شیخ محمد کبیر، تحقیق۔ گل محمد انور۔ منشی عبدالعزیز ارمان۔ محمد باقر برق وغیرہ نیز خطیب حسن خاں کلیم بنگلوری، تحقیق بنگلوری۔ شہاب الدین شہاب میسوری (المتوفی ۱۹۰۶ء) محمد قاسم شاد بنگلوری۔ وغیرہ تھے ـــــ اور مدراس کے شعراء میں شاہ صادق الحسینی شریف مدراسی اور اُن کے شاگردوں میں پرتو مدراسی وغیرہ بڑے اچھے شاعر گذرے ہیں۔

شاعری میں تلمذ:-

مقبلؒ ابتدا میں اپنے بڑے بھائی افضلؒ سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے جو فارسی

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵) ویلور گئے تو اس وقت حضرت کی عمر شریف پچیس سال کی تھی، اور جب قطب ویلور رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۸۵ھ میں مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو واعظ بنگلوری کی عمر ۵۵ سال کی تھی، گویا تیس اکتیس سال فیض حاصل فرمایا ہے۔ دوسرے یہ کہ فاضل مضمون نگار نے تصنیف و تالیف کا زمانہ ۱۲۵۷ھ۔ گویا قبل روانگی ویلور قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے اس سنہ کی کوئی تصنیف کا حوالہ بھی درج نہیں ہے۔ جنان السیر چمن دوم میں شاہ صاحب رح نے صراحت کی ہے کہ پہلا چمن گلزار نبوت ۱۲۶۰ھ سے دس سال قبل ختم کر چکا تھا، اس لئے حضرت کی پہلی تصنیف جنان السیر کا چمن اوّل ہے جس کا سنہ ۱۲۵۵ھ قرار پاتا ہے صرف "نے" علامت فاعلی کا دکن میں استعمال تیرھویں صدی کے نصف آخر سے بھی بہت قدیم ہے۔ نیز علامہ آگاہ اور علامہ بدرالدولہ کے قبل بھی فن حدیث وتفسیر و فقہ پر دکھنی مصنفیں، اکثر ملیں گے۔ تصانیف شاہ صاحبؒ غیر مطبوعہ پر کافی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اُمید ہے کہ ندوی صاحب مزید نظر ثانی اور تحقیق فرمائیں گے۔

۱۔ حالات عبدالقدوس بنگلوری مطبوعہ بنگلور۔

۲۔ رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۳۲ء۔

کے اچھے شاعر تھے اُردو میں بھی کبھی کبھی کہتے تھے، اور مقبلؒ کے ابتدائی اُردو کلام کو دیکھ کر اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مقبلؒ کا کلام آیندہ چل کر اس قابل ہوگا کہ موتیوں میں تولا جائے۔ شاہ افضلؒ کی وفات کے بعد مقبلؒ نے کسی کو اپنا کلام نہیں دکھلایا، بلکہ شاعری فطری تھی بلکہ یوں کہو کہ ورثہ میں پائی تھی، اب وجد اور آپ کے بعض نبی اعمام شاعر تھے، اور مرجع فضل و کمال، بقول شخصے "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"

خاندانی شعراء

آپ کے خاندان میں حسبِ ذیل شاعر اور مصنفین گذرے ہیں، جن کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا، جو یہ ہیں:-

(۱) سید محمد حسینی شاہ میر اوّل[1] المتوفی ۱۰۸۶ھ مصنف اسرار التوحید و انتباہ الطالبین (نثر اُردو) اور شاعر بھی تھے۔

(۲) سید شاہ کمال الدین کمالؒ ۱۲۲۲ھ[2] صاحب دیوان مخزن العرفان وغیرہ۔

(۳) سید شاہ نور اللہ حسینی[3] برادر شاہ کمالؒ المتوفی ۱۲۱۴ھ۔

(۴) سید شاہ جلال الدین اکملؒ[4] ۔ مصنف مقصود السالکین نثر اُردو اور بعض اُردو غزلیں (پدرِ مقبلؒ)

(۵) سید شاہ علی عرف علی مُراد[5] شاہ افضلؒ المتوفی ۱۲۱۳ھ (برادر و اُستاد و مرشد شاہ مقبلؒ)

(۶) سید شاہ جمال الدین ثانی[6] نبیرہ شاہ میر اول، تخلص جمال۔

(۷) سید محمد شاہ میر[7] بادشاہ ثانی تخلص بیرنگ۔

(۸) سید سلطان[8] محی الدین سالکؒ عرف غوث نما شاہ صاحب دیوان اُردو مزار گوشہ محل حیدر آباد دکن۔

(۹) سید محی الدین پادشاہ حسینی کمتر نبیرہ سید شاہ نور اللہؒ برادر شاہ کمالؒ

(۱۰) سید عبد الحق المعروف[9] بہ شاہ میر ثالث المتوفی ۱۳۴۷ھ کڑپوی صاحب دیوان

---

[1] اُردوئے قدیم مؤلفۂ شمس اللہ قادری و مطبوعہ نوائے ادب اپریل ۱۹۵۳ء

[2] رسالہ اُردو اپریل ۱۹۳۲ء [3] اثر اعتقاد مؤلفۂ حامی حیدر آبادی قلمی۔

[4] [6] [7] بیاض خاندانی مملوکہ قادر علی شاہ کڑپوی، [8] اثر اعتقاد قلمی۔

[9] دیوان شاہ میر عبد الحقؒ مطبوعہ بنگلور۔

ان کے علاوہ حضرت مقبل کے صاحبزادگان میں عزیزالدین عادلؔ، و کمال الدین اجملؔ شاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔

ان سب بزرگوں میں اپنے طرز اور رنگ کے لحاظ سے فوقیت آپ کے جد امجد شاہ کمالؒ کو حاصل ہے، اُس کے بعد حقیقی معنوں میں اگر کوئی شاعر جس کا کلام اساتذہ دہلی اور لکھنؤ، مثلاً حضرت امیر احمد مینائی، اور فصیح الملک داغؔ سے ٹکر کھاتا ہے تو وہ شاہ مقبلؒ بنگلوری کا کلام ہے۔ اور جنوبی ہند کے بعض مشہور اساتذہ مثلاً عبدالرحمٰن شاطرؔ، شریف مدراسی، خورشید احمد خاں پرتوؔ مدراسی، محمد قاسم شادؔ بنگلوری، خطیب حسن خاں کلیمؔ بنگلوری وغیرہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بنگلور کے سخن فہموں کی آپ کے متعلق اچھی رائے ہے، اور حقیقت میں مقبلؒ بڑے ذکی اور فہیم تھے چنانچہ کہتے ہیں ؎

توسن طبع رواں پر تیز فہمی ہے سوار — کام کرتی ہے دم رفتار یہ مہمیز کا

شاعری کے متعلق خود کی رائے ؎

پرکھے گا کون اس کو کوئی جوہری نہیں — مقبل جو کچھ کہ ہے ترے دُرِّ سخن میں آب

نعت گوئی میں بھی آپ کو بڑا ناز تھا اور باعثِ فخر کہا ہے ؎

مرے پھولوں میں اچھا یہ کہیں گے ہو سدا را — چمن نبیؐ کا کیسا یہ ہزار داستاں تھا

کرے مقبل ثناگو سفرِ عدم تو یارو — سرِ لوحِ قبر لکھدو یہ نبیؐ کا مدح خواں تھا

وصال

جناب مقبل شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے بتاریخ ۷ ر جمادی الثانی روز سہ شنبہ ۱۲۷۶؁ھ بوقت چاشت۔ چھیاسی سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا اور محلہ قلعہ میسور میں اپنے خانہ باغ میں سپردِ خاک کئے گئے، (انا للہ وانا الیہ راجعون) آپ کے صاحبزادے سید کمال الدین اجملؔ نے قطعہ تاریخ وصال کہا تھا جو یہ ہے ؎

عاشقِ ربّ الله خیر الورا — محی سنّت نافذ امر خدا

حضرت مقبل شہ والا نژاد — پا ز دُنیا زد سوئے عقبیٰ نہاد

عین وقت چاشت قبل استواء — در رضائے خالق قدر و قضا

روز سہ شنبہ مورخ ہژدہم — از محرّم بود مر شہر ششم

چوں سن نقلش بحق درخواستم — دست دل درگاہ او برداشتم

---

۱ و ۲ یاد داشت خاندانی قادر علی کڑپوی۔

ناگہاں ہاتف بگوشم ہجر ریشس گفت یک الف و سہ صد ہم چہل و شش
رحمت حق باد اے اجمل بر آں با طفیل شاہ رب جہاں

نیز حضرت مقبولؒ کے برادر زادہ سید قادر علی بادشاہ کرپوی کے قطعات حسب ذیل تاریخی بہت خوب ہیں ؎

اللہ اللہ محی دیں پیر زماں پیشوائے عالمان و عارفاں
واہ کیا زورِ قلم تھا ان کا ہاں واقعی تھے طوطیِ ہندوستاں
درحقیقت آفتابِ علم تھے شاعری میں تھے وہ میر شاعراں
چل بسا دُنیا سے جب شیخ زماں علم کی دُنیا میں تب آئی خزاں
فکر اک تاریخ کی جب میں نے کی یوں کہا ہاتف نے مجھ سے ناگہاں
کہہ دے قادر سالِ تاریخِ وفات شمس علماء مقبول شیریں بیاں

۱۳۴۶ھ

ایضاً ؎ کیا خوب مجھے یہ سال (مصرعہ) ہاتھ آیا؟
"مقبول پیوست بہ رحمت الہٰی"

۱۳۴۶ھ

(باقی آئندہ)

معاصرین سے التماس

ہم اپنے معاصرین سے ملتمس ہیں کہ "نوائے ادب" کے ضمیمۂ مقالہ نُما کی ترتیب کو جامع اور ہمہ گیر بنانے میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اپنی مطبوعات و رسائل کی ایک ایک جلد مُندرجۂ ذیل پتوں پر ارسال فرمائیں۔

(۱) سکریٹری دا ائیڈرس امپوریم لمیٹیڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۱۱ بمبئی ۱

(۲) سکریٹری انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲ دادا بھائی نوروزجی روڈ بمبئی ۱

اُردُو ادب میں اتحاد پسندی کے رُجحانات

(از جناب گوپی چند نارنگ دہلی)

اُردُو زبان ایرانی اوٗر ہندُوستانی تہذیبوں کے سنگم کا وہ آخری نقطہ ہے، جہاں سے اِن دُونوں تہذیبوں کے دھارے ایک ہو کر بہنے لگے ہیں۔ اُردُو کے چمن زار میں جہاں لالہ و گُل، نسرین و سمن نظر آتے ہیں وہاں سرس اوٗر ٹیسُو کے پھوٗل بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُن کی آب یاری کسی ایک قوم کی مرہُونِ منّت نہیں بلکہ ہندوؤں اوٗر مُسلمانوں دُونوں نے اُسے اپنے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اُردُو ادب میں رواداری، محبّت اوٗر اُخوّت کا جذبہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود ہندوُوں اور ایرانیوں کا سابقہ۔ اُردُو ادب میں اتّحاد اوٗر یگانگت کی روایت کسی خلا کی پیداوار نہیں ہے اُس کی پُشت پر ایک ہزار سال کے اِرتقا کی تاریخ ہے۔ اُس نے باہمی علیحدگی اوٗر نفرت کی خلیج کو پُر کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ یہ وہ رشتہ ہے جو کعبے کو شِوالے سے اوٗر ہندو کو مُسلمان سے جوڑے رہا ہے اوٗر جوڑے ہوئے ہے۔ زیرِ نظر مقالہ میں اُردُو ادب کے اِن ہی رُجحانات پر روٗشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

جِس ملواں یا سدھکڑی بولی کے سانچے میں اُردُو ادب نے ڈھلنا شروع کیا تھا، اس کا خمیر پنجاب و مُلتان کی سرزمین میں تیار ہوا تھا۔ تاریخ ادبِ اُردُو کا یہ حِصّہ ابھی تاریکی میں ہے لیکن جو حقائق دستیاب ہوئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ اُردُو ادب کے اِس اِبتدائی دوٗر میں مُسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اہل قلم بھی موجود تھے۔ اُن میں چندر بھان برہمن، منشی ولی رام ولی بدھ سنگھ اور رام کشن کے نام دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ اُس عہد سے تعلّق رکھتے ہیں جب کہ ولی دکنی کا دیوان ابھی دہلی نہیں پہنچا تھا۔ ولی رام ولی شاہجہاں کے بیٹے دارا شکوہ کے مُشیر خاص تھے۔ ان کی مثنوی ستت و نرں مطبع نادر العلوم میں چھپ چکی ہے[۱]۔ بدھ سنگھ کا زمانہ، اٹھارویں صدی کے نِصفِ اوّل سے تعلّق رکھتا ہے۔

دکن میں بھی نظامی، سُلطان محمّد قُلی قطب شاہ، وجہی، غواصی اوٗر ولی کے زمانے میں کئی ہندو شاعر بھی موجود تھے۔ لیکن صرف تین کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ سیوک رام راؤ، اور جسونت سنگھ منشی، سیوک نے جنگ نامہ لکھا، رام راؤ نے واقعاتِ شہادتِ

---

[۱] پنجاب میں اُردو۔ ص ۳۰۶

حسنین پر ایک کتاب نظم بند کی، منشی، اورنگ زیب کے گورنر سعادت اللہ خاں کے دربار میں دربار میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے اور اُن کی تصنیفات اُردو فارسی دونوں میں ملتی ہیں۔

محمد شاہ کے عہد سے شمالی ہندوستان میں بھی اُردو شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا تھا، خواص فارسی سے ہٹ کر اُردو کی طرف رجوع کرنے لگے تھے۔ اور آنے والے پچاس سال میں سارے شمالی ہندوستان کے ہندو و مسلمان اس زبان میں دادِ سخن دینے لگے۔ اُردو ادب کے اس تکوینی دَور میں ٹیک چند بہار، آنند رام مخلص، بندرابن راقم، آفتاب رائے رسوا، خوش وقت رائے شاداب، عجائب رام منشی، بدھ سنگھ قلندر، بھکاری داس عزیز راجہ رام ذرہ، بال مکند حضور، ماسٹر رام چندر، رائے سرب سنگھ دیوانہ، جسونت سنگھ پروانہ اور راجہ رام نرائن موزوں، ان ہندو اہل قلم حضرات سے ہیں جنھوں نے اُردو ادب کی بیش بہا خدمت کی ہے۔

اُردو کی قدیم ادبی روایات میں سب سے اہم مشاعروں کا رواج ہے۔ مشاعرے ایرانی تہذیب کا وہ ورثہ ہیں جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہندوستانی تہذیب کو منتقل ہوا اور ہندوستان کی اپنی چیز بن کے رہ گیا۔ مشاعروں کا رواج اُردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا اوّلیں مظہر ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا مشاعرہ منعقد ہوا ہو، جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو شریک نہ ہوئے ہوں۔ شعر و شاعری کی یہ مجلسیں ہر زمانے میں عام رہی ہیں۔ ان کے چند در چند رسوم و آداب مقرر تھے جن کا احترام ہندو و مسلم دونوں کے لئے واجب سمجھا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کے زانو بہ زانو بیٹھ کر ہندو و مسلم اپنا اپنا کلام سُناتے تھے۔ مشاعروں کا انعقاد عموماً کسی صاحبِ خانہ کے گھر پر ہوتا تھا۔ اُردو کے قدیم مشاعروں کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ میزبان کبھی کبھی ہندو بھی ہوتے تھے۔ بعض اوقات مشاعروں کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لایا جائے۔ ایسی ہی ایک کوشش لکھنؤ کا وہ مشاعرہ[1] تھا جو "آئینہ ہندوستان" کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مشاعرہ ہری سرن داس کے دولت خانہ پر منعقد ہوا تھا، اس کے علاوہ منشی لچھمن پرشاد صدر اور رنگ بہاری لال سوسن کے ہاں لکھنؤ میں برسوں مشاعرے ہوتے رہے۔ دہلی میں ایسے مشاعرے امرناتھ ساحر، پیارے لال رونق اور

[1] ضمیمہ اخبار دربار لکھنؤ یکم جون ۱۹۲۶ء

چندی پرشاد شیدا کے زیر اہتمام ۱۹۳۰ء تک ہوتے رہے۔ کنور بدری کرشن فروغ سکندرآباد کے رئیس ان مشاعروں کے بانی تھے[۵۱]۔ اس طرح مسلمانوں کے گھر ہندوؤں اور ہندوؤں کے گھر مسلمانوں کی نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ اور اس وقت کی سوسائٹی ان تعلقات میں کسی تفاوت کو روا نہ رکھتی تھی۔

اُستادی اور شاگردی کی روایت بھی اُردو میں فارسی اثر سے آئی، ہر اُستاد کے بے شمار شاگرد ہوتے تھے جو اُن کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے، حتیٰ کہ ادبی مناظروں میں اگر کوئی ایسی نوبت آتی تو اپنے ہم مذہبوں سے مقابلہ کرنے میں بھی عار نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں اُردو کے چند اُن ہندو شاعروں کا ذکر بے جا نہ ہوگا جنھوں نے مسلمان شاعروں کے سامنے زانو ادب تہہ کیا۔ ذیل میں ہر اُستاد شاعر کے سامنے اُس کے ہندو شاگردوں کے نام درج کئے جاتے ہیں:-

مرزا جان جاناں مظہر:	کشن چند مجروح
خان آرزو:	ٹیک چند بہار، اور آنند رام مخلص
میر تقی میر:	بندرابن راقم، جسونت سنگھ دیوانہ، شیو کمار وفا اور منو لال صفا
مرزا قتیل:	خیالی رام خیالی، اور لال چند انس
شاہ حاتم:	خوش وقت رائے شاداں، اور مکند سنگھ فارغ
سودا:	لچھمی رام فدا،
شاہ نصیر:	خوب چند ذکا، منولال پریشاں، رام پرشاد شاد، چنڈو لال شاداں، گنگا داس ضمیر، دھومی لال طرب موتی لال طرب، رام سکھ عاشق، عزت سنگھ عیش موہن لال منعم، گھنشام رائے عاصی، دولت رام عبرت خیالی رام عیاش، مہتاب سنگھ غم، دولت سنگھ لطیف، مول چند منشی، مٹھن لال نامی، صاحب رام راقم گوبند رائے نصرت، اور مہاراج سنگھ عزیز، جس نے بعد وفات شاہ نصیر، ان کے کلام کو جمع کیا تھا۔

[۵۱] بہ حوالہ منور لکھنوی۔

انعام اللہ خاں یقین: شیو سنگھ ظہور، اور جنتا رام عمدہ۔

میر درد: نرائن داس بیخود، لچھمن ناتھ لچھمن، بال مکند جنوں اور بہاری لال عزیز،

غالب: دیبی دیال نامی، شوجی رام مونس، ہرگوپال تفتہ، اور بچھمی نرائن شفقت،

مومن: منولال شاد، اور بشن پرشاد فرحت

ذوق: بال مکند صبر، پیارے لال ظہیر، پیاری لال مشتاق دولت رام شفق، کنور سین عزیز، اور موہن لال موہن،

امام بخش صہبائی: دُرگا پرشاد نادر

ناسخ: رام سہائے رونق، فتح چند شائق، جواہر سنگھ جوہر، رام دیال سخن، سُندر لال بسمل، اور جہنو لال طرب، دوارکا پرشاد افق بھی ناسخ سے عقیدت رکھتے تھے،

آتش: جیالال بہادر، کنور گوپال سہائے صور، دیا شنکر نسیم اور جگل کشور ظہور،

مصحفی: کانجی مل صبا، بینی پرشاد ظرافت، ٹیکارام تسلی، کنور سین مصحفی، اور موجی رام موجی،

انشا: اسیری سنگھ نشاط، لچھمن لال آرام،

میر حسن: گنگا سنگھ قادر،

جرأت: منگل سین الفت، گنگا پرشاد رند، اور اجودھیا پرشاد حسرت،

امانت: بھگونت رائے امانت، دینا ناتھ جوہر، گنگا پرشاد رحمت کدار ناتھ فرحت، تالنہو جی مروت، اور شیو پرشاد ناظم۔

وزیر: دھنپت رائے راز،

سعادت یار خاں رنگین: پورن سنگھ پورن،

قدرت اللہ خاں قدرت: عجائب رام منشی،

26

میر سوز:	موتی لال جیتؔ،
محمد حسین آزاد:	کشن لال غالبؔ، اور کیسرا سنگھ جہانگیرؔ،
داغؔ:	برج نرائن کشمیری، رام چندر بیتابؔ، راجہ ہرکشن سنگھ دیبی پرشاد مائلؔ، شیو نندن بہارؔ، نرائن پرشاد مہرؔ، اور ترکھون ناتھ زارؔ،
امیر مینائی:	جوالا پرشاد برقؔ،
ریاض خیرآبادی:	شام سندر لال برقؔ، مولا رام بسملؔ، اور ہری روت سنگھ خوشترؔ،
سید کرامت حسین:	سرورؔ جہاں آبادی،
آزاد بلگرامی:	دیا رام پنڈتؔ،
جلال لکھنوی:	سیکو لال عشرتؔ،
نوح ناروی:	درباری سنگھ شاطرؔ، اودھ پرشاد کشتہؔ، سکھ دیو پرشاد بسملؔ بیلی رامؔ، مہیش پرشاد سوگؔ،
عزیز لکھنوی:	جگت موہن لال رواںؔ، شیر سنگھ شمیمؔ،
تاجور نجیب آبادی:	کیشو داس عاقلؔ،
برکت اللہ رضا:	آنند نرائن ملاؔ،

اسی طرح کئی مسلمان شاعر بھی ہندو اُستادوں کے خوشہ چین رہے۔ جعفر علی حسرتؔ، جو قلندر بخش جراتؔ کے استاد تھے، رائے سرب سنگھ دیوانہؔ کے شاگرد تھے۔ میاں بسملؔ، میاں مشکلؔ، میر تراب علی عادلؔ اور میر حیدر علی حیراںؔ کا شمار تلامذہ بختاور سنگھ غافلؔ میں ہوتا ہے۔ کھیم نرائن زیدؔ، مولوی حفیظ الدین تمہیدؔ کے اور بنسی دھر ہمتؔ، باقر علی کے اُستاد تھے۔

اُردو ادب میں اتحاد پسندی کے جو رجحانات پائے جاتے ہیں، یہ اُس کا عملی پہلو تھا، اب اُردو کے ادبی مواد سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اُردو کے اصناف سخن میں غزل سب سے اہم ہے۔ غزل میں ہندو مسلم رواداری کی جو فضا پائی جاتی ہے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

میں نہ جانوں کعبہ و بُت خانہ و میخانہ کوں دیکھیا ہوں ہر کہاں دستا ہے تجھ مکھ کا صفا

(قلی قطب شاہ)

مشربِ عشق میں ہیں شیخ و برہمن یکساں رشتۂ سبحہ و زُنّار کوئی کیا جانے

(سراج دکنی)

کوئی تسبیح اور زُنّار کے جھگڑے میں مت بولو یہ دونوں ایک ہیں ان کے بیچ رشتہ ہے

(آبرو)

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دَیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

(میرؔ)

رام و رحیم کی سمرن ہے شیخ و ہندو کو دل اس کے نام کی رٹنا رٹے ہے کیا کیجئے

(ولی اللہ شاگرد سوداؔ)

کیسا مومن، کیسا کافر، کون ہے صوفی، کیسا رند
بشر ہیں سارے بندے حق کے سارے جھگڑے بشر کے ہیں

(ذوقؔ)

مشربِ صُلحِ کُل ہے اے زاہد دیر بھی اک حرم کا سایہ ہے

(امیرؔ مینائی)

سرِ نیاز سلامت رہے پئے تسلیم نہیں تمیز ہمیں دیر کیا حرم کیا ہے

(داغؔ)

کعبہ و دیر میں دوڑاتے ہو دھوکے دے کر کیا کہیں گے تمھیں سب لبرؔ مسلماں دل ہیں

(جگیں)

تمھارا بول بالا ہر جگہ ہے اللہ والوں میں یہی ہو حق حرم میں اور یہی جپ تپ شوالوں میں

(ثاقبؔ بدایونی)

ہندو غزل گو شاعروں کے ہاں بھی ایسے جذبات تلاش کئے جا سکتے ہیں اور حق تو یہ ہے ایک جہتی کا یہ ترنّم غزل کے زیر و بم میں ہمیشہ گونجتا رہا ہے۔

وہی یک رلیماں ہے جس کو ہم تم تار کہتے ہیں کہیں تسبیح کا رشتہ کہیں زُنّار کہتے ہیں

(ٹیک چند بہارؔ)

اصل مطلب ایک ہے آگاہ نا آگاہ ہے الک کا ترجمہ عربی میں لفظ اللہ کا

(جواہر سنگھ جوہرؔ)

دیر و مسجد پہ نہیں موقوف کچھ اے غافلو یار کو سجدہ سے مطلب ہو کہیں سجدہ کیا
(مادھو رام جوہر)

دل بدل آئینہ ہے دیر و حرم حق جو پوچھو ایک در ہے دو طرف
(دیا شنکر نسیم)

دیر و حرم ہیں شیخ و برہمن کے واسطے ہم جن کو پوجتے ہیں وہ پتھر ہی اور ہیں
(کیسرا سنگھ جہانگیر)

دیر و حرم میں جلوۂ قدرت ہے آشکار زنار و سبحہ میں نہیں فرق ایک تار کا
(راجہ کشن کمار وفا)

اپنا تو سر جھکے ہے دونوں طرف کہ اس کی تصویر بتکدے میں اور ہی حرم میں خاکا
(پیارے لال آشوب)

حس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی کعبہ ہو وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا
(چکبست)

ایک ہی جلوہ میانِ دیر و کعبہ ہے مگر اتفاقِ رائے شیخ و برہمن میں کیوں نہیں
(شیو پرشاد دیبی)

یہ سلسلہ یہاں ختم نہیں ہو جاتا، ایسی کئی مثالیں اردو نظم سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ اردو کے شاعروں نے مذہب کے ظاہری لوازمات کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ وہ دیواریں ہیں جو ہندو کو مسلمان سے اور مسلمان کو ہندو سے جدا رکھتی ہیں:-

یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں
(چکبست)

اور چونکہ مذہب کی یہ روائتی بندشیں بیکار ہیں۔ وہ دل حق بیں کو ان سے آزادی حاصل کرنے کی ترغیب دیتے ہیں:

بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے جھگڑے دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں
اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شانِ مومن سے حرم میں نعرہ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں
(چکبست)

اقبال نے بانگِ دہل کہا تھا کہ ہم سب ہندی ہیں اور مذہب ہیں بیر نہیں سکھاتا، اردو کے شاعر اسی ہندوستانی جذبے کے پیامبر ہیں۔ وہ قوم کی شیرازہ بندی کے آرزومند

ہیں: غیر ملکی عوامل نے جب کبھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چپقلش پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اُردو کے شاعر خون کے آنسو روئے ہیں:

قوم کی شیرازہ بندی کا گلہ بےکار ہے طرزِ ہندو دیکھ کر طرزِ مسلماں دیکھ کر

(چکبست)

اور وہ ان عوامل کو کفر کے حملوں سے تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ فتنہ و فساد نہ تو اسلام میں جائز ہے نہ ہندو ازم میں:

زک اگر کفر کے حملوں سے نہ ایماں پائے سرگ ہندو کو ملے خُلد مسلماں پائے

(دوارکا پرشاد اُفق)

ہندوؤں اور مسلمانوں میں بُعد پیدا کرنے کی جو کوششیں اب سے قبل پوری ایک صدی جاری رہی ہیں۔ اُردو کے اہلِ قلم اُنھیں ہمیشہ ناکام بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ حادثہ کان پور ۱۹۳۱ء میں منوّر لکھنوی نے لکھا تھا:

پھرا ہے کس لئے سر ہندو و مسلماں کا لگا ہے خون یہ انساں کے منھ کو انساں کا

جنونِ قتل کے قبضہ میں زندگی آجائے ہزار حیف کہ غالب درندگی آجائے

اِس کے باوجود وہ ناامید نہیں ہوتے کیونکہ وطن کے سینے میں جب شہادت کی شمع جاگ اٹھتی ہے تو اس کی آنچ میں دل موم کی طرح پگھل جاتے ہیں:

یہ خونِ دلِ غمزدہ کو بھر دے گا یہ خونِ ہندو و مسلم کو ایک کر دے گا

(منوّر)

اُردو کے شاعر مجموعی طور پر اتّحاد کی مشعل کو روشن رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ جب اُس کے نور سے کعبۂ دل جگمگا اُٹھتا ہے تو منافرت کی دُھند خود بخود چھٹ جاتی ہے۔

آندھیوں کے جھگڑے یکدم سبھی بھلادیں آدل سے امتیازِ دیر و حرم مٹادیں

کرکے چراغ روشن پھر اتّحاد کا ہم جنتے بڑھ کے دل کے کعبے کو جگمگادیں

(لال چند فلک)

اسلام اور ہندو ازم میں جو بھی صداقتیں ہیں، اُردو کے شاعر اُن کے عاشق و دلدادہ ہیں، وہ انہیں سمیٹ لینے کی تلقین کرتے ہیں:

حرم کو جاؤ تو رستے سے دیر کے جاؤ دُعائیں لے کے بتوں کی خدا کے گھر کو چلو

اور وہ مذہب کے نظام کہنہ کو بدلنے کی دعوت دیتے ہیں، اُس ہیجان، فرسودہ اور روائتی رسم و رواج کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں جو دل کو دل اور انسان کو انسان سے دور رکھتے ہیں:

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اُٹھادیں بچھڑوں کو پھر ملادیں، نقش دُوئی مٹادیں
سوُنی پڑی ہوئی ہے مُدّت سے دل کی بستی آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنادیں
(اقبال)

اس نئے شوالے کا ایمان، ایمان اتّحاد ہے، جس کے لئے وہ یوں دست بدعا ہیں:

باقی رہے نہ ہندو و مسلم میں، کچھ بھی فرق ہو جائیں ایک مثل دل و جاں خُدا کرے
ایمان اتّحاد یہ لائے ہر اک نفس قائم ہو اتّحاد کا ایماں خُدا کرے
عیسائی ہوں، ہنُود ہوں، مسلم ہوں خواہ سکھ سب نام پہ ہوں صُلح کے قرباں خدا کرے
(منوّر)

تخلّص رکھنے کا رواج ہندوؤں نے مُسلمانوں سے لیا، جہاں سے یہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں پھیل چُکا ہے، اُردُو کے ہندو شاعروں کے نام سے اگر ان کا اصلی نام ہٹا لیا جائے اور صرف تخلّص رہنے دیا جائے تو بعض اوقات یہ شک ہی نہیں گزرتا کہ وہ ہندو ہیں۔ قدیم ہندو شاعروں میں کئی ایسے تخلّص ملتے ہیں جو خالص اسلامی ہیں: مثلاً رام ولی، رام دین اکبر، نہال سنگھ طوبیٰ، رگبیر دیال آثم، یا جوالا پرشاد آذر وغیرہ وغیرہ۔

باہمی رواداری اور مذاہبی فراخدلی کا رنگ قدیم اُردُو ادب میں اتنا گہرا رہا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان مصنّفین اپنی کتابوں کی ابتدا سری گنیش یا سرسوتی کی مدح سے کرتے، اور ہندو، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" یا ایسے دوسرے متبرک کلموں کا ذکر اپنی تالیف کے آغاز میں ضروری سمجھتے تھے، ایک دوسرے کے مذاہبی القاب کا استعمال اس سے پیشتر ہندوستان کے فارسی ادب میں پایا جاتا ہے۔

"رحیم نے مدناشتکا سری گنیش نامہ لکھ کر شروع کیا۔ جہانگیر کے عہد کے ہندی مصنف احمد نے بھی اپنی تالیف سامدریکا میں یہی کیا ہے۔ احمد اللہ دکشنا نے اپنی تصنیف نیا کا بھید میں سری رام جی سہائے، سرسوتی اور گنیش کا نام لیا ہے۔ یعقوب نے

راشا بھوشن لکھی تو سری گنیش جی سری سرسوتی جی، سری رادھا کرشن جی اور سری گوری شنکر جی کے فضل و رحمت کا طالب ہوا ہو۔ غلام نبی رسلین نے اپنی دو کتابوں انگا درپنا، اور اساپربودھ کا آغاز سری گنیش نامہ لکھ کر کیا ہے۔ اعظم خاں نے محمد شاہ کے حکم سے سنگار درپن لکھی تو راما نوجا کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ لقمان نامی ایک موئف نے طب پر کوئی رسالہ لکھا ہے۔ اس کا آغاز بھی گنیش جی کی مدح سے ہوا ہے۔ سید پوہر کی طبی کتاب رس رتناکر میں بھی گنیش جی کے ساتھ نیازمندی دکھائی گئی ہے۔[۵۱]

قدیم اُردو ادب میں بھی یہ روایت برابر قائم رہی ہے۔ دکن کے ابتدائی مسلمان شاعروں نے جہاں جہاں بھی کوئی حمد لکھی ہے، اس میں کرتار، آدھار، سنگورو، نرنکار، پیتم اور شیام موہن کے الفاظ کو عموماً استعمال کیا ہے۔ شمالی ہندوستان میں بھی یہ رواج عام تھا۔ اہل ہنود کی لکھی ہوئی اس زمانے کی شاید ہی کوئی تصنیف ہوگی جو اسلامی القاب سے شروع نہ کی گئی ہو۔ آنند نرائن مخلص نے اپنا سفرنامہ، شیو پرشاد وہبی نے اپنا کلیات مسمیٰ مرقع ارژنگ دیبی پرشاد بشاش نے اپنا تذکرہ شعرائے ہنود، فراقی نے وقائع عالم شاہی، دیبی پرشاد سحر بدایونی اور برج باشی لال عاصی نے اپنا دیوان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کیا ہے۔

منشی بال مکند بے صبر نے اپنے دیوان خاص کی ابتدا اس شعر سے کی ہے:

سر دیوان پہ گر حرف توحید وحید آیا — تو سب اپنا سخن تفسیر قرآن مجید آیا

اور دیوان عام یوں شروع ہوتا ہے۔

جبکہ بسم اللہ وصف عارض جاناں ہوا — مطلع خورشید اپنا مطلع دیواں ہوا

جگن ناتھ خوشتر نے واجد علی شاہ کے عہد میں بھاگوت منظوم لکھی تھی، اس کا ابتدائیہ ہے:

گل افشاں حمد باری میں قلم ہے — بیاض نامہ گلزار ارم ہے

منشی چمن لال نے سنگاسن بتیسی کو نظم کیا تھا، اُس کے دیباچہ میں لکھا ہے:

الٰہی سبز کر میرے سخن کو — بہار بے خزاں دے اس چمن کو

اس کے علاوہ ایک دوسرے کی مذہبیات سے تشبیہات استعمال کرنا تو عام سی بات تھی، ہندو حضرات قرآن کی تلمیحات اور مسلم اہل قلم ہندوؤں کی قدیم حکایات

---

۵۱ خطبہ ڈاکٹر تارا چند۔ معارف نمبر ۳، جلد ۲۵، ص ۲۳۱

کو اپنے کلام میں استعمال کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اُردو غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پریم کی رنبھا[۵۱] اُربسے ہنس ہنس — کلیاں نیہہ کی سب کھلاتے ہیں
مدن[۵۲] بان سانڈے ہے باکان تھے چھند سوں — کہ جیو ال ہرن پہ سرکپ زُلف کھالی
(قلی قطب)

جودھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے صنم — ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج
تب کا مشتاق جی ہے لکھمن سوں — کشن سوں جب کہ نام نامی ہے
ولی تجھ زلف کی گر ساحری کا بیاں بولے — چلے پاتال سوں[۵۳] باشک سو پیچ و تاب سوں اُٹھ کر
(ولی)

بحری کو دکھن یوں ہے کہ جیوں نل کو دمن ہے — بس نل کوں ہے لازم جو دمن چھوڑ نہ جانا
(بحری)

آتشِ عشق نے راون کو جلا کر مارا — گرچہ لنکا سا تھا اس دیو کا گھر پانی میں
(میر)

سانولے پن پہ غضب دھج ہے بسنتی شال کی — جی میں ہے کہہ بیٹھئے اب جے کنہیا لال کی
(انشا)

ایک ایک نقطے پر سوئے لڑتے ہیں مردے — محفل مشاعروں کی اکھاڑہ ہے بھیم کا
(جان صاحب)

سانولے تن پہ قبا ہے جو ترے بھاری ہو — لالہ کہتا ہے چمن میں یہ گردھاری ہے
(امانت)

ڈر کے میری شبِ جُدائی سے — کالکا رام رام کرتی ہے (امیر)
سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی — ہوں مسلماں مگر بول اٹھوں جے کالی کی (〃)

محسن کاکوروی کی وہ نعت جس میں تمام ہندو تشبیہات استعمال کی گئی ہیں، اس قدر عام ہے کہ اس کا صرف ذکر کر دینا ہی کافی ہوگا۔

---

۵۱ رنبھا، اندر لوک کی ایک مشہور پری ہے۔

۵۲ مدن، کام دیو (Cupid) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

۵۳ ہندو میتھالوجی میں چار اہم سانپوں کا ذکر آتا ہے کالی ناگ، شیش ناگ، تکشک اور باشک۔ ولی کے شعر میں شعر باشک مراد ہے۔

اسی طرح اُردو کے ہندو شاعروں کو بھی الہیات سے استعارے اور تشبیہیں اخذ کرنے میں کوئی باک نہ تھا۔ قرآن، کلمہ، کعبہ، رسولؐ، نوح، خضر اور جبرئیل، زکوٰۃ اور سورۂ اخلاص کا ذکر اس انداز سے کرتے ہیں، جیسے یہ سب کچھ خود ان کے مذہب سے متعلق ہوں۔ ذیل میں چند ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

یم اشکِ رواں میں ڈوبتا ہے مردمِ دیدہ   مدد یا خضر دوڑو نوح کی کشتی ہو طوفاں میں
(اُفق)

کعبے کی طرف نشہ میں کس طرح سے جاؤں   دشوار سنبھلنا ہے مجھے لغزشِ پا سے
(جانکی پرشاد آئل)

بھلا نسبت ہے کیا ہندوستاں سے مصر وکنعاں کو   کہ یہاں ہر ہر گلی میں جلوہ یوسف نمایاں ہے
جو تیرے مصحفِ رُخ پہ لکھا یہ خطِ ریحاں ہے   پڑھا جاتا نہیں اک حرف بھی یہ کیسا قرآں ہے
کبھی نہ سجدہ کیا بدگماں نے میرے ساتھ   قیام اُس نے کیا میں نے جب رکوع کیا
(دیبی پرشاد بشاش)

کرتے کرتے ذکر اُس کے مُصحفِ رُخسار کا   خود بخود مجھ کو کلام اللہ ازبر ہو گیا
(بال مکند بے صبر)

میں بھی رکھتا ہوں یونہی نامۂ جاناں سر پر   جس طرح رکھتے ہیں مُصحف کو مسلماں سر پر
(جواہر سنگھ جوہر)

صنم کے کعبۂ رُخ پر جو تل ہے چوم لے زاہد   کہ بوسہ سنگِ اسود کا یہی فرضِ مسلماں ہے
(لالتا پرشاد شفق)

فکر جب مُصحفِ رُخسار کا ہم کرتے ہیں   دمبدم سورۂ اخلاص کو دم کرتے ہیں
(رام سیوک برہمن شگرفی)

سنگِ اسود کا ہو اتل پہ گماں اے فرحت   رُخ کو کعبہ دہنِ یار کو زمزم سمجھے
(شنکر دیال فرحت)

بوسہ صنم کا نہ لیں بے وضو کبھی   قرآں کا پاس چاہیئے ہم پارسا کریں
(راجہ کشن کمار وقار)

تارا چند لاہوری نے ایک خمسہ شیوجی مہاراج کی صفت میں لکھا تھا، اس کا ایک شعر ہے:

جہاں میں دیوتا جتنے ہیں ان میں نامور شیو ہیں   سبھوں کے قبلہ وکعبہ اور سب کے پیرو مرشد ہیں

حق تو یہ ہے کہ تشبیہات اسلامی ہوں یا ہندوانہ، اُردو شاعروں کے لگاتار استعمال سے زبان زد ہوچکی ہیں اور آج بھی برابر استعمال ہوتی ہیں۔

ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی، ایسے کئی مسلمان ولیوں اور مرشدوں کا ذکر کیا جائے گا جن کے پیروؤں میں ہندو بھی شامل ہوتے تھے، منشی کوڑے سنگھ صفی پچھلی صدی کے ایک ہندو شاعر تھے، صوفی شاہ محمد دین میرٹھی سے درس حقیقت لیتے تھے، ان کا ایک شعر ہے:

بفیضِ حضرتِ مرشد کہ کہئے محمد دین ان کو — صفی طینت میں تیری پارسائی ہوتی جاتی ہے

اُردو میں اتحاد پسندی کے رُجحانات کی انتہا یہ ہے کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے پیغمبروں اور دیوی دیوتاؤں کا ذکر گہرے عجز و عقیدت کے ساتھ کرتی ہیں، وہ پیغمبر اسلام اور کرشن، گوتم یا نانک کے مراتب میں کوئی تفاوت روا نہیں رکھتیں، مرزا جان جاناں مظہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ گیتا کو قرآن سے کم نہیں سمجھتے تھے، اور ہندوؤں کو اہل کتاب کہتے تھے، یعنی مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، میل جول رکھنا، اور شادی بیاہ رچانا جائز تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا کرنا تعجب خیز بھی نہیں، کیونکہ یہ اُس زمانے کی تہذیب کا رنگ تھا۔ نظیر اکبر آبادی جنم اشٹمی کے موقعہ پر بندرابن اور متھرا جایا کرتے تھے۔ اپنی نظموں میں انھوں نے ان میلوں کے ہوبہو مرقعے کھینچے ہیں۔ جوگیوں کے جھانکنے تاکنے، کبت کتھا سُننے، اور پالکیوں، ہاتھیوں، اور جوڑوں کے ذکر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نظیر خود ان میلوں میں "جو مہاراج رام رام بھجو" کا کیرتن کرنے والے جوگیوں میں شامل ہو جایا کرتے ہوں گے۔ نظیر کے ایک ایک شعر سے ان کی روح کی وہ پکار سُنی جاسکتی ہے جو محمد و کرشن دونوں کو ایک ہی ذات باری کا پرتو سمجھتی تھی اور اُس کے درشنوں کی "ابھلاشا" میں گھُلی جاتی تھی۔

نظیر نے کرشن کی عقیدت سے سرشار ہوکر جو نظمیں لکھی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

جنم کنہیا جی، بالپن، بنسری بجیا لہو و لعب کنہیا، بانسری، کنہیا جی کی شادی، رسم کتھا، ہری کی تعریف میں، بیان سیکش اور نرسی اوتار۔ نظیر کے پاکیزگی خلوص کے ثبوت میں صرف ایک شعر پیش کردینا ہی کافی ہوگا۔ اپنے جوگی ہونے سے وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں:

گھنشام مراری گردھاری، بنواری سُندر شیام برن
پربھو ناتھ بہاری کان للا سکھدائی جگ کے دُکھ بھنجن

اس کے علاوہ کرشن کو انہوں نے ان مختلف ناموں سے پکارا ہے: کانھ جھنڈولے، دُودھ کے لُٹیا، مدھ پوری کے بسیا، گون چریا، جوتی سروپ، مدن موہن، من ہرن، نند لال، گردھاری، گووردھن، نول کشور، ماکھن اچکے، گوبند چھیل کنج، بانسری بجیا، برج راج، مدن گوپال وغیرہ وغیرہ۔

ہندو مذہبیات میں شری کرشن کے متعلق شاید ہی ایسی کوئی حکایت ہو، جس کا نظیر کو علم نہ ہو۔ جمنا کنارے کی لیلا، رتھ کے چھلکتے ہوئے کلس کا اور دوارکا پوری کے موج میلوں کا ذکر نظیر جس اعتماد سے کرتے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بھاگوت پران کی ایک ایک کتھا اور قصے سے انہیں پوری واقفیت حاصل تھی۔

کنہیا کی راس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سکھیاں پھرے ہیں ایسی کہ جوں حور اور پری ۔۔۔ سُن سُن کے اس ہجوم میں موہن کی بانسری

کرتے ہیں نرت کنج بہاری بصد برن ۔۔۔ اور گھنگھروؤں کی سُن کے صدائیں چھنن چھنن

حلقہ بنا کے کشن جو ناچیں ہیں ہاتھ جوڑ ۔۔۔ پھرتے ہیں اس مزے سے کہ لیتے ہیں دل مروڑ

ناچیں ہیں اس بہار سے بن ٹھن کے نند لال ۔۔۔ سر پر مکٹ براجے ہے پوشاک تن میں لال

ہے روپ کشن جی کا تو دیکھو عجب الوپ ۔۔۔ اور ان کے ساتھ چمکے ہے سب گوپیوں کا روپ

اس میں شک نہیں کہ نظیر کے ہاں سور داس کی سی وارفتگی اور نشاطیہ بے خودی نہیں لیکن اس کی وجہ جواز بھی ہے۔ نظیر کی نظمیں کسی عرفان کی تجلی سے منور نہیں ہیں نہ ہی نظیر کے سامنے ایسا کوئی مدعا تھا۔ نظیر کا تقریباً کلام بیانیہ ہے اور نظیر کی نظمیں کرشن کھیل اہمیت کی نمائندگی کرنے میں کامیاب ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک ان میں ایک لوک گیت کا سا لُطف ہے۔

اور کہیں کہیں تو نظیر اپنی جادوِ بیانی سے بالکل مندر کی سی فضا پیدا کر دیتے ہیں:

جب ساعت پرگھٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھریا کی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنہیا کی

کرشن سے عقیدت کی اس روائت کو اُردو کے مسلمان اہلِ قلم نے موجودہ زمانے تک قائم رکھا ہے۔ حسرت موہانی کا شمار کرشن کے سچے پرستاروں میں کیا جاسکتا ہے۔ کرشن سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے وہ ہندی شاعروں کا پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تُم بن کون سُنے مہراج   راکھو بانہہ گہے کی لاج
برج موہن جب سے من بسے   ہم بھولن سب کام کاج

نردئی شیام پردیس سدھارے   ہم دُکھیارن چھوڑ چھاڑ

من موہن شیام سے نین لاگ   نس دن سُلگ رہی تن آگ

کہاں چھپائے رہے گردھاری   اور ن ل سُدھ بھول ہماری

کوئی جتن جیا دھیر نہ دھارے   نیند نہ آوے نین، گردھاری بنا

حسرت کرشن کے دلدادہ ہی نہیں بلکہ اُن کی محبت ہندوستانیت کے اُس جذبے کی ترجمان ہے جس کا راز کرشن کے کردار میں کھُلتا ہے۔ حسرت کی ایک غزل کے چند اشعار کا ذکر یہاں بے جا نہ ہوگا۔

متھرا کہ نگر ہے عاشقی کا   دم بھرتی ہے آرزو اُسی کا
ہر ذرّۂ سرزمینِ گوکل   دارا ہے جمالِ دلبری کا
برسانہ و نندگاؤں میں بھی   دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغامِ حیاتِ جاوداں تھا   ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرت   سرچشمہ فروغِ آگہی کا

سیماب اکبرآبادی نے اپنی نظم "تیرا انتظار" میں کرشن کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کشش ہے برج کی یا جذب برج والے کا خمیدہ ہیں شجر سایہ دار ایک طرف
طلوع ہو کہ درخشاں ہو مطلعِ متھرا پہنچ رہی ہے نظر بار بار ایک طرف
نصیب کاش ہو سیماب کو بھی جلوہ تیرا پڑا ہے وہ بھی سرِ رہ گزار ایک طرف

خواجہ حسن نظامی کو کرشن سے جو محبت و لگاؤ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ہمیں ان کا ایک مضمون دستیاب ہوا ہے جس میں انھوں نے کنس کا فرعون سے مقابلہ کرتے ہوئے کرشن کو موسٰی کا ہم رُتبہ قرار دیا ہے۔

غرض یہ کہ ایسے کئی مسلمان شاعروں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں جنھوں نے کرشن کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار نہائت احترام سے کیا ہے۔ مجموعی طور پر ایسے شاعروں کے چند اشعار کو دیکھ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو کرشن کی بنسی کا اک بہتا ہوا نغمہ ہے تو
(ساغر نظامی)

بنسی دھر اس بنسی کے پھر بول سُنا دے متوالے پھر برکھا رُت گھر آئی ہے پھر بادل ہیں کالے کالے
(آغا شاعر قزلباش)

سری کرشن کا میں احترام کرتا ہوں اور اس میں روز نیا اہتمام کرتا ہوں
وہ جَور و ظلم کی بُنیاد ڈھانے آیا تھا میں اُس کی رسم کو دُنیا میں عام کرتا ہوں
(ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار)

متھرا تجھ سے ہے نامور بھگوان بندرابن تجھ سے پُر اثر بھگوان
دل کی دُنیا کا تو سویدا ہے گھر خدا کا ہے تیرا گھر بھگوان
(نواب سراج الدین خاں سائل)

چارہ سازی کیجیے مُرلی منوہر آپ ہی سینۂ بسمل کا اک اک زخم کاری دیکھیے
(بسمل الہ آبادی)

تصویر اس سانولی صورت کی کھنچ آئی دل کے شیشے پر
اب تو اپنے من موہن کو میں آئینہ دکھلاتا ہوں
(ابن الحسن فکر)

کاش پھر تاریخ اُلٹ دیتی ذرا اپنے ورق   کاش ہم پھر معرفت کے بحر سے سُن سکتے سبق

(سعید احمد سعید)

اس کے علاوہ کرشن کے مسلمان مدّاحوں سے حفیظ جالندھری، ابن حسن قیصر، مرتضیٰ احمد خاں میکش، مظہر علی، منظر صدیقی ابنِ سیاب، عشرت رحمانی، مظفر حسن دائرہ خارقی محمد امین شرقپوری اور محمد عباس حسن کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اُردو کے مسلمان اہل قلم کرشن کی طرح ہندوؤں کے باقی دیوتاؤں اور پیغمبروں کا بھی احترام کرتے ہیں: نظیر اکبرآبادی نے گرو نانک کی مدح ان الفاظ میں کی ہے:

جو لُطف و عنایت ان میں ہیں کب وصف کسی سے ان کا ہو
وہ لُطف و کرم جو کرتے ہیں ہر چار طرف ہیں ظاہر وہ

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نِوار ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

اقبال بھی نانک کی عظمت کے مُعتقد تھے:

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے   ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

گوتم اور رام کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے:

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی   قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی

برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں   شمع گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز   اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا   پاکیزگی میں جوش محبّت میں فرد تھا

ہندوؤں کی کئی مذہبی کُتب کے تراجم بھی مسلمانوں کے مرہون منّت ہیں۔ ان میں خواجہ دل محمد کی گیتا اور سکھ منی صاحب ہندوؤں میں بہت ہی مقبول ہیں۔ آخر لکھنوی نے بھگوت گیتا کو نظم کیا ہے۔ نفیس خلیلی نے بھی گیتا کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ غلام الحسنین کے ہندو

مذہب پر دیئے گئے لکچروں کا مجموعہ "ہندو مذہبی معلومات" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور اجمل خاں صاحب کے اسمائے گرامی بھی اس زمرے میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

جہاں تک مذہبیات کا تعلق ہے، اردو ادب میں اتحاد پسندی کے رجحانات کا یہ ایک رخ تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسی گرم جوشی سے مسلمانوں کے جذبہ دل کا جواب دیا ہے۔

منشی کنہیا لال شاد نے جو انیسویں صدی کے نصف آخر سے تعلق رکھتے ہیں، ایک رسالہ علم تصوف پر تالیف کیا تھا۔ لکھنؤ کے منشی ہردے پرشاد وکیل اور منشی اودھ بہاری لال ثمر نے ایک کتاب "منتخبات مناجات" کو مرتب کیا تھا۔ منشی پریم چند کا ناول کربلا اور گوردت سنگھ دارا کی کتاب "محمد کی سرکار" بھی اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔

سرور جہاں آبادی کی نعت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کیفی نے لکھا ہے کہ وہ مولود شریف کے جلسوں میں پڑھی جاتی ہے۔

منور لکھنوی نے قرآن پاک کے کچھ حصوں کو اردو نظم میں منتقل کیا ہے۔ یہ حصے رسالہ ادب کراچی میں چھپ چکے ہیں۔

منشی روپ چند نامی تلمیذ ساقی سکندر آبادی کا ذکر کرتے ہوئے عشرت لکھنوی نے لکھا[51] ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک شعر نعتیہ ضرور ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر یہ شعر درج کیا گیا ہے:

آیا جو نام پاک محمدؐ زبان پر ۔۔۔ صلی علی کا شور ہوا آسمان پر

اردو کے ہندو شاعروں میں ایسے کئی نام پیش کئے جاسکتے ہیں جنھوں نے پیشوائے اسلام کی بارگاہ میں زانوئے عقیدت تہہ کیا ہے۔ ان میں ہرگوپال تفتہ، بندرا بن عاصی، بال مکند بے صبر، دیورام کوثر، اور شیو پرشاد وہبی کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو ادب میں ہندو شاعروں سے منسوب جو نعتیہ کلام موجود ہے اس بات کا شاہد ہے کہ اردو کے ہندو ادیب ہندو ہوتے بھی "قائل اسلام" ہیں۔ یگانگت اور اتحاد پسندی کی اس سے بڑی اور کیا دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔ منور لکھنوی حضرت محمدؐ کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

---

[51] ہندو شعرا: ص ۱۱۶

آپ پر نازل خدائے پاک نے قرآں کیا — سُرمۂ توحید سے وا دیدۂ عرفاں کیا
آشکارا زندگی کا جوہر پنہاں کیا — پیکرِ اقدس کو رشکِ کعبۂ ایماں کیا
جو نہ سمجھیں آپ کا رُتبہ وہ اہلِ دل نہیں — اور کوئی جادۂ تسلیم کی منزل نہیں

شیرِ خدا حضرت علیؑ کی صداقت اور تقدس کا اعتراف انھوں نے یوں کیا ہے:

ایسا مطیع اہلِ کلام اور کون تھا — ایسا شہِ عرب کا غلام اور کون تھا
فرشِ زمیں پہ عرش مقام اور کون تھا — تسبیحِ مصطفےٰ کا امام اور کون تھا
پیدا دلاوری سے تھی صدق و صفا کی شان — شیرِ خدا کی شان تھی شیرِ خدا کی شان

لیکن اس سلسلے میں ہندو ادیبوں کا اہم کام وہ مرثیے اور سلام ہیں۔ جو انھوں نے شہیدانِ کربلا کی نوحہ گری میں لکھے ہیں۔ دکنی شاعر رام راؤ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، وہ اولیں ہندو شاعر ہے جس نے شہادت امام حسینؑ پر ایک کتاب قلمبند کی تھی جو آج ناپید ہے لکھنؤ میں مرثیے کی ابتدا ایک ہندو شاعر چھنو لال سے ہوئی جو بعد میں مسلمان ہوگئے اور دلگیر تخلّص کرتے تھے۔ اُردو کے جن قدیم ہندو شاعروں نے مرثیے اور سلام لکھے ہیں، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ منشی دوارکا پرشاد اُفق، چھنو لال طرب، گردھاری پرشاد باقی، سرکشن پرشاد شاد، پیارے لال رونق، جے پی پرشاد شیدا اور راجہ رائے اُلفت کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

تاج بہادر غریب کے بارے میں کہا جاتا ہے[51] کہ ہمیشہ عشرۂ محرّم میں تعزیہ رکھتے تھے اور لالہ خدا بخش کہلواتے تھے۔ ان کے والد منشی عالم چند بھی امام حسینؑ کے شیدائی تھے اور اسی رعایت سے لالہ حسین بخش پکارے جاتے تھے۔

عہد بہ عصر کے جن ہندو شاعروں نے مرثیے اور سلام کہے ہیں، یہاں ان میں سے چند کا ذکر اجمالاً کیا جاتا ہے۔

مالک چند مالک شاگرد پیارے صاحب رشید بھی مرثیہ کہتے ہیں۔ ان کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ شیعہ حضرات ان کو منبر پر بٹھا کے مرثیہ پڑھواتے تھے۔

گوپی ناتھ امن بھی شیعہ حضرات کی طرح محرّم کو پورے احترام کے ساتھ مناتے ہیں، اُن کی نظم "حسین" کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

رنگ بدلیں ہندو و مسلم وطن میں کتنے ہی — امن کو رہنا ہے آخر تک پرستارِ حسینؑ

---

[51] ہندو شعرا ص ۶۷

حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں اُردو کے ہندو شاعر اپنی عقیدت کو یوں پیش کرتے ہیں:

اُف رے قربانی عظیم اس کی ۔۔۔ مرد میدانِ کربلا کو سلام
بندگی جس پہ ناز کرتی ہے ۔۔۔ دل سے اس بندۂ خدا کو سلام
(منوّر)

فطرت کی مصلحت کا اشارہ حسینؑ تھا ۔۔۔ قربانیوں کی آنکھ کا تارا حسینؑ تھا
وہ اس لئے مٹا کہ ستم کو مٹا سکے ۔۔۔ پھر کیوں نہ یہ کہوں کہ ہمارا حسینؑ تھا
(قمر جلال آبادی)

ہندوؤں کے اس جذبۂ غم کی بُنیاد انسانیت کے وسیع تر مفہوم پر ہے:

غیر مسلم ہیں شریکِ غم مسلمانوں کے ساتھ ۔۔۔ آج ہمدردی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ
(کرشن گوپال مغموم)

ہے حق و صداقت مرا مسلک ساحرؔ ۔۔۔ ہندو بھی ہوں شبیرؑ کا شیدائی بھی
(رام پرکاش ساحر)

کافر کوئی کہے تو کہے آمن کو مگر ۔۔۔ اُس کے دل و جگر میں قیامِ حسینؑ ہے
(گوپی ناتھ آمن)

آتی ہے بام عرش سے لب پر صدا ہے ۔۔۔ دل سے جگر بھی آلِ نبیؐ کا غلام ہے
(رام نرائن جگر)

یہ کفر سے بدتر ہے اگر اے منصورؔ ۔۔۔ اس زندۂ جاوید کا ماتم نہ کروں
(گیان چند منصور)

حضرت امام حسینؑ کا پیغام صرف مسلمانوں یا ہندوؤں کے لئے نہیں، وہ جہان بھر کے لئے اور ہر انسان کے لئے اس کی تعظیم واجب ہے:

تخصیص نہ ہندو کی نہ مسلم کی ہے اس میں ۔۔۔ شبیرؑ کا پیغام جہاں بھر کے لئے ہے
(دگمبر پرشاد گوہر)

درسِ آموزِ جہاں ہے اب بھی تعلیمِ حسینؑ
سب کریں جامِ شہادت پی کے تعظیمِ حسینؑ
(کرشن گوپال مغموم)

شیش چندر طالب دہلوی نے ایک کتاب "ہمارے حسین" مرتب کی ہے۔ یہ کتاب محرم ۱۹۴۵ء میں ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کو پیش کی گئی تھی۔ اس میں موجودہ ہندو شاعروں کے کہے ہوئے مرثیے اور سلام یکجا کردئے گئے ہیں۔ اوپر جن شاعروں کا ذکر کیا جاچکا ہے، اُن کے علاوہ اس کتاب میں جن شاعروں کا کلام درج ہے، ان کے نام یہ ہیں: جوش ملسیانی، عرش ملسیانی، راجیندر ناتھ شیدا، ضیا فتح آبادی، نرائن داس طالب، کرشن لال ادیب، پریم چند پریم، چندبہاری لال ماتھر صبا، جگدیش سہائے سکسینہ، گلشن جلال آبادی، شنکر سروپ مفتون، شگن چند روشن، امرچند قیس، بلونت کمار ساگر، رام پرتاپ اکمل، اور رام لال ورما۔

(باقی آئندہ)

ہم قافیہ اشعار

(جناب مرزا بسم اللہ بیگ صاحب)

سب جانتے ہیں کہ غزل میں ایک ردیف ہوتی ہے اور ایک قافیہ جو ہر شعر کے آخر میں دُہرائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہوس لکھنوی کا شعر سنیئے ؎

دل میں اک اضطراب باقی ہے　　یہ نشان شباب باقی ہے

اس شعر میں باقی ہے ردیف ہے اور اضطراب اور شباب کا ا۔ ب اور فتحہ ماقبل یہ قافیہ ہوا دوسرا شعر سُنیے۔ صفی لکھنوی کہتے ہیں ؎

ہم کل آئینے میں رُخ کی جُھرّیاں دیکھا کئے　　کاروان عمر رفتہ کے نشاں دیکھا کئے

اس میں دیکھا کئے ردیف۔ ا، ں، اور فتحہ ماقبل قافیہ۔

(۲) جب شاعر کسی ردیف و قافیہ میں غزل کہنا چاہتا ہے تو پہلے قافیے میں جمع کرلیتا ہے اور پھر قافیے کے لحاظ سے جو خیال ذہن میں آتا ہے اُس کو شعر کا جامہ پہناتا ہے یہاں بلند خیالی۔ نازک خیالی۔ جدّت طبع۔ الفاظ کی بندش وغیرہ اوصاف جمع ہو کر شعر کو اچھّا یا بُرا۔ بلند یا رکیک۔ رواں یا مغلق بناتے ہیں۔ غرض مختلف شاعروں نے کسی قافیہ کو کیسے باندھا ہے۔ کسی خیال کو کیسے ظاہر کیا ہے۔ کسی محاورے کو کیسے نباہا ہے یہ بات فن شاعری میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ بعض اوقات شاعر کی پوری شخصیت جس کو Personality کہتے ہیں اشعار سے نمودار ہوتی ہے بعضوں کے خیالات بلند ہوتے ہیں تو بعض جذبات کی صحیح تصویر کھینچ سکتے ہیں۔ بعض صرف ادائے زبان پر قادر ہیں۔ بعض محاورے خوب باندھتے ہیں۔ بعض کے کلام میں روانی ہوتی ہے۔ تو بعض کے کلام میں زور۔ غرض شعراء کی خصوصیات۔ ہم قافیہ اشعار سے کُھل کر سامنے آتی ہے۔ میں نے یہ کوشش کی ہے کہ چوٹی کے شعراء نے جو ہم قافیہ اشعار باندھے ہیں اُن کو مقابلہ کرکے یہ بتاؤں کہ اُن کی شخصیت اُن کے اشعار سے کیونکر نمایاں ہے

(۱) چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا موج رواں سے کام لیا
(سودا)

اس شعر میں سوداؔ نے چمن اور جنگجو دو لفظ لائے ہیں۔ ان دونوں کی مناسبت سے چمن کے لوازمات صبا۔ موج رواں۔ اور جنگجو کی رعائت سے تیغ لاکر صنعت مراعاۃ النظیر رکھی ہے۔ معشوق کی یاد سے کچھ صدمے اُٹھانے پڑے مگر غیروں کے ہاتھوں

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا   دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا (میرؔ)

یہ جذبات کی صحیح تصویر ہے۔ معشوق کی یاد سے دل کا بے اختیار ہو جانا اور قابو میں لانے کی بے انتہا کوشش تھامنے کی تکرار سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ خیال اور اُس کا اظہار دونوں قابل تعریف ہیں۔

جو تیغ یار نے خون ریزی کا خیال کیا   تو عاشقوں نے بھی منہ اُس کا خوب لال کیا

(جرأت)

یہاں خیال یہ ہے کہ ہم نے بھی معشوق کے خیال کی ہمنوائی کی۔ اُس نے قتل کا ارادہ کیا تو ہم نے سر جھکا دیا۔ یہاں مُنھ لال کرنے کا محاورہ زیادہ چسپاں نہیں ہوتا۔

برابری کا تری گُل نے جب خیال کیا   صبا نے مار تھپیڑا منہ اُس کا لال کیا

(سوداؔ)

یہاں ایک تشبیہ معشوق کے حُسن کو گُل سے دی ہے۔ مگر گُل نے برابری کا دعویٰ کیا تو اُس کو سزا مل گئی۔ یہاں مُنھ لال کرنے کا محاورہ جرأت سے زیادہ چسپاں ہے مگر پھر بھی میرؔ والی بات نہیں آتی جو بندش الفاظ۔ حُسنِ خیال۔ اور چُست قافیہ کی بدولت ہے ؎

چمن میں گُل نے جو کل دعوے جمال کیا   جمالِ یار نے مُنھ اس کا خوب لال کیا

(۳) فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ یارے نہ شُد میں دو شعر ؎

کار ما آخر شد و آخر زما کارے نہ شُد   مُشک خاک ما غبارے کوچۂ یارے نہ شُد

سالہا خون جگر در نافہ آہو شُد گرہ   مُشک شُد اما چہ شُد خال رُخ یارے نہ شُد

(زیب النساءؔ)

(۴) بصد خون برابر است:

از برہمن چہ میکنی ایں تیغ کینہ باز   یک کُشتن غریب بصد خوں برابر است

(اعظم شاہ)

کردی امیدوار مکن وعدۂ خلاف   یک وعدۂ خلاف بصد خون برابر است

(خورم)

اُفتادہ ام غریب بہ کویت مرا مکش		یک کُشتن غریب بصد خون برابر است
(بابر)

کشتی مرا و کشتہ شُد از رشک عالمے		یک کُشتن غریب بصد خون برابر است
(ناصر علی سرہندی)

(۵) "زنجیر پاست" میں

اے کہ میگوئی کہ میایم تی آئی چیز است		پائے شوکت را مگر رنگ حنا زنجیر پاست
(عاقل خاں)

گرچہ من لیلیٰ رسا سم دل چو مجنوں بے نواست		سر بہ صحرا می زنم لیکن حیا زنجیر پاست
(زیب النساء)

عشق تا خام است باشد بستۂ ناموس و ننگ		پختہ مغزان جنون را کے حیا زنجیر پاست
(عاقل خاں)

پاکبازان حقیقت را حیا باشد مدام		چوں تو مرغ حیا را کے حیا زنجیر پاست
(زیب النساء)

می گرفتیم بجاناں سر راہے گاہے		او رہم از لُطف نہاں داشت نگاہے گاہے

یہاں معشوق کا سرِ راہے مل جانا اور اُس کا کن انکھیوں سے مہربانی سے دیکھنا ایک خوبی پیدا کرتا ہے۔

(۶) ے

درد دلم اے واعظ ندانی زاہد		کہ دلت خون نہ شُد از تیر نگاہے گاہے
(ذوق)

نہیں چوں گل ہوس ابر سیاہے گاہے		کاہ ہوں خشک میں اے برق نگاہے گاہے
(سودا)

درد کی تصویر معلوم ہوتا ہے۔ دُنیا میں گُل بن کر نہیں بلکہ کاہ خشک کی طرح زندگی گذاری ہے ظفر اُس کے مقابلے میں پھیکے معلوم ہوتے ہیں مگر ایک تمنا کا اظہار لئے ہوتے ہیں ے

اس طرف کبھی تمھیں لازم ہے نگاہے گاہے
دمبدم۔ لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

مگر جرأت کا یہ شعر لاجواب ہے اپنی بے لبسی اور معشوق کی بے اعتنائی کو بڑی روانی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔ سرسری ملاقات کا ایسا ثبوت ہے کہ باید و شاید ؎

سرسری اُن سے ملاقات ہو گاہے گاہے	محفل غیر میں گاہے۔ سر راہے گاہے

(۷) ؎

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے	لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

(جرأت)

یہاں دل دینے کا ذکر بڑے چوچلے سے کیا ہے۔ پھر احسان رکھ کر اور یہ جتلا کر کہ کیسا یاد کرو گے کہ کوئی ظلم سہنے والا بھی ملا تھا خاص انداز بیان پیدا کیا ہے ؎

تم بیٹھ کے گھر غیر کے دل شاد کرو گے	ہم کون ہیں صاحب جو ہمیں یاد کرو گے

اس میں طنز کا پہلو بہت نُمایاں اور چُبھتا ہوا ہے۔ زبان بھی خوب ہے۔

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے	یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

(سوداؔ)

یہاں عاشق اپنی وفا کے مقابلے میں دُنیا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ اُس کا تیقّن ہے کہ دوُسرا یہ کمال نہیں دکھا سکتا۔ انداز بیان بہت موثّر ہے۔ اب میرؔ کا شعر سُنیئے ؎

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے	پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے

یہاں بھی خیال اور ادائی دونوں فطری ہیں (دلی درد کو بڑی خوبی سے ظاہر کیا ہے۔ فراموش کے ساتھ یاد کرنا صنعت تضاد بھی رکھتا ہے۔

(۸) آئینہ رُخ کو ترے اہلِ صفا کہتے ہیں	اس پہ دل لگتے ہے میرا اسے کیا کہتے ہیں

(جرأت)

تو نے سوداؔ کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں	یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

(سوداؔ)

معشوق کی بے وفائی کا ایک نقشہ ہے جس کو الفاظ کی شوکت اور روانی نے پُرلطف بنا دیا۔

مدعی مجھ کو کھڑے صاف بُرا کہتے ہیں	چپکے تم سُنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں (میرؔ)

یہ شکایت کا فطری انداز ہے۔ الفاظ و خیال دونوں جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہے ہیں۔ یہ انداز بیان دل میں ایک چٹکی لیتا ہے۔

(۹) اب میں آپ کو پاسبان کے قافیے میں مومن اور غالب کے دو شعر سناتا ہوں۔ جن سے اُن کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ مومن جذبات کے اظہار میں بڑا کمال رکھتے ہیں۔ محرومی۔ رقابت۔ حسد۔ رشک۔ فراق و درد کے صحیح نقشے پیش کرنے میں قادر الکلام ہیں۔ غالب ایک بڑے خیال کو کم الفاظ میں ظریفانہ انداز میں ظاہر کرنے میں بے مثل ہیں۔

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ نیند کہاں چشمِ پاسباں کے لئے

غالب کی زہر خند ظرافت کا اچھا نمونہ ہے۔

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم پاسبان کے لئے
(مومن)

(۱۰) گلا نہوا:

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
یہ تماشا ہوا گلا نہوا غالب

سُنتے سُنتے وہ حال دل بولے
یہ تو قصہ ہوا گلا نہ ہوا
(تسلیم)

اس میں بھی وہی ظرافت کارفرما ہے جو غالب کے اوپر کے شعر میں تھی مگر تسلیم کے شعر میں وہ زہر خندانہ ظرافت نہیں بلکہ معشوقانہ گفتگو کے انداز آجاتے ہیں۔

(۱۱) پریشاں کئے ہوئے:

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
(غالب)

اس میں غالب کا خاص انداز اور شخصیت رُونما ہوجاتی ہے الفاظ مناسب اور موزوں ہیں۔ برخلاف جوش ایک خیال کی ترجمانی اچھے الفاظ میں کردیتے ہیں رعایت لفظی بھی ہے۔ بالوں کی پریشانی سے آپ کا پریشان ہونا اور اُس سے راز کے افشا ہونے کا احتمال اُن کا انداز بیان ہے۔

افشائے رازِ عشق کا ساماں کئے ہوئے
پھر آگئے وہ بال پریشاں کئے ہوئے
(جوش)

(۱۲) بدخشاں کے قافیہ میں دو شعر

وہ وطن میں خاک میرے گوہرِ مضموں کی قدر
لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر
(ناسخ)

تشبیہ کامل ہے۔ ناسخ ایک خیال کو قانون فطرت کے طور پر بیان کرتے ہیں۔

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر
(ذوقؔ)

اور ذوقؔ شکایت کے انداز میں۔ ذوق کا شعر پیچھے رہ جاتا۔ اگر لفظ رنگ ذو معنی ہو کر رنگینی نہ پیدا کرتا۔

(۱۳) تن سے نکل گیا

دمِ بُلبُل اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جوں ہی سن سے نکل گیا
(ناسخؔ)

عُمر کی نظر آئی نہ گردِ سمند تک
توسنِ کمال تیز تھا تن سے نکل گیا
(تسلیمؔ)

ناسخؔ کے قافیے بولتے ہوئے اور بے ساختہ ہیں لاغری اور کمزوری مبالغہ سے بیان کرتے ہیں برخلاف اس کے تسلیمؔ محض تیزی کے اظہار میں۔ عُمر کیا باتوں باتوں میں ختم ہو جاتی ہے اس خیال کو عُمدگی سے ادا فرماتے ہیں۔

(۱۴) کیا علاج

بیمارِ عشق کا جو نہ کچھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر میرا کیا علاج
لو ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج
(ذوقؔ)

زبان کی چاشنی۔ الفاظ کی بندش۔ الفاظ کا چوچلا پن کہ لو ہم ــــــ یہ دوسرے شعر میں زیادہ ہے۔

(۱۵) بیماروں کا

نگہ یاس سے ہر ایک کا مُنھ تکتے ہیں
حال دیکھا نہیں جاتا تیرے بیماروں کا
(رسا مصطفےٰ پوری)

ڈر گئے نام شفا سُن کے رہے خواہش مرگ
مُنھ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا
(داغؔ)

رساؔ نے اچھا منظر کھینچا ہے۔ الفاظ بھی اچھے ہیں مگر داغؔ نے محاورہ بندی سے اپنے کلام کو اونچا کر دیا ہے۔

(۱۶) بیٹھے ہیں

یوں ہی کچھ جی میں آ گئی ہو گی
کیا یہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں (مجروح دہلوی)

معشوق کی ضدی طبیعت کو اچھے پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔ مگر داغؔ نے تو یہ منظر آنے کا

یہ جو چپکے سے آئے بیٹھے ہیں
لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں
(داغ)

کھینچ کر چپکے سے آنا۔ اور اس میں لاکھ فتنے اُٹھانا اس نے شعر کو بہت اونچا کر دیا ہے۔

(۱۷) مدّعا کیا ہے۔

ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدّعا کیا ہے
(غالب)

غالب کے خیال کی بلندی دوسروں میں نہیں آسکی۔

سن کے گھبراؤ گے بہت دیکھو
یہ نہ پوچھو کہ مدّعا کیا ہے
اتنا ملنا بھی ترک کر دو گے
یہ نہ پوچھو کہ مدّعا کیا ہے
(عزیز جنگ ولا)

(۱۸) زباں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے
(غالب)

حضور اکرمؐ کے نام جو بوسہ دیا جاتا ہے یہ احترام ہے اُسی خیال کو بڑی عمدگی سے غالب نے اپنے ممدوح کے لئے استعمال کیا ہے۔ جدّتِ خیال کی وجہ یہ شعر زبان زد خاص و عام ہو گیا۔

مزہ یہ شکوے میں آیا کہ بے مزہ وہ ہوئے
یہ تلخ کام رہا لذّت زباں کے لئے
(مومن)

مومن نے لفظوں کا اُلٹ پھیر کر کے لذّت کی تلاش میں تلخی میں مبتلا ہو جانے کو اُستادانہ رنگ میں ظاہر کیا ہے۔

بیان دردِ محبّت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے
(ذوق)

ذوق نے اپنی مسلّم الثبوتی دکھائی ہے۔ کہ زبان دلی جذبات کے بیان سے اس لئے قاصر ہے کہ وہ دلی کیفیات کو واضح کرتے ہی نہیں۔

(۱۹) مرحبا کہنے کو ہیں۔

زبانِ تیغ سے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
لبِ زخمِ جگر سے مرحبا کہنے کو ہیں
(جلیس)

جلیس اس خیال کو ظاہر کرتے ہیں کہ ہم ہر طرح معشوق کے ظلم سہنے کو خوشی سے تیار ہیں۔

وہ نہیں آتے نہ آئیں مرگ ظالم تو تو آ
یاں لبِ شوق و تمنا مرحبا کہنے کو ہیں
(مومن)

یاس کا منظر اچھا کھینچا ہے۔ معشوق کے آنے کی تو توقع نہیں۔ مگر شوق موت کے خیر مقدم کو بھی تیار ہے۔ مگر ذوق کے الفاظ کی بندش معشوق کے حُسن خداداد کا اظہار۔ اپنے زخم خوردہ دل کی زبانی بیان کرنا خاص لُطف رکھتا ہے۔

میں ترے ہاتھوں کے قرباں واہ کیا مارے ہیں تیر
سب دہانِ زخم تجھ کو مرحبا کہنے کو ہیں
(ذوق)

(۲۰) میلا ہو کر۔ لکھنوی رنگ میں

باغباں بُلبُل کُشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گُل کبھی نہ اترا کبھی میلا ہو کر
(صبا)

تخئیلی شاعری ہے۔ اصلیت سے تعلق نہ ہونے سے دور از کار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں رند حقیقت سے قریب ہیں۔ محبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ

جو اچھا بُرا پہنا وہ تن پہ ہوا گہنا
اچھوں کا بھی کیا کہنا رو دار نہیں چھپتے

اگر ڈی کا ہے گُماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر
(رند)

(۲۱) ایمان تو گیا

خاطر سے یا لحاظ سے میں مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا
(داغ)

زبان کی لذت ہے۔ باہمی مکالمے کی خوبی

دیکھا ہے بُت کدے میں جو اے شیخ اب نہ پوچھ
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایمان تو گیا
(داغ)

حُسن کی تعریف اس طرح کی ہے کہ دیکھتے ہی دل ایسا محو ہو گیا کہ بالکل اچھے اور بُرے کی تمیز کھو بیٹھا۔

رہنے دے بُتکدے ہی میں اے شیخ اب نہ چھیڑ
جاتا رہوں نہ کُفر سے ایمان تو گیا
(ظہیر)

مصیبت زدہ انسان جو مل جائے غنیمت سمجھتا ہے۔ اُسی انداز میں ظہیر کا شعر لُطف دیتا۔ شاعر کفر کو بھی اپنی جگہ سرمایہ سمجھ رہا ہے۔
نفسیاتی ٹھیس ہے۔

(۲۱) ملایا نہ جائے گا۔

غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو
ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
(آزاد انصاری)

طنز کا انداز اچھا ہے۔ سمجھتا ہے کہ کوئی لطف و کرم میرے لئے نہ ہوگا۔

آنکھیں ملانے میں ہے عبث تم کو احتراز
آنکھیں نہیں ہے دل جو ملایا نہ جائے گا
(رشکی دہلوی)

معشوق کے شرم و حیا کو تسلیم کرتے ہوئے جو مشورہ دیا جارہا ہے ایک لطف پیدا کرتا ہے۔

دل کیا ملائے گئے، یہ ہیں ہو گیا یقین
تم سے تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا
(داغ)

اِن سب اشعار میں دل ملانا اور خاک میں ملانا ان دونوں محاوروں کو باندھا ہے۔ داغ کی محاورہ بندی روانی کے ساتھ ہے۔

(۲۳) نگاہیں کیونکر۔

شرم سے آنکھ ملاتے نہیں دیکھا اُن کو
پار ہوتی ہیں کلیجے سے نگاہیں کیونکر
(داغ)

نئی بات پیدا کی کہ بغیر آنکھ ملائے بھی نگاہیں پار ہو جاتی ہیں یہ اعجاز ہے۔

غیر بھی میری طرح کرتے ہیں آہیں کیونکر
میں بھی دیکھوں کہ پلٹتی ہیں نگاہیں کیونکر
ہم سے تینوں سے چھپا کر تمھیں چاہیں کیونکر
چھپ سکیں گی یہ محبت کی نگاہیں کیونکر
(داغ)

رقیب سے خفا ہو جانے کا مشورہ بڑے اچھے پیرائے میں دیا ہے۔

ایک فطری اور نفسیاتی پہلو ہے کہ چھپ نہیں سکتی محبت کی نظر پیار کی بات۔"

(۲۴) قربان جائیے۔

منھ پھیر کر وہ کہتے ہیں بس مان جائیے
اس شرم۔ اس لحاظ کے قربان جائیے
(بیخود دہلوی)

روٹھے کو منانے کے لئے جو طریقہ معشوق اختیار کرتا ہے جس میں اُس کی خودداری بھی ہے، عمدہ الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

رتبہ شہیدِ عشق کا گر جان جائیے
قربان ہونے والے کے قربان جائیے
(امیر)

امیر کا خیال اور الفاظ دونوں دیکھے ہیں۔ حسنِ بیان سب، اپنی تو بیت بھی مقصود ہے۔

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں مری جان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے
(داغ)

مگر داغ ایک نفسیاتی ٹھیس لگاتا ہے۔ کبر نخوت والے اگر اتنا جھکیں تو اللہ کی قدرت ہی یاد آجاتی ہے اور شاعر کے لئے انتہائی خوشی کا مقام ہے۔ حیرت کو جو تمہ پر ختم کیا ہے، بے انتہا گدگدانے والی چیز ہے اور فطری طریقہ وفورِ شوق۔

(۲۵) جان جائیے۔

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے
کیا ہے ہمارے دل میں ذرا جان جائیے
(امیر)

باہمی گفتگو میں بڑے چوچلے سے دلی تمنا کو معشوق سے کہلوانے کی کوشش کی ہے۔

صورت سے ہی سوال کو پہچان جائیے
دل میں ہمارے جو ہے صنم جان جائیے
یہ تو خوشی ہے آپ کی میری خوشی نہیں
میں کس طرح کہوں کہ مری جان جائیے
(آغا منشی امداد حسین)

ایک ہی خیال کو دو شاعروں نے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ امیر کا شعر اونچا ہے۔ یہاں قافیہ کو نئے معنی پہنا کر لذت پیدا کی ہے۔

(۲۶) نیند نہ آئی تمام رات۔

وعدے کے اپنے سچے تھے آئے وہ خواب میں
ناظم تمہیں کو نیند نہ آئی تمام رات
(ناظم رامپوری)

معشوق کی طرف سے بدگمان نہ ہو کر اپنی ہی غلطی کا اعتراف کرنا محبت کی انتہا کی دلیل ہے۔

مومن میں تیرے نالوں کے صدقہ وہ کہتے ہیں
ہم کو بھی آج نیند نہ آئی تمام رات
(مومن)

دل کا بدل ہے رات کو خوبی سے ظاہر کیا ہے اور اس طرح اپنی محبت کی صداقت دکھلانا چاہتا ہے۔ ایسی بات میں جو خیال پنہاں ہے اُس کو پوشیدہ رکھ کر شاعر نے خیال بہت اونچا کر دیا ہے۔ سوچنا چاہیئے کہ کیا کہا ہوگا۔

کچھ ایسی بات وہ مجھے سمجھا کے سو رہے
مارے خوشی کے نیند نہ آئی تمام رات
(مومن)

(۲۷) بدل گئی۔

بے ساختہ اک آہ جو مُنھ سے نکل گئی
اللہ رے انقلاب کہ دُنیا بدل گئی
(صفی لکھنوی)

تخئیلی شاعری ہے۔ حقیقت سے تعلق نہیں۔ زبان کی روانی سے بُری نہیں معلوم ہوتی۔

پینے سے کر چکا تھا میں توبہ مگر جلیل
بادل کا رنگ دیکھ کے نیت بدل گئی

عادت بُری چیز ہے۔ توبہ کے بعد بھی قیام مشکل ہوتا ہے۔

صد سالہ دَورِ چرخ تھا ساقی کا ایک جام
نکلے جو میکدے سے تو دُنیا بدل گئی
(جلیل)

اس شعر میں حقیقت کا اظہار ہے۔ قلبی سرور کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا بدل گئی۔ اس کو صد سالہ دَورِ چرخ سے تشبیہ دی ہے۔

(۲۸) سنبھالی جائے گی۔

اب دلِ ناکام ہے اور فرطِ یاس
اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی
(آزاد انصاری)

غم و یاس کا ایک نقشہ کھینچا ہے۔ الفاظ کی بندش اچھی ہے۔

جب یہ صورت دیکھی بھالی جائے گی
کس سے پھر نیت سنبھالی جائے گی
(داغ)

حُسن کو دیکھ کر نیت کا ڈانواں ڈول ہونا ایک فطری چیز ہے سوال نے لُطف کو اور بڑھا دیا ہے۔ اپنی بدگمانی کے استدلال میں یہ بات پیش کی ہے۔

اُن سے خود اُن کی نگاہِ مستِ ناز
دیکھئے کیونکر سنبھالی جائے گی
(انصاری)

جوانی کی مست نگاہی دیکھ کر حیرت ہے کہ دُنیا کی کیا حالت ہوگی۔

(۲۹) خالی جائے گی۔

نالۂ آزاد ہے یا مضحکہ
آہ درویش اور خالی جائے گی

اپنی دردویش سفتی کا ڈر بتلا کر گیدڑ بھبکی دی ہے۔

التماسِ شوق سے کیا فائدہ
جانتا ہوں بات خالی جائے گی
(آزاد انصاری)

اس میں زبان کی لذّت ہے۔ حُسنِ طلب ہے۔

آہ جب دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی؟
کیا نہ آئیں گے وہ آج اے انتظار
کیا یوں ہی یہ رات ٹالی جائے گی؟
(توفیق)

توفیق کا انداز بیان انصاری کے پہلے شعر سے اونچا ہے۔
انتظار کی تلخ گھڑیوں کی کیفیت خوبی سے ظاہر کی ہے۔

(۳۰) ڈالی جائے گی۔

کیا چڑھاؤ گے مری تربت پہ پھول
خاک بھی تم سے نہ ڈالی جائے گی
(غلام مصطفےٰ رسا)

چڑھانا کے مقابلہ میں ڈالنا صفت تضاد ہے، محاورے کو خوبی سے ادا کیا ہے۔

بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی
کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی

روانی ہے۔ اپنی اطاعت کیشی کا مظاہرہ۔

دیکھتے ہیں غور سے تیری شبیہ
شاید اس میں جان ڈالی جائے گی
(جلیل)

اس میں خیال کی ندرت ہے معشوق کی ایک نگاہ جان بخشی کے لئے کافی سمجھ رہے ہیں۔

نازِ خودداری غلط ثابت ہوا
عادتِ تسلیم ڈالی جائے گی
کیا خبر تھی پردہ ہائے لطف میں
جور کی بنیاد ڈالی جائے گی
(آزاد انصاری)

معشوق کے مقابلہ میں خودداری کام نہیں دیتی اس لئے اب تسلیم کی خو ڈالیں گے
اس میں طرزِ بیان دلچسپ ہے۔ ایسا ہوتا بھی ہے۔

(۳۱) آسماں ہوکر۔

ہوئے پست ایسے ان کی۔ کبھی اُٹھتے نہیں دیکھی
رہے رہنے کو کتنے اس زمیں پر آسماں ہوکر
ترے کوچہ میں پہنچا ہے کسی نے ہم غریبوں کو
گرا ہے سایہ دیوار ہم پر آسماں ہوکر
(ریاض خیر آبادی)

ریاض خیرآبادی نے انقلاب کا ایک نقشہ کھینچا ہے کہ امیروں کو بھی یہاں پست ہوتے دیکھا ہے۔
معشوق کی گلی میں رہنا بھی مصیبت سے خالی نہیں۔ سایہ کا آسمان بننا ایک جدت ہے

چلا ہے اُڑ دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمینِ کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
یہی عالم ہے گر جوشِ جنوں میں خاک اُڑانے کا
زمیں بھی سر پہ اک دن آ رہے گی آسماں ہو کر
(وزیر)

ایک تجربہ کار کس طرح نو آموز کو سکھلاتا ہے اُس کی عجیب مثال ہے۔ دل سے مخاطبت کرکے آیندہ کی پریشانیوں سے اُسے خبردار کرتا ہے۔
شاعرانہ تعلّی ہے کہ زمین بہ شکل آسمان اوپر دکھلائی دے گی یا یہ کہ ہم زیرِ زمیں ہو جائیں گے اور یوں زمین اوپر ہو جائے گی دونوں معنی نکلتے ہیں۔

(۳۲) جبیں سے۔

رُکا خنجر جو دستِ نازنیں سے
چھُری جھُنجھلا کے لی چینِ جبیں سے
(امیر)

ایک ہتھیار جب کام نہیں کرتا تو دوسرا حربہ کیسے لیا جاتا ہے اُس کی توضیح کی ہے۔

کہو سر رکھ کے قدموں پر اُنھیں سے
مٹا دو میرے لکھے کو جبیں سے
(جلال)

رعائتِ لفظی اور تصوّف کے رنگ نے اس شعر کو چمکا دیا ہے۔

وہ آئے خندہ پیشانی کہیں سے
تبسّم ہے عیاں چینِ جبیں سے
(داغ)

بعضوں کی عادت بھی ہوتی ہے مسکراتے ہوئے بھی چین ڈالتے ہیں تو پھر حقیقت کی طرف مائل ہو گا۔ ورنہ طنز کا پہلو نکلتا ہے۔

نہ آپ آئے نہ ہم سمجھے کہیں سے
پسینہ پوچھئے اپنی جبیں سے
(انور دہلوی)

معشوق کا غیر سے ملنا۔ اس کی غلط بیانی۔ پھر صفائی کی کوشش۔ اپنی قدیم نادر کرنے کی عادت یہ سب خوبی سے ظاہر کر دے۔ اور کس خوبی سے کہا کہ تم جھوٹے ہو۔

(۳۳) جاتا رہا۔

روگ تھا، آزار تھا، اچھا ہوا جاتا رہا
ایسے دل کا رنج کیا، جاتا رہا، جاتا رہا
(ریاض خیرآبادی)

Ratimalgation ہو چکنے کے بعد جسے کہتے ہیں اُس کا اظہار کیا ہے۔

کھو گیا دل، کھو گیا، رہتا تو کیا ہوتا امیر
جانے دو اک بے وفا جاتا رہا جاتا رہا

یہ بھی وہی پہلی کیفیت کا اظہار ہے۔ اُس پر ایک تہمت بے وفائی کی اور زیادہ کر دی ہے۔

دل مرا تھا، گر گیا، گُم ہو گیا جاتا رہا
غم تمھیں کاہے کا ہو جاتا رہا جاتا رہا
(تسلیم)

اس میں چوچلا ہے۔ اُوپر والے خیال کو اور زیادہ نخرے سے ظاہر کیا ہے۔

مغتنم ہے اب کسی کی دشمنی بھی مغتنم
دوستی کا واسطہ جاتا رہا جاتا رہا
(آزاد انصاری)

انتہائے غم میں معشوق کی دُشمنی کے ربط کو بھی غنیمت سمجھ رہا ہے، کہ لگاؤ تو ہے۔

(۴۴) گھر ملے

اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
(غالب)

عاشقانہ حسد کو خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے
دی تھی دُعا کسی نے کہ جنّت میں گھر ملے
(آزردہ)

جنّت میں گھر اس طرح ملا۔ اُس کی گلی میں رہ جانا ہی اپنی محبّت کی معراج ہے۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زُہد کی
کیا کہ رات کس کے گھر ملے
(شیفتہ)

ظرافت کا پہلو ہے۔ استعجابی الفاظ نے جان ڈال دی ہے۔ زبان کی لطافت پوری پوری ہے شعر بہت اونچا ہے۔

جانے دے اے تصوّر جاناں نہ کر تلاش
ایسا نہ ہو کہ وہ کسی دشمن کے گھر ملے
(قربان علی سالک)

اس شعر کی تو تعریف نہیں ہو سکتی۔ تصوّر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ جانے دے، ورنہ زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ اس میں معشوق سے بدگمانی اور اپنی محبّت کو ظاہر کیا ہے۔

(۴۵) دل میں رہتے ہیں۔

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ رو کے سے نہیں رکتیں
بہت ارمان ایسے ہیں، کہ دل کے دل میں رہتے ہیں

ایک حقیقت کا اظہار ہے کہ دل ارمانوں کا جولاں گاہ ہے۔

خدا رکھے محبّت سے کئے آباد دونوں گھر
میں اُنکے دل میں رہتا ہوں وہ میرے دل میں رہتے ہیں
(داغ)

محبّت کو ذریعہ بنایا دو گھر آباد کرنے کا۔ اس وجہ سے رنگینی پیدا ہو گئی۔ اُمنگیں بڑھ گئیں۔

کوئی نام و نشان پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے وہ عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں

اس میں اپنے تخلص سے فائدہ اُٹھا کر عاشقوں کے دل میں رہنے کا جواز پیدا کر لیا۔

بتانِ ماہوش اُجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
کہ جس کی جان جاتی ہے۔ انھیں کے دل میں رہتے ہیں
(داغ)

صفت تضاد لاکر اس شعر کو رنگین بنایا ہے اچھے لوگ اُجڑی ہوئی منزل ہی پسند کرتے ہیں۔

بُتانِ ماہ پیکر عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں
جفا پیشہ تو ہیں لیکن وفا منزل میں رہتے ہیں
(جلیل)

یہاں بھی صفت تضاد دوسرے رنگ میں لُطف دے رہی ہے۔ جفا پیشہ ہوکر وفا منزل کی رہائش قابل ستائش ہے۔

شکایت کس زباں سے میں کروں اُنکے نہ ملنے کی
یہی اِحسان کیا کم ہے کہ میرے دل میں رہتے ہیں
(داغ)

یہ شعر بہت اونچا ہے۔ دل میں رہنے کو بھی اُن کا احسان مانا۔ نہ ملنے کا گلا ہی نہیں کرتے۔

(۴۶) زمانے کے لئے۔

سر میں تیشہ مار کر فرہاد تو نے کیا کیا
خوف پیدا کر دیا سارے زمانے کے لئے

معمولی خیال ہے۔

میں سمجھتا تھا کہ غم میرے لئے مخصوص ہے
وقت وہ بھی ہو گیا سارے زمانے کے لئے
(عزیز جنگ ولا)

پہلے سے بہتر۔

عشق کی ہستی ہی کیا ہے عشق بیچارہ غریب
حُسن برہم ہے تو کافی ہے زمانہ کے لئے
(عزیز جنگ ولا)

دونوں سے بہتر خیال ہے

دل کو یوں آمادہ کیجئے غم اُٹھانے کیلئے
زندگی اِک درس بن جائے زمانے کیلئے
عزیز جنگ ولا

یہ شعر اونچا ہے۔ الفاظ کی نشست بھی اچھی ہے۔

غرق عشرت ہو کے جینے سے کہیں بہتر ہے جوش
درس عبرت بن کے مرجانا زمانے کے لئے
(جوش)

یہ شعر زیادہ اونچا اور بلیغ ہے۔

(۴۷) انتظار کا

مہندی شبِ وصال لگائی ہے یار نے
گُل ہوگیا چراغ شبِ انتظار کا
(شکر)

معمولی خیال ہے۔

وہ آئیں یا نہ آئیں اب اس سے غرض نہیں
آنکھوں کو پڑ گیا ہے مزہ انتظار کا
(جلیل)

عادت بھی علت ہوتی ہے۔ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم۔

اب وعدۂ وصال کی تکلیف بے محل
وہ دن گئے کہ حوصلہ تھا انتظار تھا
(آزاد انصاری)

الفاظ کی ترکیب انوکھی ہے۔ حُسنِ طلب کا انداز نیا ہے۔

للٰلہ نقضِ عہد کی حرکت سے درگذر
جی چھوٹ جائے گا نگہِ انتظار کا
(آزاد انصاری)

یہاں بھی ترکیب لفظی اور محاورات لُطف دے رہے ہیں۔

یارب یہ سچ ہے بات کہ محشر کی صُبح سے
دامن سِلا ہوا ہے شبِ انتظار کا
(جوہر)

انتظار کی عجیب تصویر کھینچ دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محشر اور شبِ انتظار باہم سِلے ہوئے یا ملے ہوئے ہیں۔

(۴۸) دشمن کے میٹھے ہیں۔

قیامت یوں بپا کی ہے انھوں نے آن محفل میں
مرے پہلو سے اُٹھ کر متصل دشمن کے بیٹھے ہیں
(مبارک احمد شاد)

اچھا خیال ہے۔ الفاظ بھی اچھے ہیں۔

ہی کیوں نہیں اُٹھی قیامت ماجرا کیا ہے
ہمارے سامنے پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں
(داغ)

پریشانی اور حسد کی انتہا بتلائی ہے۔

غضب ہے بے چھوئے چھیڑے جھجکنا چونکنا اُن کا
یہ عالم ہے کہ گویا گھر میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں
(ریاض خیر آبادی)

رنگینی ہے۔

بہت رویا ہوں میں جب سے یہ میں نے خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

(داغ)

کیا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔ دشمن کے سامنے بیٹھنے سے جو اضطراب ہے اُس کو خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کئے وہ سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

(امیر)

(۴۹) دل سے لگی ہے۔

یہ آتشِ غم یار کی محفل سے لگی ہے
اے شمع ترے سر سے مرے دل سے لگی ہے
آنکھ اپنی بُتِ حور شمائل سے لگی ہے
بُت بن گئے جنّت کی ہواؤں سے لگی ہے

(قرار بلگرامی)

خیال بھی اچھا ہے۔ ترکیب ستھری ہے۔ آگ کہاں سے لگی اُس کی توجیہہ ہے۔
جنّت کے ذکر حور کی رعایت رکھی ہے۔

یاد سفرِ ملکِ عدم دل سے لگی ہے
ہر دم مجھے تو گور کی منزل سے لگی ہے

بڑی روانی سے خیال ظاہر کیا ہے۔

وسط پائے کہیں زندگی و موت کا جھگڑا
اے تیغِ جفا سب تو ہی دل سے لگی ہے

نا امیدی کا فوٹو کھینچا ہے۔

کیا کہتے ہو نہیں بھول گیا میں دمِ رخصت
اک یاد تمہاری سو مرے دل سے لگی ہے

(تسلیم)

ایک چوچلا ہے۔ یاد کبھی بھلائی نہیں جاتی۔

(۵۰) آسماں کیسے کیسے

بتوں کے ہیں جورِ نہاں کیسے کیسے
پھر اُس پر عدو آسماں کیسے کیسے

زندگی میں ہر طرح ظلم اُٹھانا پڑتا ہے۔

اُبھارے گا کیا کیا زمینِ لحد کو
ستم ڈھائے گا آسماں کیسے کیسے

(ریاض خیر آبادی)

وہی خیال ہے گر درد نہ یاد ہے۔

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
(امیر)

تضاد لفظی نے لُطف دوبالا کردیا۔

مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
(داغ)

یہاں بھی وہی کیفیت ہے۔

بٹھاتا ہے پہلو میں کس کس کو اُن کے
اُٹھاتا ہے حشر آسماں کیسے کیسے
(راز رامپوری)

یہاں بھی اُٹھانا۔ بٹھانا زیادہ لُطف دیتا ہے۔ مگر شعر لاجواب ہے۔

زمینِ چمن گُل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
(آتش)

اس شعر کا جواب نہیں۔

(۱۴) کہیں نہ کہیں

نزع میں بھی ہے جستجو باقی
پُتلیاں پھر گئیں کہیں نہ کہیں
(اعظم علی شائق حیدر آبادی)

انتظار کا عجیب سماں ہے۔ ایک فطری کیفیت کو بھی اپنے ہی مطلب کے لئے محمول کر رہا ہے۔

ضبط کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں
یہ تو کہئے کہ راز کی باتیں
آپ نے غیر سے کہیں نہ کہیں
(امیر)

یہاں کہیں کا قافیہ لُطف دے رہا ہے۔

آہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
آگ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں
(سحر)

آہ سے آگ لگ جانا قرینِ قیاس ہے مگر بعد کے شعر کی بات نہیں آتی۔

چوٹ کھانا دلِ حزیں نہ کہیں
درد رہ جائے گا کہیں نہ کہیں
(داغ)

بالکل فطری بات ہے۔ ان سب اشعار میں مضمون صداقت سے قریب ہے۔

کس تغافل سے کہتے ہیں حسرت
تم کو دیکھا تو ہے کہیں نہ کہیں
(حسرت)

معشوق کی بے رُخی کو ایسے الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ عام طور سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ ظرافت کا عجیب انداز ہے۔

(۴۲) نکال کے۔

نازک بہت ہیں ہونٹ مرے نونہال کے
ساقی پلائے پھول تو کانٹا نکال کے
دُہرائے آنچل اوڑھو دوپٹہ سنبھال کے
کُھل کھیلے تم تو اور بھی جوبن نکال کے
(امیر بدایونی)

علیحدہ کرکے ــــــ خالص لکھنوی رنگ ہے۔ الفاظ۔ بندش مُحاورے سب اُسی انداز کے ہیں۔
جوان ہوکر ــــ وہی اوپر والا رنگ ہے محاورات زیادہ لُطف دے رہے ہیں۔

نِکلا جو چاند ابر سے یاد آگیا مجھے
پردہ سے جھانکنا وہ ترا منھ نکال کے
مٹّی جو دینے آئے تو وہ اب ہنسی خوشی
پھینکو بھی اب غُبار کو دل سے نکال کے
(امیر بدایونی)

باہر لاکر ــــ تشبیہ عُمدہ ہے۔ زبان اچھّی ہے
واقعات گذشتہ کو بھول کر ــــ غُبار کو نکال پھینکنے کے مُحاورے نے اور اپنی بیکسی کا منظر دکھلاکر ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش سے قدیم شکایات کو رفع کرنا چاہتا ہے۔

اے جان اپنے غمزے کو تم روکتے نہیں
کم بخت لے چلا ہے کلیجہ نکال کے
(امیر بدایونی)

اضطراب و مصیبت میں مُبتلا کرکے چلا ہے۔ بڑے چوچلے کا شعر ہے۔ شکایت کا یا انداز ہے۔

دل آپ کا ہے دل جو کچھ ہے سب آپ کا
دل لیجئے مگر مرے ارماں نکال کے
(امیر بدایونی)

ارماں پورے کرکے ــــ اُوپر کے سب شعروں سے اس کا انداز جُداگانہ ہے، دل لینے کے لئے عجیب شرط رکھی ہے۔

(۴۳) حال اچھّا ہے۔

آنکھ سے دیکھتے جاتے ہیں کہ حالت ہے خراب
اور مُنھ سے کہے جاتے ہیں کہ حال اچھّا ہے
(جلیل)

شوخی کا اظہار ہے۔ یا حقیقت کا اخفا۔

یاں دم آنکھوں میں ہے اور واں یہ گذرتی ہے خبر
آنکھ بیمار نے اب کھولی ہے حال اچھا ہے
(رازؔ رامپوری)

نوابوں کے پاس تسلّی کے لئے جو کلمات کہے جاتے تھے انہیں کا اظہار ہے۔

دمِ آخر نگہ یاس یہ کہتی ہوئی نکلی
جائیے جائیے بیمار کا حال اچھا ہے

ناامیدی کا عجیب نقشہ کھینچا ہے

ہونٹ پہ ہوتا جو تبسّم سا پسِ مرگ ریاضؔ
کہہ گئے مر کے بھی کم بخت کا حال اچھا ہے
(ریاضؔ خیرآبادی)

اس میں طنز بھی ہو سکتا ہے۔ حسرت بھی بھولے پن یا الھڑ پن کا اظہار ہے۔

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
(امیرؔ)

طنز کی ٹکسالی زبان ہے۔ اظہار خیال کی قدرت بتلاتا ہے۔

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے
(داغؔ)

بدقسمتی کی شکایت ہے جو رہا سہا اعتماد ہے اُس کے کھو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے
(غالبؔ)

تعریف سے اونچا شعر ہے۔ نفسیاتی کیفیت کا اظہار اس سے بہتر نہیں ہو سکتا۔

بھولے پن سے دمِ رخصت یہ سوال اچھا ہے
ہاتھ سینے پہ ہے کیوں دل کا تو حال اچھا ہے
(امیرؔ)

بھولے پن کو ایک واقعہ کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش ہے۔

ہم نشیں وہ اگر آتے ہیں تو آنے دینا
یہ نہ کہنا کہیں للہ کہ حال اچھا ہے
(جگرؔ لکھنوی)

اضطراری کیفیت قلبی کو بڑے مزے سے ادا کیا ہے آنے کی جو اہمیت عاشق کے پاس ہے ہر لفظ ظاہر کر رہا ہے۔

لاکھ جانیں مری قربان ہوں اس رونے پر
آپ آنسو نہ بہائیں مرا حال اچھا ہے
(رازؔ رامپوری)

محبّت قلبی کا بلند مقام ہے۔ اپنی حالت کے خراب ہو جانے کا کوئی افسوس نہیں۔ اُن کے آنسو اپنی لاکھوں جانوں سے زیادہ قیمتی بتلاتا ہے۔

(۴۴) خُدا خُدا کر۔

دُعائیں مانگیں ہیں مُدتوں تک جُھکا کے سر، ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر
ہوا ہوں تب میں بُتوں کا بندہ ، خُدا خُدا کر خُدا خُدا کر
(گویا لکھنوی)
یعنی بڑی مشقت سے ،

تو مُصحفِ رُخ اگر دکھا دے تو اس پہ دیں ہم ہزار بوسے
ہمارا سجدہ ہو تیرے آگے ، بُتِ ستمگر خُدا خُدا کر خُدا خُدا کر
(عزیز جنگ ولاؔ)
یعنی ایسا ہرگز نہ ہوگا،

نہ کافر عشق ہو کسی کا ، نہ کر کسی بُت کی یار پُوجا
ولا دم واپسیں ہے تیرا ، خُدا خُدا کر، خُدا خُدا کر
(عزیز جنگ ولاؔ)
خُدا سے ڈر

نہیں ہوس وقت جوش مستی ، قدِ خمیدہ سے کچھ حیا کر
بُتوں کا بندہ رہے گا کب تک ، خُدا خُدا کر، خُدا خُدا کر
(ہوس لکھنوی)
اب اللہ سے رشتہ جوڑ۔

کہاں ہے کچھ اپنے ہوش میں آ، تجھے یہ توفیق ہو گیا کیا
تو اور یہ وصل کی تمنا ، خُدا خُدا کر، خُدا خُدا کر
(توفیق)
آپ کی ذات گرامی سے بہت دُور ہے، آپ یہ خیال خام چھوڑ دیں۔

بتانِ ہندوستاں میں تو نے ، بہت سی کی سیر بُت پرستی
خلیل کعبے میں چل کے یاں سے بس اب کوئی دن خُدا خُدا کر
(دوست علی خلیل، شاگرد آتش)
خُدا کی عبادت کر۔

نہ کر تصوّر بُتوں کا دل میں۔ محل تو یہ ہے کہ کچھ حیا کر
خلیل کعبے میں بُت پرستی خُدا خُدا کر ، خُدا خُدا کر
(دوست علی خلیل)
ناممکن ہے یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں۔

بتوں کو بھی بد نہ کہیو واعظ، خُدا کو گر ایک جانتا ہے
نکال حرفِ دوئی نہ مُنھ سے ، خُدا خُدا کر، خُدا خُدا کر
(ظہیر دہلوی)
خُدا کی ذات میں مستغرق ہو جا

لگا نہ ماتھے پہ اپنے قشقہ، نشانِ سجدہ مٹا مٹا کر
بُتوں سے کیا لے گا نازؔ مل کر، خُدا خُدا کر، خُدا خُدا کر
(نازؔ دواخ خیرپور)

یہ کام بار آور نہ ہوگا۔

کیا ہے دیندار اُس صنم کو ہزاروں طوفاں اُٹھا اُٹھا کر
لگائیں وہ تہمتیں کہ بولا خُدا خُدا کر، خُدا خُدا کر
(داغؔ)

داغؔ میں عجیب جدت خیالی ہے۔ اتنی تہمتیں لگانا کہ اُس کو خُدا یاد آجائے۔ اور بے ساختہ اُس کی زبان سے نکل جائے کہ خُدا خُدا کر اور اس طرح مسلمان بنانا ہمارا ہی کام تھا۔

اظہارِ تشکّر

ہم اپنے اُن تمام معاصرین کے شکر گذار ہیں جنھوں نے اب تک نوائے ادب سے اپنے موقّر رسالہ کا تبادلہ جاری رکھ کر مقالہ نُما کی ترتیب میں ہماری مدد کی ہے۔ ہم متوقع ہیں کہ آئندہ بھی وہ ہم سے اِسی طرح تعاون فرماتے رہیں گے اور مقالہ نما کو بہتر سے بہتر بنانے میں ہمارے ممدّ و معاون رہیں گے۔

۱۔ ادب لطیف	لاہور	۹۔ روح ادب	کراچی	۱۷۔ ہمدرد صحت	دہلی
۲۔ اُردو	کراچی	۱۰۔ ماہ نو	"	۱۸۔ ہندستانی ادب	حیدرآباد
۳۔ بُرہان	دہلی	۱۱۔ معارف	اعظم گڈھ	۱۹۔ معیار	میرٹھ
۴۔ العلم	کراچی	۱۲۔ فیض الاسلام	راولپنڈی	۲۰۔ کتاب	لاہور
۵۔ چراغ راہ	"	۱۳۔ معگل پربھات	وردھا	۲۱۔ تہذیب	پٹنہ
۶۔ الفُرقان	لکھنؤ	۱۴۔ نگار	لکھنؤ	۲۲۔ آج کل	دہلی
۷۔ سب رس	حیدرآباد	۱۵۔ نظام المشائخ	کراچی	۲۳۔ قندیل	لاہور
۸۔ فاران	کراچی	۱۶۔ نیا ہند	الہ آباد	۲۴۔ ساقی	کراچی

تبصرے

گریہ و تبسم — صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ قیمت دو روپے ۸ر
ملنے کا پتہ:- صفیہ شمیم ملیح آبادی ۹۳، مارگلا لائنز راولپنڈی

گریہ و تبسم صفیہ شمیم ملیح آبادی کی رُباعیات کا مجموعہ ہے۔ رُباعی شاعری کی سب سے مُشکل صنف ہے، کُہنہ مشق اساتذہ بھی اِس کوچہ میں قدم رکھتے ہوئے ڈرتے تھے، چنانچہ اُردو شاعری میں بہت کم اچھے رُباعی گو شاعر ہوئے ہیں۔

صفیہ شمیم کی یہ کوشش یقیناً قابل تعریف ہے، اُن کی رُباعیات تخیّل اور اندازِ بیان دونوں لحاظ سے اچھی کہی جاسکتی ہیں، اگرچہ اُن میں عمیق خیالات اور حکیمانہ مطالعۂ حیات کی کمی ہے لیکن اگر مشق جاری رہی تو یقین ہے کہ وہ اُردو ادب میں اپنے لئے جگہ پیدا کرلینگی۔

صفیہ شمیم، اُردو کے مشہور شاعر جوؔش ملیح آبادی کی حقیقی بھانجی ہیں، اس طرح شاعری بھی گویا انھیں ورثہ میں ملی ہے، جوؔش کے خاندان میں اؔنیس کا بہت اثر ہے، اس کا رنگ صفیہ کی زبان اور اندازِ بیان میں صاف نظر آتا ہے، زبان کی کہیں کہیں معمولی خامیاں رہ گئی ہیں۔

ایک اور خاص بات جو اِن رُباعیات میں نظر آتی ہے وہ شاعرہ کی رجائیت ہے، انھیں زمانہ کی زبوں حالی اور سیاسی انتشار کا احساس ہے اور اس پر وہ اظہارِ افسوس بھی کرتی ہیں لیکن وہ مایوس نہیں۔ انھیں یقین ہے کہ حالات ضرور بدلیں گے۔

علی گڈھ میگزین، طنز و ظرافت نمبر — ناشر:- علی گڈھ مُسلم یونی ورسٹی
قیمت ۳ روپے

علی گڈھ میگزین نے پچھلے چند سالوں سے خاص نمبروں کے نکالنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ ادبی حلقوں میں مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے، زیر تبصرہ بھی خاص نمبر ہے اور اس کا موضوع طنز و ظرافت ہے۔

ابتدا میں مولانا عبدالماجد دریابادی کا مکتوب (بنام پروفیسر ضیا احمد) ہے جس میں انھوں نے طنز و ظرافت کے مواد کے متعلق بہت سے مفید اشارے کئے ہیں۔

لائق مُرتّب نے مضامین حاصل کرنے میں یقیناً بہت کاوش سے کام لیا ہے، شوکت سبزواری کا مضمون "اُردو شاعری میں طنز" اور ظفر احمد صدّیقی کا مضمون "اُردو ادب

میں پیروڈی" خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں۔ لیکن شوکت سبزواری نے اکبر کے طنز کو جس نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے اُس میں اختلافِ رائے کی بہت گنجائش ہے، محمد احسن فاروقی کا مضمون "سرشار کا مزاح" بھی خاصا ہے، سرشار کے متعلق ان کی بعض رائیں بہت صحیح اور وقیع ہیں، مثلاً سرشار نے بھانڈوں کے مزاح کو ادبی حیثیت دینے کی کوشش کی، یہ کوشش قابل قدر ہے مگر انھیں اِس کے ابتذال کو بھی دُور کرنا تھا اور وہ ایسا نہ کر سکے" "سرشار کا مزاح تمامتر ہنگامی ہے وہ ایسی سنجیدہ مُسکراہٹ نہیں پیدا کرتا جیسی مفکّرین پسند کرتے ہیں" فاروقی نے خوجی کے کردار پر کافی طویل بحث کی ہے، اگرچہ اِس موضوع پر احتشام حسین نہایت عُمدگی سے لکھ چکے ہیں، مضمون کے آخری حصّہ میں ڈاکٹر فاروقی جعفر علی خاں اثر سے اُلجھ گئے ہیں اور ذاتیات پر اُتر آئے ہیں یہ عیب خود اثر میں بڑی شدّت کے ساتھ پایا جاتا ہے، لیکن ادب میں اینٹ کا جواب پتھر سے دینا اچھّی نگاہ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔

رشید احمد صدّیقی پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کسی قدر مُبالغہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک اچھے طنز نگار ہیں، لیکن مضمون نگار نے کہیں کہیں عقیدت سے کام لیا ہے جس کا تنقید میں گذر نہیں ہونا چاہیئے۔

بعض مضامین میں نہایت غلط قسم کے بیانات پائے جاتے ہیں "فرحت اللہ بیگ کی زبان مُلّا رموزی کی گلابی اُردو کے بہت قریب ہے" یہ فرحت اللہ بیگ کی انتہائی توہین ہے "رشید کے یہاں طنز ظرافت سے پیدا ہوتی ہے" یہ سو فی صدی صحیح نہیں۔ کنہیّا لال کپور کو افسانہ نگاروں کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے، افسانہ نویس طنز نگاروں میں کرشن چندر کا نام نہیں لیا گیا، حالانکہ ان کے افسانوں میں طنز کے تیرو نشتر پائے جاتے ہیں۔

محفوظ علی بدایونی ہماری زبان کے ایک اچھے طنز نگار تھے لیکن اُن سے عام ادبی حلقہ واقف نہیں۔ اِس نمبر میں اُن کی خوبیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ بہت ہی ہلکی سی کوشش ہے، مضمون کا خاتمہ نہایت مُبالغہ آمیز ہے، قاضی عبدالودود کا مضمون میر ضاحک تحقیقی ہے اور بہت اہمیت رکھتا ہے۔ طنزیہ مضامین میں "جینے کا سلیقہ" (رشید احمد صدیقی) اور "اب وقت آگیا ہے" (قاضی عبدالغفار) اچھے ہیں اور طنز کا عُمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں، رشید احمد صدّیقی کے یہاں حسبِ معمول دعوتِ فکر دینے والے جُملے پائے جاتے ہیں۔

* * *

ضمیمہ (ب)

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں

اُردو مخطوطات

از

حامد اللہ صاحب ندوی

خاتمہ:-

نبی جب کریں اس کرم کی نظر   اُمت کوں بھی ڈر کیا ہے روز حشر
نہ ظالم کرے اُس اُپر کچھ ستم   ز برکت محمدؐ نبی الختم
یو سید بلاقی نبی کا غلام   قصہ یو کھیا تجھ لطف سوں تمام

ترقیمہ:-

"تمام شُد معراج نامہ بہ روز سہ شنبہ بہ تاریخ دہم جمادی الثانی، سنہ ۱۱ جلوس محمد شاہ، کاتب الحروف فقیر حقیر سید نماز الدین"

مختلف کُتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے موجود ہیں، یوروپ میں دکھنی مخطوطات، تذکرۂ اُردو مخطوطات اور فہرست اُردو مخطوطات میں بھی اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بمبئی یونی ورسٹی لائبریری میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے جو بہ نسبت جامع مسجد کے نسخہ کے اچھی حالت میں ہے۔ سنہ تصنیف کے متعلق جو شعر اوپر نقل کیا گیا ہے وہ اسی نسخہ کا ہے جامع مسجد کے نسخہ میں وہ اس طرح ہے۔

کہ ہجرت ہزار ایک بنے سال میں   کہ اتوار کے روز خوش حال میں

جس سے شبہ ہوتا ہے کہ سنہ تصنیف شاید ایک ہزار یکانوے ہے۔

معجزات نبویؐ

مصنّف و سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۱۰۶، ۱۳ شعر فی صفحہ،

خط نستعلیق، ابواب سُرخ روشنائی میں، سائز ۷" × ۱۱"

یہ مثنوی اوّل و آخر سے ناقص ہے اس لئے مُصنّف اور سنہ تصنیف کا پتہ نہیں چل سکا۔ اس کا موضوع رسولؐ اللہ کے معجزات ہیں، بہ حالت موجودہ یہ اٹھارہ مختلف معجزات پر مُشتمل ہے، مضمون کی بندش سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں حمد کا پورا باب اور نعت کا کچھ حصّہ غائب ہے۔

موجودہ نسخہ منقبت چہار یار سے شروع ہوتا ہے، اِس منقبت کے بعد حضرت محبوب سبحانی کے اوصاف ہیں اور پھر مناجات، اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے مُناجات کے بعض شعر حسب ذیل ہیں:-

صحیح رکھ توں ہر آن اعضا مرے   نہ گردان ناقص کرم سوں ترے

تو کر عفو ماضی گنہ مجھ تمام | کرا حال نیکی کے سیری سوں کام
توں کر مصدرِ غور میرا ضمیر | نہ کر فعل بد کا توں طرف عذیر؟
مرا شعر معروف کر مثلِ دیں | نہ مجہول و صعاں ہوئیں حرف چیں
توں فاعل نہ کر مجھ برے کام پر | توں مفعول مجھ نیک انجام کر

چوتھے باب میں مذکورۂ بالا مُناجات کے علاوہ رسول اللہ صلعم کے سفر شام اور حضرت خدیجہ سے آپ کی شادی کا ذکر ہے، پانچویں باب میں ابو لہب کے اس واقعہ کا، جس میں اس نے رسول اللہ کو مارنے کے لئے ایک بھاری سی چٹان ہاتھوں میں اٹھائی تھی، جس کی طرف سورۂ لہب میں بھی اشارہ کیا گیا ہے، خلاصہ ہے

معراج نامہ معظم کی طرح اس کی سُرخیاں بھی منظوم ہیں جو بہ ذات خود ایک مستقل قصیدہ کی حیثیت رکھتی ہیں، بہ حالت موجودہ یہ مثنوی اس قسم کے سولہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا اور آخری شعر حسبِ ذیل ہے:۔

(۱)

حمدِ خدا، نعتِ نبی بولیا جنے سو اس اُپر
واجب ہوا کرنا انے اب مدح چاروں یار کا

(۱۶)

یو او سیاں یک شخص نے حضرت کے یاراں تے کیا
دھر لعن اپنے دل منے مقتول ہوا تلوار کا

ابتدا:

شتابی تھیں اسوار ہو اس اپر | بلایا ہے تمنا خدا زود تر
محمد تے تب اس پو اسوار ہو | چلے حق کے ملنے کوں تیار ہو
محمد کے جبرئیل ہو ہمرکاب | چلے وہاں تھیں لے کو نبی کوں شتاب

خاتمہ:۔

کھیا تب او حاجی سے اسے نابکار | کیا تھا کہو کیا مرے سوں قرار
نزاں دیکھ حضرت علیؓ کے کُدن | رسوؐل خدا نے کہے یو سخن

کرو یا علیؓ قتل تم اس کوں بیگ
کہ ہے جوش میں مجھ کلیجہ کا دیگ

قصہ ہرنی کا

مصنف علی، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۴، جملہ شعر ۴۳، کرم خوردہ

یہ تینتالیس شعر کی ایک نظم ہے جس میں رسول اللہؐ کے ایک معجزہ کا ذکر کیا گیا ہے، اِس معجزہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ ایک دن کہیں جا رہے تھے، راستہ میں ایک بدوی کو سوتے ہوئے دیکھا جس کے سرہانے ایک ہرنی بندھی ہوئی تھی، جوں ہی، رسولؐ اللہ کی نظر اس ہرنی پر پڑی وہ نہایت رحم طلب نگاہوں سے اُنھیں دیکھنے لگی جیسے وہ کہہ رہی ہو کہ میرے بچے بھوک سے تڑپ رہے ہیں، خدا کے لئے مجھے آپ اپنی ضمانت پر رہا کیجئے۔ میں اپنے بچوں کو دودھ پلاکر فوراً واپس آجاؤں گی۔

رسولؐ اللہ اس سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی ضمانت پر اُسے رہا کرادیا، تھوڑی دیر بھی نہیں گذری کہ ہرنی اپنے بچوں کو دودھ پلاکر سچ مچ واپس آگئی۔ اس واقعہ کا بدوی کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ فوراً مسلمان ہوگیا اور ہرنی کو بھی رہائی دے دی۔

نظم کے چاروں صفحات نہایت کرم خوردہ ہیں، اور یوسف زلیخا امین کے ساتھ مجلّد ہیں، اس کا کوئی شعر بھی پورا پورا پڑھا نہ جاسکا آخری شعر حسب ذیل ہے۔

عالی حکایت کیا اہے احمد نبی کے شرف پر
جن نے سُنا او یوں کہا ایں معجزہ گُفتہ علیؔ

اس کے ایک نسخہ کا تذکرۂ اُردو مخطوطات میں بھی ذکر ہے، اس میں ابتدا و خاتمہ کے دو دو شعر بھی دئے گئے ہیں۔ شاید یہ نُسخہ آخر سے ناقص ہے۔ اُس کے اشعار کی تعداد اُنتیس بتلائی گئی ہے۔ اس کا ایک مطبوعہ نُسخہ بھی پروفیسر ندوی کے ذاتی کُتُب خانہ میں موجود ہے جس کو مکتبۂ سلطان حسین نے بمبئی سے شائع کیا ہے۔

قصہ کٹھیارنی کا

مصنف فاضل، سنہ تصنیف نامعلوم۔ صفحات ۱۷، جملہ شعر ۲۶۵

خط نستعلیق، سائز ۶" × ۱۰"

مُصنّف کے حالات معلوم نہ ہوسکے، خاتمہ کے دو ایک شعروں سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نام فاضل تھا، چنانچہ ایک شعر ہے؎

اے فاضل یو تیری خدائی نہیں   فقیرچ ہے تو بادشاہی نہیں

علاوہ ازیں ایک شعر میں اُس نے اپنے آپ کو افضل کی طرف منسوب کیا ہے ممکن ہے باپ کا نام افضل ہو۔ شعر یہ ہے:۔

الٰہی یہ بی بی کی حرمت نول   کر افضل کے فاضل پہ کر یو فضل

ڈاکٹر سیّد ظہیرالدّین مدنی نے اپنے مضمون "گجرات میں مذہبی مثنویاں" میں ایک شاعر فاضل کا ذکر کیا ہے اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ "فاضل تخلّص کا ایک شاعر ۱۱۳۰ھ میں عمر فاروق رضؓ کے عہد خلافت کا ایک منظوم واقعہ لکھتا ہے، شاعر کے وطن اور دوسرے حالات زندگی سے ہم بے خبر ہیں، زبان پر گجراتی اثر زیادہ معلوم ہوتا ہے اس لئے ہم نے اُسے گجراتی مثنوی نگاروں میں شمار کیا ہے" [۵۱]

ممکن ہے عہد فاروقیؓ کے واقعہ کو منظوم کرنے والا یہ فاضل ہی قصۂ کٹھیارنی کا بھی مصنف ہو، ویسے اس مثنوی میں بھی گجراتی زبان کی خصوصیات پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں اس کا ناقل بھی جیسے کہ ترقیمہ سے ظاہر ہوتا ہے سورت کا باشندہ ہے۔ اگر یہ قیاس درست ہو تو پھر قصۂ کٹھیارنی کا سنہ تصنیف بارہویں صدی ہجری کا نصف اوّل ہوگا۔

مثنوی میں بی بی فاطمہ کے ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ واقعہ کا خلاصہ یہ کہ جب بی بی فاطمہ کی شادی ہوئی تو اس وقت اُن کی عُمر صرف بارہ سال کی تھی۔ نہایت لاڈ و پیار سے پرورش پائی تھی اس لئے شادی کے بعد اُن سے حضرت علیؓ کی خدمت اچھی طرح نہ ہوسکی ہر وقت انھیں اپنی برتری کا خیال رہتا تھا۔ یہ چیز رسول اللہ پر ناگوار گذری اُنھوں نے اس سلسلہ میں عملی سبق حاصل کرنے کی غرض سے بی بی فاطمہ کو ایک کٹھیارنی کے گھر بھیجا جو اپنے شوہر کی خدمت کے لئے مشہور تھی۔ وہاں پہنچ کر جب بی بی فاطمہ نے دیکھا کہ کس طرح وہ اپنے شوہر کی مطیع اور اس کے درد و غم میں برابر کی شریک ہے اور کس طرح وہ اس کی خدمت کے لئے ہر وقت ایثار و قربانی سے کام لے رہی ہے تو انہیں حضرت علیؓ سے بے رُخی برتنے کا بڑا افسوس ہوا۔ اور گھر پہنچ کر اُن سے اپنے کئے کی معافی چاہی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن کی خدمت میں مصروف ہوگئیں۔

واقعہ سُنانے کے بعد شاعر عورتوں کو نصیحت کرتا ہے کہ:۔

سُنو دل کے کانوں سیں اے عورتاں   کرو اپنے سرتاج کی منتّاں

---

[۵۱] نوائے ادب اپریل ۱۹۵۰ء

اگر کچھ کہے تو نہ تم اُف کہو   ہریک وقت اس کی رضا میں رہو
نہیں تو قیامت میں جنجال ہے   بڑا سخت دن ہے بُرا حال ہے
اسی پگ تلے ہے تری جنتاں   اسی ہاتھ میں ہے تیری نعمتاں
مجازی خدا ہے یہ دُنیا منے   بھی مولیٰ حقیقی ہے عقبیٰ منے

اور ساتھ ہی ساتھ مردوں کو بھی عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے:۔

جو کچھ حق ہے مرداں کا عورت اُپر   سُخن ایک دو میں سناؤں مگر
ارے جھوٹ اس کوں دلاسا نہ دے   کسی وقت کا توں نسا سا نہ لے
بیچی تیری صورت کی عاشق ہے او   توں اوروں کوں دل دے کے فاسق نہو

مثنوی کی ابتدا حمد و نعت اور منقبت سے ہوئی ہے۔ جو سات اشعار پر مشتمل ہے، پھر اپنے کلام کی مقبولیت کے لئے دُعا کر کے اس طرح شروع کیا ہے۔

الٰہی مری طبع کوں زور دے   جو امرت بچن مجھ کوں فی الفور دے
دِوا کر توں روشن مرے ذہن کا   بیاں میں کروں قرۃ العین کا
سخن کے توں موتی کوں دے آب آج   تو چھلکا مری طبع ہتاب آج
بیاں دار کٹھیارنی کا کروں   او محبوب خوش نازنیں کا کروں

مثنوی نہایت کرم خوردہ ہے ابتدا کا صرف ایک شعر پوری طرح پڑھا جا سکا۔

ابتدا:۔

ثنا صفت اللہ کی بولوں سو میں   اسے سب کے صفتاں سو کھولوں سو میں

خاتمہ:۔

کہ میں تو نصیحت کے لائق نہیں   عزیزاں شرع بیچ فائق نہیں
میں اپنے گناہوں میں غرقاب ہوں   سدا بیچ عصیاں میں بے آب ہوں
الٰہی یہ بی بی کی حرمت نول   کہ افضل کے فاضل پہ کر یو فضل

ترقیمہ:۔

"برائے خواندن شیخ علی ولد شیخ احمد ساکن در شہر سورت، در محلہ نان پورہ بہ قلم میاں شفیع ... سنہ بارہ سے بچاون "ماہ ذوالحج بہ تاریخ انیسویں"

اس کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے، دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے سوائے اس کے ندوی صاحب کے نسخہ کے

خاتمہ میں حسبِ ذیل دو شعر زیادہ ہیں۔

صغیرہ کبیرہ ت پاک ہیں اور دُنیا کے کاموں سے بیباک ہیں
بہ حرمت انھوں کے ہوا بہ تمام درود داں نبی پر علیہ السّلام

اس نُسخہ کا ترقیمہ حسبِ ذیل ہے:۔

"تحریر فی التاریخ سلخ شہر شوال المکرم ۱۲۶۳ھ یک ہزار دو صد و شصت و سہ ہجرۃ النبویہ۔"

قِصّۂ شاہ یمن

مُصنّف فاضل، سنہ تصنیف نامعلوم۔ صفحات ۲۵، شعر فی صفحہ ۱۱،
خط نستعلیق، سائز ۶½ × ۵½۔

مُصنّف کے حالات معلوم نہ ہو سکے، وجہ تالیف بیان کرتے ہوئے صرف اس قدر لکھا ہے کہ:۔

"نہیں شاعر نہ مجھ کو علم حاصل فقط ہے نام میں رکھتا ہوں فاضل"

گزشتہ نسخے کے تعارف میں جس فاضل کا ذکر کیا گیا ہے وہ یقیناً اس نسخہ کے فاضل سے الگ ہے اس لئے کہ اُس کی زبان پوری کی پوری دکھنی ہے اور اِس کی زبان ریختہ، چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے:

سخن کو دی ہے رب نے کیا ہی وسعت زبانِ شاعراں میں ہے فصاحت
خصوصاً ریختہ گوئی میں اے یار نہایت ہے مزا اور لُطف بسیار

علاوہ ازیں وجہ تالیف میں یہ جتاتے ہوئے کہ میں نے یہ معجزہ ایک اور کتاب سے لیا ہے جو بے انہا بُری زبان میں لکھی ہوئی تھی، اس کے خلافِ محاورہ اور غلط سلط ہونے پر سخت تنقید بھی کی ہے۔ لکھا ہے:۔

یہ قصہ معجزے کا جو لکھا تھا زبانِ زشت میں لیکنے کہا تھا
ہر یک کی فکر موافق قدر کے ہے سخن فہمی بھی ہے اے دوستو شئی
نہایت لفظ اس میں بے مہارت لکھے تھے اس نے اے صاحب فراست
سخن داں کے نہ تھا پڑھنے کے قابل نہ مطلب اس سے کچھ ہوتا تھا حاصل
ہوا معلوم جب مجھ کو زبوں یہ مرے دل نے کہا اب میں کہوں یہ

لکھا میں نے یہ اپنی حسب طاقت | کہ تھی جتنی مجھے صاحب لیاقت
عزیزو قافیہ بندی سے کر کر | کیا یہ معجزہ میں نے سراسر
جو کوئی اس کو پڑھے بندہ نوازا | نہ کیجیو طعن مجھ پر بس خدارا
نہ میں شاعر نہ مجھ کو علم حاصل | فقط ہے نام میں رکھتا ہوں فاضل

ان اشعار میں جس، زبان کے بے محاورہ اور غلط سلط ہونے پر یوں لسن طعن کی گئی ہے وہ یقیناً دکھنی زبان ہی ہوگی۔ کیونکہ شالی ہند کے مصنفین اپنی ریختہ کے مقابلے میں اس کو نامانوس اور خلاف محاورہ ہی سمجھتے تھے، چنانچہ میر بہادر علی (فورٹ ولیم کالج) کے والد ماجد مولانا عبداللہ دہلوی کے جس ترجمہ تنبیہ الغافلین کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے، اُس میں بھی انھوں نے دکھنی زبان کے متعلق ایسی ہی رائے ظاہر کی ہے۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کتب خانہ میں قصۂ معجزۂ انار کے نام کی ایک مثنوی ہے جو ۱۲۰۰ھ میں اسمٰعیل مردہاں نے لکھی ہے۔ یہ شاعر امروہہ کا تھا جو شاید بعد میں دکن میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس کی دوسری مثنویاں بھی دکھنی زبان میں ہی لکھی ہوئی ملتی ہیں چونکہ مذکورۂ بالا مثنوی اور اِس مثنوی کا قِصہ در اصل ایک ہی ہے اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ فاضل نے جس مثنوی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہی ہوگی۔

بہر حال قصۂ شاہ یمن کا مُصنف کوئی دکھنی شاعر نہیں ہے۔ بلکہ ریختہ کا دلدادہ اور شالی ہند کا باشندہ معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی کا موضوع رسولؐ اللہ کا ایک معجزہ ہے۔ جس کی وجہ سے شاہ یمن کے باغ کے پتہ پتہ نے خدا کے ایک اور محمدؐ کے رسول ہونے کی گواہی دی تھی۔ اور جس کو دیکھ کر باغ کا مالی مُسلمان ہوگیا تھا اور خود شاہ یمن بھی بعد از خرابی بسیار اسلام لے آیا تھا۔

مثنوی حمد و نعت سے شروع ہوئی ہے۔ اور درود و سلام پر ختم ہوجاتی ہے۔

ابتدا:۔

کروں کیوں کر نہ حمد کبریائی | اور اس کے بعد نعت مصطفائی
وہ ہے خالق مرا یکتائے معبود | کہ کن سے کر دیا کونین موجود
محمد کو کیا فخر دو عالم | ہوا یوں فخر موجودات عالم

خاتمہ:۔

رکھیں مومن پہ سارے دیں سے ساری | رہے کلمہ شہادت دل سے جاری

الٰہی ہو گنہ گاروں پہ رحمت — کہ محشر کو نبی کی ہو شفاعت
یہ سن کر اے مسلمانو کرامات — پڑھو حضرت نبیؐ پر دل سے صلوٰۃ

قصّۂ شاہ یمن کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی کریمی لائبریری میں موجود ہے، جس کو مطبع کریمی نے ۱۳۱۱ھ میں بمبئی سے شائع کیا ہے۔ مگر یہ مطبوعہ نسخہ مذکورۂ بالا مخطوطہ کی نقل نہیں ہے بلکہ کسی دکھنی شاعر کا لکھا ہوا ہے۔ زبان کی بعض خصوصیات اس کے گجراتی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ مثنوی میں کہیں مصنّف و سنہ تصنیف وغیرہ کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ لسانی خصوصیات کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مذکورۂ بالا مثنوی سے کئی سال بعد لکھی گئی ہے

اِس کے ابتدائی اور اختتامی اشعار حسب ذیل ہیں:-

ابتدا:-

اوّل تعریف اس شاہ جہاں کو — کیا پیدا دہی ارض و سما کو
دگر تعریف سو ہے مصطفےٰ کو — کہ جس کی صفت میں پایا خدا کو
محب خاوند کہ جس کا یہ عبد ہے — کہ اُس کے فہم میں سب عقل ردہی
کہ جس کی شان میں قرآن ساجے — ہیتر لولاک کا سر پہ براجے

خاتمہ:-

الٰہی اس کے پڑھنے سُننے والے — قیامت کو ہوں رضواں کے حوالے
یہ سُن کر اے مسلمانو کرامات — کہو اس بات پر صلوٰت صلوٰت
الٰہی کر یو دم آخر کی یاری — رہے کلمہ شہادت دل سے جاری

فاقہ نامہ

مُصنّف طالب، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۵، شعر فی صفحہ ۱۷،
خط نسخ، سائز ۶½ × ۸½۔

طالب کے حالات معلوم نہ ہوسکے، لسانی خصوصیات کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ گجرات کا باشندہ ہوگا۔ مثنوی کا موضوع بی بی فاطمہؓ کی فاقہ مستی ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح بی بی فاطمہؓ اور ان کے جگر گوشے تین دن تک فاقہ کرتے رہے اور چوتھے دن جب اپنی چادر فروخت کرنی چاہی تو ایک غریب کے دستِ سوال بڑھادینے پر چادر بھی اس کے حوالے کردی اور خود خُدا پر صبر کرکے بیٹھ رہیں۔

ضمیمۂ

مقالہ نما

مقالہ نما

مُرتّبین
عالی جعفری ———— عصمت جاوید
فضل اللہ فاروقی ———— احمد ملک

مذہبیات

۱- ؟ :

مسلمانوں کی صنعت کاری

(اعظم کراچی ۳ء ۵ جنوری ۴۴ — ۴۹)

مضمون نگار کا نام نہیں دیا ہوا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں دکھایا ہے کہ مسلمانوں میں صنعت کاری ہر ملک اور ہر زمانہ میں پائی جاتی تھی۔

۲- اظہر علی فاروقی:

"کالی ماتا" کے چرنوں میں بنگلا منسا منگل

(آج کل دہلی ۵۳ء جون ۱۶ — ۲۰)

بنگال کے باسیوں کے مذہبی رجحانات پر تبصرہ کرتے ہوئے منسا منگل کے تہوار سے بحث کی ہے۔ منسا منگل کی ابتدا بھی چنڈی کا دیہ کی طرح ہمیشا سور اور چنڈی یا کال کی جنگ سے ہوتی ہے۔ منسا منگل کے گیت ہری دت کی کتابی منسا منگل سے سیکڑوں برس پہلے بنگال کے عوامی گیت بن چکے تھے۔ منسا منگل کے قصّوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے۔ اسلوب و بیان کے لحاظ سے یہ اُردو کے قدیم افسانوں کی طرح ہے۔ اس موضوع پر ساٹھ سے زائد شاعروں نے قلم اٹھایا ہے۔

۳- خلیق احمد نظامی۔ پروفیسر:

حضرت خواجہ محمّد عاقل

(برُہان دہلی ۵۴ء جنوری ۵ — ۱۶)

مقالہ نگار نے مشائخ چشت کے نام سے جو کتاب مُرتّب فرمائی ہے زیر نظر مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے جس میں خواجہ محمد عاقل کے حالاتِ زندگی، مجاہدات توزیع اوقات، اخلاق وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۴- سعید حسن، ڈاکٹر:

اسلامی تہذیب و ثقافت عہد نبویؐ سے عہد بنی اُمیّہ تک

(نگار لکھنؤ ۵۳ء مئی ۱۱ — ۲۰)

عہد نبویؐ اور خلفائے راشدین کی سادہ زندگی پیش کرنے کے بعد بنو اُمیّہ کے دَورِ حکومت میں جو جو عجمی رسم و رواج۔ شاہانہ شان و شوکت۔ لباس کھانا پینا، سیر و تفریح، رقص و سرود اور عورتوں کی تعلیمی و علمی زندگی کی چند مثالیں پیش کی ہیں۔

۵- سعید حسن:

علوم و معارف

آغاز اسلام سے عہد بنو اُمیّہ تک

(نگار لکھنؤ ۵۳ء جون ۱۲ — ۱۸)

ظہور اسلام سے پہلے عربوں کے ادب کی حالت دکھانے کے بعد اسلامی عہد میں ان کے ادب و کلام، کلام مجید کی ترتیب، احادیث، اور دوسرے علوم وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔

۶- ظفر احمد عثمانی:

اسلام میں جاگیرداری و زمینداری کا نظام

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ء اپریل ۲۴۵ — ۲۶۸)

مندرجہ بالا عنوان پر ایک طویل مضمون مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا معارف میں نکل چکا ہے

جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام میں اس قسم کی زمینداری کا وجود نہیں ہے جیسی کہ اب تک ہندوستان میں تھی اور اس کے ثبوت میں احادیث وغیرہ پیش کی تھیں۔ مندرجہ بالا عنوان سے صاحب مضمون نے اس نظریہ کی تردید کی ہے کہ اسلام میں جاگیرداری نظام نہیں ہے اور جائز نہیں اپنے دعوے کی دلیل میں احادیث۔ اور فقہاء و اُمت کے فیصلوں سے شواہد پیش کئے ہیں۔

۷۔ ظفر احمد عثمانی:

اسلام میں جاگیرداری و زمینداری کا نظام

(قسط دوم)

(معارف۔ اعظم ۵۳ مئی، ۳۲۵ ــ ۳۴۰)

زمینداری و جاگیرداری کے سلسلے میں اس قسط میں فقہاء کے مذاہب اور ان کی کتابوں کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام میں زمینداری، و جاگیرداری قطعی طور سے ناجائز نہیں۔

۸۔ ظفر احمد عثمانی

اسلام میں جاگیرداری و زمینداری کا نظام

(قسط دوم)

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ جون ۴۰۵ ــ ۴۲۰)

مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب نے سید مناظر احسن صاحب کے مقالہ اسلام میں ... پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور احادیث رسول اور فقہا کے عمل کے خلاف مناظر احسن صاحب نے جو نتائج اخذ کئے ہیں اُن سے شدید اختلاف کیا ہے۔

۹۔ عزیز احمد:

اسلامی نظام میں فکر و ادب کی بنیادیں

(چراغ راہ کراچی ۵۳، مارچ ۲۰ ــ ۲۳)

مختصر سی تمہید کے بعد اس مقالہ میں اس بات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح اسلام ایک مخصوص نظام حیات اور مخصوص فکر پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۱۰۔ فارق۔ ڈاکٹر خورشید احمد:

قاضی شریح

(برہان دہلی ۵۳ مئی، ۲۷۳ ــ ۲۸۴)

قاضی شریح پہلی صدی ہجری کی ایک نہایت قابل شخصیت ہے۔ وہ تقریباً ساٹھ سال تک مختلف خلفاء کے زمانہ میں منصب ... پر متمکن رہے وہ ایک خدا ترس راست باز اور انصاف پسند انسان تھے۔ ایک سو سال سے زائد عمر پائی۔

۱۱۔ فارق۔ ڈاکٹر خورشید احمد:

قاضی شریح

(۲)

(برہان دہلی ۵۳ جون ۳۲۵ ــ ۳۴۴)

قاضی شریح بحیثیت قاضی انکی سیرت کی مضبوطی۔ ان کی قوت فیصلہ۔ اور ان کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

۱۲۔ محفوظ الکریم معصومی

ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر

(ایک مضمون کا جائزہ)

(برہان دہلی، ۵۳ فروری ۹ ــ ۸۱)

مارچ ۵۰ء میں صاحب مضمون نے عنوان بالا پر ایک مضمون لکھا تھا اسی موضوع پر ۵۱ء میں دو حضرات نے مقالے لکھے۔ مولانا محتی حسن کامون پوری اور اختر تلہری صاحب، نے ان حضرات کو بعض عجیب قسم کی غلط فہمیاں ہو گئی تھیں جن کا ازالہ معصومی صاحب نے اس مضمون میں فرمایا ہے۔

۱۳۔ محفوظ الکریم معصومی:

امام بیہقی کی ایک لطیف تصنیف

کتاب المدخل الی السنن

(معارف اعظم گڑھ ۵۳، اپریل)

پانچویں صدی ہجری کے ائمہ حدیث وسنن میں

امام بیہقی کی نمایاں شخصیت بھی ہے۔ آپ کی تصانیف کثیرہ میں سے مندرجہ بالا کتاب کا ایک قلمی نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے جس کا سنہ کتابت ۵۴۳ھ ہجری ہے۔ یہ نسخہ اپنی مستقل حیثیت کے باوجود کتاب السنن الکبیر کا مقدمہ بھی ہے۔ مضمون نگار نے تحقیق و تجسس کے بعد آخر مضمون میں کتاب کی فہرست مضامین بھی دے دی ہے، گو کہ اوّل سے یہ نسخہ ناقص ہے۔

۱۴۔ محفوظ الکریم معصومی:

امام بیہقی کی ایک لطیف تصنیف
کتاب المدخل الی السنن
(قسط ۲)

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ مئی)

پیش نظر نسخہ کے اصول دو قدیم نسخے ہیں ان دونوں کے اختلاف پر جا بجا تنبیہ موجود ہے۔ ایک نسخہ کے لئے "ھم" اور دوسرے کے لئے "ص" کی علامتیں ہیں۔ "ص" نسخہ کے بارے میں تصریح موجود ہے لیکن "ھم" نسخہ کے لئے کوئی اشارہ نہیں پھر دونوں نسخوں کی تصریحات بیان کی گئی ہیں۔ کتاب کے سلسلہ میں دوسری مفید اہم معلومات بیان کی گئی ہیں۔

۱۵۔ محمد حمید اللہ۔ ڈاکٹر

رومی قانون اور اسلامی قانون
کے تعلقات پر چند ملاحظات

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ جنوری ۴۴-۴۸)

یہ نال لینو کے اطالوی مضمون کا ترجمہ ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عام ملکی نظم و نسق کے ایک جز کو چھوڑ کر رومی قانون کا اسلامی قانون پر بہت ہی کم اثر پڑا ہے۔

۱۶۔ محمد علی شاہ (خواجہ)

قرآن مجید اور ترجمہ و تفسیر

(برہان دہلی ۵۳ جون، ۳۵۹-۳۶۷)

مضمون نگار نے ۱۸۷۷ھ میں زمانہ قیام اورینٹل کالج لاہور، مندرجہ بالا عنوان پر تفسیر کے قدیم و جدید ذخیرۂ کتب سے تحقیقی معلومات بہم پہونچائی تھیں انھیں کو اس مضمون میں وضاحت سے بیان کیا ہے۔

۱۷۔ محمد ظفیر الدین۔

رحمتِ عالم صلعم کا پیش کردہ نظامِ حیات

(برہان ۵۲ جنوری، ۲۸-۴۸)

مضمون میں اسلام کے اجتماعی، معاشرتی، عمرانی، اور ملکتی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آج بھی پیغمبر اکرم کی تعلیمات پر عمل کرنا حکومت و ملت کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۸۔ مسعود حسن (کلکتہ) مترجم:

امام غزالی کی غیر مستند تصانیف۔

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ مارچ ۱۷۸)

مندرجہ بالا عنوان پر مسٹر ڈبلیو منٹگمری واٹ نے ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی گریٹ برٹن کے رسالہ میں شائع ہوا ہے۔ جس میں امام غزالی کی جعلی تصانیف کے سلسلہ میں تحقیق و تفتیش کے جدید طریقے استعمال کرکے بعض نئے اور مفید معلومات پیش کئے ہیں۔ امام غزالی کی کتابوں کے جعلی ثابت کرنے کیلئے بعض اصول مرتب کئے ہیں۔ اور اُن کی طرف منسوب کتابوں کی آخر میں فہرست دی گئی ہے۔

۱۹۔ مفتون احمد۔

مولانا شبلی اور ندوۃ العلماء

(نگار لکھنؤ ۵۳ مارچ ۲۷-۳۰)

شبلی نے ندوۃ العلماء کے ذریعہ نئے زمانے میں

مولویوں کے وجود کے لئے ایک وجہ جواز ڈھونڈی اور ان کے پیٹ کا سوال حل کیا اس کے علاوہ جس چیز نے شبلی کو مولویوں کی گروہ بندی پر آمادہ کیا وہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ اعلیٰ طبقہ کی بے راہروی کا غلط تجزیہ تھا، شبلی نے مغرب زدگی کے صحیح اسباب کا کھوج نہیں لگایا اور نہ اس خود غرضی اور وحشیانہ استحصال کو سمجھا جن پر مغرب کا لایا ہوا سرمایہ دارانہ نظام قائم تھا۔ انھوں نے علماء کو جدید علوم سے روشناس کرایا بھی تو ان علوم کو مسلمان بنا کر گویا ان کی نظر میں جدید علوم بذات خود اہم نہیں تھے بلکہ ان کی اہمیت اس بات میں تھی کہ وہ مذہبی عقائد کی کس حد تک تائید کرتے ہیں۔

۲۰۔ مناظر احسن گیلانی:

نظام جاگیرداری و زمینداری کی اسلام میں کیا گنجائش ہے

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ جنوری ۵-۲۳)

مختلف حوالجات کی مدد سے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام نے زراعت کے سلسلہ میں فریب اور ظلم و زیادتی کو ناجائز ٹھہرایا، حتیٰ کہ نقدی بندوبست اور بٹائی کو جو مسلمانوں میں رائج رہے جائز نہیں ٹھہرایا اور خود کاشت و مشترکہ کاشت کی موافقت کی۔

۲۱۔ مناظر احسن گیلانی:

مُسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

(برہان دہلی ۵۳ جنوری ۱۷-۲۷)

مسلسل۔ اس قسط میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مذہب اسلام نے کبھی تفرقہ نہیں پیدا کیا۔

ملکہ تنگ دماغوں نے فروعی اختلافات کو جلب منفعت کی خاطر بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔

۲۲۔ مناظر احسن گیلانی:

قرآن کے صائبین کیا بُدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ فروری ۸۵-۱۰۱)

قرآن نے تمام قوموں میں ہادی اور پیغمبر بھیجے جانے کی اطلاع دی ہے، اسی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے، تاریخی اور مختلف مذہبی کتابوں کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بودھ مت کے ماننے والے ہی صائبین کے لقب سے قرآن میں یاد کئے گئے ہیں۔

۲۳۔ مناظر احسن گیلانی۔

قرآن کے صائبین کیا بُدھ مذہب کے ماننے والے تھے؟

(قسط دوم)

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ مارچ)

المسعودی، البیرونی اور انگریز مورخوں کے حوالوں سے بودھ مذہب اور عقائد پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں الفاظ کا ایک زبان سے دوسری زبان میں تلفظ بدل جانے پر روشنی ڈالتے ہوئے وضاحت کی گئی ہے کہ بودھا کا لفظ جب "بوذاسف" بن سکتا ہے تو کیوں نہ سمجھا جائے کہ صابی کا لفظ بھی ردّ و بدل سے متاثر ہوا ہو۔

۲۴۔ مناظر احسن گیلانی:

کس لئے؟

(قسط دوم)

حد اتک رسائی کے لئے رہبانیت و روحانیت اس کی تفصیل۔ پھر اس کے برعکس دوسرا گروہ بھی ہے جو عملی مادّیت کو اپنا فکر نظر قرار دیتا ہے۔ پھر اس اصول کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔

۲۵- میر سیادت علی خاں:

حجاج بن یوسف
بغاوت ابن اشعث

(ہندستانی ادب حیدرآباد ۵۲، ۵۳
دسمبر، جنوری ۹-۱۲)

۱- حجاج بن یوسف کے عہد میں ابن اشعث نے جو خوفناک بغاوت کی تھی اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

۲۶- میر سیادت علی خاں:

حجاج بن یوسف - اصلاحات

(ہندستانی ادب حیدرآباد ۵۳ فروری ۱-۱۳)

عراق میں حجاج بن یوسف کے جاری کردہ اصلاحات کا مفصل ذکر، مضمون میں حجاج کو عراق سے کم مالگذاری کے ملنے کی وجہ بھی تفصیل سے بتائی گئی ہے۔

۲۷- میر سیادت علی خاں:

حجاج بن یوسف
(باب ۱۱ مسلسل)

(ہندستانی ادب حیدرآباد ۵۳ مارچ ۲-۹)

اس خط میں حجاج بن یوسف کی فتوحات۔ وسط ایشیا، فتوحات قتیبہ بن مسلم اور فتح بخارا کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔

۲۸- میر ولی الدین ڈاکٹر:

بیماری اور اس کا روحانی علاج

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ فروری ۱۲۴-۱۳۹)

عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے کہ بیماری شر مطلق ہے جس میں کوئی خوبی اور بہتری نہیں وغیرہ لیکن اگر بیماری سے نجات پانی منظور ہو تو یہ رائے بدلنی پڑے گی۔ اور بتدریج یہ ماننا پڑے گا کہ بیماری اور اس سے پیدا ہونے والا درد و غم مطلق ترین رحمت ہے۔ اس نظریہ کے ثبوت میں مختلف احادیث نبوی۔ مولانا روم حافظ و سنائی کے اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

۲۹- ولی الدین میر:

کندی اور اس کا فلسفہ
وفات ۸۷۳ء

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ جون ۴۳۴-۴۲۱)

مضمون میں اسحاق کندی کے حالات زندگی۔ اس کی تصانیف اس کے فلسفہ اور اس کی فلسفیانہ تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۰- ہاشمی فریدآبادی:

شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک

(ماہ نو کراچی ۵۳ مئی ۱۶-۱۸ و ۴۸)

شاہ ولی اللہ دہلوی کی مذہبی و معاشرتی اصلاحی تحریک کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

۳۱- یونس احمر:

نذر الاسلام اور ان کے اسلامی نظریئے

(ماہ نو کراچی ۵۳ مئی ۲۷-۲۸)

اپنی سپاہیانہ زندگی، بغاوت آفریں شباب، تلخ تجربات اور نامرادیوں کے ساتھ نذر الاسلام اپنے مذہب اور مسلمان بھائیوں سے بیگانہ نہیں تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں بلاد اسلامیہ میں مسلمانوں کی حالت دیکھ کر صبح امید لکھی۔ تحریک خلافت سے اثر لیا، پیغمبر اکرم کی منظوم سوانح عمری (نامکمل) عید میلاد پر نظمیں اور قوالیاں وغیرہ نذر الاسلام کے اس درد اور محبت کو ظاہر کرتی ہیں جو انہیں مسلمانوں اور اسلام سے ہے۔

تاریخ و سیاسیات

۳۲- الطاف علی بریلوی:

بیگمات اودھ پر مظالم کا پس منظر

(العلم کراچی ۵۳ جنوری ۵-۵۶)

۲- اس قسط میں ان مظالم اور ان کی نوعیت دکھائی

گئی ہے جو وارن ہسٹنگز کے زمانہ میں بیگمات اودھ پر خصوصاً بادا بیگم پر ہوئے تھے۔

۳۳۔ ص۔ ع:

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ مئی)

ڈاکٹر ایس۔ سی سرکار صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج اور پروفیسر کے۔ کے دت لکچرار پٹنہ کالج نے مل کر ۱۹۵۲ء میں ایک کتاب "ٹکسٹ بک آف ماڈرن انڈین ہسٹری" کے نام سے لکھی تھی اُس کے ایک باب میں عہدِ مغلیہ کے معاشی حالات بھی لکھے گئے ہیں اسی باب کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

۳۴۔ محمد جمیل در اسد:

کُتُب خانہ اسکندریہ

(آج کل دہلی ۵۳ مئی)

کُتُب خانہ اسکندریہ کی ابتدائی تاریخ مختلف حوالوں سے پیش کرنے کے بعد اُس کے عہد بعہد عروج و زوال کی داستان اور آخر میں اس الزام کی تردید کہ اس کُتُب خانہ کی تباہی کی ذمّہ داری مسلمانوں پر ہے تاریخی شہادتوں اور حوالوں سے غلط قرار دیا ہے۔

۳۵۔ وی۔ ستنکو:

تین سال پہلے

(آج کل دہلی ۵۳ جنوری ۲۲-۲۳)

اس مقالہ میں راجستھان کے ماضی کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی جنگی اہمیت پر تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس طرح پچھلے راجستھانی راناؤں کا خواب سردار پٹیل کے ہاتھوں شرمندۂ تعبیر ہوا۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۳۶۔ آفاق احمد:

صفیہ آپا

(تہذیب پٹنہ ۵۳، اپریل)

جاں نثار اختر کی بیوی اور مجاز کی بہن۔ ترقی پسند ادیبوں میں ایک خاص مقام رکھتی تھیں افسوس کہ موت نے انھیں بہت جلد جُدا کر دیا اُن سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں۔

۳۷۔ ادارہ:

تحریک اسلامی کے داعی

(چراغ راہ، کراچی ۵۳ جون، ۲۳-۲۸)

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی امین احسن اصلاحی، محمّد عبد الجبّار غازی اور میاں محمد طفیل کے مختصر حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔

۳۸۔ ا۔م:

طامس مور

(ہندستانی ادب حیدر آباد ۵۳ فروری ۴۳-۴۴)

مشہور انگریز شاعر طامس مور کے حالات زندگی اور تصنیفات مختصر طریقے پر پیش کئے گئے ہیں۔

۳۹۔ امیر حسن نورانی:

منشی نول کشور

(تہذیب پٹنہ ۵۳ ستمبر ۹-۱۲)

اُردو، فارسی، عربی غرض اسلامی علوم و فنون کے محسن اعظم منشی نول کشور ۱۸۳۶ء میں بستوئی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ فارسی سے تعلیم کی ابتدا کی۔ اور بعد میں آگرہ کالج میں داخل ہوئے۔ مضمون نگاری اور صحافت سے بڑی دلچسپی تھی۔ اسی لئے وہ کالج سے لاہور گئے اور "کوہ نور" کے عملے میں شامل ہوگئے اور اُسے ترقّی دی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد آگرہ

اور پھر لکھنؤ گئے۔ اپنا پریس قائم کیا اور اودھ اخبار جاری کیا۔ اور بڑی محنت اور جاں فشانی سے کام کرتے رہے۔ چنانچہ پریس اور اخبار دونوں کامیاب رہے وہ بڑے اولوالعزم، صاحب حوصلہ، خوش اخلاق میانہ رو اور رواداری آدمی تھے۔ حکومت اور عوام سبھی میں مقبول تھے (مضمون نگار منشی جی پر ایک مستقل کتاب تالیف کر رہے ہیں)

۴۰۔ برنی۔ ضیاء احمد:

حکیم اجمل خاں

(تہذیب۔ پٹنہ ۵۳۔ اپریل)

حکیم اجمل سے ملاقات، اُن کا کردار، اور اُن کی زندگی کے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔

۴۱۔ بیدار۔ عابد رضا خاں:

شیخ علی بخش بیمار

(برہان دہلی ۵۳۔ مئی)

یوم بیمار کی صد سالہ برسی کے موقع پر رام پور میں یہ مضمون پڑھا گیا، بیمار انولہ ضلع بریلی کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۰ھ میں انتقال ہوا۔ مختلف تذکرہ نویسوں سے بیمار کے سلسلہ میں جو فروگزاشتیں ہوئی ہیں اُن کی تصحیح کی گئی ہے بیمار کے کلام سے مختلف اشعار پیش کر کے ان کی شاعری کے مرتبہ کو اُجاگر کیا گیا ہے۔

۴۲۔ پرکاش چند کھنہ:

معزول بادشاہ

(آج کل ۵۳ مارچ ۵۱ — ۵۵)

رضا شاہ پہلوی کے حالاتِ زندگی۔

۴۳۔ حمید اللہ ڈاکٹر:

مولانائے روم کی سات سو سالہ برسی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ مئی ۳۸۲۔ ۳۸۴)

۱۰ر فروری ۱۹۵۳ء کو مسلمانان مقیم فرانس کی ایک انجمن نے مولانا روم کی سات سو سالہ برسی منانے کا اہتمام کیا۔ جلسہ میوزے گیمے میں ہوا جس کی اجازت وزیر اعظم فرانس سے لینی پڑتی ہے۔ جلسہ کی صدارت نجم الدین ہمت افغانی نے کی۔ پروفیسر ماسینون، پروفیسر فتحی (ترک) اور پروفیسر ماسے نے مختلف عنوانات پر مقالات پڑھے، حاضرین میں سفراء، بہ کثرت اساتذہ اور مختلف ملکوں کے لوگ شریک تھے۔

۴۴۔ ص۔ ع:

سرمد

(معارف اعظم گڑھ ۵۳، اپریل)

اسلامک کلچر حیدر آباد دکن کے جوبلی نمبر میں کیلیفورنیا یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر جے فشل نے "ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کے دربار میں یہود اور یہودیت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں سرمد پر ایک خاص نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ اُسی مضمون کی تلخیص ہے۔

۴۵۔ طلحہ۔ ایم بی۔

اسپینوزا اور اس کا فلسفۂ ادب

(آج کل دہلی ۵۳ مارچ ۱۲ — ۱۵)

اسپینوزا کے حالات زندگی پیش کئے ہیں اور اس کے اہم سوانح نگار پیاسٹر کو پرس کی بعض غلط بیانیوں پر روشنی ڈالنے کے علاوہ اسپینوزا کے فلسفۂ ادب و مذہب سے بحث کی ہے۔

۴۶۔ عابد علی عابد:

عُرفی شیرازی

(ماہ نو کراچی ۵۳ مئی ۵ — ۱۱ ، ۴۵)

عُرفی کی زندگی اور کلام پر تبصرہ۔

۴۷۔ عشرت رحمانی :

میاں منصور

(ہمایوں لاہور ۵۳ مارچ ۲۲۳–۲۲۶)

اصلی نام سید زین العابدین تھا۔ ان کے والد سید حسن علی تھے۔ دربار رام پور سے وابستہ تھے۔ مولانا منصور اپنے عہد کے شعرا میں چنداں قابل ذکر نہیں۔ ان کا ذوق شعری ان کی افتاد طبع کے مطابق ایک صوفی منش نعت گو کہا جا سکتا ہے اور کلام سلیس اور شستہ ہے۔ تاریخ گو کی حیثیت سے وہ ایک ممتاز مرتبہ رکھتے تھے۔ لیکن تاریخ ادب میں ایک امیر مینائی ہی نے ان کا تذکرہ "انتخاب یادگار" میں کیا ہے۔ ۱۳۰۶ھ میں انتقال کیا۔ ان کا مزار رام پور میں ہے۔

۴۸۔ کلب علی خاں فائق :

داغ کے چند مخصوص رامپوری تلامذہ

(نگار لکھنؤ ۵۳ جون ۲۴–۳۰)

احسان علی خاں احسان، امیر حسن دبیر، حیات بخش رسا، محمد آغا شاغل، محمد شبیر علی خاں شبیر، محمد عظمت علی خاں عظمت، فیروز شاہ خاں فیروز، ذوالفقار علی خاں گوہر، محمود علی خاں محمود، حافظ محمد علی نجف اور حکیم عبدالہادی خاں وفا کی مختصر زندگی، کلام پر ہلکا سا تبصرہ اور ان کے کلام کا مختصر انتخاب دیا ہے۔

۴۹۔ محمد حمید الدین محمود :

مارشل اسٹالن۔ اس صدی کی شخصیت

(آج کل دہلی ۵۳ مئی ۱۲–۱۳)

بچپن سے لے کر آخر زندگی تک اسٹالن کے مختصر حالات اور اس کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

۵۰۔ محمد رکن الدین احسان :

ابو ریحان البیرونی

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۴۴–۴۶)

مشہور مصنف ابو ریحان بیرونی کی حیات اور کارناموں کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔

۵۱۔ محمد مصلح الدین احمد :

آئزن ہاور

(آج کل دہلی ۵۳ اپریل ۳۵–۳۹)

مضمون نگار نے جنرل آئزن ہاور موجودہ صدر امریکہ کے حالات زندگی بتلائے اور ان کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔

۵۲۔ منظر شہاب :

ودیاپتی۔ میتھلی ادب کا عظیم فن کار

(تہذیب پٹنہ ۵۳ اپریل ۱۹–۲۵)

ودیاپتی کے حالات زندگی، میتھلی ادب میں ان کی عظمت، ان کی شاعری کے نمونے، ان کی کتابوں کے دوسری زبانوں میں تراجم۔ اور ان کے انتقال کا زمانہ متعین کیا ہے کہ ۱۴۳۰ء کے بعد ان کے زندہ رہنے کا ثبوت نہیں پایا جاتا۔

۵۳۔ ناصر انعام اللہ خاں مترجم :

حکیم سنائی

(برہان دہلی ۵۳ فروری)

افغانستان کے مشہور ادیب خلیل اللہ خلیلی نے حکیم سنائی کے سوانح حیات فارسی میں مرتب کئے۔ اسی کا یہ ترجمہ ہے۔

زیر نظر مقالہ میں سنائی کے ابتدائی حالات نام و نسب۔ اور اس کی شاعری و مذہب پر تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۵۴۔ ناصر انعام اللہ خاں (مترجم)

حکیم سنائی

(قسط دوم)

(برہان دہلی ۵۳ مارچ ۱۳۳ ـ ۱۴۸)

حکیم سنائی شیخ یوسف ہمدانی کے مرید تھے، شیخ صاحب کبائر اسلام میں سے ہیں۔ مرید ہونے کے بعد سنائی پہلے ایک غزل گو شاعر تھے اب معلم اخلاق ایک مصلح اور عشق و معرفت میں گم ہوگئے۔ اُن کی شاعری میں تاثیر عرفان گہری ہوتی گئی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ سنائی کے مختلف مقامات کے سفر کے حالات بھی دلچسپ ہیں۔ آخر میں عہد سنائی میں شہر غزنی کے مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں۔

۵۵۔ ناصر انعام اللہ خاں (مترجم)

حکیم سنائی

(مسلسل)

(برہان دہلی، ۵۳ مئی ۲۸۵ ـ ۲۹۶)

اس خط میں حکیم سنائی کے دس معاصر شعراء کا تذکرہ اور اُن کی شاعری کی چند مثالیں۔ سنائی سے اُن کے تعلقات۔ اور آخر میں سنائی کا سنِ وفات اور مزار اور نئے مزار کی تعمیر کے بارے میں مفصل حالات بیان کئے گئے ہیں آخر میں کلام سنائی اور ان کی تصنیفات کی فہرست دی ہے۔

۵۶۔ ناصر انعام اللہ خاں (مترجم)

حکیم سنائی

(مسلسل)

(برہان دہلی ۵۳ جون ۶
۳۴۴ ـ ۳۵۸)

حدیقۂ سنائی اور اُن کی دوسری تصانیف کا تعارف۔

۵۷۔ نجمہ مسعود:

صفیہ آپا کے ساتھ

(تہذیب پٹنہ ۵۳ ستمبر ۱۳ ـ ۱۶)

نجمہ مسعود، صفیہ جاں نثار اختر کی شاگرد ہیں انھوں نے اس مضمون میں صفیہ اختر کی اس زندگی کی باتیں بیان کی ہیں جب وہ بھوپال میں پڑھا رہی تھیں مجاز کی بہن، جاں نثار اختر کی بیوی عزم اور حوصلے کی مالک تھیں، بلند انسان تھیں۔ اپنے لکچر اور گفتگو کے ذریعہ اپنی شاگردوں میں انھیں اوصاف کو پیدا کرنے میں کوشاں رہتی تھیں۔

۵۸۔ یوسیس:

امریکہ کی مشہور ناول نگار مسز پرل ایس بک

(ہندستانی ادب حیدرآباد ۵۳ فروری ۸ ـ ۱۹)

پرل ایس بک کے مختصر حالات زندگی پیش کئے ہیں اور اُن کی ادبی تصنیفات پر روشنی ڈالی ہے۔

۵۹۔ یونس احمر۔

دولت وزیر بہرام خاں

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۳۱ ـ ۳۲)

بنگالی زبان و ادب کے عظیم شاعر دولت وزیر بہرام کے حالات اور کلام پر مختصر سا تبصرہ ہے۔

تنقید، ادب، لسانیات

۶۰۔ ابو سعید قریشی:

کلکِ غالب

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۹ ـ ۱۰ ـ ۴۹)

قطب الدین فصیح ابن سائل دہلوی مرحوم نے مقالہ نگار کو غالب کے فارسی کلام کا پہلا مطبوعہ ایڈیشن (مطبع دارالسلام، دہلی ۱۲۶۱ھ) دیا انھوں

نے اس میں سے کلک، مرمزیہ اور عاملہ سے متعلق اشعار لے کر تشریح بھی تبصرہ کیا ہے۔ اس ایڈیشن کے حاشیے پر غالب کے قلم سے ۱۸۶۱ء تک کا فارسی کلام درج ہے۔

۶۱۔ ابو اللیث صدیقی:
آج کا اُردو ادب
(ماہ نو کراچی ۵۳ جون، ۷ — ۱۲)

ابتدا میں ادب العالیہ کی تعریف اور اُردو ادب العالیہ میں میر کی عشقیہ شاعری اور اقبال کا حکیمانہ کلام بھی اسی تحت میں آتا ہے اور سب سے قابل حقیقت آج کے اُردو ادب کی جمہوریت پسندی ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں مختلف دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

۶۲۔ احتشام حسین:
برنارڈ شا
مصنفہ: ظ۔ انصاری
(زبان دہلی ۵۳ مارچ ۱۸۰ — ۱۸۱)

ڈاکٹر عابد حسین اور آل احمد سرور کے پُر مغز مضامین کے علاوہ ابھی تک کسی نے برنارڈ شا کے متعلق اُردو میں کوئی قابل ذکر چیز نہ لکھی اس سلسلہ میں ظ۔ انصاری کی نئی تصنیف برنارڈ شا ایک اہم فرض انجام دیتی ہے۔ اختصار کے باوجود یہ کتاب اُردو زبان میں سب سے اہم مقام حاصل کرے گی۔

۶۳۔ اختر اورینوی:
جبلتیں اور قدریں
(تہذیب پٹنہ ۵۳ جنوری ۹)

۲۔ اس مضمون کی یہ دوسری قسط ہے پہلی اپریل ۱۹۵۲ء میں چھپ چکی ہے۔ پہلی قسط کے ساتھ اس میں دکھایا ہے کہ انسان میں کئی جبلتیں ہیں جو انفرادیت کے باوجود بیشتر مرکب طور پر سامنے آتی ہیں اور اُن کی تسکین لُطف و انبساط پیدا کرتی ہے۔ تمدّن و تہذیب کی ترقی جبلتوں کو مرکب تر اور پیچیدہ بناتی ہے اور ارتفاع جبلت کا عمل شروع ہوجاتا ہے اور یہ ارتفاع جبلتوں کو زیادہ لطیف، بلند اور متوازن بناتا ہے۔ معاش، جنس اور جمال کی جبلتوں میں بھی ارتفاع ہوتا ہے۔

۶۴۔ اختر اورینوی:
جبلتیں اور قدریں
(تہذیب پٹنہ ۵۳، فروری ۱۴ — ۲۱)

۳۔ اس قسط میں فنی قدروں اور فنونِ لطیفہ و ادب کے صحیح و متوازن نظریہ کو بوضاحت بیان کیا ہے۔

۶۵۔ ارشد کاکوی۔ ایم۔ اے:
شکیل بدایونی کی شاعری
(شاعر ۵۳ جنوری، فروری ۲۸ — ۳۲)

شکیل بدایونی کے مجموعہ کلام "رعنائیاں" کو سامنے رکھ کر اور اس سے مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شکیل کے یہاں تغزل ہے۔ ان کے یہاں فنی رکھ رکھاؤ ہی نہیں بلکہ لب و لہجہ میں فنی دلنشینی بھی ہے۔ ان کے جذبات میں خلوص و صداقت اور شاعری میں شادابی و بالیدگی ہے۔ ان کے یہاں روایت محض کی تقلید قطعی نہیں۔ ان کی نظموں میں بھی غزلیت رچی ہے۔

ان کی نظموں میں "چور" "نمائش" اور "تصادم" معرکے کی ہیں۔ ہاں قطعات بیجان ہے ہو سکتا ہے کہ تسنیم سلیم چھتاری کا افسانہ "جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا" شکیل کی نظم "چور" ہی کا حاصل ہو۔

۶۶۔ ادارہ:

کانگرس اور اردو

(تہذیب پٹنہ ۵۳ جنوری ۴—۶)

اردو کے سلسلے میں کانگرس نے متعدد تجویزیں منظور کیں لیکن اُن پر کبھی کار بند نہیں ہوئی۔

۶۷۔ ادارہ:

غالب کا عکس خط

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۱۲ و ۱۳ کے درمیان)

غالب کے خود نوشت فارسی کُلیات کے ایک صفحے اور مطبع دارالسلام، دہلی والے مطبوعہ کُلیات کے ایڈیشن کے حاشیئے کے تین مصرعوں کا عکس پیش کیا ہے۔

۶۸۔ ادارہ:

غالب کی رنگین تصویر

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۲۴ و ۲۵ کے درمیان)

غالب کی ایک رنگین تصویر جس میں غالب مسند پر بیٹھے، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حُقہ پی رہے ہیں۔

۶۹۔ ادارہ:

آل انڈیا کانگریس اور ہندُستانی

(ہندستانی ادب حیدر آباد ۵۳ مارچ ۲—۸)

جنوری ۵۳ء میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس حیدر آباد میں ہوا۔ ملک کے مختلف حصّوں سے شرکت کرنے والوں نے ایک مُشترک زبان میں تقریر کی جس کا نام دوسرے لوگ "ہندی" رکھتے ہیں اور ہم ہندستانی، ثبوت میں وہی تقریریں پیش کی گئی ہیں جو سیدھی سادھی ہندستانی میں ہیں اور جسے سب نے سمجھا اور جو تقریر کہ خالص ہندی میں تھی مشکل ہی سے چند لوگ سمجھ سکے۔

۷۰۔ ادب گلشن آبادی نو:

صحت تلفظ

(ہمایوں لاہور ۵۳ مارچ ۲۲۷—۲۲۹)

دسمبر ۱۹۵۲ء میں صحت تلفظ کے بارے میں کچھ نوٹ نکلے تھے۔ اسی سلسلہ میں ادب گلشن آبادی نے اظہار خیال کیا ہے۔ انشاؔ کے اصول کی اصابت دکھاتے ہوئے وہ چاہتے ہیں کہ تلفظ وغیرہ کے سلسلے میں اصول اور قوانین وضع کر لینے چاہئیں۔

۷۱۔ اسلام حسین:

کلامِ ریاض کے تین پہلو

(آج کل دہلی ۵۳ مارچ ۸—۱۱)

مجموعی طور پر ریاض کی شاعری کا خمیر تین عناصر سے تیار ہوا ہے۔ شراب، شباب اور شوخی۔ مضمون میں انہیں تین پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ ریاض کی شاعری میں ایک نشہ ہے جس کے پڑھنے سے وہی رنگینی و لطافت ہمارے احساسات پر حاوی ہو جاتی ہے جو ان کا مقصدِ تخلیق تھا۔ یہی اُن کی کامیابی کی بہت بڑی مثال ہے۔

۷۲۔ اسلوب احمد انصاری:

مجاز

(تہذیب پٹنہ ۵۳ مارچ ۱۴—۱۷)

مجاز کی شاعری پر کوئی مقررہ لیبل چسپاں کرنا مشکل ہے۔ تکنیک کے معاملہ میں وہ پُرانی روش سے انحراف نہیں کرتے۔ جدید وضع کے تجربوں سے انھوں نے رُوشناس نہیں کرایا۔ ان کی بیشتر نظمیں مواد اور روح کے اعتبار سے انقلابی نہیں محض غنائی ہیں۔ ان کی مقبولیت کا راز ہلکی پُھلکی غنائی رومانی نظموں میں ہے۔ ہم عصری اجتماعی زندگی اور اُس کے مسائل کا شعور و احساس نہ مجاز کے شعری ادراک کا قابل ذکر جزو ہے اور نہ

یہ شعور و احساس فکر و نظر میں تبدیلی ہوا ہے۔ ان کی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ اُن کے تجربات محدود ہونے کے باوجود ذاتی اور اصلی ہیں۔ آگے چل کر مضمون نگار نے ان کی مختلف نظموں اور غزلوں سے اپنے دعوے کے ثبوت میں منتخب اشعار دئے ہیں۔

۷۳۔ اسلوب احمد انصاری:

داغ کی شاعری کے صحت مند عناصر

(نگار لکھنؤ ۵۳ مارچ ۳۴ ـــ ۴۰)

داغ کی جدت پسندی کلیت، کا فقدان اُن کے لہجہ کی نرمی، ان کی جسمانی محبت، ان کی انانیت، جمالیاتی احساس، زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا حوصلہ، روایت سے ہٹ کر ذاتی تجربہ کی بُنیاد پر اپنے خیالات پیش کرنے اور معاملہ بندی کے باوجود ابتذال سے دامن بچائے رکھنے کو مقالہ نگار نے داغ کی شاعری کے صحت مند عناصر سے تعبیر کیا ہے۔

۷۴۔ افتخار اعظمی۔

اسلام کا ادبی تصوّر

(معیار، جیکب آباد - ۵۳ جون ۳۱-۳۳)

ابتدا میں بتایا ہے کہ اسلام صرف مسجد و مُلّا کا دین نہیں بلکہ ایوان حکومت کے لئے نظام فکر رکھتا ہے۔ اور زندگی کی قدریں معیّن کرنے میں بڑا حصّہ لیا ہے۔ قرآن کی مختلف آیتوں کے تراجم پیش کئے ہیں جو ادب کا شاہکار ہیں۔

مختلف مثالوں کے بعد کہا ہے کہ اسلامی ادب کوئی روکھی پھیکی چیز نہیں اس میں عمل کی تڑپ اور فلاح انسانیت کے لئے اضطراب ہے۔

۷۵۔ امین کامل:

کشمیری زبان میں شادی بیاہ کے گیت

(آج کل دہلی ۵۳ جون ۴۲ ـــ ۴۶)

کشمیری زبان کے چند اُن گیتوں کا ترجمہ مع ضروری پس منظر کے پیش کیا ہے جو شادی بیاہ کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں۔

۷۶۔ انتظار حسین:

اس سبھا میں

(ہمایوں لاہور ۵۳، مارچ ۲۶۱-۲۶۲)

رسالہ خیال سے اقتباس ہے۔ اس میں پاکستان کے مشہور شاعر جعفر طاہر کا تعارُف پیش کیا گیا ہے۔ جعفر طاہر اپنے بل بوتے پر آگے بڑھتے اور شہرت پاتے رہے ہیں۔ جھنگ کے رہنے والے ہیں۔ رنگ سیاہ اور اکہرے جسم کے مالک ہیں۔ دل رقیق ہے۔ لب و لہجہ جاندار ہے جو ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے وہ پہلے مسلمان اور پھر شیعہ ہیں۔

۷۷۔ بیدار عابد رضاخاں:

میر حسین تسکین اور اُن کا کلام

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ جنوری ۶۳-۶۹)

مومن خاں کے شاگرد میر حسین تسکین کے دیوان کا ایک قلمی نُسخہ اسٹیٹ لائبریری رامپور میں ہے جو ناقص ہے اس لئےکہ اس میں تمام ردیفیں نہیں۔ یہ مضمون اسی نسخہ پر مشتمل ہے اس میں کوشش کی گئی ہے کہ تسکین کے رنگ کلام پر روشنی پڑ جائے اور اس کا ایک اچھا انتخاب بھی سامنے آجائے۔ مضمون میں تسکین کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۷۸۔ تحسین سروری:

خالقِ باری کے طرزِ ادا کی دکنی تصانیف

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ فروری ۱۴۰-۱۴۹)

شروع میں پروفیسر شیرانی مرحوم کی تحقیق کہ خالق

باری، امیر خسرو کی نہیں بلکہ ضیاء الدین خسرو کی ہے جن کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری ہے۔ لیکن خالق باری سے پہلے بھی دو اسی قسم کی کتابوں کا پتہ چلا ہے ایک کا نام "مثل خالق باری" ہے جس پر ڈاکٹر عبدالحق کا مقالہ رسالہ اُردو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں "واحد باری" نام کا ایک قلمی نسخہ ہے اس کا مصنف اشرف بیجاپوری ہے۔ زور صاحب نے ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب دسویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں کی تصنیف ہے۔ دکن کی اسی قسم کی اور تصانیف میں۔ رازق باری۔ مصنفۂ میر سید محمد والہ، متوفی ۱۱۸۳ھ۔ گنج نامہ، مصنفہ مہلہہ (؟) اشرف اور راجی چند کے بعد کی تصنیف ہے۔ فیض باری، حافظ میر شمس الدین محمد فیض۔ سال تصنیف ۱۲۵۶ھ۔ ان کے وہ ایک اور قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے، یہ بھی خالق باری کے طرز پر ہے، اس میں بعض الفاظ قدیم وضع کے ہیں۔ مثلاً۔ ڈ وغیرہ کی علامتوں کو (::) سے ظاہر کیا ہے۔ اس نسخہ میں الفاظ کے جو معنی بتائے گئے ہیں وہ ٹھیٹھ دکنی ہیں۔

۷۹۔ تمکین کاظمی:

ہندوستان کا ایک گمنام شاعر قلق

(نگار لکھنؤ ۵۳ مئی، ۱۷-۱۲)

شاگرد مومن قلق کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کی چند مثالیں پیش کر کے وضاحت کی ہے کہ قلق پر مومن کے رنگِ تغزل کا گہرا اثر تھا۔

۸۰۔ تمکین کاظمی:

داغ حیدرآباد میں

(تہذیب، پٹنہ ۵۳ ستمبر ۲۵-۳۰)

پہلی مرتبہ داغ ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد آئے، ہاتھوں ہاتھ لئے گئے ۱۳۰۵ھ میں دربار میں گئے۔ قصیدہ پڑھا اصلاح کلام کا سلسلہ شروع ہوا لیکن تنخواہ مقرر نہ ہوئی۔ اس زمانہ میں کنور سعادت علی اور دوسرے امراء کفیل بنے۔ ہر شخص کو داغ نے ہموار کر لیا اور ہمدرد و دوست بنا لیا تھا۔ تاہم دربار سے باقاعدہ توسل ہونے کے سبب ۱۸۸۹ء میں دلی گئے۔ ۱۸۹۰ء میں پھر بلاوے پر حیدرآباد آئے اور استاد مقرر ہوئے اور پھر ہر طرح نہال ہوئے بہت عمدہ زندگی بسر کی۔ داغ اونچے انسان تھے۔ ۱۹۰۵ء میں انتقال کیا۔ مکہ مسجد میں نماز جنازہ ہوئی۔

۸۱۔ تنویر احمد علوی:

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور خطوطِ غالب

(آج کل ۵۳ فروری ۲۲-۲۶)

غالب کی عام زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کے خطوط سے وہ اقتباسات پیش کئے ہیں جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے اور ان کی اس وقت کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

۸۲۔ جعفر علی خاں اثر:

پھر وہی نشاطِ رفتہ

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ مارچ ۲۰۶-۲۱۹)

مارچ ۱۹۵۲ء کے نگار میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے مجموعۂ کلام نشاطِ رفتہ پر صاحبِ مضمون کی ایک تنقید شائع ہوئی تھی نومبر اور دسمبر ۱۹۵۲ء کے معارف میں پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوی نے اثر صاحب کی تنقید پر اعتراضات کئے ہیں۔ مندرجہ بالا عنوان سے اثر صاحب نے پروفیسر صاحب کی تنقید کا جائزہ لیا ہے اور اپنی تنقید کی وضاحت کی ہے۔

۸۳۔ جلال الدین احمد:

غلام عباس

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۱۵-۱۷)

غلام عباس کی حیثیت و شخصیت ایک لحاظ

سے منفرد اور دلچسپ ہے۔ وہ کم لکھتے ہیں، مختصر لکھتے ہیں اور جو لکھتے ہیں، دھیمے انداز میں، اپنی آواز کو اونچا کئے بغیر، وہ شور، ہنگامہ پسند نہیں کرتے وہ بے ریا، بے لاگ مگر پُرخلوص جذباتی کردار نگاری کے ماہر ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے فن سے مدد لیتے ہوئے، اپنے کرداروں کا تعارف کراتے اور معاشرہ پر گہرے طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ الحمرا، جزیرۂ سخنوراں اور آسندی ان کی تصانیف سے ہیں۔ ادھر وہ ایک ناول لکھ رہے ہیں، جس میں وہ عمل کے پہلو پر زور دیں گے۔ بظیر اس کے ناول کامیاب نہیں ہوگا۔ ویسے ہی جیسے ان کے افسانوں میں نہیں ہے۔

۸۴۔ جلیل احمد قدوائی:

امانت

(العلم کراچی ۵۳ جنوری ۳۲۔۱۴)

"انتخاب کلام سخنورانِ بدنام" کی چوتھی قسط میں امانت کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے جو ہمیں امانت کے خصوصیات کے ساتھ ساتھ اچھے اچھے شعر بھی دیتا ہے۔

۸۵۔ جمیل مہدی:

حسرت اور تہذیب عاشقی

(آج کل دہلی ۵۳ جنوری ۵۔۹)

اُردو غزل میں ایک عام جسم کے سستے جذبات سے ہانپنے کی آواز سما گئی تھی۔ حسرت نے اُسے از سرِنو تازہ اور خوش گوار بنادیا۔ اُسے ضبط اور سلیقے کا سبق دیا اس کی خواہشوں میں نظم پیدا کیا۔ خود اپنی شاعری کے ذریعے سے انھوں نے ایک ایسے سرمست اور سرشارِ عشق کی تخلیق کی جو خواہش کے ارتکاب کے بجائے خواہش کے اظہار تک محدود ہے۔

۸۶۔ جوش ملیح آبادی:

مطالعے اور جائزے

(آج کل دہلی ۵۳ مارچ ۲۱)

شیدا کے مجموعۂ مقالات پر تبصرہ۔ شیدا صاحب نے اقبال پر جو کچھ لکھا ہے اس میں جسارت بھی پائی جاتی ہے اور بصیرت بھی۔ شیدا اقبال سے اتنے متاثر و مرعوب نہیں جتنے کہ دوسرے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک مقالہ "جوش اور عورت ہے" اس میں پیش کئے ہوئے خیالات سے تبصرہ نگار بالکل متفق ہے۔ یہ مجموعہ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیدا صاحب نے ایک ایسی انتقادی نظر پائی ہے جو باریک سے باریک رگوں میں بھی ڈوب کر ادیب کی نبضوں کی ہر ضرب کو دیکھ سکتی ہے۔

۸۷۔ حسن عسکری:

غالب کی فارسی اور تنقیص و ارادت

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۴۴۔۳۸)

حالی کے زمانے میں ارادت مندی عام تھی جو اس دور کے ہر ادیب میں ملتی ہے۔ چنانچہ ارادت ہی کی بناء پر حالی نے مُلّا عبدالصمد والے قصّے کو پیش کیا حالانکہ غالب اس سے انکار کر چکے تھے۔ بہر حال غالب میں کچھ کمیاں ضرور تھیں جن کا احساس اور ذکر غالب کی تحریروں میں ملتا ہے۔ تاہم ارادت کے ساتھ ساتھ وہ تنقیص کا بھی کچھ زیادہ شکار اور زخمی ہے۔ اس مضمون میں قاضی عبدالودود کے مضمون متعلقہ غالب کی تحقیق پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۸۸۔ خلیل الرحمن اعظمی:

چند لمحے داغ کے ساتھ

(نگار لکھنؤ ۵۳ مارچ ۲۲۔۲۶)

داغ کی غزلوں سے لطف اٹھانے کے لئے ذہنی بلوغ کی ضرورت ہے۔ داغ نے اپنے مزاج کو پالیا

معاملہ بھی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ اُن کا کارنامہ معاملہ بندی نہیں بلکہ شاعری کا نشاطیہ لب و لہجہ ہے۔ داغ اور داغ اسکول نے اُردو غزل کی راہ سے وہ سب روڑے ہٹا دیئے جن کی وجہ سے اس میں ایک رکاؤ اور بند بندسی کیفیت تھی۔

۸۹۔ خواجہ احمد فاروقی:

مومن دہلوی

(تہذیب پٹنہ ۵۳ مارچ ۹ — ۱۳)

خطبۂ صدارت جو مومن کی صد سالہ یادگار کے موقع پر ادارۂ ادبیات رام پور کے جلسہ میں ۴ر جنوری ۵۳ء کو پڑھا گیا۔ ابتدا میں ایسی یادگاریں منانے کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا گیا ہے کہ اس سے اُردو زبان و ادب کا تاریخی پس منظر عوام اور موجودہ نسل پر روشن ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو سامنے رکھ کر مومن کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے، اُردو ادب کا نئے ہندوستان کے بنانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ مومن کی شاعری ماضی اور حال کے درمیان ایک پل کی سی ہے۔ مومن کی ایک اور خصوصیت ان کا تغزل ہے۔ مومن کی فارسی غزلوں میں بھی تیکھا پن ہے۔

۹۰۔ د۔ د گورکھپوری:

نواب جھانسوی کی غزل گوئی پر اجمالی نظر

(معیار۔ جیکب آباد ۵۳ مئی۔)

جھانسی میں شاعری کی ابتدا ۱۸۲۰ء کے بعد سے ہوئی۔

حامد شاہجہانپوری اور معین احسن جذبی اور نواب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ نواب کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

۹۱۔ دیا نرائن نگم:

چند خطوط

(تہذیب پٹنہ ۵۳ جنوری ۳۲ — ۳۸)

منشی دیا نرائن کے چھ خط ہیں۔ سب کے سب سہیل عظیم آبادی کے نام ہیں اور زمانۂ تحریر ۵ر نومبر ۱۹۳۸ء سے لے کر ۳۱ر جولائی ۱۹۴۰ء تک ہے۔ ان خطوط میں اُردو ہندی، لنگوا فرینکا، اور "زمانہ" رسالہ سے متعلق گفتگو ملتی ہے۔

۹۲۔ رشید احمد صدیقی:

علی گڈھ کے مخطوطات

(آج کل دہلی ۵۳ جون ۲۱ — ۲۲)

مسلم یونیورسٹی کے کتب خانے میں مخطوطات کی تعداد کم و بیش چھ ہزار ہے۔ جس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مختار الدین آرزو نے شوق و محنت سے ان نوادر کی ایک طرح کی "خود وضاحتی" فہرست مرتب کر دی ہے۔ نسخوں کو موضوع اور نوعیت کے پیشِ نظر اس فہرست میں الگ الگ رکھا ہے۔

۹۳۔ رشید احمد علوی:

سیماب — ایک نظریہ ساز

(شاعر بمبئی ۵۳ جنوری فروری ۱۴ — ۱۷)

سیماب کی حیثیت بہ طور ایک نظریہ ساز کے تاریخی ہے اور نظم و غزل ہی کی نہیں بلکہ نئے اور پرانے ادب کی چپقلش کے دور میں میانہ روی کے کئی جدید نظریات سیماب کے خیالات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

اُن کا اپنا ایک خاص رنگ تغزل ہے اور نظم نگاری کا ایک خاص اسلوب۔ یہ انہیں کے قلم کا تصرف ہے کہ دوسرے دبستانوں سے بہت کچھ لینے کے باوجود "آگرہ اسکول" ایک علیحدہ اور منفرد دبستان ہے۔

۹۴۔ رشید حسن خاں:

تنقید جدید کا ایک پہلو

(آج کل دہلی ۵۳ جنوری ۵۵ ۳۵-۴۰)

تنقید جدید کا ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جدید نقاد موضوع کے مقابلہ میں زبان و بیان کو جائز اہمیت نہیں دیتے۔ چنانچہ نئے ادیبوں کے ہاں زبان و بیان کی بے حد خامیاں پائی جاتی ہیں۔ موضوع کے نئے ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ زبان، بندش، انتخابِ الفاظ، اور قافیے کے سجیلے پن کو نظر انداز کر دیا جائے "ترقی پسندوں" کے ہاں اس قسم کی خامیاں ملتی ہیں اور افسوس یہ ہے کہ وہ انھیں دور کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

۹۵۔ سخاوت مرزا:

اشرف خاں دہلوی

(آج کل دہلی ۳ ۵ جنوری ۴۱-۴۴)

اشرف خاں نام، خاں تخلص، ولد محمد علی خاں وزیر دہلی مصحفی لکھنوی کے خاص تلامذہ میں سے تھے اور بڑے باکمال شاعر گذرے ہیں۔ لالہ سری رام کے مقابلہ میں مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کے حالات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں۔ علم درسی سے فارغ ہو کر خاں مرزا سلیمان شکوہ کے بارس کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھائے۔ فنون سپہ گری، نیزہ باری اور گھوڑے کی سواری میں طاق تھے۔ اس شہسوار میدان شجاعت و شعر و سخن کو اپنا گھوڑا بھی بڑا پیارا تھا۔ منتظر اور گرم دو شاگرد تھے جنھوں نے بمقابلۂ انتا اُستاد کی اُستادی کے مورچے باندھے۔ خاں کا کلام صاف و شستہ، محاورہ روزمرّہ، نازک خیال اور لطیف تشبیہات سے مالامال ہے۔

اُردو میں ان کے دو دیوان ہیں۔ پچھلے دیوان کا ناقص الاول نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں ہے۔ دوسرا دیوان علی گڑھ میں ہے۔

۹۶۔ سخاوت مرزا:

ضعیفی دکنی کی ایک اور خاص تصنیف

نصیحت مدن یا نقل نامہ

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ مارچ ۱۹۲-۲۰۶)

شیخ داود نام ضعیفی تخلص۔ وطن کی تحقیق نہ ہو سکی۔ یہ ایک عالم فاضل اور عارف کامل شاعر تھے۔ ان کی دو تصانیف ہدایت نامہ بندہ اور قصۂ عشق صادق کے علاوہ ایک تیسری کتاب نصیحت مدن یا نقل نامہ کا پتہ چلا ہے۔ اور اس مضمون میں اسی کتاب کے موضوع زبان وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔

۹۷۔ سُہیل بخاری:

اُردو زبان اور اُس میں نثر نگاری کی ابتدا

(ہمایوں لاہور ۵۳ مارچ ۲۱۷-۲۲۲)

اُردو کی جائے پیدائش سے متعلق مختلف نظریات سے بحث کی اور بتایا ہے کہ محمود غزنوی کے زمانہ میں لاہور میں اُردو پیدا ہوئی اور اس کا تعلق شورسینی پراکرت سے ہے۔ اُردو نثر کی پہلی کتاب بندہ نواز گیسو دراز کی معراج العاشقین ہے۔ اُردو کی ترقی کا اوّلین گہوارہ شمالی ہند ہے۔ مزید تحقیق سے گمشدہ کڑیاں مل سکتی ہیں دکن نے اُردو کے نشوونما اور ترقی میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔

۹۸۔ شاہ مقبول احمد:

بہاری ماحول اور اُردو ادب

(آج کل ۵۳ جون ۸ ۴۴-۳ ۵)

اُردو کا تعلق یو۔پی، دکن اور بہار وغیرہ سے زیادہ رہا ہے۔ تاہم اُردو ادب میں زیادہ تر یو۔پی ہی کی لسانی خصوصیات اور زندگی ملتی ہے۔ دکن اور بہار

وغیرہ کے ادیبوں اور شاعروں نے بالعموم تقلیدی ادب ہی پیش کیا ہے۔ جب سے لسانی مرکزیت ختم ہو رہی ہے مقامی زندگی اور زبان کے اثرات بھی علاقائی ادب میں نمودار ہو رہے ہیں۔ بہار کے پہلے کے لکھنے والوں میں شاد عظیم آبادی اور رشیدۃ النساء کے ہاں بہاری ماحول زیادہ ملتا ہے۔ اور ادھر اختر اورینوی، شکیلہ اختر، بانپوری اور سہیل عظیم آبادی ہی وہ دو چار ادیب ہیں جن کی نگارشات میں بہار سانس لیتا معلوم ہوتا ہے۔

۹۹۔ شفیع الرحمان محمد:

ہندی زبان اور مسلمانوں کی شرکت

(آج کل دہلی ۵۳ء مئی، ۴۵—۵۳)

ہندستان کی مختلف زبانوں کی ابتدائی تاریخ، زبانوں کے نقشہ داری اثرات، ہندی زبان کی ابتدا، عہد بعہد کی ترقی، بعض شاعروں کے تذکرے اور پھر مسلمانوں کا ہندی شاعری میں جو حصہ ہے اُن کا ذکر اور مثالیں پیش کی ہیں۔

۱۰۰۔ طالب جے پوری:

میر و فراق

(تہذیب پٹنہ ۵۳ء ستمبر ۱۷—۲۴، ۴۰)

۲۔ کائنات کی عظمت و وسعت، انسان سے متعلق بلند خیالات، جذبۂ عشق کی صداقت، غم کا انتہائی وجد آفریں احساس، لہجہ اور آواز کی نرمی کا گُر وغیرہ میر اور فراق دونوں کے ہاں مشترکہ طور پر ملتے ہیں لیکن میر کے ہاں دُکھ، درد، غنیت، انفرادیت ہے، میر کا عشق ناخوش گوار اور خیر و برکت سے محروم ہے۔ اور فراق کے ہاں مسرت، حقیقت، کائناتی رنگ، خوش گواری، خیر و برکت بھی کچھ ہے۔ اور یوں میر کے بعد فراق اُردو کا کامیاب ترین شاعر ہے۔

۱۰۱۔ طاھاکا دانیال:

ابوالکلام اور بذلہ سنجی

(آج کل دہلی ۵۳ء مئی — ۵)

مولانا کے خطوط میں جو طنز اور مزاح کی چاشنی اور ظرافت پائی جاتی ہے مختلف اقتباسات پیش کرکے اُن کی وضاحت و تشریح کی گئی ہے۔

۱۰۲۔ ظہیر الدین احمد جامعی (ڈاکٹر):

اقبال کی کہانی پر تبصرے سے متاثر ہو کر

(برہان دہلی ۵۲ء مئی، ۳۱۵—۳۲۰)

بُرہان کی حالیہ اشاعت میں اقبال کی کہانی میری نہایت حقیر کوشش سے متعلق ہے بعض باتوں سے آپ اگر مطمئن نہیں ہیں تو میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو مطمئن کرسکوں، پھر آگے چل کر نام نہاد صوفی اور مُلّا کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے اور ان کے سیاہ کارناموں کی وجہ سے ملت کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی مثالیں ترکی مصر اور دوسرے ممالک میں کافی پائی جاتی ہیں۔

۱۰۳۔ عبادت بریلوی، وقار عظیم، ابن انشا

غزل کی ارتقائی صلاحیتیں

(ماہ نو کراچی ۵۳ء فروری، ۴—۴۳، ۴۹)

غزل کی ارتقائی صلاحیتیں دراصل ایک مذاکرہ ہے جس میں ان تینوں ادیبوں نے حصہ لیا ہے۔ غزل کے ماضی اور حال سے بحث کرتے ہوئے تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ غزل شروع سے لیکر ابتک زندگی، اس کی بدلتی ہوئی صورتوں اور قدروں سے ہم آہنگ رہی ہے اور یوں ہی ترقی کرتی رہیگی۔

۱۰۴۔ عبدالسلام ندوی:

شاعری بطور پیشے کے

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ء مئی ۳۴۱—۳۴۴)

عرب میں شاعری اعزاز و شہرت کا بہت بڑا ذریعہ

سمجھی جاتی تھی لیکن جب کوئی غرض شامل ہو۔ عربی شاعری میں انحطاط اُسی وقت شروع ہوا جب شاعروں نے صلہ کی لالچ میں قصائد لکھنے شروع کئے۔ متعدد مثالوں کے بعد فارسی شاعروں کی مثالوں سے یہ وضاحت کی گئی ہے کہ فارسی شاعری چونکہ عربی شاعری کے دَورِ انحطاط کی پیداوار ہے اس لئے یہ خوشامدانہ قصائد سے شروع ہوئی۔ اُردو شعراء کو البتّہ فارسی کے اکثر شاعروں کی طرح زحمتیں نہیں برداشت کرنی پڑیں بلکہ اکثر شعراء نے بڑی خودداری اور غیرت کا ثبوت دیا ہے۔ آخر دَور میں جبکہ بادشاہ نہ رہے۔ اور نہ نواب شعراء کی حالت ابتر ہوگئی تھی لیکن اب پھر مُشاعروں وغیرہ میں بُلائے جاتے ہیں اور بعض نہایت ذلیل حرکتیں کرتے ہیں کہ کرایہ آمد و رفت وصول کرکے بھی شرکت نہیں کرتے۔

۱۰۵۔ عبد السّلام ندوی:

اُردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا
انقلاب کی عام تاریخ

(معارف اعظم گڈھ ۴۳ء جون ۲۴۳)

ابتدا میں ایک عام اصول پیش کیا گیا ہے کہ غالب قومیں مغلوب قوموں کے تہذیب و تمدّن زبان و ادب پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اگر مغلوب قوم جہاں باقی و یہاں آرائی کا سینکڑوں سال کا تجربہ رکھتی ہے تو نہایت خاموشی غالب قوم کی شاعری و ادب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جیسے کہ عربی سادہ شاعری پر عجم کی رنگین شاعری نے تسلّط جمالیا پھر مختلف مثالوں کے بعد لکھا ہے کہ اُردو شاعری فارسی شاعری کے دَورِ انحطاط میں شروع ہوئی اوّل اوّل اُردو کا اثر۔ پھر فارسی شاعری کے نمونوں کو

سامنے رکھ کر اس میں تراش و خراش اور فارسی خیالات و مضامین بھی اختیار کئے گئے۔

۱۰۶۔ غلام رسول مہر:

جنگ آزادی کی کہانی
غالب کے مکاتیب میں

(ماہ نو کراچی ۵۳ء فروری ۳–۶)

۱۸۵۷ء کے اہم تاریخی واقعہ کا نقشہ غالب کے مکاتیب سے جستہ جستہ اقتباسات لے کر تیار کیا ہے ان اقتباسات کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار مفید تبصرے بھی پیش کرتا چلتا ہے۔

۱۰۷۔ غلام مصطفٰے خاں ڈاکٹر:

غنچہ شاہی

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ء فروری ۱۰۲–۱۲۴)

اس عجیب و غریب تخلص رکھنے والے شاعر کا حال کسی تذکرے اور فہرست میں نہیں پایا جاتا لیکن اُس کے کلام میں بعض الفاظ مثلاً "شاہی" یا "جیو" کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد آباد گجرات سے اس کا تعلّق رہا ہے۔ اس کے کلام کے چند اوراق راشد برہان پوری سے دستیاب ہوئے ہیں۔ کلام میں کافی فنّی خامیاں ہیں۔ اور عروض میں عوام کے تلفّظ کا تابع ہے۔ پیشِ نظر نسخہ بہت بدخط اور غلط ہے لیکن چونکہ کلام نایاب ہے اس لئے قابلِ اشاعت ہے۔

۱۰۸۔ فیض الرحمٰن اعظمی:

اُردو ادب میں جدید ترین رُجحانات اور اُن کا تجزیہ

(آج کل دہلی ۵۳ء اپریل ۲۰–۲۴)

جدید ترین رُجحانات جو آج اُردو ادب میں آگے بڑھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بہت صحت مند ہیں۔ یہ بہت کچھ غلط ترقی پسندی کے ردّ عمل کے طور

ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ وہ رجحانات ہیں جو آزادی کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ ماضی کے ادب اور زندگی سے اب رشتہ توڑنے نہیں بلکہ جوڑنے کی کوشش جاری ہے۔ افسانے کم اور ناول زیادہ لکھے جا رہے ہیں غزل بھی مقبول ہو رہی ہے۔ طویل نظمیں اور نئے اسلوب کی آزاد نظمیں پیش کی جا رہی ہیں تنقید بھی میکانکی اصولوں کی شکار نہیں رہی ہے۔

۱۰۹۔ فصیح الدین بلخی:

اردو کے قواعد اور لغات کی تدوین

(تہذیب پٹنہ ۵۳، اپریل)

اردو کی سب سے پہلی گرامر کے مصنف۔ جو شواکٹلر (جرمن) اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے لیکر ڈاکٹر عبدالحق کی گرامر تک (۱۹۱۴ء) کے تمام غیر ملکی اور اکثر ہندوستانی مصنفین و مرتبین گرامر و لغات اور ان کی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

۱۱۰۔ فصیح الدین بلخی:

صوبۂ بہار میں غالب کی مقبولیت

(نگار لکھنؤ۔ ۵۳ مئی ۴۰-۴۵)

ان ۹ مشاہیر شعرائے بہار کا تذکرہ، حالات اور ن کے اشعار کے نمونے جو غالب کے اتباع اور ر شاگردی کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔

۱۱۱۔ کلب علی خاں فائق رامپوری۔

یادِ رفتگاں۔ رامپور کا ادبی مرکز

(نگار لکھنؤ ۵۳ مارچ ۷-۱۶)

دہلی اور لکھنؤ کے بعد رام پور علم و ادب کا ایک ست بڑا مرکز رہا ہے جسے دہلی و لکھنؤ اسکولوں کا سنگم نا چاہیئے۔ مضمون میں ریاست رام پور کی مختصر تاریخ ے ساتھ ساتھ مقامی شعراء اور لکھنؤ اور دہلی سے رامپور رد ہونے والے شعراء کا تفصیلی ذکر ہے، مومن اور غالب بھی رام پور آئے تھے۔ نوواردین میں داغ، تسلیم لکھنوی، اسیر، امیر، جلال، بحر، قلق وغیرہ ممتاز شعراء تھے۔ مضمون میں اس بحث کا بھی ذکر ہے کہ رامپوری شعراء پر لکھنؤ اسکول حاوی تھا یا دہلی اسکول، اس کے علاوہ اس میں دوسری ضمنی بحثوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔

۱۱۲۔ کلیم سہسرامی:

تاریخ بہار کا ایک گمشدہ ورق

(شاعر بمبئی ۵۳ جنوری فروری ۲۷-۲۹)

اردو تذکرہ نگاروں کی غلط بیانیوں اور پروفیسر معین الدین دردائی کے مقالہ "بہار اور اردو شاعری" کی مبینہ خامیوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سہسرام کا سب سے پہلا شاعر حسن علی خاں راحت نہیں جیسا کہ اردو تذکرہ نگار کہتے ہیں بلکہ غلام مرتضیٰ جنون تھے۔ مضمون نگار نے موخرالذکر کو سہسرام کا سب سے پہلا شاعر ماننے کے اسباب بتائے ہیں اور راحت و جنون کے مختصر حالات زندگی پیش کئے ہیں۔

۱۱۳۔ محبوب اللہ:

ن۔م۔ راشد کی شاعری

(شاعر بمبئی ۵۳ جنوری، فروری ۳۳-۳۶)

ن۔م۔ راشد کی نظمیں غیر مقفی ہوتی ہیں اس کے باوجود اس کے اسلوب اور بیانیہ قوت میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔

اس کی نظموں میں ایک غیر معمولی جاذبیت و دلکشی ہوتی ہے۔ اس کی تمام شاعری جنسی شاعری ہے اس کا محور عورت اور اس کا جمالیاتی پہلو ہے۔ اس کی پوری شاعری پر فرائیڈ کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی شاعری اس اعتبار سے بیحد اہم ہے کہ وہ ایک دور کو دوسرے دور میں مکمل طور سے داخل کرتی ہے۔

۱۱۴۔ محمد جمیل:

ہزارہ کے ہندکو گیت

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۲۷ – ۳۰)

"ہندکو" زبان پنجابی اور اُردو کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ اس لئے قدرتی طور پر پنجابی سے اس کی مشابہت ہے۔ صرف بول چال کے انداز میں نمایاں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ زبان صوبہ سرحد (پاکستان) کے ضلع پشاور کے نواح اور تمام ہزارہ میں مروّج ہے۔ اسی کے لوک گیتوں کے اقتباسات ان کے ترجمے اور ان گیتوں پر تبصرہ درج کیا ہے۔

۱۱۵۔ محمد حسن:

مرزا رُسوا کی شخصیت

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۴۷ – ۵۲)

مرزا رُسوا کی زندگی اور ادب کی طرف اُردو کے ادیبوں اور نقّادوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ رُسوا نے یتیمی اور عُسرت میں زندگی کے دن گذارے۔ ہیئت، فلسفہ، موسیقی، ادب اور دوسرے فنون سے انھیں گہری دلچسپی تھی اور ان میں مہارت رکھتے تھے۔ جس چیز کی دُھن سوار ہوتی اُسے پورا کرکے چھوڑتے۔ غضب کے بذلہ سنج اور خوددار آدمی تھے۔ رُسوا اُمراؤ جان کی وجہ سے اتفاقیہ اُن کا تخلّص ہوا اور اسی سے مشہور ہوئے ورنہ ان کا تخلّص مرزا تھا۔

رُسوا فرضی تخلّص۔ اُن کے ناول اُن کی زندگی کے بھی عکّاس ہیں۔

مضمون نگار نے کوشش کے بعد مرزا کی شخصیت پر معلومات سید افتخار حسین، سید مسعود حسین ادیب، سید یوسف حسین موسوی اور پُرانے رسالوں سے حاصل کئے ہیں۔

۱۱۶۔ محمد عبید اللہ:

مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی مختصر تاریخ

(برہان دہلی ۵۳ فروری ۱۰۷ – ۱۱۲)

سعید احمد پرنسپل مدرسۂ عالیہ کلکتہ نے حکومت بنگال کی فرمائش پر مدرسہ کی مختصر تاریخ انگریزی میں لکھی تھی یہ مضمون اسی کا ترجمہ ہے۔

۱۱۷۔ محمد عرفان:

پریم چند بہ حیثیت ناول نگار

(آج کل دہلی ۵۳، اپریل ۵ – ۱۰)

پریم چند ہندوستان کے بین الاقوامی شہرت کے مالک ادیب ہیں۔ یوں تو یہ افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن انھوں نے جاندار ناول بھی لکھے ہیں۔ اُن کے ناولوں کی تعداد تیرہ ۱۳ ہے۔ ان سب پر اس مقالہ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ پریم چند نے اُردو میں نفسیات نگاری کی ابتدا کی ہے۔ اصلاح معاشرت اُن کا مرکزی خیال ہے، جو ہر ناول میں موجود ہے کردار نگاری پچھلے کچھ ناولوں میں عمدہ ہے۔ حقیقت نگاری کی سعی میں بہت کامیاب ہیں۔ زبان اور ٹکنیک وغیرہ بھی بعد کے ناولوں میں خوب ہیں۔ اُردو کے ناول نگاروں میں بڑے اونچے درجے کے مالک ہیں۔

۱۱۸۔ محمد علی اثر:

برسات کے گیت

(آج کل دہلی ۵۳ مارچ ۲۲ – ۲۸)

مضمون میں مختلف اُستادوں کی کچھ نئی اور پُرانی ملاریں پیش کی گئی ہیں ان میں چند کو چھوڑ کر باقی سب ملاریں اہلِ رامپور کی ہیں ان ملاروں میں آنے والے بھاشا کے مُشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں اور ملار لکھنے والوں کے نام بھی علیٰحدہ علیٰحدہ درج ہیں۔ مضمون میں بارہ ماسہ مسکیں اور احمد علی شوق قدوائی

کی اس موضوع پر بھی چھوٹی مثنوی کے کچھ اشعار بھی پیش کئے ہیں۔

۱۱۹۔ محمد علی خاں اثر:

گرم رامپوری اور اُن کا کلام

(معارف، اعظم گڑھ ۵۳، اپریل ۲۸۳۔۲۹۹)

گرم رام پوری کے حالات تذکروں میں بہت مختصر اور اُن کے اشعار کی تعداد بھی چند ہی اب تک معلوم تھی لیکن اُن کے پرپوتے تُراب علی خاں رامپوری کے ذریعہ اُن کے حالات اور اُن کا کلام جس میں ۳۰۔۴۰ ہزار اشعار ہیں۔ غزلیں۔ مثنویاں۔ قصائد۔ رُباعیاں وغیرہ سبھی کچھ ہیں۔ زبان صاف اور سادہ ہے۔ طبیعت میں ظرافت، اور اظہار خیالات میں بیباکی ہے۔ تخیّل کی بلندی اور نُدرت استعارات بھی جابجا اُن کے کلام کی زینت ہیں۔ کلام کا زیادہ حصّہ معاشی اور زندگی کے تجرباتی مسائل پر بھی حاوی ہے اور تاریخی حالات کا آئینہ دار۔

۱۲۰۔ محوی صدّیقی اور اختر عزیز:

یوم سیمابؒ (بھوپال) کے دوٗ خُطبے

(شاعر بمبئی ۵۳ جنوری فروری ۳۲۔۴۳)

محوی صدّیقی لکھنوی اور اختر عزیز بی اے کے صدارتی خُطبے جو انہوں نے یوم سیمابؒ کے موقع پر پڑھے، ان میں سیمابؒ کی بینہ شاعرانہ صلاحیتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۲۱۔ مختار الدّین احمد آرزو:

غالب سے ایک ملاقات ۱۲۸۰ھ میں

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۷۔۸، ۱۲)

عزیز الدّین عزیز لکھنوی کشمیر کے رہنے والے تھے، چنانچہ لکھنؤ سے، جہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت کرتے رہے، کشمیر کے کئی سفر کئے۔ انھیں میں سے ایک سفر میں غالب سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا حوالہ تو تین، چار جگہوں پر مل جاتا ہے لیکن ان کا ماخذ دیا ہوا نہیں ملتا۔ مقالہ نگار نے اس ملاقات پر ضروری تبصرے کئے اور ماخذ رسالہ ادیب (نوبت رائے نظر کا رسالہ) دکھایا ہے۔

۱۲۲۔ مختار الدّین آرزو:

میرزا غالب سے ایک ملاقات

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۱۲۔۱۵)

'سیر دہلی' شیخ محمّد ریاض الدّین امجد کا مختصر سا سفرنامہ ہے جس کا دوسرا تاریخی نام "سرور ریاض ہے" (۱۲۷۷ھ) یہ ۴۶ صفحوں کا ہے۔ اپنے مختصر قیام دہلی میں یہ مختلف بُزرگوں سے ملے تھے جن میں غالب بھی تھے۔ ان سے دو ملاقاتیں ہوئیں۔ اس مضمون میں ان دو ملاقاتوں کا اقتباس درج ہے۔ اب تک جن لوگوں سے مرزا کی ملاقات کا حال معلوم ہوا ہے۔ اس میں یہ ملاقات اور اس کے اندراجات سب سے قدیم ہیں۔ اس لئے بہت اہم ہیں۔

۱۲۳۔ مرزا احسان احمد:

کلام عارف

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ جنوری ۴۴۔۴۷)

ایک غیر معروف شاعر عثمان عبّاسی عارف کے کلام کا نمونہ پیش کرکے ان کی بینہ شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈال کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شاعرانہ استعداد و صلاحیت سے اردو تغزّل کی بہت کچھ آئندہ توقعات وابستہ ہیں۔

۱۲۴۔ م۔ ف:

سوالات عبدالکریم

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۵۔۱۱)

"قاطع بُرہان" والے معرکے کی اہمیت غالب

کی زندگی میں بہت ہے۔ اس کے جواب میں منجملہ اور کتابوں کے منشی سید سعادت علی کی تصنیف "طرق قاطع بُرہان" بھی ہے۔ اس کے جواب میں " دافع ہذیان"۔ " لطائف غیبی" اور " سوالات عبدالکریم" لکھی گئیں۔ اس مضمون میں سوالات عبدالکریم کا تعارف پیش کیا ہے اور دکھایا ہے کہ سوالات پوری نہیں تو کافی حد تک خود مرزا کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ مضمون غالباً مالک رام صاحب کا لکھا ہوا ہے۔

۱۲۵۔ م۔ ر:

سوالات عبدالکریم کے دو صفحے

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۳۲)

م۔ ر نے آج کل کی فروری ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں سوالات عبدالکریم پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس صفحہ پر اس کتاب کے دو صفحوں کا عکس پیش کیا گیا ہے۔

۱۲۶۔ ناظر عالم:

غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۱۱-۱۲)

ناظر عالم، حیدرآباد، دکن کی بھیجی ہوئی غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل صفحہ پر چھپی ہے یہ غزل مولوی عبدالرزاق صاحب راشد سے حاصل کی۔ جنھیں یہ غالب کے شاگرد داد خاں سیاح کے ایک رشتہ دار سے ملی تھی۔ ناظر عالم صاحب کی طرح مدیر ماہ نو اس غزل سے متعلق جاننا چاہتے ہیں کہ آیا یہ غالب کی ہے یا نہیں؟

۱۲۷۔ نجات اللہ صدیقی:

صالح اور غیر صالح ادب
ایک تقابلی مقابلہ

(معیار جلیک آباد ۵۳ مئی ۱۳-۲۳)

ادب، ادیب۔ ادب کا کیا مقصد ہے، ادیب کے کیا فرائض ہیں اور پھر مختلف ادبی تحریکوں، ترقی پسند کمیونسٹ ادب۔ ترقی پسند سوشلسٹ ادب، ہندو قوم پرست ادب۔ مسلم قوم پرستی کے جذبات رکھنے والا ادب وغیرہ مختلف عنوان قائم کرکے پھر ان پر مختصر بحث کرکے، اپنے نظریہ خاص کی وضاحت کی ہے کہ صالح ادب کیا ہے،

۱۲۸۔ نصیر الدین ہاشمی:

حیدرآباد کی قدیم ادبی محفلیں

(آج کل دہلی ۵۳ جنوری ۱۰-۱۳)

حیدرآباد شروع ہی سے علم و فن کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ جس کا مختصر تذکرہ ادوار کے تناسب سے اس مقالہ میں ملتا ہے۔ قطب شاہی دور کے بادشاہ اور امیروں کے بعد عرصہ تک ادبی محفل خاموش رہی۔ ارسطو جاہ شمس الامراء اور چندو لال وغیرہم کی قدردانیوں کے سبب حیدرآباد میں ایک بار پھر چہل پہل شروع ہوئی۔ ان کے علاوہ دوسرے امراء نے بھی علم و ادب کی سرپرستی کی۔ امراء کی کوٹھیوں اور مزاروں پر مشاعرے ہوا کرتے رہے ہیں، مہاراجہ کشن پرشاد کے ہاں کے مشاعرے خاصے مشہور اور اہم ہیں۔ مختلف انجمنوں مثلاً اقبال کلب، انجمن معارف، انجمن ثمرۃ الادب اور عثمانیہ ریڈنگ وغیرہ نے حیدرآباد کی علمی و ادبی اور ثقافتی زندگی میں بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔

۱۲۹۔ نظیر صدیقی:

مومن کا تغزل

(نگار لکھنؤ ۵۳ جون ۴۳-۴۸)

۱۔ مومن کے تغزل کے بارے میں تذکرہ نگاروں سے لے کر اس دور کے نقادوں تک کے درمیان دو رائیں نہیں ہیں۔ لیکن ان رایوں میں عقیدت مندانہ مبالغہ آرائی اور طرفداری پائی جاتی ہے۔ تاہم ان کو درگزر کرکے بھی کہا جا سکتا ہے کہ مومن اُردو کے

بڑے غزل گو شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ مومن کے مدحت طراز نقادوں سے مضمون کی اس قسط میں اختلاف کیا اور اس کی وجہیں بتائی ہیں۔ اور یہ قسط مومن کی خیالی اور معنی آفرینی کے ابتدائی ذکر پر ختم ہوجاتی ہے۔

۱۳۰۔ نعمان احمد صدیقی:

فراق کی عشقیہ شاعری

(تہذیب، پٹنہ ۵۳ فروری ۹-۱۳)

فراق کا غم جاناں اُردو کے غزل گوئی کے عشقیہ شعور میں ایک اضافہ ہے۔ ایک ایسا اضافہ جس میں اُردو ادب کے عشقیہ شعور کے روایاتی اور تاریخی ارتقاء کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔ ہمیں میر، غالب، مصحفی اور حسرت کے دل کی دھڑکنوں کی پرچھائیاں فراق کے غم جاناں میں مل جائیں گی۔ مگر بحیثیت مجموعی فراق ان کے علاوہ عشقیہ شاعری میں اقبال سے بھی اونچے ہیں۔

۱۳۱۔ نسیم صدیقی:

جیلانی کا افسانہ عظیم کیوں ہوا؟

(چراغ راہ کراچی ۵۳ مارچ ۲۶-۳۱)

جیلانی صاحب نے ایک کہانی بعلم بن بعور کے نام سے لکھی، چراغ راہ میں اسے عظیم کہانی کہا گیا۔ لوگوں نے اعتراض کیا۔ اسی اعتراض کا جواب اس مضمون میں دیا گیا ہے۔

۱۳۲۔ نعیم صدیقی:

ہمیں کیسا ادب مطلوب ہے

(چراغ راہ کراچی ۵۳ جون ۲۹)

ادب کی تعریف اور تقسیم کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسلامی ادب ایک مقصدی ادب ہے جسے تعمیری ادب بھی کہا جا سکتا ہے اور صرف ایسا ہی ادب زندگی کو آگے بڑھانے اور منزل کی طرف لے جانے میں معاون ہوسکتا ہے۔

۱۳۳۔ وقار عظیم:

اقبال کی شاعری کا ایک کردار

(ماہ نو کراچی ۵۳ جون ۲-۳)

اقبال نے مُلّا کے کردار کو اپنے اشعار اور نظموں میں کس طرح پیش کیا ہے؟ اُسے بہت سے اشعار پیش کرکے وضاحت کی ہے۔

۱۳۴۔ ہارون خاں شروانی:

حسرت موہانی کے سیاسی رُجحانات

(آج کل دہلی ۵۳ جون ۵-۱۰)

۱۔ حسرت نے ۱۹۰۳ء میں بی اے کیا۔ اگرچہ علی گڑھ کی پیداوار تھے لیکن رائج الوقت علی گڑھ پالیسی کے سخت مخالف تھے۔ حُرّیت پسند واقع ہوئے تھے۔ کانگریس کے جلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ بائیں بازو کی پالیسی ان کی ہمیشہ رہی۔ ان کا رسالہ اردوئے معلّٰی ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی بھی تھا۔ بار بار جیل گئے۔ مگر رسالہ کی پالیسی لوگوں کے اصرار کے باوجود نہیں بدلی۔ حسرت تلک کے حامیوں میں تھے۔ اپنے جذبات و خیالات کو حسرت ہمیشہ اپنی غزلوں میں پیش کرتے رہے۔ (باقی)

۱۳۵۔ یوسف حسین:

غالب کے یہاں تخیّل
اور جذبہ کی ہم آمیزی

(ماہ نو کراچی ۵۳ مئی ۱۲-۱۴ و ۴۸)

میر کے بعد غالب کے یہاں جذبہ و تخیّل کی ہم آمیزی ملتی ہے۔

یہی آمیزش جمالیاتی تخلیق کرتی ہے اور اسی کے سبب غالب کے کلام میں حُسن، رنگینی، حرارت اور زندگی ملتی ہے۔

آرٹ

۱۳۶۔ اجمل علی:

اجمل — ایک جدید مصوّر

(ماہ نو کراچی ۵۳ فروری ۴۷)

پاکستان کے ایک مصوّر اجمل کے آرٹ کی خامیوں اور خوبیوں کو دکھایا گیا ہے۔

۱۳۷۔ عبدالرحمٰن چغتائی:

رضیہ سراج الدّین

(ماہ نو کراچی ۵۳ مئی ۵ ۳۰-۴۰)

رضیہ سراج الدّین تقسیم ہند سے پہلے ہی ایک کامیاب مصوّر کے طور پر مشہور تھیں۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان کی ہو گئیں۔ انھیں کے طرز رہائش، تعلیم اور آرٹ پر بحث کی ہے۔

۱۳۸۔ عبدالرحمٰن چغتائی:

اُستاد اللہ بخش

(ماہ نو، کراچی ۵۳، ۲۱)

اُستاد اللہ بخش لاہوری کی مصوّری۔ اس کا آرٹ اُس کی تدریجی ترقی نے آج اُسے ایسے مقام پر لاکھڑا کیا ہے کہ آج پاکستان کے بہترین آرٹسٹوں میں اس کا شمار ہے۔

معاشرتی حالات

۱۳۹۔ ابن حبیب:

بہار کے آدی باسی

(تہذیب، پٹنہ ۵۳ جنوری ۱۲-۱۶، ۲۱)

بہار کے آدی باسیوں کی تباہ حال زندگی کا تفصیلی تذکرہ دیا ہے۔

۱۴۰۔ اختر احمد انصاری:

مصر کا سیاسی بحران

(تہذیب پٹنہ ۵۳ جنوری ۷ ۲۰-۲۱)

مصر کے سیاسی بحران کی وجہیں دی ہیں اور موجودہ دُنیا میں مصر کو جو اہمیت حاصل ہے اور اس سلسلے میں برطانوی اور امریکی چالوں کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۴۱۔ ادارہ:

ابوالہول کی بیداری

(نگار لکھنؤ ۵۳ مارچ ۴۴-۴۶)

محمد نجیب کے حالات زندگی اور ان کے فوجی و سیاسی کارنامے درج ہیں۔

۱۴۲۔ اسرار احمد آزاد:

کینیا کا مسئلہ

(آج کل دہلی ۵۳ جون، ۱۲-۱۵)

کینیا کے عام حالات، نظم و نسق، اقتصادی حالات اراضی کی تقسیم، شہری اور سیاسی حقوق اور قومی آزادی کی تحریک وغیرہ سے بحث کی ہے۔

۱۴۳۔ اطہر حسین جعفری:

عراق کا ایک غیر معروف فرقہ منڈائی

(آج کل دہلی ۵۳، اپریل ۱۲-۱۴)

عراق کا ایک چھوٹا مگر بڑا پُرانا فرقہ ہے پیشے کے لحاظ سے یہ بڑھئی اور لوہار کا کام کرتے ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانہ سے برتنوں وغیرہ پر سونے چاندی کے نقش و نگار بھی بناتے ہیں۔ مذہبًا عیسائیت سے قریب ہیں۔ تاہم یہ خود چونکہ تفصیل بتانے سے گریز کرتے ہیں اس لئے قطعیت سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اس مقالہ میں منڈائی فرقے کے طرز معاشرت وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

۱۴۴۔ اقبال صدّیقی:

رو تو دورے ساڑی تان اور بانسری بجتی رہی

(تہذیب پٹنہ ۵۳ ستمبر ۷ ۳۰-۴۰)

چھوٹا ناگپور کے ادی باسیوں کی زندگی اور کچھ گیت ترجمہ کے ساتھ دئے ہیں۔

۱۴۵- دیو پرکاش ناگر:

انڈونیشیا کے حالات

(آج کل دہلی ۵۳ جنوری ۵-۵۳)

جنک کمار احساس نے مضمون نگار کے ایک مضمون کا یہ ترجمہ پیش کیا ہے جس میں انڈونیشیا کے دیہاتوں کی زراعت اور لوگوں کے رہن سہن کے طریقوں سے معہ انتظامی امور کے بحث کی گئی ہے۔

۱۴۶- رام ادھن:

سرینام

(آج کل دہلی ۵۳ جون ۲۳-۲۸)

جنوبی امریکہ کے شمال میں گی آنا کا وہ حصّہ جو ڈچ حکومت کے تحت ہے سرینام کہلاتا ہے۔ اس کی تاریخ پیش کی اور وہاں ہندوستانیوں کے آمد کے ذکر کے ساتھ اُن کے رہن سہن وغیرہ کے طور طریقے بتائے ہیں۔ وہاں بولی جانے والی زبانوں میں سے اُردو بھی ایک ہے۔

۱۴۷- رام نندن:

بن باسی

(تہذیب پٹنہ ۵۳ فروری ۲۶-۲۹،۴۵)

ہندستان کے بن باسیوں کے حالات و کوائف بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کی "اصلاح" کرنے کی کوششیں ان کے لئے سوُدمند ثابت نہیں ہوئی ہیں۔

۱۴۸- شری رام سیجنا:

اسرائیل کی صنعتی ترقّی

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۴۰-۴۳)

کئی سو سال تک یہودی بکھرے رہے بالآخر ۱۹۴۸ء میں انجمن اقوام متحدہ کے تحت فلسطین میں انکی حکومت قائم ہوئی۔ اس فلسطینی حصّے کو اسرائیل کا نام دیا گیا۔ یہودیوں کے مصائب اور کارناموں کے تذکرے کے بعد دکھایا گیا ہے کہ اسرائیل بڑی زبردست صنعتی ترقّیاں کرسکتا ہے۔

۱۴۹- ظفیر الدین محمد۔ (مترجم):

مُسلمان حکومتوں کی موجودہ زبوں حالی ایک امریکن سیّاح کے قلم سے

(قسط دوم)

(بُرہان دہلی ۵۳ مارچ ۱۴۹-۱۶۱)

مصری عورتیں مشرقِ وسطیٰ کے تمام ممالک سے آزاد و ترقّی یافتہ ہیں۔ یورپ کی نقّالی پر جان دیتی ہیں محفل رقص و سرُود میں بےباکی سے شریک ہوتی ہیں مصری کسانوں کی حالت قابلِ رحم ہے۔ مصر کا کسان بھوکا اور ننگا ہے۔ مکانات گھٹیا درجے کے ہیں۔ جہالت عام ہے۔ حکومت کو پرواہ نہیں۔ بغداد کی حالت بھی ناگفتہ بھی ہے۔

قدیم تاریخ سے آج کی حالت کا مُقابلہ کرتے ہوئے عراق کی تنزّلی کی حالت پیش کی ہے۔

یہودی گاؤں ان کی ترقّی اور ان کی منظّم زندگی پیش کرکے سیّاح لکھتا ہے کہ مسلمان بھی اس طرح ترقّی کرسکتے ہیں۔ ورنہ زمانہ کی رفتار سے چشم پوشی موت کا پیغام ہے۔

۱۵۰- عبدالقادر برلاس:

۱۸۱۵ء کا ایک سفر بنگال

(العلم کراچی ۵۳ جنوری ۹-۳۱)

عبدالقادر برلاس کے دادا ہرات سے عہد محمد شاہ میں ہندوستان آئے۔ عبدالقادر مراد آباد میں پیدا ہوئے، فقہ، حدیث، تفسیر، ہیئت، ہندسہ، حساب اور فرائض میں مہارت حاصل کی۔ ملازمت کے سلسلے میں سفر پر سفر کرتے رہے اور جہاں جہاں گئے وہاں کے سیاسی تمدّنی اور معاشرتی حالات قلمبند کرتے رہے۔ ۱۸۱۵ء میں مشرقی بنگال کی جو کیفیت تھی اس کا نقشہ اس مضمون میں ملتا ہے جو ان کے سفرنامے سے اقتباساً لیا گیا ہے۔ اصل فارسی میں ہے۔ ترجمہ صدر یار جنگ کی لائبریری میں ہے۔

۱۵۱۔ ہنڈرسن سارمیں۔ ظفیر الدین مترجم:

مسلمان حکومتوں کی موجودہ زبوں حالی ایک امریکن سیاح کے قلم سے

(برہان دہلی ۵۳ فروری ۱۰۷ — ۹۱)

نگار کا سالنامہ ایک مستقبل کی تلاش میں سے چند ابواب امریکن سیاح ہنڈرسن نے ایران و مصر کی زبوں حالی، افلاس، دارالسلطنت اور ملک کا معیار، شیراز کی عورتیں، مزدوروں کی تعداد اور بیکاری، جہالت قاہرہ میں سامان عیش و نشاط بھی ہے اور افلاس و تباہی بھی، سیاح کی نظر نہایت گہری اور وسیع ہے۔

۱۵۲۔ ڈی۔ رام چندرا ریڈی:

چینی بچے

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۶۲—۶۳)

چینی بچوں کی دلچسپیوں اور کھیل وغیرہ سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔

اقتصادیات

۱۵۳۔ ابوسالم:

سوویت نظام

(تہذیب، پٹنہ ۵۳ فروری ۱۸—۲۲)

سوویت نظام کے بارے میں سامراجیوں نے غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں ورنہ سچ تو یہ ہے کہ اس نے روسی عوام کی زندگی اور تہذیب کو بلند ہی کیا ہے۔

۱۵۴۔ ابوالقاسم فرخ:

کانگریس اور زرعی اصلاح

(تہذیب پٹنہ ۵۲ ستمبر ۳۱ — ۳۴)

زرعی اصلاح کے سلسلے میں کانگریسی حکومت نے جو کچھ کیا ہے اس پر تنقید و تبصرہ پیش کیا ہے۔

۱۵۵۔ عائشہ:

ڈالر اور اسٹرلنگ

(نگار لکھنؤ ۵۳ جون ۳ — ۴۴)

امریکہ کا کاروبار ڈالر میں ہوتا ہے اور دوسرے ملکوں کا پونڈ یعنی اسٹرلنگ میں۔ ان سب کی آپسی تجارت اور ان کے امریکہ سے تجارتی ربط کو دکھایا ہے۔

۱۵۶۔ عزیز ہاشمی:

ہندوستان کا متوسط طبقہ

(تہذیب پٹنہ ۵۳ جنوری ۲۲—۲۶)

متوسط طبقہ کی نوعیت و کیفیت دکھاتے ہوئے ہندوستان کے متوسط طبقہ کی زندگی اور اس کے مسائل بتائے ہیں۔

۱۵۷۔ من کمار سین:

کمیونٹی پروجکٹ

(تہذیب، پٹنہ ۵۳ جنوری ۱۷- ۲۱)

کمیونٹی پروجکٹ پر اشتراکی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔

تعلیمات

۱۵۸۔ عبد السلام (رامپوری)

قدیم اسلامی درسگاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں

(برہان دہلی ۵۳ مارچ ۱۶۲ — ۱۷۳)

ابتدا میں مسلمانوں کے تعلیمی عروج کے اسباب بیان کرنے کے بعد پھر مسلمانوں کی تعلیمی پستی کے اسباب و علل پر بحث کی گئی ہے اور آخر میں چند تجاویز پیش کی گئی ہیں کہ اگر مسلمان آگے بڑھتے ہوئے زمانے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی پالیسی کو بھی تبدیل کریں تو ان کی تعلیم کے بنیادی نقائص کافی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔

۱۵۹۔ یوسین:

امریکہ میں تعلیمی سرگرمیاں

(ہندستانی ادب حیدرآباد ۵۳ء فروری ۳۰ — ۳۱)

امریکہ کے بالغوں میں ۲ فی صد اشخاص ان پڑھ ہیں ان میں سے بھی ۳ کروڑ تعلیم بالغاں کے اسکولوں میں تربیت پا رہے ہیں۔ یہ ملک ہر سال تعلیمی ہفتہ مناتا ہے مضمون میں مختلف تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سائنس

۱۶۰۔ ادارہ:

سائنس کے نظر نہ آنے والے آلات

(نگار لکھنؤ ۵۳ء مارچ ۳۱ — ۳۳)

خوردبینی آلات کی ایجاد کی تاریخ ان کی ساخت اور فوائد کا ذکر۔

۱۶۱۔ قادر جدی:

ہم فضا میں ایک اور چاند بنائیں

(ہندستانی ادب، حیدرآباد ۵۲، ۵۳ء دسمبر، جنوری ۱۷ — ۲۱)

یہ میجر الگزینڈر بی، اے۔ ساورسکی کے انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے جس میں راکٹ کے آئندہ کے امکانی طریقۂ استعمال سے متعلق معلومات دی ہیں۔

نفسیات

۱۶۲۔ سُہیل بخاری:

آسیب زدگی

(آج کل دہلی ۵۳ء مارچ ۴۸ — ۴۹)

مضمون میں اس عقیدے کو کہ آسیب زدگی غیبی قوت کا مظہر ہے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آسیب زدگی کی نفسیاتی توجیہہ پیش کی گئی ہے۔

۱۶۳۔ شکیل الرحمٰن:

تحلیل نفسی اور ہم

(شاعر بمبئی ۵۲ء جنوری فروری ۲۵ — ۲۷)

فرائیڈ کے نظریات سے بحث کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ نفسیات و اخلاقیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے ادیبوں کو انسانیت کی خاطر لکھنا چاہیئے وہ فنکار جو گندگی اور غلاظت میں اُلجھے رہتے ہیں حقیقت کی گہرائی میں نہیں اُتر سکتے۔

وفیات

۱۶۴۔ ادارہ:

آہ مفتیٔ اعظم ہند

(بُرہان دہلی ۵۳ء جنوری ۱ — ۴)

مفتی محمد کفایت اللہ کی موت پر تبصرہ، حضرت مفتی صاحب کا وجود اپنی علمی و عملی خوبیوں اور گوناگوں دماغی و اخلاقی کمالات کے باعث پورے عالم اسلام کا ایک ایسا متاع گرانمایہ تھا کہ آج اس کے اُٹھ جانے پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

۱۶۵۔ رحم علی الہاشمی:

اُردو کے ایک محسن کا انتقال

(آج کل دہلی ۵۳ء، اپریل ۲۶)

اکاڈیمیشین الیگزائی پیٹرووچ برانیکاف کو ہندوستان کی دیسی زبانوں اور خصوصاً اُردو زبان سے خاص دلچسپی تھی، جس کے لئے انھوں نے ہندوستان کا سفر بھی کیا اور یہاں کے اُردو اداروں سے خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ اُردو وغیرہ سے متعلق کئی کتابچے اور مضامین لکھے۔ کم و بیش سو تصنیفات کے مالک تھے۔ ادھر وہ ایک روسی اُردو لغت مدون کرنے میں مشغول تھے۔ تاس ایجنسی کی اطلاع کے بموجب ایک طویل علالت کے بعد انھوں نے انتقال کیا۔

۱۶۶۔ سلیمان ندوی سید:

ایک شریف النفس دوست کی دائمی مفارقت

پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (پونہ)

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ مارچ ۲۰۲-۲۲۵)

مرحوم شیخ عبدالقادر ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۰ دسمبر ۵۲ء کو انتقال کیا مرحوم کا بڑا حصہ پونہ و بمبئی میں گذرا۔ ان کا خاص موضوع فارسی تھا۔ اردو مراٹھی کے ماہر تھے۔ زندگی بھر علمی شغف رہا۔ مرحوم کی ملاقات سب سے پہلے صاحب مضمون سید سلیمان ندوی صاحب سے ۱۹۱۳ء میں ہوئی اس کے بعد سے تعلقات گہرے ہوتے گئے افسوس کہ علم و اخلاق کا یہ مجسمہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔

متفرقات

۱۶۷۔ ادارہ:

رموزِ خطابت

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ جنوری ۷۸-۷۹)

یہ جناب نظیر الدین احمد کی تالیف ہے۔ انھوں نے مختلف ملکوں اور قوموں کے مشہور خطیبوں کے تجربات اقوال اور خطابت سے متعلق دلچسپ و مفید تاریخی واقعات کی روشنی میں فن خطابت کے اصول اور کامیاب خطیب بننے کے طریقے بتائے ہیں۔

اردو میں اس موضوع پر بہت کم کتابیں ہیں اور جو ہیں وہ بھی معمولی درجہ کی۔

یہ کتاب اپنی معلومات کے لحاظ سے نوآموز مقرروں کے لئے مفید اور کارآمد ہے۔

اس کتاب میں عرب خطیبوں کے اکثر و بیشتر نام غلط لکھے گئے ہیں مگر اس سے اصل کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

۱۶۸۔ انوار صابری:

ہندوستان میں شیشے کی صنعت

(آج کل دہلی ۵۳ اپریل ۲۵-۲۶)

ہندوستان میں شیشے کی صنعت کی تدریجی ترقی کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔

۱۶۹۔ گوجا کمار سنہا:

ایشیا میں امریکی برطانوی رقابت

(تہذیب پٹنہ ۵۳ فروری ۴۴-۲۵-۵۰)

ایشیا کے مختلف ممالک میں اپنے اپنے مفاد اور اثر بڑھانے میں امریکہ اور برطانیہ دونوں کوشاں ہیں۔ اسی کی تفصیل اس مقالہ میں ملتی ہے۔

۱۷۰۔ محمد اسحاق صدیقی:

فن تحریر کی تاریخ

(نگار لکھنؤ ۵۳ جون ۱۹-۲۳)

فن تحریر کی تاریخ پیش کرنے کے سلسلے میں تعارفی گفتگو کی ہے جو ACROPHONY (یعنی بعض تصویری الفاظ چن کر ان کے ناموں کی شروع کی آوازیں لے لینا) پر ختم ہوتی ہے۔

تبصرے

۱۷۱۔ ادارہ:

(برہان دہلی ۵۳ فروری ۱۲۶-۱۲۷)

(۱) اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی۔ از ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی، تقطیع کلاں صفحات ۱۳۲ قیمت ۳ روپے۔ پتہ اشاعت، محل دار السلام، قدیم ملک پیٹ، حیدرآباد دکن۔

(۲) خطبات و رباعیات اکبر الہ آبادی حصہ دوم مرتبہ جناب ضیا احسان الحق،

تقطیع کلاں، ضخامت ۲۴

صفحات، کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت بلا تزئین روپے
چھ آنے، شائع کردہ بزم اکبر کراچی۔

(۳) اکبر اس دَور میں۔ مرتبہ اختر انصاری،
اکبر آبادی۔ تقطیع کلاں، ضخامت ۲۳۰ صفحات
کتابت و طباعت اعلیٰ۔ قیمت صہ، شائع کردہ۔
بزم اکبر کراچی ۱۹۵۱ء

۱۷۲۔ ابن فرید:

ادب ایک نیا موڑ مڑ گیا

(معیار، جیکب آباد، ۵۳ مئی ۳۶-۳۲)

چراغ راہ کراچی کی اشاعت خاص جنوری ۱۹۵۳ء
پر ایک طویل تبصرہ۔

۱۷۳۔ ادارہ:

آہنگ

(برہان دہلی ۵۳ مارچ ۱۹۰-۱۹۱)

مجاز کا کلام "ادب برائے زندگی" کا مظہر ہونے
کے ساتھ ساتھ زندگی برائے ادب کا بھی ترجمان ہے
آہنگ مجاز کے کلام کا مجموعہ ہے۔ کتابت و طباعت
اعلیٰ اور کاغذ اعلیٰ ضخامت ۲۱۶ صفحات قیمت مجلد
؏ چار روپے آٹھ آنے۔ آزاد کتاب گھر، کلاں محل
دہلی۔

۱۷۴۔ ادارہ:

ابتدائی معاشیات

(نگار لکھنؤ ۵۳، مارچ ۵۵-۵۶)

ایچ، ایچ حسن بی اے کی تالیف ہے جس میں معاشیات
کے تمام اساسی و ابتدائی اصولوں کو سہل زبان میں پیش کیا
گیا ہے۔

اخیر میں فہرست اصطلاحات بھی دی گئی
ہے جو افادہ سے خالی نہیں۔

۱۷۵۔ ادارہ:

اُردو زبان کا نیا عروض

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ جنوری ۷۱-۷۵)

اس کے مصنف پروفیسر۔ حبیب اللہ خان غضنفر
ہیں۔ چونکہ اُردو شاعری کے عروض کی بنیاد عربی
عروض پر ہے اس لئے وہ بجنسہٖ اُردو شاعری کے
لئے موزوں نہیں۔ مصنف نے اُردو شاعری کے
مزاج کے مطابق اس میں بعض ترمیمیں کی ہیں اور ان
کو اُردو شاعری کی مختلف بحروں میں برت کر دکھایا
ہے۔ اس سے اُردو شاعری کے عروض میں وسعت
پیدا ہوگی اور کم یا بالکل نہ استعمال کئے جانے والے
بعض اوزان اُردو شاعری میں رائج ہو جائیں گے۔

۱۷۶۔ ادارہ:

اُردو غزل

(نگار لکھنؤ ۵۳، مارچ ۵۳-۵۴)

ڈاکٹر یوسف حسین کی مشہور و مقبول کتاب کے
دوسرے ایڈیشن پر تبصرہ۔ حالی کے مقدمہ شعر و
شاعری کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جس میں
اُردو غزل پر سنجیدہ اور مفکرانہ انداز سے تبصرہ
کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں
غزل گوئی پر محض جذباتی، نفسیاتی فنی اور عصری حیثیت
سے نگاہ ڈالی اس کی افادیت سے بحث کی ہے۔
اور اس لحاظ سے یہ کتاب مقدمہ شعر و شاعری سے بالکل
جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

۱۷۷۔ ادارہ:

امن نامہ

(شاعر بمبئی ۵۳ جنوری، فروری ۶۹)

یہ جاں نثار اختر کی طویل نظم ہے جو کلکتہ امن
کانفرنس میں پڑھی گئی تھی اس میں جاں نثار اختر کا مقصد

پوری شدّت اور حُسن کے ساتھ نُمایاں ہے۔ اگر وہ ذرا سی اور توجہ سے کام لیتے تو اس نامہ کی وہ معنوی اور لفظی شکلیں بھی دُور ہو جاتیں جو ارباب علم کو کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔

۱۷۸۔ ادارہ:

تذکرۂ مولوی ذکاءُ اللہ دہلوی

(تہذیب پٹنہ ۵۳ فروری ۵۲)

مولوی ذکاءُ اللہ کا درجہ اُردُو ادب میں بہت اُونچا ہے، وہ اپنے دَور کے بڑے عالم اور وضعدار بزرگ تھے۔ ان کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ علم و دانش کا خزانہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سی۔ ایف۔ اینڈریوز صاحب اُن سے متاثر ہوئے۔ یہ کتاب اینڈریوز صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہے جو خود ان کی زندگی پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ ضیاءُ الدین احمد برنی صاحب نے اُسے اُردُو میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۷۹۔ ادارہ:

ترجمانِ اسرار

(برہان دہلی ۵۳ جون ۳۸۰ – ۳۸۱)

کتاب ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی کا اُردُو ترجمہ ہے۔ جسے حسنین شیخ عبد الرحمٰن نے کیا ہے، ترجمہ شگفتہ اور خوب ہے۔ البتہ بعض جگہ نظرِ ثانی کی ضرورت ہے جیساکہ فاضل مترجم نے خود کہا ہے۔ پونے دو سو صفحات، ٹائپ نفیس اور جلی مکتبۂ کارواں دیپک روڈ انارکلی لاہور سے مل سکتی ہے قیمت درج نہیں۔

۱۸۰۔ ادارۂ نقد:

ترقی پسند ادب

(نگار لکھنؤ ۵۳ مارچ ۵۴)

اس کتاب میں سردار جعفری نے ترقی پسند ادب کی تاریخ نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کی ہے اور ان تمام مباحث کو لے لیا ہے جو موضوع کے لحاظ سے ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہمیں اس تحریک کے آغاز مقاصد وغیرہم کا علم ہوجاتا ہے اور جن سے ترقی پسند ادب کی طرف سے پیدا ہونے والی بہت سی بدگمانیاں دُور ہو جاتی ہیں۔

۱۸۱۔ ادارہ:

دی مائنڈ القرآن بلڈز

(نگار لکھنؤ ۵۳ مارچ ۵۳)

ڈاکٹر سید عبد اللطیف کی مذکورۂ بالا انگریزی کتاب پر تبصرہ۔ اس میں فاضل مصنف نے تعلیماتِ قرآن کی رُوح کو پیش کیا ہے اور اس بات کو غلط ثابت کرتے ہوئے کہ اسلام ایک خونخوار و خوں ریز مذہب ہے۔ قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے کہ دُنیا میں انسانیت، اخوّت و امن پسندی کی جیسی زبردست تعلیم اسلام نے دی ہے اس کی مثال مُشکل ہی سے کہیں اور مل سکتی ہے۔ اچھا ہوتا اگر اس کا اُردُو ترجمہ بھی ساتھ ہی شائع کردیا جاتا۔

۱۸۲۔ ادارہ:

رسالہ نور المعرفت

(برہان دہلی ۵۳ جون ۳۸۱ – ۳۸۲)

تصنیف ولی شاعر ہندی۔ مرتبۂ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی۔ رسالہ اگرچہ مختصر ہے تاہم ولی کی فارسی انشا پردازی اور اس کے علم و فضل کا بہترین شاہکار ہے۔ لائق مرتب نے اس رسالہ کو اڈٹ کرکے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ملنے کا پتہ :۔ قیمت۔ ایک روپیہ
انجمن اسلام اُردُو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱

۱۸۳۔ ادارہ:

سی۔ ایف، اینڈریوز

(تہذیب پٹنہ ۵۳ فروری ۵۱-۵۲)

سی۔ ایف اینڈریوز پادری تھے۔ ترک وطن کر کے ہندوستان آئے تھے اور مشنری کا نے کے سبب تبلیغ عیسائیت کرتے تھے۔ لیکن بعد میں انسانیت کے بلند مراتب کے پیش نظر مشن سے علیحدہ ہو گئے اور ہندوستانیوں کی خدمت اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی جدوجہد میں شریک ہو گئے۔ یہ کتاب انھیں کی زندگی سے متعلق ہے جسے ان کے شاگرد بنارسی داس چترویدی نے مارجوری سائکس کی شراکت میں مرتب کی اور اینڈریوز صاحب کے دوسرے شاگرد ضیاء الدین احمد برنی نے اس کو اردو کا لباس پہنایا۔ صفحات: ۲۴۴۔ قیمت چار روپیہ گیارہ آنے۔ ناشر: تعلیمی مرکز، گیدول نیکہ راج روڈ۔ کراچی، (پاکستان)

۱۸۴۔ ادارہ:

شعرائے اردو کے تذکرے

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ جنوری ۷۷-۷۸)

ڈاکٹر سید عبداللہ صدر شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی کی تالیف۔ اس میں میر کی نکات الشعراء سے لے کر آب حیات تک اردو کے تمام اہم تذکروں کا جائزہ لیا گیا ہے اردو میں اس موضوع پر اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے اور مولف کی دقتِ نظر اور نکتہ سنجی کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

۱۸۵۔ ادارہ:

شعر و سخن

(شاعر بمبئی ۵۳ جنوری فروری ۶۸-۶۹)

یہ ہندی میں اردو کا ضخیم اور مفصل تذکرہ ہے جسے گوئلی صاحب نے جو ہندی کے بہت بڑے عالم محقق اور ادیب ہیں، مرتب کیا ہے اس طرح اردو کے وہ شعرا جو اب تک صرف اردو داں طبقے تک محدود تھے ہندی میں منتقل ہو کر ہندو اور مسلمانوں کے مشترکہ کلچر کی بہتر نمائندگی کر سکیں گے۔

۱۸۶۔ ادارہ:

مسلمان اور نظریۂ شرافت

(نگار لکھنؤ، ۵۳ مارچ ۵۴-۵۵)

جناب رفیق مارہروی کی تالیف۔ مؤلف نے اس کتاب میں نہایت خوبی سے وہ تمام روایات پیش کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ سادات نسلی حیثیت سے کس طرح اور کب خلط ملط ہوئے۔ کتاب نہایت دقت نظر اور علمی ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

۱۸۷۔ ادارہ:

نالہ پابند نے

(شاعر بمبئی ۵۳ جنوری فروری ۶۸)

یہ اختر انصاری کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں عشقیہ غزلیں ہیں ہر چند کہ ان پر روایتی اسلوب کی چھاپ بہت گہری ہے لیکن اپنی شگفتگی کے اعتبار سے کامیاب ہیں، اختر کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں البتہ وہ زبان کی سلاست، صفائی اور تاثر کا کافی خیال رکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ اختر کے بہتر مستقبل کی طرف ایک اشارہ ہے۔ اس مجموعہ میں چند گیت بھی ہیں جن کی اشاعت مناسب نہ تھی۔

۱۸۸۔ ادارہ:

نقش جمیل

(نگار لکھنؤ ۵۳۔ مارچ ۵۶)

جمیل مظہری پروفیسر پٹنہ کالج کی نظموں کا مجموعہ جسے جناب رضا نقوی نے مرتب کیا ہے۔ اس مجموعہ میں جتنی نظمیں مختلف ابواب کے تحت شائع کی گئی

ہیں وہ اپنے عنوانات کے لحاظ سے ہر طرح مکمل ہیں اور بعض بعض بہت بلند ہیں۔

۱۸۹۔ ادا ۔ ر ۔ک :

وادیٔ کشمیر کی تاریخ پر سرسری تبصرہ

(نگار لکھنؤ ۳ مارچ ۱۷ — ۲۱)

اس میں وادیٔ کشمیر کے تاریخی حالات مختصراً پیش کئے گئے ہیں۔

۱۹۰۔ ج ۔ ن ۔ ا :

اُردو زبان ہماری

(آج کل ۳ جنوری ۵۶)

یہ ایک مسدس ہے جو جناب مسعود اختر جمال نے لکھی ہے ۔ نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں کیا ہوگا ۱۷×۲۷ سائز کے بتیس صفحات کا یہ کتابچہ کتاب گھر، جہاں آباد، رائے بریلی، یوپی سے مل سکتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے۔

۱۹۱۔ د ۔ خ :

اصطلاحاتِ معاشیات

(ماہ نو کراچی ۳ مئی ۴۸)

پروفیسر دلشاد کلانچوی کی اس تالیف میں علم الاقتصاد کی اصطلاحوں کے مانوس مرادفات پیش کئے گئے ہیں جن میں عام رواج پانے کی صلاحیت ہے یا "شاید وقت اور استعمال ان کو قطعیت اور جامعیت کی خلعت پہنادے" ساتھ ہی علم الاقتصاد کا ایک مجمل خاکہ بھی پیش کر دیا ہے جس سے اصطلاحیں بخوبی ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔

اپنی عام فہم زبان کی وجہ سے یہ کتاب طلباء کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

ناشر: دانش کدہ بہاول پور۔ صفحات ۱۱۸
قیمت سوا روپیہ۔

۱۹۲۔ د ۔ خ :

شعرستان

(ماہ نو کراچی ۳ مئی ۴۷ — ۴۷)

یہ ماہنامہ "پرچم" کراچی کی اشاعت خصوصی ہے جسے سیابؔ اکبر آبادی مرحوم کے صاحبزادے مظہر صدیقی اور نعمان تائب نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد یہ پاکستان کے اُردو گو شعراء کے خود نوشت حالات اور خود انتخاب کئے ہوئے کلام کو پیش کیا گیا ہے جس میں چار سو جدید شعراء کا ایک مستقل تذکرہ تیار ہو گیا ہے۔ ابتدا میں ایک سو شعراء کی تصاویر ہیں جو کتاب کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہیں۔

ناشر: مکتبۂ پرچم، حسن علی آفندی روڈ۔ کراچی، ضخامت ۴۱۶ صفحات۔ قیمت: تین روپے آٹھ آنے۔

۱۹۳۔ سرا ۔ ا ۔ ک :

تاریخ صحافت اُردو

(تہذیب پٹنہ ۳ ستمبر ۵۰)

امداد صابری صاحب نے تاریخ صحافت اُردو کی پہلی جلد شائع کر کے اُردو ادب کی گرانقدر خدمت انجام دی ہے مواد کی فراہمی اور ترتیب سے ان کی محنت اور محبت ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء تک کے اخبار و رسائل کا حال ملتا ہے اور ان کی تعداد ایک سو ہے۔ صابری صاحب کے نزدیک جامِ جہاں نما (۱۸۲۲ء) اُردو کا پہلا اخبار ہے۔

اکثر قدیم رسائل اور اخبارات کی تحریروں کے نمونے اور ان میں سے بعض کی عکسی تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔

صفحات: ۴۰۴۔
ناشر: سوبھاش بک ڈپو دہلی
قیمت: سے ؏ر

۱۹۴۔ س۔ ع:

اُردو تنقید کا ارتقا

(تہذیب پٹنہ ۵۳ جنوری ۶۰)

اُردو تنقید کا ارتقا ڈاکٹر عبادت بریلوی کا تحقیقی مقالہ ہے جو انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے پیش کیا تھا۔ اس میں اُردو تنقید کی مکمل تاریخ اور اس کے ارتقا کی تفصیل ہے۔ اور سارے نقادوں اور ان کے رجحانات سے بحث کی ہے یہ کتاب اُردو تنقیدی ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ صفحات: ۵۵۰۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنے۔ ناشر انجمن ترقی اُردو (پاکستان) اُردو روڈ۔ کراچی (پاکستان)

۱۹۵۔ سعید احمد:

مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(برہان دہلی ۵۳ جون)

مندرجہ بالا کتاب محمد اجمل خاں صاحب کی تالیف ہے۔ فاضل مولف نے سیرت مبارکہ کا خاکہ قرآن مجید سے تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب پر تبصرہ نگار نے قرآن وحدیث اور لغت کی روشنی میں تنقید کی ہے اور پروفیسر اجمل خاں کے مسامحات کو ظاہر کیا ہے۔

۱۹۶۔ ع۔ س:

چند ہم عصر طبع سوم

(تہذیب پٹنہ ۵۳ فروری ۵۱)

اس اشاعت میں اٹھارہ خاکے ہیں اور اس میں سرسید کا خاکہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنے مخصوص انداز میں ان چند ادیبوں کے خاکے لکھے ہیں جنھوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔ صفحات ۲۸۴ قیمت: تین روپے آٹھ آنے۔ ناشر انجمن ترقی اُردو (پاکستان) اُردو روڈ کراچی (پاکستان)

۱۹۷۔ ع۔ م:

امر کہانی

(آج کل دہلی ۵۳ اپریل ۵۵)

بتاب بریلوی نے رامائن ۲۵ صفحات میں اس نام سے منظوم رامائن پیش کی ہے جو اہل سخن سے داد لئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ قیمت ایک روپیہ۔

ملنے کا پتہ، آکاش بانی آفس۔ بہاری پور۔ بریلی

۱۹۸۔ ع۔ م:

بہار کے نو چراغ

(آج کل دہلی ۵۳، اپریل ۵۴)

سید محمد حسنین نے بہار کے سات افسانہ نگاروں کے خاکے اور ان کے نمائندہ افسانوں کا یہ مجموعہ جو صوبۂ بہار کے ذہین ادیبوں کی ایک اچھی تصویر ہے۔ مرتب کیا ہے۔ پیش لفظ رشید احمد صدیقی کا لکھا ہوا ہے۔ افسانوں اور افسانہ نگاروں کے خاکوں کا یہ مجموعہ ایک اچھی ادبی اوپج ہے۔ پتہ: محمد حسنین۔ بھونر پوکھر، پٹنہ ۴ ضخامت ۱۷۶ صفحات۔ تقطیع: ۳۰×۲۰/۱۶ کتابت وطباعت اوسط قیمت ۲ روپے۔

۱۹۹۔ ع۔ م:

تہذیب مودّت اور ترقی پسندوں کے نام

(آج کل دہلی ۵۳ فروری ۵۶)

یہ دونوں مختصر مجموعے نجم آفندی اکبرآبادی کے پاکیزہ کلام کے ہیں اور دونوں ایک ایک روپے میں مہتمم زادۂ ادب۔ ۱۳۴۹ بیرون دبیر پورہ، حیدر آباد دکن سے مل سکتے ہیں۔

۲۰۰۔ ع۔ م:

نشاطِ غم

(آج کل دہلی ۵۳، اپریل ۵۳-۵۴)

"نشاطِ غم" لبسمل سعیدی کے کلام کا مجموعہ ہے اس

میں غزلیں قطعے اور رُباعیات شامل ہیں اور ہر جگہ ایک ماہر اُستاد کی فن کاری جلوہ گر ہے۔ غزلوں میں غم کی نشاط آفرینی ہے۔ ان کے مجاز پر تصوّف کا اطلاق کرنا ظلم ہے۔ اُن کے معیار تغزّل کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ جب تک اُردو شاعری اور غزل کی محبوب صنف باقی ہے ان کا کلام بھی باقی رہے گا۔

ناشر: منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ۱۰۔ دریا گنج دہلی۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ و کتابت، طباعت: عمدہ۔ جلد و جلد پوش گوارا۔

قیمت۔ چار روپے۔

۲۰۱۔ ع۔م:

نگار — داغ نمبر

(آج کل ۵۳، اپریل ۵۵-۵۶)

اُردو کے رسالوں میں نگار ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ اُس کے سالنامے بڑی ادبی اہمیت کے مالک رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں اُس نے داغ نمبر نکالا ہے۔ اس میں داغ کی شاعری اور زندگی سے متعلق بڑے دلچسپ مضمون شائع ہوئے ہیں۔

۲۰۲۔ م۔ س:

مطالعۂ غالب

(تہذیب پٹنہ ۵۳ جنوری ۶۱)

مرزا جعفر علی خاں اثر نے اس کتاب میں غالب کی زندگی، ان کا ماحول اور ان کے کردار کی روشنی میں غالب کے اشعار کا مطالعہ کیا ہے اور غالب کی جدّت پسندی اور وقت پسندی کی اچھی تصویر بتائی ہیں۔ اگرچہ قدم قدم پر اختلاف کی گنجائش ہے تاہم کتاب پڑھنے کے لائق ہے۔ صفحات: ۱۱۲ صفحے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

ناشر: دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

۲۰۳۔ ن۔ ک:

جی نی یس

(ہمایوں لاہور ۵۳ مارچ ۲۶۳)

جی نی یس انور جلال کا ناول ہے، اس کا مرکزی خیال ہمارے غیر متوازن ماحول پر ایک شگفتہ طنز ہے۔ منصور جینئیس جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے دلچسپ ہونے کے علاوہ ہمارے معاشرے کی علمی اور سماجی قدروں کے بنیادی کھوکھلے پن کی ایک زندہ تصویر ہے۔ اس ناول کی تکنیک بالکل نئی ہے۔ مجموعی طور پر ایک اچھا اور دلچسپ ناول ہے۔

پبلشرز: انارکلی کتاب گھر لاہور۔

صفحات ۱۳۰۔ کاغذ، لکھائی چھپائی اور سرورق خوبصورت ہیں۔ قیمت چار روپے۔

۲۰۴۔ ن۔ ک:

ماہنامۂ خیال

(ہمایوں لاہور ۵۳ مارچ ۲۶۳)

ماہنامۂ خیال پاکستان کا نیا ماہوار رسالہ ہے جس کے ادارے میں مشہور افسانہ نگار انتظار حسین اور یوسف امین ہیں۔ خیال ایک جاندار پرچہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ہندی رُجحان میں احتیاط ضروری ہے۔

ناشر: مکتبۂ خیال ۔ ۴۰ بسنت روڈ۔ لاہور۔

ناشر:۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی　مطبع:۔ اجمل پریس پرنس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی

دفتر:۔ رائیٹرس امپوریم لمیٹیڈ پیلس بلڈنگ فیروز شاہ مہتہ روڈ

بمبئی ۱

Vol. 5] *January-March 1954* [No. 1

NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY JOURNAL

OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Published Every

JANUARY & APRIL
JULY & OCTOBER

Annual Subscription
Inland & Pakistan:
Rs. 3/- postage extra.

Price each Copy:
Re. 1/-

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ماہ اپریل ۱۹۵۴ء

جلد ۵ شمارہ ۲

چندہ سالانہ تین روپے } علاوہ محصول ڈاک
" ششماہی دو روپے

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

فہرست مضامین

شذرات

گذشتہ سہ ماہی کی سب سے اہم خبر انجمن ترقی اُردو (ہند) کے اُس وفد کی جو اُردو کو علاقائی زبان کا درجہ دلانے کے لئے بنایا گیا تھا صدر ہند سے ملاقات تھی۔ اس وفد نے ۱۵ر فروری کو اس طرح ملاقات کی کہ اس کے ارکان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک تھے اور ان کے پاس ساڑھے بیس لاکھ اُردو بولنے والوں کے دستخط تھے، ہم کو اُمید ہے کہ زبان کے اُلجھاؤ سے جو انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور جس کا سبق ملک کے مختلف صوبوں اور بیرون ملک کے علاقوں میں روزانہ مل رہا ہے، اس مسئلہ کو مدبّرانہ طریقہ سے طے کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اُردو آج بھی منقسم ہندوستان کو بڑی حد تک متحد رکھنے کا ذریعہ بن سکتی ہے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسی کے نام پر آج بھی مختلف مذاہب ہی نہیں مختلف خیالات کے لوگوں کو بھی ایک جگہ جمع کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دو بڑے خوش گوار منظر دہلی اور بمبئی میں دیکھنے میں آئے،

جناب پنڈت برج موہن دتا تریہ کیفی مدظلہ العالی نے اپنی تمام زندگی ہندوستان کی مشترکہ زبان مشترکہ تمدن اور مشترکہ روایات کے قیام میں مجاہدانہ صرف کر دی ہے؛ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر، ممتاز افسانہ نگار، اچھے تمثال نویس، قابل احترام محقق، اور عروض، لغت اور زبان کے مستند فاضل ہیں بلکہ اُردو زبان سے ان کی والہانہ محبت اور جانبازانہ عشق نے ان کو آج بھی جب کہ ان کی عمر کا قافلہ ۸۸ منزلوں سے گذر چکا ہے، صحت جواب دے چکی ہے اور قویٰ مضمحل ہو چکے ہیں۔ ان کو مجبور کر رکھا ہے کہ اس کے تحفظ و قیام کے لئے جہاں تک ان سے ہو سکے، وہ کوشش کریں، چنانچہ اب بھی اُردو کے سلسلہ میں کوئی جلسہ ہو اور کہیں بھی ان کو دعوت دی جائے تو مسافت کا خیال کئے بغیر وہ کسی نہ کسی صورت، دوسروں کے سہارے پہنچ کر اپنے آہنی عزم کی مثال سے کمزور دلوں میں نئی روح پھونک دیتے ہیں۔ پھر وہ احسان فراموش اور قدر ناشناس ہوگا جو یہ نہ چاہے گا کہ جس صورت سے بھی ہو اس محسن اُردو کی خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں پہلے دہلی میں یوم کیفی منایا گیا اور اس میں تقریروں اور نظموں کے علاوہ ملک کے مختلف گوشوں سے مختلف لوگوں سے مقالے لکھوائے گئے۔ اس

جلسہ کی پوری روئداد اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔

اسی سلسلہ کی دوسری کڑی، بمبئی کا یوم جشن کیفی تھا، یہ دلچسپ تقریب ۷ مارچ کی شام کو منائی گئی، یہاں بھی پنڈت جی کے پرستاروں میں ہر جماعت اور ہر فرقہ کے لوگ موجود تھے، مجلس بہت کامیاب رہی، اور اس دُعا پر ختم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ حضرت کیفی کو ایسی سینکڑوں ۸۸ ویں جبلی دیکھنا نصیب فرمائے۔ اگر ہم میں تھوڑے سے بھی کیفی پیدا ہو جائیں تو ملک کے بہت سے مسئلے ہی طے نہ ہو جائیں بلکہ تہذیب و تمدّن اور علوم و فنون کے ایسے ایوان سج جائیں جو ساری دُنیا کے لئے مثال ہو سکتے ہیں۔

جہاں اس جشن کی خوشی ہے، وہیں ایک تقریباً اسی عُمر کے تعلیم و تہذیب کے رہنُما کے اچانک دُور ہونے کا غم بھی ہے، مولوی رفیع الدّین احمد مرحوم آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے کی سیاسی و سماجی دُنیا کے ایک اہم رُکن تھے۔ وہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ دکن کالج پونہ اور نیو کالج لندن میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۹۲ء میں، لندن ہی میں بیرسٹری شروع کر دی اور وہاں قانونی اور سیاسی حلقوں میں اتنا اثر و رسوخ پیدا کر لیا کہ اسلامی ممالک کے سلسلہ میں ان کی رسائی بیکنگھم پیلس سے لے کر ڈاؤننگ اسٹریٹ تک ہو گئی، وہ "ٹائمس" (لندن) "پال مال گزٹ" اور "ناٹن ٹینتھ سینچری" کے مُستقل مضمون نگار تھے، پھر جب یہاں آ گئے تو بھی انھوں نے اپنے درجہ کو باقی رکھا، صحت کی خرابی سے پہلے وہ صوبہ بمبئی کی وزارت میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ اسمٰعیل یوسف کالج کی تعلیمی تشکیل ہے۔ انھوں نے اس کالج کی غرض ہی یہ بتائی تھی کہ اس میں اسلامی زبانوں اور علوم و فنون کی تعلیم کا پورا بندوبست ہو تا کہ جو لوگ اس سلسلہ میں تعلیم مکمل کرنا چاہیں صوبہ بھر سے یہاں آ سکیں۔ وہ اپنی تجویز کو پوری طور سے انجام نہ دے سکے تھے کہ ان کی بصارت نے جواب دے دیا، لیکن اس کے باوجود بھی ان کی بصیرت اپنا کام کرتی رہی اور ان کی صحبت میں چند لمحے بسر کرنا، گذشتہ پنجاہ سالہ تاریخ کا مطالعہ کرنا ہوتا تھا، خاکسار کو اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف رہا ہے۔ ان کے پاس ایسے کاغذات تھے کہ ان کی اشاعت سے اسلامی ممالک کی پنجاہ سالہ تاریخ یورپ کی حکمتِ عملی اور ہمارے ملک کے مختلف مسائل پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ کیا ہم ان کے عزیزوں سے توقع رکھیں کہ وہ مولوی صاحب مرحوم کی مصروف و مشغول زندگی کے حالات کتاب کی صورت میں پیش کریں گے۔

حضرت شاہ مقبلؒ میسوری اور اُن کا کلام

(محمد سخاوت مرزا صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (عثمانیہ)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اولاد

حضرت مقبل شاہؒ نے چار فرزند اور دو صاحبزادیاں چھوڑیں۔

(۱) سید عزیز الدین عادلؔ (۲) سید بادشاہ محی الدین قابلؔ

(۳) سید کمال الدین اجملؔ (۴) سید تقی الدین تقیؔ

ان میں بڑے صاحبزادے عادلؔ نہایت ذکی، فہیم اور عالم و فاضل تھے، جنھوں نے شمالی ہند نیز عرب اور مصر کے علماء سے استفادہ کیا، رامپور میں سالہا سال تحصیل علم اور درس و تدریس میں مشغول رہے۔ افسوس ہے کہ رامپور ہی میں ہیضہ سے انتقال ہو گیا اور وہیں دفن کئے گئے۔ عالم ضعیفی میں اس صدمۂ جانکاہ نے جناب مقبلؔ کی کمر توڑ دی۔ چوتھے فرزند تقیؔ بھی آپ کی زندگی ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ اس وقت شاہ اجملؔ قابلؔ اور صاحبزادیاں بقید حیات ہیں، بیان کیا جاتا ہے آپ کے اہل و عیال میسور میں قصبہ کے قریب سکونت پذیر ہیں اور آپ کے ایک پوتے سید احمد پیر قادری، رسالہ ساغر ماہنامہ، بنگلور کے اڈیٹر ہیں۔

اولاد معنوی

خلفاء میں آپ کے صاحبزادے سید کمال الدین اجملؔ جانشین ہیں؛

مریدین و معتقدین بنگلور، میسور، کولار، محل ضلع چیتور مدراس وغیرہ میں بہت سے ہیں آپ کے تلامذہ میں، غلام احمد زفرؔ بنگلوریؒ مشہور تھے، جنھوں نے [1] تاریخ کتاب فتاوائے علماء سنیہ حصہ چہارم، حقیقت محمدیہ سید عبدالحق شاہ میرؒ کڑپوی کی کہی تھی۔ دیگر تلامذہ کا حال معلوم نہ ہو سکا۔

تصنیفات

(۱) خطبات یعنی خطب ابن نباتہ عربی کا اُردو ترجمہ منظوم مطبع حشمت الاسلام

[1] گلدستہ نعتیہ مرتبہ شاہ میر عبدالحقؒ مطبوعہ۔

بنگلور ۱۳۳۳ھ ۔ ۲۹۶ صفحات تقطیع کلاں۔ باہتمام حاجی محی الدین بنگلوری مرید مقبولؒ۔

(۲) سراپائے رسولؐ اکرم ۷۷ بند فصیح و بلیغ، مطبوعہ مطبع فخر المطابع لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔

(۳) دیوان نعتیہ[۱] مقبولؒ۔ ڈھائی ہزار بیت تخمیناً۔ (مستقل دیوان ہے)

دیوان غزلیات مقبولؒ۔ رُباعیات مخمس ترجیع بند، عربی و فارسی غزلیات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی تقریباً دو ڈھائی ہزار اشعار ہیں؟

اس طرح مقبولؒ نے سات آٹھ ہزار بیت سے کم نہ کہے، چونکہ یہ دواوین اُن کے نبیرہ سید احمد پیر بنگلوری کے قبضہ میں ہیں، اس لئے ہم تفصیل نہ لکھ سکے، موصوف نے باوجود خط و کتابت کچھ جواب نہ دیا۔ جناب مقبولؒ کا ایک اہم کارنامہ اپنے جد امجد حضرت شاہ کمال الدین گرم کنڈوی المتوفی ۱۲۲۴ھ کا دیوان اور کلیات، جس کی دو ضخیم جلدیں ہیں ۱۳۳۱ھ میں بنگلور میں چھپوایا ہے چونکہ یہ قدیم دکھنی دیوان ہے اور اکثر قلمی نسخے دستیاب ہو سکتے ہیں، اس کا کوئی زرّین انتخاب خصوصاً صوفیان کرام کے لئے نہایت ہی کار آمد ہوگا جو اسرار و معارف اور تصوّف کی چوٹی کے مسایل پر مبنی ہے۔

محاسن شاعری

مقبولؒ شاہ، امیر مینائی ۔ داغ۔ جلال لکھنوی کے معاصر ہیں۔ جن کے اکثر تلامذہ بھی بنگلور میں موجود تھے جن کے مشاعروں میں مقبل نے بھی شاید حصّہ لیا ہوگا، مگر مقبولؒ شاہ ایک گوشہ نشین قدیم وضع اور طرز کے بزرگ تھے، کلام میں بعض جگہ الفاظ اور لہجہ دکھنی ہونے کے باوجود جدّت آفرینی، ندرت تشبیہہ، صفائی بیان، و محاورہ بندی میں معاصرین اہل کمال سے کم نہیں۔ جنوبی ہند کے شعراء کے متعلق شالی ہند کے مشہور شعراء اور ادیبوں کو کچھ غلط فہمی ہوگئی جس کا ذکر یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ چنانچہ مشہور مولف خم خانہ جاوید لالہ سری رام دہلوی مدراس اور میسور کو اُردو زبان سے بالکل بے بہرہ جانتے ہیں، چنانچہ قلندر پیران میسوری کے ضمن میں لکھا ہے کہ

(ص۶۴ خم خانہ جاوید) "میسور جیسے دور افتادہ مقام پر کسی کا اُردو شعر گوئی کی طرف ملتفت ہونا ہی بڑی بات ہے" اور

(خم خانہ جاوید ص۵۹۲، ریاض (محمد یعقوب) کے متعلق لکھتے ہیں کہ "تعجب ہے کہ صوبہ مدراس جیسے دور افتادہ مقام میں انھیں اُردو میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا" اور

---

[۱] دیوان نعتیہ قلمی ملوکہ سید قادر علی بادشہ (کڑپہ)

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز پنڈت جگناتھ آزاد دہلوی کا بیان ہے، کہ میں مدراس میں اُردوٗ مشاعرہ کی خبر سُن کر حیرت میں پڑ گیا۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں :۔ مدراس کے "حامد اشرف صاحب کے دعوت نامہ کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ " مدراس اور مشاعرہ!" دعوت قبول کرنے کا ارادہ ترک کر دیا کہ مدراس میں اُردوٗ کا کلام کون سُنے گا"؟ آخر اشرف صاحب کے آخری خط پر آمادہ ہوا کہ مُشاعرے کے انتظامات بفضل خدا جاری ہیں، انشاءاللہ یہ مُشاعرہ نہایت کامیاب ہوگا" اس ضمن میں آزاد، دہلی سے پہلے حیدر آباد آئے ڈاکٹر زور کے مہمان رہے۔ آزاد کہتے ہیں کہ " زور صاحب کے مکان پر تقریباً تمام شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی جن کی تعداد تیس کے قریب تھی ان میں چند شعرا، کے نام لئے ہیں جن میں نرسنگھ راج عالی بھی ہیں۔ تعجب ہے کہ آزاد کو حیدر آباد جیسے لاکھوں کے شہر میں اُردوٗ کے معدودے چند ادیب اور شعرا، ہی ملے اور وہ بھی بلند پایہ نہیں، میزبان کی صحیح رہبری نہ ہو تو بیچارے نووارد کا کیا قصور ہے۔ اُردوٗ غزل کے خاص اُستاد، بھبود علی صفی اخگر، تراب یار جنگ سعید، شہید، نحوی۔ ضیاءؔ (مفتی صاحب) وغیرہ تو خیر، ہمارے دیس کا خاص مزاحیہ شاعر " دہقانی" جو مجلسوں کو گرمایا کرتا ہے، وہ بھی محروم رہا۔ اس ۸۰ صفحات کے سفرنامے میں مدراس، کرنول کے مشاعروں سے متعلق اصل چیز ہی مفقود نظر آئی، کوئی مختصر رودیاد مُشاعرہ، مصرع طرح، یا کسی شاعر کے دو ایک شعر سے بھی جو آزاد کو شاید پسند آئے ہوں خالی ہے۔ مقبولؒ شاہ کے وطن، بنگلور کے صرف دو شعرا، تابش اور خوب چند کا نام لیا ہے۔

ہم نے بھی ایک آدھ ہفتہ جنوبی ہند میں گذارا ہے۔ اور دیکھا ہے کہ اُردوٗ کے مُشاعرے تو مدراس کے قصبات میں بھی دھوم دھام سے ہوتے ہیں، چنانچہ کدری (اننت پور) میں جہاں دکن کے مشہور عاشق معشوق چندربدن و مہیار محوِ خواب ہیں، حضرت خاکی شاہ کے عرس میں دو تین مصرعجات طرح پر مُشاعرہ ہوا تھا، صرف اشتہار کے ایک شعر کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قدر شُستہ اُردوٗ میں شعر کہنے والے یہاں بھی موجود ہیں ؎

کتنی بڑی سرکار ہے کیسا بڑا دربار ہے　　گنجینۂ انوار ہے درگاہ خاکی شاہ ولی

مصرع طرح اوّل ؏ معبودِ حقیقی سے احوال سنا بیٹھے

" " ثانی ؏ دیدار اولیا سے دیدار خدا پایا

بانیٔ مشاعرہ ۔ شاہ محی الدین بادشاہ قادری اُردو منشی ہائی اسکول کدری (مشاعرہ مارچ ۱۹۵۰ء)

ہماری رائے میں جنوبی ہند کو شستہ اُردو میں شعر کہنے والے شعراء سے بے بہرہ جانا غلطی ہے۔ چنانچہ تازہ خبر یہ ہے کہ بنگلور میں یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو ہندو مسلمان شعراء بنگلور و مدراس کا بلند معیار مُشاعرہ ہوا، مشاہیر شعراء امراء و سربرآوردہ اصحاب شریک تھے۔ شعراء میں امامی، محمود ایاز مظہر اللہ، محمود بنگلوری، سیّدہ اختر، بلکہ مدراس کے مشہور شاعر و آصف آرکاٹی بھی بلوائے گئے۔ تابش بنگلوری صدر مُشاعرہ تھے "شمالی ہند کے مہمانوں نے حیران ہو کر کہا کہ ان کو معلوم نہ تھا کہ بنگلور میں اُردو کا یہ مقام ہے"۔

اگر جنوبی ہند کے ادب توجہ کریں تو ٹراونکور، کوچن، وغیرہ میں بھی اُردو کی مقبولیت کا پتہ چل جائے۔ اور حیرت در حیرت کا موجب بن جائے۔

(ہماری زبان یکم ستمبر ۱۹۳۵ء علی گڈھ)

ہم یہاں مقبولؔ کے محاسن شاعری کی تائید میں بعض اشعار پیش کرتے ہیں:۔

بہ طرزِ غالب ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا　　اگر اور زندہ رہتے یہی انتظار ہوتا

مقبولؔ شاہ ؎

نہ بگڑتی اپنی قسمت تو بن آتے کام سارے　　کوئی اپنا یار ہوتا کوئی دستیار ہوتا

مقبولؔ کا یہ مطلع بھی خوب ہے ؎

کوئی شعلہ دل نہ ہوتا نہ کوئی شرار ہوتا　　یہ طپش اسے نہ ہوتی نہ یہ بیقرار ہوتا

داغؔ دہلوی کے رنگ میں ؎

آنکھ اپنی خط کاہکشاں سے جو لڑی رات　　یاد آگئی اے مہ تری موتی کی لڑی رات

کاہکشاں یا کہکشاں؛ انشاء نے اس کو کہکشاں ہی باندھا ہے ؎

حُقّہ جو ہے حضرت مُغلی کے ہاتھ میں　　گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں

محاورہ بندی اور روزمرہ ؎

کچھ ہم سے کہو تم کہ ارادہ ہے کہاں کا
کرتی نئی، انگیا نئی، بالی ہے نئی آج

(دیا یا...)

مرتے مرتے ہجر میں ہم جی گئے　　کچھ دیا ہی اپنے آگے آگیا

گھوڑے دوڑانا ؎

تو نہ آئے اگر اے شاہ سوار خوش خط   گھوڑے کاغذ کے عنایات سے اکثر دوڑا

باتیں چبانا کے محاورہ میں خاص لطف پیدا کیا ہے ؎

نبات اک ایک بات اُن کی ہے مقبولؔ   کریں کیونکر نہ وہ باتیں چبا کر

تیوری چڑھانا ؎

آیا کبھی جو پھول کے رستہ وہ گل اِدھر   تیوری چڑھائی پھول کے بدلے مزار پر

زنجیر زلف کے استعمال میں خاص نزاکت ہے ؎

پھینکتا توڑ کے دیوانہ ترا پاؤں سے   شک نہ ہوتا تری زلفوں کا جو زنجیروں پر

راجہ منالال ہرعشؔ[1] حیدرآبادی تلمیذ عطا جالسی کا یہ شعر بھی خوب ہے ؎

ہر گریہ سے پاؤں دل بیتاب میں زنجیر   جوں موج سے پہنے ہے کنول آب میں زنجیر

سراپائے معشوق میں عجیب نازک خیالی پیدا کی ہے ؎

دیکھ کر سارے سہی قد قامت گل رو کی شاخ   کہتے ہیں یہ تو ہے نخل گلشن مینو کی شاخ

معشوق سے پُر لطف طنز ؎

بار سے میوے کے جھکتی ہیں چمن میں ڈالیاں   بے ثمر پُر خم ہے کیوں اے گل ترے ابرو کی شاخ

مذاق، نادر تشبیہ

"ابرو" کے متعلق اساتذہ لکھنؤ و دہلی کی بہت سی غزلیں ہیں مگر مندرجہ بالا شعر میں عجیب جدّت آفرینی ہے۔

آتش تر آفتاب ؎

ساغر و خم کو کہو ماہ و فلک مے کشو   مے کو جو تم کہتے ہو آتش تر آفتاب

چار پہر ؎

شب کو ہے مہ دن کو وہ رنگ قمر آفتاب   چار پہر چاند ہے چار پہر آفتاب

دہن زخم دل معشوق کی زبان سے ؎

دہن زخم دل اُس گل نے جو دیکھا مقبولؔ   ہنس کے بولا کہ پڑا ہے گل تر میں سوراخ

دل ہوا اپنا دم بادہ کشی جل کے کباب   دیکھ کر اُس لب میگوں کو لب ساغر پر

یعنی ہم سے تو ساغر ہی اچھا ہے کہ اُس کی معشوق کے لب تک رسائی ہے۔

---

[1] تذکرۂ عروس الاذکار قلمی مولفۂ نقش حیدرآبادی۔

رام کلی ؎

بھول کر گانے لگے رام کلی مرغ چمن بہر گلگشت جو وہ غیرتِ گلزار آیا

ماہتابی ؎

چاندنی کا ہے سماں ساتھ ہمارے شب کو ماہتابی پہ کوئی رشکِ قمر چاہیئے تھا

کفن شیر و شکر ؎

ہم تھا عاشق لبِ شیریں کا کسی کے مقبلؔ بعد مردن کفن شیر و شکر چاہیئے تھا

زخمِ دامن دار

بقول مولانا حالی علیہ الرحمۃ ہمارے شعراء نے گریباں[1] و چاک گریباں کو سینکڑوں طرح سے باندھا ہے، نئے اور اچھوتے مضامین پر طبع آزمائی شاعر کا کمال ہے، ایک مضمون مختلف پیرایوں اور متعدد اسلوبوں میں بیان کرنا بھی کمال شاعری ہے۔ لیکن جب ایک ہی مضمون ہمیشہ نئی صورت میں دکھایا جاتا ہے تو تازگی باقی نہیں رہتی (ص ۱۳۲ مقدمہ دیوان حالی) منیر شکوہ آبادی نے ۳۷ بیت کی غزل کہی تھی، زخم دامن دار بھی بڑی اچھی تشبیہہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس خصوص میں لکھنؤ کے ایک شاعر خواجہ مرتضیٰ بقا نے ۴۲ بیت کہے تھے، کسی کلکتہ کے مشاعرے میں۔ اور مشاعرہ جیت لیا تھا، جس کا مطلع یہ تھا ؎

کب دھنک ہے آسمان پر قوس الوان کار کی وہ تو ایک ترچھی کلی ہے زخم دامن دار کی

غرض ہمارے شعراء نے بھی اس کو بیسیوں طریقہ سے باندھا ہے۔

مولانا رضی الدین کیفی تلمیذ داغ کا یہ شعر ہے ؎

پنجۂ وحشت کے ناخن بڑھ گئے آئی بہار دھجیاں اڑنے لگیں پھر زخم دامن دار کی

فصاحت جنگ جلیل[2] فرماتے ہیں ؎

میری وحشت ہو گئی گر دست قاتل کی شریک دھجیاں اڑتی پھریں گی زخم دامن دار کی

قیس کی بلہوس عریانی پہ لیلیٰ رو پڑی جا بجا پیوند دیکھا زخم دامن دار کا

گویا جلیل نے زخم دامن دار کے پیوند کو عریانی کا لباس قرار دیا ہے۔ اور پھر لیلیٰ کا اس کو دیکھ کر رو پڑنا تقاضائے فطرت ہے۔ اسلوب بیان بہت اچھا ہے اسی مضمون کو مقبلؔ شاہ نے بھی، بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ پیراہن تن میں عاشق کے لئے صرف ایک ہی چاک گریبان کافی ہے، جو زخم دامن دار کا ہو شاہ صاحب کا شعر یہ ہے ؎

---

[1] بقا لکھنوی، بیاض خاندانی مملوکہ محمد ادریس، قریشی حیدرآبادی [2] دیوان جلیل مطبوعہ

چاک ہے پیراہن عریانی تن کا مرے		زخم دامن دار قاتل میری تیغ تیز کا
بقول شخصے ع		درون سینۂ من زخم بے نشان زدۂ

فارسی تراکیب اور مشکل زمینوں میں بھی مقبولؒ شاہ خوب کہتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

آہِ سوزاں بان ہے، نالے انارِ آتشیں		ایک اک داغ دل اپنا پھول ہے گلریز کا

عاشق کی مٹی سے بنے ہوئے ساغر کے متعلق بھی شعراء نے عجیب خیال آرائیاں کی ہیں، مٹی میں مل جانے کے بعد بھی اُس کی مٹی کشش عشق اور زندگی کے آثار سے خالی نہیں ہوتی۔ اشرف علی خاں المتخلص بہ فغاںؔ تلمیذ مصحفیؔ کہتے ہیں ؎

جو کہ چمٹیں ترے ہونٹوں سے دم مے نوشی		جان لیجو کہ مری خاک کے پیمانے ہیں

گردھاری پرشاد باقیؔ حیدرآبادی ؎

باقیؔ کسی بدمست کی ہے خاک کا اثر		بے وجہ جذب ہوئے نہیں جام سفال میں

مقبولؒ نے بھی دو شعر کہے جو حسرت و یاس اور نازک خیالی سے خالی نہیں ؎

میں ہوں وہ شکستہ دل جو خاک میں مل جاؤں		ٹوٹے گا بناؤ گے ساغر جو مری گِل کا

خندہ اس کا مثل مینا بادہ خواروں کو رولائے		گر بنے ساغر ہماری خاک درد آمیز کا

منشی امداد علویؒ کا بھی ایک شعر ہے ؎

پسِ مردن بھی ہے احسان ساقی		مری مٹی کا پیمانہ بنایا

جس پر ایک مرتبہ قوالی میں آپ کے ایک، مرید و خلیفہ مولانا میر احمد حسین حیدرآبادیؒ کو بڑا وجد آیا اور عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

شیر علی خاں آیاںؔ حیدرآبادی نے بھی عجیب نازک تخیل دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے ؎

کون دل سوختہ بادیدۂ نم ہے تہہ خاک		سو تو پانی کی جو ہر ایک قدم ہے تہہ خاک

بعض جدید تشبیہات ؎

مُسکرانے سے کھلا جب وہ دہانِ شیریں		ہم نے سمجھا کہ یہ ہے تنگ شکر میں سوراخ

دلِ بیتاب چھدا تیر کمان ابرو سے
نوک ناوک سے ہوا واہ شرر میں سوراخ

علہ دیوان فغاں مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ علہ عروس الاذکار از نقش مخطوطہ۔

خشکیٔ نخل بدن سے سبب نقص دروں　　سوکھے جس دم، کرے زنبور شجر میں سوراخ

عطاؔ جائسی[1] ؎

کان میں کچھ گُل کے صبا کہہ گئی　　آنکھ جو نرگس کی کھلی رہ گئی

مقبلؒ ؎

صبا نے کی جو سرگوشی کچھ اُن سے　　چمن میں ہنس پڑے گُل کھل کھلا کر

فصیح الملک داغؔ دہلوی نے اپنی ایک بے طرح غزل مشاعرہ عظیم آباد ۱۲۹۲ھ[2] میں پڑھی تھی ؎

فرقت کی شب یہ کام لیا دل کے داغ سے　　ڈھونڈا اجل کو تا بہ سحر اس چراغ سے

کھاتے ہیں داغ دوست مرے دل کے داغ سے　　سچ ہے چراغ ہوتا ہے روشن چراغ سے

مقبلؔ کی غزل کے دو شعر یہ ہیں ؎

سینہ بھی داغدار ہوا دل کے داغ سے　　روشن کئی چراغ ہوئے اک چراغ سے

آنکھوں سے جائے اشک بہا خون ساقیا　　کی تو نے چار آنکھ جو چشمِ ایاغ سے

صنعت معمّہ

اُردو زبان میں معمّہ کے شعر نادر و کمیاب ہیں، مومن خاں مومنؔ۔ محسنؔ کاکوروی کے بعض معمّہ دیکھنے میں آئے۔

مقبل شاہؒ نے بھی اپنے تخلص کا معمّہ اس طرح کہا ہے ؎

ذیلِ غم، ردیفِ قلق، فرقِ بکا، قلبِ الم　　انھیں حرفوں سے مرکب ہے تخلص اپنا

گویا مقبلؔ سراپا درد و غم کی تصویر ہے۔

اُردو باکمال شعراء کے معشوق کے سراپا میں، بہت سی غزلیں پائی جاتی ہیں، اور ایک شاعر محسنؔ لکھنوی نے اس قسم کا ایک تذکرہ سراپا سخن[3] لکھا ہے جو طبع ہوچکا ہے۔ مقبل شاہ نے بھی بہترین اشعار کہے ہیں، ہم یہاں شعرا اہلِ زبان لکھنؤ سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں امام، شعرا ناسخؔ کی، ساق کی تعریف میں ایک پوری غزل ہے جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

زانو کی طرح صاف ہیں اُس حور کی ساقیں　　آئینے کی رانیں ہیں، تو بلور کی ساقیں

مانا نہ پری کی ہیں نہ یہ حور کی ساقیں　　یہ نور کی رانیں ہیں یہ ہیں نور کی ساقیں

---

۱ عروس الاذکار از نقش مخطوطہ　　۲ داغ نمبر رسالہ نگار ۱۹۵۲ء

۳ سراپا سخن مطبوعہ۔

شاہ مقبولؒ ؎

آئینہ زانو ہیں تو یہ رانیں ہیں سیم کی   ہیرے کی پنڈلیاں ہیں تری اور زر کے پاؤں

ابرو کی تعریف میں کئی شعراء باکمال لکھنؤ کی غزلیں ہیں، مثلاً

عشقی کانپوری تلمیذ رشک ؎

موج ہے چین جبیں چہرہ ہے تیرا یم حسن   ہیں صدف آنکھیں تو مچھلی ترے خمدار ابرو

خفی لکھنوی ؎

کشتیاں آنکھیں ہیں بیشک خطِ پیشانی موج   مچھلیاں حسن کے دریا میں ہیں اے یار ابرو

چھوٹے آغا قمر لکھنوی ؎

ان کو خنجر کہوں تلوار کہوں یا میں کماں   کیا کہوں کیا ہیں ترے اے بتِ خونخوار ابرو

میر علی اوسط رشک ؎

نظر آتی ہے کمان ابرو خمدار کا عکس   تانتا ہے جو وہ سفاک کماندار ابرو

نادر تشبیہہ[1]

شاہ مقبولؒ ؎

آنکھ میں ساقی کے عکس افگن ہے ابرو کی حسام   یا اٹھی ہے موج یہ جام شراب ناب میں

اُن بھوؤں کا ہے تصور دیدۂ پُر آب میں   دو تواڑے خوش نما چھوٹے ہیں اس تالاب میں

"پاؤں" کے متعلق بھی، ہمارے شعرا نے عجیب عجیب نازک خیالی و جدت آفرینی سے کام لیا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

آتش لکھنوی ؎

سارا یہ شعبدہ ہے ترا اے حنائے یار   مرجاں کے ہاتھ ہیں نہ عقیق یمن کے پاؤں

ناصر نگینوی ؎

دیکھے چراغ لے کے جو ہر سیمتن کے پاؤں   مہندی کے ہاتھ آئیں نہ ایسے پھبن کے پاؤں

آفتاب الدولہ قلق ؎

وہ کون ہے جہاں میں نہیں جس کو حبِّ زر   زاہد لگائیں آنکھ سے اس سیمتن کے پاؤں

ابو ناصر تلمیذ میر کلو عرش ؎

ہیرے کے تھے جو ہاتھ حنا سے بھرے ہیں لعل   مرجان کی شاخ تر ہوئے مہندی میں سن کے پاؤں

---

[1] دیوانِ مقبولؒ قلمی کتب خانہ قادر علی شاہ ساکن کڑپہ۔

عبداللہ خاں مہر ؎

حسن صفا سے کان جواہر بنے ہو تم　　　الماس کی ہے ساق عقیق یمن کے پاؤں

مقبول شاہ ؎

مہندی سے لال دیکھ کے اُس فتنہ گر کے پاؤں　　　کہتے ہیں سیم ساق یہ ہیں سرخ زر کے پاؤں

بازو۔　امین الدولہ مہر تلمیذ رشک لکھنوی ؎

اُترے دریا میں تو تو ہو جائیں　　　مچھلیاں بے قرار بازو پر

مُحسن علی محسن تلمیذ وزیر لکھنوی ؎

نہ اس کو مچھلی سمجھتے یہ دل ہے عاشق کا　　　اسی سبب سے ہے اس کو قرار بازو پر

مقبول شاہ ؎

بازو قاتل کی مچھلی کا نہیں خنجر میں عکس　　　ہے گریہ ماہی دریا چُھری کی آب میں

اُردو زبان میں نعت گوئی

شمالی ہند میں مولانا محسن کاکوروی اور غلام امام شہیدؒ کو نعت گوئی میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، آخر الذکر کا میلاد نامہ بہت مشہور ہے، جس میں قصہ دائی حلیمہ بھی شامل ہے اسی قصہ کا ایک نسخہ پروفیسر ڈاکٹر زور حیدر آبادی کے ادارہ ادبیات[1] میں ہے. مگر تعجب ہے وہ لکھتے ہیں کہ مصنف نامعلوم ہے اور سنہ تصنیف قبل ۱۲۵۰ھ لکھا ہے یوں تو قدیم دکھنی شعرا نے میلاد نامے بھی لکھے ہیں، مگر نثر میں بھی ایک عجیب میلاد نامہ ''منظر انسانی'' کے نام سے ایک دکھنی مصنف مولانا عبدالعزیز مہاجر نائطی[2] مدراسی کا لاجواب ہے۔

حسن اتفاق سے ہماری نظر سے ایک نعت کی قدیم بیاض مکتوبہ ۱۲۹۰ھ[3] احمد حسین قمر مدراسی کی گذری تھی، جن میں اکثر دکھنی شعرا کا نعتیہ کلام تھا۔ بلند پایہ شعراء میں، قمر مدراسی، ذکا مدراسی، شاد (بنگلوری؟) لطف، بندہ، صمد، ولی ویلوری، شاہ کمال کڑپوی، فیض حیدر آبادی، وغیرہ ہیں۔ بعض اہل ہنود کایستھ فرقہ کے نعتیہ دیوان فارسی بھی دیکھنے میں آئے۔ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے تو معراج نامہ اُردو[4] میں لکھا تھا۔ جس سے واضح ہے کہ جنوبی ہند میں نعت گو شعرا کی بھی کمی نہیں رہی۔

---

[1] فہرست مخطوطات ادارہ ادبیات اُردو مرتبہ ڈاکٹر زور [2] تذکرہ نوایط مرتبہ عزیز جنگ ولا مدراسی مطبوعہ حیدر آباد [3] بیاض قلمی کتب خانہ عمر یافعی حیدر آبادی [4] رسالہ اُردو انجمن ترقی اُردو۔

مقبولؒ کے جد امجد شاہ کمال کو اس صنف میں کمال حاصل تھا، یہ اُس وقت کی بات ہے جبکہ اُردو زبان عبوری دور سے گذر رہی تھی، آپ کے بعض قصیدے مرصع قاآنی کے رنگ میں ہیں، گو زبان دکھنی ہے مگر فصاحت و بلاغت بلا کی ہے جس کا ایک مختصر نمونہ مضمون شاہ کمالؒ مندرجہ رسالہ اُردو اپریل ۱۹۳۲ء میں دیا گیا ہے۔ شاہ کمال حیدرآبادی المتوفی ۱۲۳۵ھ شاہ کمالؒ کے حسب ذیل اشعار بہت جوش میں پڑھا کرتے تھے ؎

سخا کے معدن، عطا کے مخزن وفا کے خرمن صفا کے درپن　　　رضا کے مامن، حیا کے گلشن، سرا کے مالی نبی امی

گوش تیرے ہیں گہر ہائے فا وحیٰ کے صدف

باغ ما زاغ کے نرگس ہیں دونوں نین تیرے

یہ صافی رو یہ ہر دو ابرو، یہ قد دلجو یہ چشم جادو

مثال درپن، ہلال روشن، نہال گلشن، غزال صحرا

غلام مصطفیٰ عشقی بیدری (حیدرآباد دکن) بڑے عاشق رسولؐ تھے، مرحوم کا عربی سلام ایسا مقبول ہوا ہے کہ کوئی محفل میلاد آج بھی ایسی نہیں جہاں یہ نہ پڑھا جاتا ہو۔ متاخرین میں شائق حیدرآبادی مرحوم کے قصائد بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔

مدراس میں سید صادق حسینی شریف مدراسی ایک بلند پایہ نعت گو تھے۔ "حدیث شریفعہ" آپ کا ایک نعتیہ دیوان ہے جو چھپ چکا ہے، فرماتے ہیں ؎

لکھ کے توصیف نبی نظم کا میداں جیتا　　　نہ رہا آہ مرے عہد میں حساں جیتا

دشت یثرب میں جنونِ رخِ سرور کے طفیل　　　میں نے سو مرتبہ مجنوں سے بیاباں جیتا

میں مدح گوئے پیمبر ہوں مجھ سے کیا نسبت　　　شریف آئیں جو سو ناسخ و ہزار آتش

اسی زمانہ میں غالباً محمد قاسمؒ شاد بنگلوری کا کلام بھی ہے جنھوں نے سراپائے نبی اکرم لکھنے میں کمال کیا۔ تبرکاً ایک بند پیش ہے ؎

گر وصف کروں ابرو کا ساتھ آنکھ کے تکرار　　　کعبہ کہوں ان کو تو یہ ہیں عابد بیمار

یا ساغر بلوریں طاقوں میں نمودار　　　یا ترک ہیں کھینچے ہوئے کفار پہ تلوار

یوں مردمک چشم ہیں سایے میں پلک کے

بچے کو گویا حور سُلاتی ہے تھپک کے

عہ حدیث شریف مطبوعہ (کتب خانہ آصفیہ ۲۸) رسالہ اُردو ۱۹۲۹ء غالباً یہ وہی شادؔ ہیں، مدیر قاسم الاخبار مدراس۔

سراپا میں شاؔد نے گیارہ بند کہے مگر مقبلؔ نے تو ستہتر بند کہے ہیں، جو مطبع فخر المطابع لکھنؤ میں چھپ چکے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت ہم کو اس کے صرف چند ہی بند مل سکے، دو بند ہدیۂ ناظرین ہیں جس میں تصوف کا عنصر غالب معلوم ہوتا ہے ؎

قدرت حق کا دکھاتا ہوں تماشا دیکھو　　چہرہ میں کثرت و وحدت کا ہے جلوہ دیکھو
منھ تو ہے ایک مگر اس میں ہے کیا کیا دیکھو　　بینی و چشم و لب و ابروِ زیبا دیکھو
سر بسر دیکھو تو کثرت ہے عیاں وحدت میں
سچ اگر پوچھو تو وحدت ہے نہاں کثرت میں

شق کیا آپ نے انگلی سے فلک پر جو قمر　　ہوئے انگشت بلب دیکھ کے سب پیغمبر
دست روشن پہ پڑی حضرت موسیٰ کی نظر　　ید بیضا کو چھپا لینے لگے شرما کر
دست مخلوق کو اس ہاتھ سے لگا کیا ہے
ید بیضا کو ید اللہ سے دعویٰ کیا ہے

شاؔد ؎

رکھتی ہیں گلشن بطحا کی تمنا آنکھیں　　شکل نرگس مجھے ہو جاویں سراپا آنکھیں
مجھ سے کیا ہو سکے اے قبلۂ عالم تشبیہ　　ہیں بھویں کعبہ کی محراب تو کعبہ آنکھیں

مقبل شاہؔ ؎

نرگس گلشن جنت کی ہوں ششدر آنکھیں　　دیکھ پائیں شہ کونین کی گر وہ آنکھیں
سر کی آنکھوں سے وہ دیکھے شب اسرار رب کو　　کس پیمبر کو ہوئیں ایسی میسر آنکھیں

نوٹ

جناب سخاوت مرزا صاحب نے اپنے اس مضمون کی گذشتہ اشاعت کے صفحہ ۱۵ پر حاشیہ میں میری بعض فروگذاشتوں کی وضاحت کی ہے، اس وضاحت کے اہم جُزو دو ہیں پہلا جُز میرے بیان کئے ہوئے اور شاہ صاحب کے لکھے ہوئے حالات کے اختلاف سے متعلق ہے اور دوسرا جُز ان کے عہد تصانیف کے آغاز سے متعلق۔

پہلے جُز کے سلسلہ میں گذارش ہے کہ میں نے جو حالات شاہ صاحب کے بیان کئے ہیں وہ دراصل انہیں کی تصانیف میں اشارات کی شکل میں مجھے مختلف ذرائع سے ملے تھے

یہ ذرائع تین قسم کے تھے ایک شاہ صاحب کا اپنا بیان، دوسرا ان کے فرزند شاہ صوفی کے نوٹس، تیسرا آفر کی تقریظیں۔

جہاں تک شاہ صاحب کے اپنے بیان کا تعلق ہے مجھے کہیں ان کے حالات سے متعلق ان کی اپنی لکھی ہوئی کوئی چیز نہیں ملی، سوا اس کے کہ انھوں نے جنان السیر اور سر الشہادتین وغیرہ کے بعض مقامات پر بزرگانِ ویلور کا ذکر کیا ہے اور ان کی منقبت بھی لکھی ہے، اس کے برخلاف صوفی صاحب نے جنان السیر پر جابجا حاشیے دیئے ہیں، کہیں شاہ صاحب کا سنہ وفات ہے تو کہیں ان کے تصانیف کی فہرست، کہیں ان کی عمر ہے تو کہیں ان کے حالات سے متعلق بعض جملے، اسی طرح آفر نے بھی جنھوں نے عام طور پر شاہ صاحب کی تصانیف پر تقریظیں لکھی ہیں اور جن کے مجموعۂ قصائد میں بزرگانِ ویلور وغیرہ پر بعض قصیدے بھی ہیں۔ اپنی بعض تقریظوں میں ان کے بعض حالات کی طرف اشارہ کیا ہے، ان دونوں ذرائع سے مجھے جو اشارات ملے وہ اس قدر بکھرے ہوئے اور ذرہ ذرہ تھے کہ مجھے اپنے ہر جملہ کی تائید میں ان کا نقل کرنا اور مضمون کو پہیلی بنانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا اس لئے اس کے مفہوم کو میں نے اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا، حالانکہ اس طرح پیش کرتے ہوئے خود مجھے اطمینان نہیں تھا، اس وقت ایک چھپے ہوئے مضمون کے سوا اس سلسلہ کی کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے، ورنہ میں اپنی صفائی کے لئے اُن اشاروں کو نقل کر دیتا، لہذا مرزا صاحب کا یہ خیال کہ میری نظر سے مطلع انور نہیں گذری بالکل صحیح ہے، واقعی مطلع النوّر میری نظر سے نہیں گذری اور نہ میں نے اپنے مضمون میں کہیں یہ دعویٰ کیا ہے، مطلع النوّر سے متعلق میرے جملے صرف یہ تھے:۔

"شیدا کی اس قابلِ رشک وفات کا تذکرہ شاہ صاحب نے مختصر طور پر جنان السیر کے اُس نسخہ میں کیا ہے جو شیدا کی وفات کے بعد شائع کیا گیا تھا اس میں وہ لکھتے ہیں کہ اگر مفصل حالات معلوم کرنے ہوں تو مطلع النوّر کا مطالعہ کرو۔"

اِن جملوں سے صاف ظاہر ہے کہ مجھے مطلع النوّر کا علم بھی شاہ صاحب ہی کے حوالے سے ہوا ہے، اگر یہ کتاب میری نظر سے گذرتی تو میرے بیان کئے ہوئے حالات میں اور ان کے اپنے لکھے ہوئے حالات میں اس طرح فرق نہ ہوتا، اور پھر اِس کا تعارف بھی میں دوسری دستیاب شدہ کتابوں کی طرح دو چار جملوں میں ضرور کراتا، بہر حال مطلع النوّر میری نظر سے نہیں گذری جس کی وجہ سے یہ فروگذاشت مجھ

سے ہوئی ہے، میں مرزا صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کی وضاحت کردی۔

مرزا صاحب کی وضاحت کے دوسرے جُز کے سلسلہ میں جو شاہ صاحب کے آغاز تصانیف سے متعلق ہے، گذارش ہے کہ ان کے اعتراض کے مورد میرے مضمون کے شاید حسب ذیل جملے ہیں:۔

" انیس سال کی عمر میں انھوں نے تبلیغ وارشاد کا سلسلہ شروع کیا جو زبان وقلم دونوں کے ذریعہ زندگی بھر جاری رہا۔"

اُن سے اوّل تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ میں اِن جُملوں کے ذریعہ شاہ صاحب کا اُنّیس سال کی عمر میں مُصنّف ہونا ثابت کر رہا ہوں، لیکن اگر ان سے یہ بات معلوم ہوتی بھی ہو تو شاید بڑی حد تک یہ حقیقت سے دُور بھی نہیں ہے، کریمی لائبریری بمبئی میں اُن کا ایک رسالہ " تحفۂ طرفین و ہدیۂ طریقین" ہے اس کو مطبع حیدری بمبئی نے ۱۳۰۲ھ ہجری میں شائع کیا ہے، اِس رسالہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ اس سے پہلے ۱۲۷۶ھ میں بنگلور سے شائع ہوا تھا، اس کی اِبتدا میں اس کے ناشر محمد قاسم صاحب مرحوم نے جو نوٹ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

" یہ نسخۂ جلیلہ .... جناب مولانا مولوی عبدالحی صاحب مدظلہ العالی نے جواب میں .... رسالدار بلند خاں صاحب شروانی اور بعضے سائلین بنگلور کے تحریر فرمائے تھے جب مقبول و مُستندِ خاص و عام اور موجب اصلاحِ اُمّتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ و السّلام کا تھا تو یہ بندۂ آثم محمد قاسم المتخلص نجم نے محض بہ نیت اصلاحِ اُمّتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم مطبع فردوسی میں چھاپا کروایا، چونکہ یہ رسالہ ۱۲۵۱ھ ہجری میں بنا سوء اختلاف فریقین کے اٹھا دینے میں رقم ہوا۔ نام بھی تحفۂ طرفین و ہدیۂ طریقین جس میں سال مذکور حاصل ہے رکھا گیا، خدائے تعالیٰ سب مسلمانوں کو آپس میں ملا دیوے۔"

اسی رسالہ میں صفحہ پچیس پر ہمارے اسلاف کی رواداری کی مثالیں دیتے ہوئے شاہ صاحب نے اپنی ایک تصنیف کی طرف اس طرح توجہ دلائی ہے:۔

"اس فقیر نے رسالۂ تنبیہ العوام میں بھی جو ۱۲۴۶ھ ہجری میں تصنیف پایا ہے احتیاط کا بیان لایا ہے اور عوام کو اس جھگڑے میں دخل دینے سے منع کیا ہے۔"

ان حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ جنان السیر ان کی پہلی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس سے پیشتر بھی وہ کم از کم مذکورۂ بالا رسالے ضرور لکھ چکے ہیں، ان کے سن آغاز تصنیف کا ان کے سن حیات سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالے سترہ اور بیس سال کی عمر میں لکھے گئے ہیں۔

ممکن ہے کہ تحفہ میں تنبیہ کا جو اس سے ۳ سال بعد لکھا گیا ہے، حوالہ دیکھ کر یہ خیال پیدا ہو کہ جو رسالہ انھوں نے سنہ ۱۲۵۱ھ میں لکھا اس میں سنہ ۱۲۵۴ھ کے رسالہ کا ذکر کس طرح کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ جو لوگ جنان السیر وغیرہ کے مختلف ایڈیشن دیکھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلاء صاحب ہر نئے ایڈیشن میں جو ان کی اجازت سے چھپتا تھا ترمیم و اضافہ کرنے کے عادی تھے۔ چنانچہ یہ رسالہ بھی سنہ ۱۲۵۴ھ میں ترمیم و اضافہ کے بعد ہی چھپا ہوگا اور اسی لئے اس میں انھوں نے تنبیہ کا ذکر بھی کر دیا ہے۔

(حامد اللہ ندوی)

معاصرین سے التماس

ہم اپنے معاصرین سے ملتمس ہیں کہ "نوائے ادب" کے ضمیمۂ مقالہ نما کی ترتیب کو جامع اور ہمہ گیر بنانے میں ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اپنی مطبوعات و رسائل کی ایک ایک جلد مندرجۂ ذیل پتوں پر ارسال فرمائیں۔

(۱) سکریٹری دائیلرس امپوریم لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۱۱ بمبئی ۱

(۲) سکریٹری انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲، دادا بھائی نوروزجی روڈ بمبئی ۲

راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند

(جناب قاسم علی صاحب سجن لال)

ہم اس مضمون میں راجہ شیو پرشاد کے خیالات زبان اُردو ہندی پر کیا تھے ان کو پیش کریں گے۔ اور اس مضمون میں زیادہ تر ہم ان ہی کے مضمون "کچھ بیان اپنی زبان کا" سے بہت کچھ استفادہ کرینگے۔ بات یہ ہے کہ اس مضمون کے کچھ مختصر ٹکڑے ۱۸۶۸ء ہم عصر اخباروں میں شائع ہوئے ہیں۔ اب خوش قسمتی سے ہم کو ان کا مکمل مضمون زبان پر ہاتھ لگا ہے۔ کاغذ پُرانا ہونے کی وجہ سے کچھ کرم خوردہ ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔

راجہ شیو پرشاد نے پہلے اپنے مضمون "دَورِ قدیم کی زبان" کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے۔

"اس ملک کے ابتدائی رہنے والے کون تھے۔ اور اُن کی زبان کیا تھی۔ یہ بات صرف خیال و قیاس سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ زبانِ تامل اور تلگو کی جڑ تھی کہ جو اب تک دکھن میں جاری ہے اور سنسکرت سے کچھ بھی علاقہ نہیں رکھتیں یا ان بہت سی زبانوں میں سے کسی کی جڑ تھی جو اب بندھیا کے آس پاس جنگل پہاڑیوں کے رہنے والے پہاڑوں کے درمیان رائج تھیں۔ ہم کو اس مقام پر اتنا بھی کہنا چاہیئے کہ وہ سنسکرت ہرگز نہیں تھی۔ سنسکرت کے متعلق اس ملک میں آریہ لوگوں کے ساتھ یعنی برہمن۔ کشتری۔ اور ویشہ کے ساتھ کہ جن کی وہ بولی تھی، جانب شمال و مغرب یعنی ہندوکش ہمالے پار' اُترکر دیش سے آئی، ثابت ہے کہ یہاں کے ابتدائی باشندے اس ملک کے ہر حصّے میں جُدا جُدا قسم کی بولیاں بولتے تھے۔ اِس سے مطلب نہیں کہ کِس قدر ابتدائی باشندے قدم بہ قدم ہٹتے ہوئے دکھن کو چلے گئے۔ خواہ دشوار گذار جنگل پہاڑوں میں پناہ گیر ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی جماعت نے شودر کے نام سے اپنے ظفریاب گورے دشمنوں کی یعنی آریہ لوگوں کی اطاعت قبول کی اور ان کی نئی آبادیوں میں آباد ہوکر شمار میں آئے۔ گو نہایت خوار ذلیل اور خدمت گذار تھے۔ تاہم وہی

نہایت کارآمد تھے۔ پردیسیوں کو اکثر عورتوں کی تلاش رہتی ہے اور اس باعث سے اونچے بدن والوں کو شودروں کی عورتیں لینے میں یقین ہے کہ کچھ زیادہ پرہیز نہ رہا ہو۔ پس اس حالت میں ضرور وہ خطرہ برہمنوں کے دل میں گزرا ہوگا کہ جس میں ابتدائی باشندوں کے ساتھ اس طرح کی راہ و رسم پیدا ہونے سے ان کی زبان یعنی وید کی زبان پڑ گئی تھی۔ اور وہ بڑے شکر گزار ہوئے ہوں گے۔ پانینی کے جب اس نے اپنی لاثانی اور حیرت انگیز قاعدے کی کتاب یعنی کودی بنا کر اُن کی زبان کو قائم اور مستحکم کردیا۔ پانینی نے جبکہ اس زبان کو قائم کیا ضرور اس کو کسی قدر ان آلائش اور آمیزشوں سے پاک وصاف بھی کرنا پڑا ہوگا کہ جو اس وقت تک اس میں بھر گئی تھیں۔ اور اس لئے اس کا نام سنسکرت پڑا۔ کیونکہ "سن" مکمل اور دُرست کو کہتے ہیں اور "کرت" کے معنی بنایا ہوا۔ سنسکرت کے معنی لغت میں (۱) موضوع و مصنوع (۲) آراستہ (۳) پیراستہ (۴) مُصفّا (۵) منزہ (۶) کمل (۷) مقدس (۸) منضبط (۹) قواعد صرف و نحو کے بموجب بنائی ہوئی زبان اتنے لکھے نین۔ برہمنوں کا پیشہ درس و تدریس تھا۔ اور اُن کی بزرگی اور اُن کی روزی اِسی سنسکرت زبان کے علم پر منحصر تھی، بلا شک ان کو حسبِ اقتضائے بشریت حسد ہوا ہوگا کہ کہیں عوام الناس یعنی ابتدائی باشندے اور دو نسلے جن کو منوجی نے "انتر پرکھو" لکھا ہے اس کو سیکھ نہ لیویں۔ انھوں نے ایکبارگی ان کے لئے اس کا دروازہ بند کردیا اور انھیں اس کے درس و تدریس کی کلّی ممانعت کی اور وجہ اس ممانعت کی یہ قرار دی کہ پانینی کا صرف و نحو سنسکرت ویدانگ یعنی جزو وید ہے کہ جس کو جہاں تک کوئی شودر سن سکے (سیکھے) پڑھنا بھی منع ہے اور شودروں کو سکھلانے کی تو کون سی بات ہے۔ اور نام اس کا دیو بانی رکھا یعنی زبان دیو۔ دیو سنسکرت میں خدا بادشاہ اور برہمن کو کہتے ہیں۔ ماسوا اس کے عوام الناس کو اُس حالت میں سنسکرت لفظوں کا صحیح تلفظ کرنا بھی بہت مشکل پڑا ہوگا اور پراکرت کے نام سے وہ اُن کی نئی نئی زبانیں وجود میں آگئی ہوں گی کہ جو ایسا قریب قریب سنسکرت سے علاقہ رکھتی تھیں۔ پراکرت مشتق ہے پرکت سے یعنی طبیعت اور اُس کے معنی ہیں مُستخرج۔ جب ایک زبان سے کوئی دوسری زبان نکلتی ہے۔ اصلی زبان کو اُس دوسری زبان کی پراکرت کہتے ہیں۔ ہیم چندر مشہور نعت والا لکھتا ہے کہ پراکرت

کی اصل سنسکرت ہے۔ کیونکہ جو کچھ سنسکرت سے نکلے اسی کا نام پراکرت رکھا جاسکتا ہے قطع نظر اس کے ایک اور بھی فرق ان دونوں لفظوں سے یعنی سنسکرت اور پراکرت سے معلوم ہوتا ہے۔ سنسکرت اُن لوگوں کو کہتے ہیں جو مہذب ہیں۔ اور پراکرت ان کو جو غیر مہذب ہیں۔ پس پراکرت ان بولیوں کا نام رہے گا جو مفصل میں عوام النّاس بولتے ہیں۔

الغرض پراکرت وہ زبان ٹھہری جو سنسکرت الفاظوں سے بنی تھیں مگر بموجب تلفّظ عوام النّاس یعنی جس طرح پر ان کو عوام النّاس استعمال میں لائے تھے اور جن میں ابتدائی باشندوں کے الفاظ ملے ہوئے تھے اور صرف و نحو اُس کا کسی قدر سنسکرت ... نکال کر ہر ایک ضلع کے حسب حالات و مواقع کچھ نہ کچھ تغیّر و تبدّل کرکے اپنے اپنے طور پر ترتیب دے لیا تھا ہم یہاں مثال کے طور پر چند الفاظ بتلاتے ہیں جو ابتدائی باشندوں کی زبان سے یعنی پراکرت میں آگئے اور سنسکرت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے۔

پرانی پراکرت	نئی پراکرت یعنی ہندی	سنسکرت
गोडम्	गोड़	पादम.
पोट	पेट	उदरम
छिणालिया.	छिनाल.	पुंश्चकी.
खुंटा	खुंटा.	स्तमम
डुब्बन्तम.	डूबना.	मज्जन्तम
घोट्ट	घूटना	पिब.

اور نیچے وہ الفاظ لکھے جاتے ہیں جو سنسکرت سے پراکرت میں آگئے ہیں۔

سنسکرت	پرانی پراکرت	نئی پراکرت یعنی ہندی
शृणु.	सुणु	सुन
घृतम.	घिअम	घी
दधि.	दही.	दही
नृत्य	णच्च	नाच
मुखम	मुहम	मुह
बधिर.	बहिर	बहिरा.
मेघ.	मेहो	मेह
कथय.	कहदि	कह

نئی پراکرت یعنی ہندی	پرانی پراکرت	سنسکرت
बहु	वहु	वधु
काज	कज्ज	कार्य्य
आज	अज्ज	अद्य.
चमार	चम्मारओ	चर्मकार.
कुम्हार	कुम्मारो	कुममकार.
सब	सब्बम	सर्व्वम
सच	सच्चम	सत्यम
हाथ	हत्थी	हस्त
बुड्ढा	बुड्ढ	वृद्ध
सेठ	सेट्ठि	श्रेष्ठि
सूखा	सुक्ख	शुष्क
पोथी	पोत्थआी	पुस्तकम
पोखरा	पोक्खर	पुष्कर.
दहिना	दहिणम	दक्षिण
खेत	खेत	क्षत्रम
मट्टी	मट्टिआ	मृत्तिका.
रीछ	रिच्छ	ऋक्ष
मोर	मोरि	मयुर
बाहिन	बाहिर.	वहिश.
हलदी.	हलद्दी	हरिद्रा.
संझा	संझा	संध्या.
सूई	सई	सूची.
गहिरा	गहिरम	गभीरम
छट	छट्ठी	षष्ठी
तेरह	तेरह.	त्रयोदश.

سنسکرت	پرانی پراکرت	نئی پراکرت یعنی ہندی
षट	छ	छ
बिंशति.	वीसई	बीस
दुहिता.	धीआ	धी
याष्टि	लट्ठी.	लाठी
बाष्य.	बापफो	बाफ
मत्स्य.	मच्छ	मछली.
यः	जो	जो
उतिष्ठ.	उट्ठेहि	उठ

جوں جوں یہ تمام پراکرتیں یعنی یہاں کے ضلع ضلع کی بولیاں یعنی ماگدھی۔ اُردو ماگدھی۔ شورسینی۔ مہاراشٹری۔ شادری۔ ابھیری۔ چنڈالی۔ پیشاچی وغیرہ اعلیٰ برتوں کے نزدیک گنواری اور بہت ذلیل رہیں اور راج دربار یعنی کچہریوں کی زبان سنسکرت بنی رہی حتّٰی کہ تولّدِ مسیح سے ۵۴۳ برس پہلے شاکیہ منی گوتم بدھ مت والے نے ایک ایسا انقلابِ عظیم برپا کیا جو آج تک دُنیا میں سنا بھی نہیں گیا۔ اُس نے اپنا مذہب عوام النّاس کے لئے بنایا۔ اس نے اپنا بیان عوام النّاس کو سمجھانا چاہا۔ اور اس نے ان کی زبان میں وعظ کہنا شروع کیا پراکرت۔ عورت بچے۔ خواندہ، ناخواندہ سب سمجھتے تھے اور انھیں مگدھ یعنی جنوبی بہار پراکرت یعنی ماگدھی کہ جو بودھ مت کا گویا مولد تھا یکبارگی درجہ اعلیٰ کو پہنچ گئی۔ اور دیسی زبان مذہبی زبان اور دیسی زبان درباری قرار پائی۔ اور علوم و فنون کے اس زبان میں کُتُب خانے ہوں گے اور کوئی سو دو کم دو ہزار برس گذرے ہیں "وررچ" نے اس کے لئے قواعد صرف و نحو بھی منضبط کردے۔ سنسکرت گویا اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ گئی۔ سنسکرت کی گویا موت آئی۔ صرف کسی کسی جگہ میں جہاں کے راجاؤں نے ویدک مت نہیں چھوڑا تھا بنی رہی۔ یہاں تک کہ بودھ مت والوں نے باپ کو بیٹا اور بیٹے کو باپ قرار دیا اور لکھ دیا کہ "ایک زبان ہے جو تمام زبانوں کی اصل ہے اور

ابتدائے آفرینش میں انسان اور برہمن جنھوں نے کبھی کچھ کیا سنا نہ تھا بلکہ قادرِ مطلق بودھ لوگ بھی اسی میں بولتے تھے اس کا نام ماگدھی ہے۔"

सा – मागधि मूल भासा नरा ये यादि कप्पिका ब्रह्माना
चस्सु तालीपा सम्बुद्धा चापि भासरे.

جب شری شنکر آچاریہ نے آٹھویں یا نویں صدی کے قریب بودھوں کو یہاں سے نکالا سنسکرت کو پھر رائج کرنے کی کوشش ہوئی لیکن شنکر سوامی کے بھی مقدور سے باہر تھا کہ پراکرت کو معدوم کریں اور سنسکرت کو روز مرّہ کے تمام کام اور آپس کی بول چال کے لئے رائج زبان بنادیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ چند روز کے لئے سنسکرت دھارا کے راجا بھوج اور قنوج کے راجہ راٹھور کے درباروں میں بڑے آب و تاب کے ساتھ چمک گئی تھی۔ لیکن پراکرت کو (اور یہاں غرض اس پراکرت سے ہے جو مگدھ سے لے کر متھرا کے آگے تک ماگدھی اور شورسینی کے نام سے بولی جاتی تھی) کچھ دن بعد ایسے سخت اور زبردست دشمنوں سے کام پڑا کہ اب تک کبھی نہیں آئے تھے۔ یہ اہل اسلام تھے۔ یہ فارسی بولتے تھے اور انھیں کے ساتھ فارسی اس ملک میں آئی۔

ان لوگوں نے اپنی فارسی یعنی زبانِ فارس کے مقابلہ میں پراکرتوں کا نام ہندی یعنی زبانِ ہند رکھا۔ اس زمانہ تک پراکرتوں میں رفتہ رفتہ بڑے بڑے تغیر و تبدّل ہو گئے تھے اختصار اور آسانی تلفظ کے باعث بہتیرے لفظ بالکل بدل گئے تھے۔ املا میں بھی فرق آگیا تھا۔ نئے نئے لفظ شامل ہو گئے تھے۔ پرانے بہ مشکل پہچانے جاتے تھے۔ چنانچہ تمام دُنیا کی زبانوں کا یہ ہی دستور ہے۔ "سر چارلس لایل" کہ جو بڑا زبردست عالم ہے کہتا ہے "کہ دُنیا میں کوئی زبان بھی ہزار برس سے زیادہ قائم نہیں رہتی ہے۔ جو زبانیں کہ اب بولی جاتی ہیں، ہزار برس پیشتر ان میں سے کسی کا بھی وجود نہ تھا۔ یعنی ٹھیک اسی طرح پر کوئی بھی بولی نہیں جاتی تھی۔ اور اس طرح پر بہت قدیم زبانیں تغیر و تبدّل پاکر اور بہت سی زبانیں متواتر بن کر تب ان حال کی زبانوں میں منتقل ہوئی ہیں۔" اب اس زمانہ کی پراکرت وہ پراکرت نہ تھی جس میں بودھ نے وعظ کیا تھا، پریاگ اور دہلی کی بولیوں میں وہاں کی ان بولیوں کی نسبت

جو دو ہزار برس پیشتر وہاں بولی جاتی تھیں اور جن میں مہاراج دھرم اشوک کا حکمنامہ پتھر کے کھمبوں پر کھدا ہوا ہے۔ بہت فرق آگیا تھا۔ اس فرق کے دکھلانے کے لئے ہم نے اوپر کی فہرستوں میں ایک خانہ کے درمیان نئی پراکرت یعنی ہندی کے نام سے ان لفظوں کو بھی لکھ دیا ہے جو اب بولے جاتے ہیں۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کی شکل پہلے پراکرت میں کیا تھی اور اب اس ہندی میں کیا ہوگی۔ اہل اسلام کی سلطنت میں یہ فارسی الفاظ اور فارسی محاوروں سے بالکل بھر گئی۔ فارس کی قدیم زبان یعنی ژند اوستا سنسکرت سے بہت مناسبت رکھتی ہے۔ بلکہ دونوں ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ مثال کے طور پر چند الفاظ جو ہم یہاں لکھتے ہیں اُن کے تلفظ اور معنی کی مناسبت سے ہمارا یہ دعویٰ فوراً پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا۔

कदीमे फारसी	संस्कृत		
(۱)	(۲)	(۱)	(۲)
पैतर	पितृ	मैध्य	मध्य
भ्रातर	भ्रातृ	मिरेथ्यु	मृत्य
पैति	पति	पध	पाद
अस्प	अश्व		
बाच	वाच		
जेनु	जानु		
मधु	मधु		
व श्र	वस्त्र		
वैरि	वारि		

لیکن یہ نئی فارسی جس نے ہماری پراکرت کو معمور کر دیا خود عربی سے بھری ہوئی آئی۔ عربی سنسکرت سے مطلق تعلق نہیں رکھتی۔ پراکرت نے فارسی کے ساتھ عربی کو بھی اپنے اندر جگہ دی اور احکام شرع اسلام جو اس وقت قوانین مجریہ ہندوستان تھے عربی زبان میں ہونے کے باعث عربی زبان تمام ہر کیا خاص اور کیا عام سب

کی روز مرّہ بول چال ہوگی۔

اب اس نئی زبان کو یعنی اس اپبھرنش پراکرت کو جسے فارسی اور عربی ملی ہندی کہو چاہے ہندوستانی بھاکھا کہو۔ چاہے برج بھاکھا۔ ریختہ کہو چاہے کھڑی بولی۔ اُردو کہو چاہے اُردوے معلّی۔ اس کے تخم تب ہی سے بوئے گئے کہ جب محمود غزنوی نے چڑھائیاں کیں اور اہل اسلام کی اس ملک پر توجہ ہوئی۔ آٹھ سو برس سے زیادہ گذرتے ہیں دہلی اور آگرہ یہ دونوں اس وقت گمنام تھے۔ قنّوج گویا ہندوؤں کی سلطنت کا دارالحکومت اور پایہ تخت گنا جاتا تھا۔ سنسکرت کا علم وہاں اپنے اوج پر تھا۔ یہ قنّوج ہی تھا جہاں سے بنگالے کے راجا آدستر نے کلین براہمن منگوائے۔ بنارس قنّوج کے تابع تھا۔ متھرا کا شہر بھی بڑی رونق پر تھا۔ محمود غزنوی ان دونوں شہروں کی بڑی بڑائی لکھتا ہے۔ لیکن کمال افسوس کی بات ہے کہ اس وقت کی بھاکھا میں لکھی ہوئی کوئی قدیم پستک اب دستیاب نہیں ہوتی۔ سب سے قدیم اس زبان کی پستک اب ہم لوگوں کو ہاتھ لگی ہے۔ مشہور بھاٹ چند کا ...... پرتھوی راسا بھی۔ کہتے ہیں بھاٹ چند کانگڑے کا رہنے والا تھا۔ پرتھوی راج سومیشر چوہان اجمیر والے کا بیٹا تھا۔ اپنے نانا اننگ پال راجہ دہلی کو گود بٹھایا تھا۔ شہاب الدّین غوری نے ۱۱۹۳ء میں اس کے گلے پر چھرا پھروادیا اور تب ہی سے ہندوستان میں اہلِ اسلام کی سلطنت قائم ہوئی۔ پرتھوی راج کے تحت میں دہلی اور اجمیر کا راج ایک ہوجانے کے باعث کسی قدر دہلی نام آور ہوگئی تھی۔ لیکن زیادہ دہلی کی نام آوری کا باعث یہ ہے کہ وہ تب سے برابر اہل اسلام کی دارالسلطنت رہی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ چندن زبان یعنی جس زبان میں اس نے پرتھوی راج راسا لکھا ہے، یہ آیا قنّوج کی زبان تھی یا متھرا کی یا کانگڑے کی یا دہلی اور اجمیر کی۔ یا اس زمانہ میں ان مقاموں کی بولیوں کے درمیان کچھ ایسا چنداں فرق نہ تھا۔ بہرکیف چند سطریں لکھی جاتی ہیں۔ ان کے ملاحظہ سے معلوم ہوجائے گا کہ ممالک مغرب شمال کی زبان تب سے اب کس قدر بدل گئی اور کیسا جلد فارسی الفاظ اس میں ملنے لگے تھے۔

मिले सेनं सुरतान दिसा अन्नेक दिव्य भर विम्य पारिा—
पट्ठरी सुकरि सावस्य पर
गहि के दु साज्जि गज्ज निसुबर अ

आवत पग सारथ सयन मिलिमन था फिपयय
थानलारे तब कहे साह साहब अहो तातारवान
सुनि
रवुरासान सस्तमा जमन मासुफ रवानपुने

اب اس ملک میں دو قسم کے آدمی ہوگئے۔ ایک ..... نے اِس ملک کو فتح کیا یعنی اہل اسلام اور دوسرے جو ان کے مطیع ہوئے یعنی اہل ہند۔ دربار کی زبان فارسی اور دربار کی زبان تمام دُنیا میں اور تمام زمانہ میں اولیٰ اور اشرف سمجھی جاتی ہے۔ گویا بالکل وضعداری کی وہ جڑ ہوجاتی ہے۔ اہل ہند کا سب سے بڑا حوصلہ یہ ہی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو علم و لیاقت میں اہل اسلام سے قرب حاصل کریں۔ بڑی سے بڑی تعریف اس وقت اہل ہند کی یہ ہی ہوسکتی تھی کہ ان کے اشعار مثلِ اہل ولایت یعنی ایرانی کے معلوم ہوتے ہیں۔ ہندو لوگ نہ صرف آپس کے درمیان فارسی میں خط و کتابت جاری رکھتے تھے اور اپنے گھر کا حساب بھی فارسی میں لکھتے تھے بلکہ اگر لفظ صحیح ہوتا تو میں کہہ سکتا مُفرِس بن گئے تھے جس قدر وہ زیادہ مقرّب بارگاہِ سُلطانی تھے اسی قدر زیادہ مبتلا اس بلائے عظیم کے تھے۔ اس وقت کے ہندو مُصنّفوں کا حال جو سرہنری الیٹ صاحب نے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے۔ لائق دیکھنے کے ہے، صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ "ہندو مُصنّف کی تصنیف میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اس کی قوم اور اس کا مذہب ظاہر ہوسکے۔ ہاں شاید کسی قدر عبارت کا غیر فصیح اور پُرتکلّف ہونا البتّہ اس بات کی انگشت نمائی کرتا ہے کہ غیر کی پوشاک اس کے بدن پر کیسی نازیبا ہے۔ وہ ہندوؤں کو کافر لکھتا ہے اور مسلمانوں کو مومن۔ وہ پیروں کی ایسی تعظیم کرتا ہے کہ گویا اُن کا بڑا معتقد ہے۔ جب کبھی ہندو مارے جاتے ہیں وہ لکھتا ہے "داخل فی النّار والستقر شدند" اور جب کبھی مُسلمان کا ایسا حال ہوتا ہے تو لکھتا ہے "شربت شہادت نوشیدند" وہ اپنے حاکموں کے معمولی الفاظ اور محاوروں کا اس قدر

عادی ہوگیا کہ وہ لکھتا ہے نور اسلام محرم الحرام۔ قرآن شریف۔ اور بسم اللہ بغیر تو کچھ شروع ہی نہیں کرتا اور حمد نعت بھی وہ اپنے دیباچہ ...... ضروری سمجھتا ہے۔ ایک بڈھا ہندو مُصنّف جو ...... مانتا ہوگا کہ جلد ہی چِتا میں پھُنک کر راکھ کی ڈھیر ہوکر گنگا میں بہایا جائے گا اپنے تئیں بر سر تابوت و بر کنارہ گور لکھتا ہے۔" اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بہت سی باتیں وہ مُصنّف کی خوشامد کی راہ سے جان بوجھ کر اپنے مُسلمان مالکوں کے خوش کرنے کو لکھتے تھے۔ تاہم ہم کو اس بات کے دکھلانے کو پراکرت کی نہروں میں کس طرح فارسی لفظوں کی سیلابی آگئی بہت کار آمد ہیں۔"

یہاں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں اور مُسلمانوں کے میل جول کی یہ ایک اچھی مثال ہے دونوں تہذیبیں اور کلچر کس طرح ایک دوسرے سے مل کر ایک ہوگئی ہیں اور اس سے زیادہ نہیں مطلب نکال سکتے ہیں۔

اس کے بعد راجہ شیو پرشاد کبیر کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ "کبیر پندرھویں صدی کے آخر میں سکندر لودھی کے زمانہ میں ہوا۔ وہ بنارس میں ایک مُسلمان جولاہہ کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اور پڑھا لکھا نہ تھا۔ راما نند کا چیلا ہوا اور کبیر پنتھیوں کا مت نِکلا۔ اس کی تصنیفات سے اب بھی بہت کچھ بچ رہا ہے یہ اسی کا ہے۔"

छोड़ बदबख्त तु कहर के नजर कु ।
खोज दिल बीच जहां बसत हक्का ॥
अजब दीदार है अजब महबूब है ।
करन कारन जहां सबद सच्चा ॥
खड़े दरदबद दरबेस दगीह मे ।
खैर और मिहिर मौजूद मक्का ॥
जिकर कर कर फिकर दरद कै कार ।
कहे कबीर इह सखुन पक्का ॥

اس کے بعد ہی راجہ شیو پرشاد تلسی داس کے حالات بیان کرتے ہیں "بابا تلسی داس براہمن تھے۔ پنڈت تھے۔ شاعر تھے۔ سادھو تھے۔ اکبر شاہ کے ہم عصر تھے ضلع باندہ میں جمنا کنارے راجاپور میں پیدا ہوئے تھے اور سترہویں صدی کے

شروع میں گنگا کنارے ..... میں پرلوک کو سدھارے۔ ان کی رامائن میں اپنے قسم ... ... ہے۔ اس سے بڑھ کر ہندوؤں میں اس وقت کوئی ..... پستک رائج نہیں ہے۔ گو زبان کسی قدر ...... ہے اور سنسکرت الفاظ اور محاوروں سے بھری لیکن شاعری میں اپنی قسم کی ایک ہی ہے گھوڑے کی تعریف میں لکھتے ہیں۔

जगमगाति जाजराव जो जसु .... तिमानकाते हिलगे
किं कि किलल्ला मलगाम ललित बिल्ली किसुर नर मुनि ठगे

اس کے بعد سورداس کے کچھ پد پیش کرتے ہیں۔ سورداس کے متعلق لکھتے ہیں "اُسی زمانہ کے قریب سورداس ہوئے انھوں نے کرشن کے جس گائے۔ ان کے پد مشہور ہیں۔ یہ ان کا کہنا ہے۔

कीजै प्रभु अपने बिरद की लाज ।
मोह पतित कबहूं नही आयो नैकु तुमार काज ।
माया सबल धम धन बनिता ।
बांध्यौ हौं इह साजा ॥
देखत सुनत सबै जानत हौं ।
तऊ न आयौ बाज ॥
कहियत बहुत काहि तुमतान ।
स्रवनन सुनी आवाज ॥
दियो न जात .... उतराई ।
चाहत चढ़न हाज ॥
लीजै पार उत ..... सूर कौं ।
महाराज ब्र ...... ज ॥
नई न करत .... हत प्रभु तुमसों
सदा गरीब .... ज ॥

اس کے بعد ہی وہ لکھتے ہیں "اگر ہم چاہیں بہتیری مثالیں .... نانک داود نابھا وغیرہ کے جو قریب اسی زمانہ میں ہوئے ہیں دے سکتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے نامی کوئی نہیں ہے اور ہمارے نزدیک اب اس بات کی کافی دلیلیں پیش

کہ گو اہل ہند نے دیوناگری حرف اور اپنا خاص تلفّظ اور بہت سا اپنے صرف ونحو کا قاعدہ بحال و برقرار رکھا تاہم فارسی لفظوں کو بہت آزادی سے کام میں لائے۔"

راجہ شیو پرشاد نے اہل اسلام کے آنے کے بعد کے اثرات کا ذکر کرنے میں بیان کرتے ہیں۔ "اہل اسلام اپنے گھمنڈ کے مارے محکوموں کی زبان میں گفتگو کرنا بیشک موجب ذلّت و حقارت سمجھتے ہوں گے۔ لیکن ان کی حرم سرا ہندو لڑکیوں سے پرتھیں اور انھیں رات دن کام ایسے ہندوؤں سے پڑا کرتا تھا کہ جو فارسی سے کم واقف تھے۔ پس یہ گھمنڈ رفتہ رفتہ کم ہوگیا۔ اور اگر بالکل خط و کتابت نہیں تو بول چال تو ہندوؤں کے ساتھ ان کی زبان میں جائز سمجھی جانے لگی۔ اور اشعار بھی ان کی زبان میں نُدرت کے طور پر خواہ فخریہ بنانے لگے۔ خواجہ ابوالحسن جس کو امیر خسرو کہتے ہیں اور جو غیاث الدّین بلبن کے دربار میں نامی ملک الشعرا تھا تیرھویں صدی میں اس قسم کی غزلیں کہنے لگا تھا

زحال مسکیں مکن تغافل درا اے نینا بنائے بتیاں

غزل مشہور ہے یہاں بالکل لکھنے کی حاجت نہیں۔

لیکن سبھی خسرو کی طرح طوطیِ ہند نہ تھے۔ ہندی میں فاش غلطیاں کرتے تھے ان کی زبان ہندی پر تو ہم نو آمد صاحب لوگ کی ہندی کو ترجیح دے سکتے ہیں۔ چنانچہ مثال کے لئے کچھ کلام سعدی دکن کا سُنئے۔ اکثر ایسے لوگ غلطی سے سعدی شیرازی سمجھتے ہیں۔ یہ چودھویں صدی میں ہوا تھا۔

ہمنا تمین .... تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا۔ ایسی بھلی یہ ریت ہے

اس کے بعد راجہ شیو پرشاد ملک محمد جائسی کا ذکر کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ملک محمد جایس والے کی مثنوی پدماوت ایسے عیوب سے مبرّا ہے اور شیرینی اُس کے کلام میں ٹپکتی ہے۔ وہ سولھویں صدی میں شیر شاہ کا ہم عصر تھا۔

مثنوی کا دیباچہ

सय्यद अशरफ पीर पियारा !
जेहि मोहि पथं दीन्ह उजियारा ॥
लेसा हिये प्रेम कर दिया
उठी जाति भा निर्मल हीया ॥

मारग हुत जो अंधेरे असूझा ।
भा उजरे सब जाना बूझा ।।
खार समुद्र पाप मोर मेला ।
बोहित धर्म लीन्ह कै चेला ।।
जाके एस होहिं कंड हारा ।
तुरत वरा सो पावै पारा ।।
दस्तगीर गाढ़े के साथी ।
जिहिं अवगाह डीन्ह तिहिं हाथी ।।

مغل دَور میں ملک میں امن و امان تھا۔ تو علوم و فنون کی ترقی بھی لازمی تھی۔ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے شیو پرشاد لکھتے ہیں۔

''یہ اکبر جہانگیر اور شاہ جہاں کا زمانہ تھا کہ جب سی قدر ملک میں امن امان رہنے لگا اور علوم و فنون کی طرف لوگوں کا دل متوجّہ ہوا۔ ترجمہ کے لئے سنسکرت پستکیں تلاش ہونے لگیں اور ہندوؤں کے ساتھ رہ رسم بڑھ جانے سے مسلمان شاعر بھی کہ جن میں کوئی خاندان شاہی سے نہ ہوں گے بالکل یہاں کی زبان میں شعر کہنے لگے۔ وَلی اس قسم کا شاعر اوّل کہا جاسکتا ہے۔ اس کو تین سو برس سے زیادہ گذرے یہ شعر اسی کا ہے۔

طاقت نہیں کسی کو ایک حرف سُن سکے احوال گر کہوں میں دل بے قرار کا
آئے ولی ہماری طرف تیغ ناز لے اس شوخ کو خیال اگر ہے شکار کا
مسند گل منزل شبنم ہوئی دیکھ رُتبہ دیدۂ بیدار کا

لیکن مضمون اِن شاعروں کے پاس بجُز عشق کے اور کچھ نہ تھا۔ کبھی وہ کسی کا سراپا اور ناز و انداز بیان کرتے ہیں۔ کبھی وہ دردِ فراق میں مُبتلا ہیں۔ اِس کے سوا اور ان کو کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ ایسے مضمونوں کے لئے نہایت نرم و شیریں الفاظ درکار ہیں۔ سوائے نرم و شیریں الفاظ کے دوسرے کام میں نہیں آسکتے۔ اگر فارسی کے حروف تہجی پر نگاہ کی جائے تو فوراً ثابت ہوجائے گا کہ اِس سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی زبان ملائم اور شیریں نہیں ہے۔ پس روز بروز ہندی الفاظ اِن شاعروں کے نزدیک سخت و

درشت ٹھہرنے لگ گئے۔ اور ان کی جگہ میں فارسی اور عربی الفاظ بھرتی ہونے لگے۔ مثلاً پہلے پنکھڑی کا استعمال ہوتا تھا جیسے کہ

نازکی اُن لبوں کی کیا کہئے　　پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

لیکن بعد جو شاعر ہوئے ان کے کانوں میں اس لفظ نے گھاؤ کیا فوراً برگِ گل سے بدل دیا۔

برگِ گل پر یار کی تصویر کا دھوکا ہوا　　گویا نہیں نزاکت سے دو برگِ گل زِلب

بعد اس طرح قدم بقدم کھینچتے کھینچتے ہم لوگ مرزا نوشہ اسداللہ خاں غالب اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی اُردوے مُعلّٰی کو پہنچے۔ دونوں نہایت مشہور ناظم و ناثر ہیں ایک دہلی کے اور دوسرے لکھنؤ کے ابھی زندہ ہیں[1]

دہلی دارالسلطنت تھی اور ملک مشرق کے آدمی ہمیشہ کلام الملوک کو ملوک الکلام سمجھتے ہیں۔ قلعہ دہلی کی زبان سب کے لئے سند ہوگئی لیکن وہ صرف قلعہ ہی کی زبان تھی ضلع میں جاٹ گو جروں کی زبان سے بڑھ کر شاید کسی دوسری زبان میں دہقانیت نہ ملے۔ چنانچہ روایت ہے جب ایک شاعر دہلی کے نواح میں پہنچا، پوچھا قلعہ کتنی دُور ہے۔ لوگوں نے جواب دیا پاس ہے۔ آگے بڑھ کر پھر پوچھا جواب ملا نجیک ہے، آگے بڑھ کر پھر پوچھا لوگوں نے کہا قریب ہے۔ جب قلعہ کا دروازہ دکھلائی دیا۔ پھر پوچھا وہاں والوں نے بتلایا متصل ہے۔ اب اسی سے آپ لوگوں کو قلعہ کی اُردوے مُعلّٰی کی بالکل حقیقت دریافت ہو جائے گی۔ اس اُنیسویں صدی کے شروع میں ڈاکٹر گل کرسٹ صاحب نے میر امّن دہلوی مُصنّف باغ و بہار اور للوجی لال کب ساکن اکبرآباد مُصنّف پریم ساگر کو حکم دیا کہ نثر کی کچھ کتابیں اس ملک میں ایسی تصنیف کریں کہ جن کو پڑھ کر صاحب لوگ اس ملک والوں کی بولی سمجھ سکیں اور اس مُلک والے جو کچھ کہہ سکیں، صاحب لوگ ان سے بولیں۔ اس کو سمجھ لیویں۔ دونوں مُصنّف بے شک حیران ہو گئے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ان کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ دونوں نے کتاب لکھی مگر دونوں کو ایک نئی زبان بنانی پڑی للّوجی نے تو اپنی پریم ساگر میں سے بالکل فارسی الفاظ خارج کئے۔ یہاں تک کہ اپنے مربّی ڈاکٹر گلکرسٹ

---

[1] اس عرصہ میں دونوں نے انتقال کیا۔

کے لئے بھی صاحب کا لفظ نہیں لکھا۔ افسوس للوجی یہ بھی بھول گئے کہ خود ان کا نام آدھا یعنی لال لفظ فارسی ہے۔ میر امن نے گو بعض مقام میں ندان اور ٹک وغیرہ ایسے ہندی الفاظ لکھے ہیں جو کہ اب استعمال میں نہیں آتے۔ تاہم باغ و بہار کے ابتدا میں ایک لفظ ایسا فارسی کا مرکب لکھا ہے کہ جس سے شاید صاحب لوگوں کو تمام عمر اس سے سابقہ نہ پڑے گا۔ یعنی دلق پوش۔ (باقی)

واجد علی شاہ اور اُن کی بیگمات کے غیر مطبوعہ خطوط

(از جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ریڈر شعبہ اُردو دہلی یونی ورسٹی)

واجد علی شاہ اور اُن کی بیگمات کے خطوں کے جو مجموعے ہمارے علم میں ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) مخزن اسرار سلطانی معروف بہ رُقعات بیگمات (قلمی) آصفیہ حیدر آباد دکن۔

(۲) رُقعات اہلیہ واجد علی شاہ (قلمی) خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

(۳) تاریخ نزالہ مطبوعہ مفید عام آگرہ۔ کُتُب خانہ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔

(۴) تاریخ نور (قلمی) خدا بخش لائبریری پٹنہ۔

(۵) اِنشائے راحت رُوح۔ مطبوعہ مطبع اثنا عشری لکھنؤ۔ کُتُب خانہ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔

(۶) تاریخ ممتاز مخطوطہ برٹش میوزیم۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں لاہور سے شائع بھی ہوگئی ہے۔

(۷) تاریخ بدر (قلمی) ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن۔

(۸) رُقعات بدر مطبوعہ حیدر آباد دکن۔ یہ تاریخ بدر ہی ہے جس کو نام کے ادنیٰ تغیر کے ساتھ سید محمد علی سرش بلیح آبادی نے قاسم پریس واقع چنچل گوڑہ حیدر آباد میں چھپوایا ہے۔

(۹) بیگمات اودھ کے خطوط مرتبہ مفتی انتظام اللہ شہابی۔ مطبوعہ فاروقی پریس دہلی اس میں مُرتب نے خطوں کے حوالے نہیں دئے ہیں۔ انھوں نے بعض جملے نکال دئے ہیں اور شوقیہ نظموں کے اشعار کم کر دئے ہیں۔

انسان کی اصلی سیرت کا اندازہ عیش میں نہیں تکلیف میں ہوتا ہے۔ یہ خطوط چونکہ انتزاع سلطنت کے بعد لکھے گئے ہیں اس لئے جان عالم اور ان کی بیگمات کے کردار کو سمجھنے میں بہت مدد دیتے ہیں۔ مٹیا برج میں وہ شاہانہ کرّ و فر باقی نہیں رہا تھا پھر بھی یہ اس زمانہ کا زندہ لکھنؤ تھا۔ اس تہذیب کے اصلی خط وخال ان تحریروں میں صاف نظر آتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے زوال

کے بعد واجد علی شاہ ان کے متعلقین اور رعایا پر کیا گزری۔ ان کے دلوں میں جانِ عالم کی کتنی محبت تھی اور خود بادشاہ ان حالات سے کتنے متاثر تھے۔ اس لئے یہ خطوط صرف ادب ہی کا بیش قیمت سرمایہ نہیں تاریخ ہندوستان کی اہم دستاویز بھی ہیں۔

واجد علی شاہ کی معزولی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اِس کا اثر خود اُن پر۔ لکھنؤ پر اور اُن کے متعلقین پر پڑا۔ کل تک جس کے ۱۷۰۰ اہل قلم۔ ۵۰۰ طبیب اور ۱۵۰۰ چوبدار ملازم تھے وہ دفعتاً شہریاری و سروری سے محروم کردیا گیا اور وطن سے دُور، دیارِ غیر میں پھینک دیا گیا۔ جس وقت وہ یہ شعر پڑھتے ہوئے لکھنؤ سے رُخصت ہوئے ہیں ؎

رُخصت اے اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہیں

تو سننے والوں کے کلیجے شق ہو گئے۔ بچّہ، بوڑھا، عورت، مرد، ہندو، مسلمان کوئی ایسا نہیں تھا جو دھاڑیں مارکر نہ رو رہا ہو۔ ان کی یاد میں غزلیں لکھی گئیں۔ گیت گائے گئے ڈنڈے والوں اور بھاڑوں نے اپنے مذاق کی نظمیں لکھیں۔ گلی گلی اور کوچے کوچے میں سُنائیں کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں عورتیں یہ شعر نہ پڑھتی ہوں ؎

واجد علی پیارا کلکتہ کو سدھارا
سڑکیں مگل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے

یہ واقعات مولانا عبدالحلیم شرر نے بیان کئے ہیں۔ ان کی تائید نواب خاص محل کے ایک خط سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے کلکتہ سے شیدا بیگم کے نام لکھا ہے۔

"بہن شیدا بیگم میران جی کی ۲۷ تاریخ ۱۲۷۲ھ پنجشنبہ کا دن عمر بھر نہ بھولے گا جب کہ سلطان عالم کو جنرل اوٹرم صاحب نے باپ دادا کی سلطنت چھوڑنے اور حکومت سے دست بردار ہونے کا حکم دیا اور لکھنؤ سے ہم لوگ جُدا ہوئے جیسے بُلبل گلزار سے چھوٹی۔ یوسف مصر سے نکلے۔ بوئے گُل چمن سے جُدا ہوئی۔ پیا جان عالم کا سکوت اور تمام عملہ کا حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر بے کسی کے آنسو بہانا کمال ادب سے رومال میں غم کے موتیوں کو سمونا۔ اعزّا کو ہچکیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہم آخرش محلات میں ماتم بپا کرتے ہوئے سُلطان عالم کے ہمراہ روانہ ہوئے اس وقت جان عالم کا یہ کہنا "تم پر دس برس تک میں نے سلطنت کی اس عرصہ میں جو کچھ صدمہ اور رنج میری ذات سے تم کو پہنچا ہو اُس کو بخوشی معاف کردو۔

اس وقت میں معزول ہوں اور تم سے چھٹتا ہوں۔ خدا جانے زندگی میں پھر ملوں یا نہ ملوں۔“
بہن! اس جملہ نے تمھیں یاد ہے مجمع کو مجلس ماتم بنادیا تھا۔ حضرت منور الدولہ احمد علی خاں نے کہا ”سرکار ایسے وقت میں غلام کو قدموں سے جدا تو نہ کرو۔ سلطان عالم خاموش ہو گئے۔ حضور ملکہ کشور آرا بیگم صاحبہ اور بھیا سکندر حشمت سلمہ اور لخت جگر نور نظر ولی عہد بہادر سلمہ میں اور چار اور سرکار کی خادمہ ہمراہ تھیں۔“
آگے چل کر سفر کی روداد لکھی ہے۔
”رجب کی پانچویں کو لکھنؤ سے چلے تھے کان پور پہنچے۔ میرا روتے روتے بُرا حال ہوا۔ پرون صاحب کے بنگلہ میں ہم لوگ مقیم ہوئے۔ رجب بھر مہینا وہیں بیتا۔ شعبان کی پہلی کو الہ آباد کو رخصت ہوئے۔ آٹھ دن وہاں ٹھہرے۔ پھر بنارس آئے۔ راجہ پرانا نمک خوار تھا اپنی اُس نے اچھی خدمت کی۔ رانیاں حضور ملکہ کی بڑی تواضع کرتیں ہر وقت ہاتھ باندھے چاکری میں کھڑی رہتیں۔ مجھ مغموم کی پوچھ بھی بہت تھی۔ میں ہر وقت سلطان عالم کی دلجوئی میں لگی رہتی۔ ان کا باتوں میں دل بہلاتی مگر وہ غم میں گھُلے جاتے ہیں۔ میں واری جاؤں یہ حال دیکھ کے دل کڑھتا ہے۔ بنارس سے دُخانی جہاز پر سوار ہوئے رمضان کی ۲۷ کو کلکتہ ہمارا قافلہ پہنچا۔ سب پر تکان کا اثر ہے۔ اس وقت تم کو راستہ کی مختصر کیفیت لکھ رہی ہوں تم بھی حال لکھنا ہمارے پیچھے کیا بیتی۔
راقمہ۔ نواب خاص محل۔ کلکتہ
۲۹ رمضان ۱۲۷۲ھ

خط لکھنے کے لئے صرف کاغذ اور قلم ہی کی نہیں، خونِ جگر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ جان عالم اور ان کی بیگمات کے خطوں میں حسرتوں کی سُرخی ہے، جذبات کی گھٹا ہے، ارمانوں کا سوگ ہے۔ ان میں دلی کیفیات کا اظہار ہے لیکن ایسا بے لاگ، جیسے تیر کمان سے نکل جائے۔ یہ خط صرف تاریخ کے طالب علم ہی کے لئے اہم نہیں مکتوبی ادب میں بھی ایک درجہ رکھتے ہیں۔
عبدالحلیم شرر نے ان خطوں کے متعلق خونِ اختر کے مقدمہ میں لکھا ہے۔
”مجھ میں جو کچھ ادبی ذوق پیدا ہوا ان ہی تو دو ناموں کی برکت ہے[1]“ ایک اور

---

[1] جان عالم ص ۸۱-۸۲-

موقع پر لکھا ہے۔

"مجھے فارسی عاشقانہ عبارت آرائی کے شوق میں یہاں بیت الاجرا واجد علی شاہ میں حسن و عشق کا ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ بادشاہ کے نام محلات عالیات اور بیگمات جو خطوط بھیجا کرتیں وہ خطوط بادشاہ کے ملاحظہ کے بعد اسی دفتر بیت الاجرا میں محفوظ رکھے جاتے۔ یہ خطوط جو تو دّو نامے کہلاتے علی العلوم سُرخ اور پر افشاں کاغذ پر ہوتے اور عموماً عاشقانہ انداز سے رنگین عبارت میں لکھے جاتے اُن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہوگی جن کو میں نے پڑھنا شروع کیا۔ مجھے ان میں بڑا لُطف آیا۔ افسوس کہ وہ نایاب ذخیرہ خدا جانے کہاں گُم ہوگیا۔ آج موجود ہوتا تو شائع کرنے کے قابل تھا اس لئے کہ ان میں جتنے خطوط تھے بیگمات انشا پردازوں کے لکھے ہوئے تھے اور نہایت زورِ قلم دے کر رنگین عبارتوں میں لکھے گئے تھے۔ ہر ایک خط میں ایک جُداگانہ جدّت طرازی اور تازگی تھی۔ بہر حال میری انشا پردازی کا پہلا نصاب یہی تو دّو نامے تھے جو ظاہری صورت باطنی رنگ عبارت دونوں حیثیتوں سے بہت ہی دل کش تھے۔"

عورتیں زبان کی سب سے بڑی محافظ ہوتی ہیں اور اُردو کی ٹکسالی زبان کا تو دار و مدار صرف بیگمات پر ہے۔ واجد علی شاہ کی بیگمات کو اس معاملہ میں خصوصیت خاصہ حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوں میں روز مرّہ کی چاشنی الفاظ کی ترتیب محاورات کی برجستگی اور نُدرت ادا کی شیشہ گری یہ تمام خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ واجد علی شاہ کا بھی علمی مذاق نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ درجہ کا تھا اور در اصل ان میں دو ہی مذاق تھے ایک ادب اور شاعری کا اور دوسرا موسیقی کا۔ شرر کا بیان ہے کہ "ان کی علمی استعداد بہت بڑھی ہوئی تھی عربی کے وہ عالم نہ تھے مگر فارسی میں ان کا درجہ شاید ابوالفضل سے کچھ ہی کم ہوگا۔" اُردو میں انھوں نے جو تصنیفات چھوڑی ہیں وہ اُن کی قابلیت کی گواہ ہیں۔ خطوط کے لئے کسی خاص علم و فضل کی ضرورت نہیں ہے وہ صرف "حسنِ اتّفاق" کا نام ہیں اور صرف چند لمحات ہی سب سے زیادہ عزیز چیز ہیں۔

اودھ کے اس غم نصیب بادشاہ نے بھی اکثر خطوں میں ان عزیز لمحات کی یاد تازہ کی ہے اور تصوّر میں اس محفل طرب کو دوبارہ آراستہ کیا ہے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ وہ گذرے ہوئے اوقات کو جذبات کی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ ایک دفعہ پھر، چاہے وہ عالم خیال ہی میں کیوں نہ ہو بسر کرنا چاہتے ہیں۔ ان دل رُبا اداؤں، دلچسپ واقعوں اور حسین یادوں کا وہ ایک مینا بازار سا لگاتے ہیں اور قیدخانہ کی خلوت میں ان کو دل صد پارہ کی ۲ شوں سے کمتر اور سہ کرتر خریدتے ہیں اِس سے اُن کے زخموں میں ٹھنڈک سی پڑجاتی ہے اور حال کی تلخیاں ایک حد تک گوارا ہوجاتی ہیں۔ ان تلخیوں کی کچھ حد بھی ہے! تاج و تخت سے محرومی۔ سلطنت کی تاراجی، ماں اور بھائی کی دائمی مفارقت، قید و بند کے مصائب، نگین آرا و دیہم آرا کا انتقال، دوستوں کی بدسلوکی، بیگمات و محلات کی تباہی و مفلسی، پھر اپنی بےزری اور بےکسی، غرض مصائب کا اتھاہ سمندر ہے جس میں ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی ہچکولے لے رہی ہے۔ وہ ان مصائب کو دلکش یادوں سے بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو جعفری بیگم یاد آتی ہے، اس کی تیغ زبانی اور نازک مزاجی، اس کا کھلنڈرا پن اور چنچل طبیعت۔ انھیں نگار محل کا قصہ یاد آتا ہے جس کو انھوں نے کام و دہن کی تمام لذتوں کے ساتھ ۱۲ صفحے میں لکھا ہے۔ اسی طرح سرفراز پری کے ساتھ جو معاملات عشق و محبت درپیش تھے وہ ان کی چشم باطن کے سامنے پھر دست افشاں اور پاکوبان آگئے ہیں۔

اصل میں وہ خط نہیں لکھتے بلکہ "تا دستداد مواصلت جسمانی ملاقات پر اکتفا کرتے ہیں"

ایک اور خط میں لکھتے ہیں۔

"خیرجی یہ بھی ایک طبیعت کا مزہ ہے دل لگی ہے ایک تحریر کا لطف ہے خفا نہ ہوا کروجی بہلایا کرو"

امراؤ محل کو لکھتے ہیں۔

"جب تک حصول مواصلت نہ ہو خط و کتابت میں غفلت نہ ہو" یہی حال دوسرے فرقت زدوں کا تھا۔ نواب بدر عالم لکھتی ہیں۔

"زندگی کا سہارا اب فقط خط تمھارا ہے۔ للّٰلہ ہاتھ جوڑتی ہوں منّتیں کرتی ہوں جانِ عالم اِدھر دیکھو ہماری طرف مُنھ پھیرو سُنتے ہو خط جلدی جلدی لکھا کرو"

بعض جگہ خطوں میں یہ شراب چھلک گئی ہے ان میں اختلاط کی باتیں ہیں اور عشق و عاشقی کی چھیڑ چھاڑ ہے۔ نواب بدر عالم بادشاہ کو لکھتی ہیں۔

"اے ہمارے دولتِ حجاب کے لینے والے .... ایذا و تکلیف کے دینے والے، کلبۂ احزان کی نشست میں ہم کو شہنشاہ منزل کی برخاست زیادہ تر نقشِ جگر ہے، اور تمھارے فراق میں واللہ اب تک درد کر رہے، یاد تمھارے حرکات و اختلاط کی ہر اعضا میں، کھپی ہے اور نوک نشتر فراق ہماری ہر رگ میں چُبھی ہے.... مجھے بھولا سمجھ کر اپنا مزا یاد دلاتے ہو مستوں کو سرودِ عبث سُناتے ہو۔"

لیکن [redacted]گی کی حقیقتیں بڑی بے رحم ہوتی ہیں۔ جب وہ دامن گیر ہوتی ہیں تو خوشی رنج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

"سُنو اے جانِ جان تم جو بدرِ عالم کو جانِ عالم کی دُلہن لکھتے ہو ..حق تعالیٰ ر دن لائے کہ دولھا مع بارات آئے، عُروسِ شب گھونگھٹ فراق کو ہٹا کر مُصحفِ رُخسار دکھائے۔ شربتِ وصل پلائے۔ جب دُلہن کہنا۔ اب تو بلاکشیدہ ستم رسیدہ کہنا چاہیئے۔ شہنشاہ منزل کی جو برخاستوں کو پوچھتے ہو بس تم نے آبلہ ہائے جگر پر نشتر لگاکر زخم پر نمک چھڑکا یا آتش میں روغن دیا، ہائے غضب کیا۔"

محبوب عالم نواب مغل صاحبہ نے ان پچھلی صحبتوں کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے ؂

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لُٹا ہوا

جانِ عالم پچھلی باتیں یاد آتی ہیں گھنٹوں رُلاتی ہیں۔ برسات کا کیا موسم آتا ہے دل بے چین ہو جاتا ہے مجھ پہ غم کا عالم چھا جاتا ہے، عیش باغ کا جلسہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے دل پاش پاش ہو جاتا ہے، مینھ برسا پانی جا بجا بہہ گیا۔ گلی کوچہ صاف رہ گیا ساون بھادوں میں زردوزی پاپوش پہن کر پھریئے کیچڑ کا نام کیا ہے مٹی بھی نہ بھرے۔

"فصلِ بہار کی صفت، پروردگار کی قُدرت، باغ میں آنے کا ہر ایک شائق تماشہ دیکھنے کے لائق خواجوں کا جمگھٹا، رنگا رنگ کی پوشاک، آپس کی تاک جھانک، باغ کا تختہ لالہ و نافرمان، جن پر ٹنے والوں کی جان قربان، صاحبانِ محلات کی سُبک روی، خرامِ ناز ہر قدم پر کبک دری، چال بھول کر جبینِ نیاز رگڑتی،

شاخِ سرو ان کے روبرو نہ اکڑتی جانِ عالم تمھاری جانب سے آم کے درختوں میں جھولا پڑتا، جھولنے والیوں پر آپ کا دل ٹپکا پڑتا۔ ہر ایک سے محبت کے پینگ بڑھاتے خواجین ہمت بڑھا بڑھا کے پینگ چڑھاتے باغ میں کوئل پپیہے مور کا شور، جھولے پر لگتا... ساون بھادوں کے جھالے وہ رنگین جھولنے والے اس سمے کا خیال آکر دل پاش پاش ہوجاتا ہے۔"

ان خطوں میں اشتیاق و محبت ہجر و مفارقت اور شکوہ و شکایت سب ہی کچھ ہے۔ گویا ایک دُنیا اس دیدۂ تر میں سمٹ آئی ہے۔ "خونے بہ جگر جمع کُن و رنگ بردن آر" کا لُطف ان خطوں میں ہے۔ بعض جگہ محبت کا اظہار عورت کی طرف سے کیا گیا ہے اس لئے ان میں ہندی کے دوہوں کا بھی رنگ ہے۔ ہر خط کا انداز الگ ہے القاب الگ ہے جو خط پریشانی میں لکھے گئے ہیں ان میں اسلوب سادہ لیکن موثر ہے جو نسبتاً اطمینان سے لکھے گئے ہیں ان میں طرزِ بیان دل فریب اور طرح دار ہے لیکن خُلوص کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے رنگینی اور تکلف نے رمز و ایما کو نکھار دیا ہے اور خطوں کے ماحول اور لکھنے والوں کی بیچارگی اور خستہ دردنی کو اور نُمایاں کر دیا ہے۔

القاب میں بڑی بڑی جدتیں برتی گئی ہیں۔

بدر عالم صاحبہ لکھتی ہیں۔

"اے میرے قدردان۔ اے میرے مہربان۔ اے میرے معین و مددگار اے میرے ہمدم و غم خوار۔ اے میرے یوسف۔ اے میرے جانی۔ اے میرے قیدی اے میرے زندانی۔ اے میرے جانِ عالم۔ اے میرے سُلطانِ عالم۔ اے میرے اختر پیارے۔ میں صدقے تمھارے۔"

فرخندہ محل لکھتی ہیں۔

"مہرِ گلزارِ رعنائی تدرو کوہسار بے وفائی زیداللہ حسنہ۔"

کنیز فاطمہ بیگم لکھتی ہیں۔

"دافع درد و الم حضرتِ جانِ عالم زیدہ اللہ عشقہ۔"

شیدا بیگم لکھتی ہیں۔

"مہر پیشانی، چہرۂ نورانی، ابرو کمان تیر مژگان، بادام چشم، بہرام حشم

گُل کی خوش بو، بلبل کی گفتگو، فرشتۂ زیب، زاہد فریب، حسینوں کے رنگ، زہرہ جبینوں کے ڈھنگ، شاہد کی سج، عزیز کی دھج، دارُوئے دردِ اشتیاق، مرہم زخمِ فراق، داؤدِ آواز، مجسّم اعجاز، بے آراموں کے چین، اُستاد تان سین، محفل کی زیبائش، ہر دل کی آرائش، خورشید جمال کی ضَو، حُسن کی لَو، بے فکروں کا قہقہہ، خوش دِلوں کا چہچہہ، بے صبروں کے آرام، بے نشانوں کے نام۔ شاہوں کے سرتاج، نازنینوں کے مزاج ——"

جانِ عالم فاطمہ بیگم کو لکھتے ہیں۔

"رشکِ بدر مُشتری قدر، زہرہ جمال مہر مثال، حُور نژاد، پری نہاد، گل رو سمن بو انیس و ہمدم خوبیٔ مجسّم"

بادشاہ، نواب شیدا بیگم کو لکھتے ہیں۔

"مجنوں کے دل کی تسکین، لیلیٰ کا روئے رنگین، یوسف کے مُنھ کا بناؤ زُلیخا کے کلیجہ کا گھاؤ، وامق کے آنکھوں کی روشنی، عذرا کی دل لگی، دل کی راحت دمن کی عزّت، قیس کے دل کا رکھ رکھاؤ، پری زادوں کا بناؤ، سورج کی کرن، چاند سا بدن، اخترِ نما نواب شیدا چاہنے والے گئے کی بنا ہنے والی دل پسند ارجمند، عاشق فریب، معشوقہ بازیب، نہال چمن محبّت بالکل چاہت کی صورت، الف قد، بے ساخد، تے سے ابرو، چاند سا رُو، بہت اچھی خدا کے واسطے ایک چٹھی، مورتی لاکھوں میں کٹھورنی، محبّت کا پیلا عشق کا نقشا —— کڑور بار جیوں گا مگر تجھی پر مروں گا"

شیدا بیگم اس کے جواب میں لکھتی ہیں ؎

دُور سے تم مانگتے ہو چٹھی بات ہرگز نہیں ہے یہ اچھی

ایک اور خط میں لکھتی ہیں۔

"اخترِ آسمانِ دلربائی گوہرِ دریائے آشنائی۔ خسرو خو، شیریں گفتگو، سلیماں حشم بلقیس شیم یوسف جمال، زلیخا خِصال، ماہ صورت، چکور سیرت، لیلیٰ کی سج مجنوں کی دھج، دمن کے دل کا گھاؤ، دل کی صورت کا ساؤ، عذرا کا ناز وامق کا انداز شاہد کی راحت، عزیزہ کی عزّت، شمع کا رنگ، پروانہ کا ڈھنگ، شہر کی آرائش پہلو کی زیبائش...... زخمِ فراق کے مرہم مرزا جان عالم ——"

اسی طرح دُعائیہ اور اشتیاقیہ الفاظ میں بھی جدت ہے۔

"چہرۂ الفت آب و تاب باد"

"زید اللہ جمالہ زید اللہ نورحسنہ"

خاتمہ پر لکھا ہے ۔"زیادہ حسرت ہم آغوشی زیادہ شوق وصال"

بعض القاب بہت مختصر ہیں۔ جانِ عالم ہمارے اختر پیارے یا اختر پیارے میں صدقے تمھارے یا اختر جانی۔

یہ خطوط دُوری و مجبوری کے عالم میں لکھے گئے ہیں اس لئے بعض جگہ ہجر میں وصال کا تکلف ہے اور تحریر میں تقریر کا رنگ آگیا ہے۔ بعض مواقع پر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو بے تکلف دوست آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔

نواب بدر عالم صاحبہ لکھتی ہیں۔

"سُنو صاحب کوئی تمھاری محبت میں مرے یا جئے تمھیں اپنی طعنہ زنی سے کام ہے یہ بھی خوبی ہمارے ایام کی ہے"۔

نو ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ کے خط میں لکھتی ہیں۔

"سُنو جانِ عالم بغیر تمھارے ان صندلی کلائیوں میں جہانگیریوں کا یہ نقشا ہے گویا شاخِ نخل صندل میں مارِ پیچاں لپٹا ہے۔

ایک اور خط میں لکھا ہے۔

"سُنو جانی تم معشوق ہو ہم عاشق ہیں اور تو کوئی نشانی تمھاری نہیں رکھتی، مگر خط تمھارے ہاتھ کے ہردم سینۂ غم کے خزینے پر رہتے ہیں۔ کبھی آنکھوں پر رکھ کر روتی ہوں اشکوں سے بھگو لیتی ہوں"۔

دوسرے موقعہ پر لکھتی ہیں۔

"جانِ عالم اِدھر دیکھو ہماری طرف مُنھ پھیرو سُنتے ہو خط جلدی لکھا کرو"۔

یہی بے تکلفی جانِ عالم کے خطوں میں ہے۔

"نواب نگار محل تو نے پھرستا رکھا ہے"۔

"دیکھو تو زمانہ کا کیا عالم ہوگیا۔ زاویۂ تنہائی میں مکین ہیں"۔

ان خطوں میں جو صفائی اور بے تکلفی ہے وہ مُستقبل کا اشاریہ ہے۔ غالب کے ہاتھوں میں پہنچ کر یہ نقش اتنا دلفریب ہوگیا کہ دل و نظر دونوں اس میں جذب

ہوکر رہ جاتے ہیں لیکن یہ صفائی گفتگو کچھ غالب کی خصوصیت نہیں ہے ان کی اس خصوصیت میں سرور اور بے خبر بھی بعض جگہ شریک ہیں۔

بیگمات کے ان خطوں میں تمام نسائی خصوصیات موجود ہیں۔ بعض جگہ اُن کے مخصوص محاورے ہیں اور محلاتی زبان کا چٹخارہ ہے مثلاً

یاسمن محل لکھتی ہیں۔

"جانِ عالم ایک سال ہوگیا سب چہیتیوں کو نوازا مجھ نگوڑی کو کبھی بھول کے بھی پرزہ کاغذ سے خوش نہ کیا"

نواب خاص محل کلکتہ سے شیدا بیگم کو لکھتی ہیں۔

"میں ہر وقت سلطانِ عالم کی دلجوئی میں لگی رہتی ہوں ان کا باور میں دل بہلاتی مگر وہ غم میں گھلے جاتے ہیں۔ میں واری جاؤں یہ حال دیکھ کے دل کڑھتا ہے"

نواب بدر عالم دلدار محل کے انتقال پر لکھتی ہیں۔

"جانِ عالم تم نے جو لکھا تھا کہ تیسری تاریخ رجب کی نواب دلدار محل نے اس جہان فانی کو چھوڑا، طرف عالم باقی کے منھ موڑا۔ ہے ہے سنتے ہی میں بے ہوش ہوئی یہ کیا ستم ہوا میری انیس کنج لحد سے ہم آغوش ہوئی لطف زندگی سے دل بیٹھ گیا اُلفت اور صحبت کا مزا اُٹھ گیا، خدا انہیں جنت نصیب کرے ان کا اقبال بڑھا کہ تمھاری خدمت میں انتقال کیا"

بعض جگہ سوکن کا جلاپا اور رشک و رقابت کے جذبات سطح پر آگئے ہیں۔

نواب بدر عالم، واجد علی شاہ کو لکھتی ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ نواب خاص محل صاحبہ اگلے ہی زمانہ میں کہ جب میں ان کے پاس رہتی تھی کیسے کیسے فساد کرتی رہیں اور کبھی روداد میری تم تلک جانے کو نہ ہوئیں اب عنایت خدا سے کلکتہ میں گواہی دیتی ہیں"

محلات عجیب عجیب فتنہ و فساد اٹھاتی تھیں اور خوب ایک دوسرے کی لگائی بجھائی کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ نواب شیدا بیگم پر اتہام لگا کہ اُن کے لڑکی ہوئی ہے دوسری مرتبہ یہ الزام لگا کہ نثار علی لہسنیا ہاتھی پر چڑھ کے چینی بازار میں ان کے محل کے کوٹھے کے سامنے چار گھڑی تک کھڑا رہا اور ان کے یہاں کی کھڑکیاں کھلی رہیں اور عورتیں بیٹھی رہیں۔ نہ تو کھڑکیاں بند ہوئیں نہ عورتیں اٹھیں اس کے

کیا معنی ۔" نورزماں بیگم کی بھی کسی نے چغلی کھائی اور حکم ہوا کہ خورد محل کے ساتھ جاکر رہو انھوں نے اپنی برأت میں لکھا ہے" اشراف زادیوں سے یہ فعل نہیں ہوتے"۔

سُلطان جہاں بیگم بھی ان الزاموں سے بری نہ تھیں۔ ۵ار محرم ۱۲۷۳ھ کے خط میں لکھتی ہیں۔

" لوگوں نے مجھ رنجور پر اتہام باندھے حضور کو بھی یقین آگیا۔ حضرت عباسؑ علمبردار کی سوگند میں آپ کا نام لئے بیٹھی ہوں نہ غم خوار ہے نہ دمساز ہے صرف آپ کی یاد ہے ؎

رفتہ رفتہ ہوئی ہوں سودائی		دور پہنچے گی میری رسوائی

ان خطوں کے پڑھنے سے مٹتے ہوئے درباری ماحول کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور نفسیات انسانی کے وہ پہلو بھی جو کسی لباس میں بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے یہ رشک و حسد امتیاز اور تخصیص کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور اس کے پیچھے یہ احساس ہے کہ دوسروں کو زیادہ قُربت حاصل ہے اور ہم اس صف میں نہیں ہیں۔

ہندوستان کے بعض دربار اس کی ہمہ رنگ تہذیب و تمدن کے آئینہ بردار رہے ہیں اس لئے جو اُردو ان درباروں کے سایہ میں پلی اور بڑھی اس میں فارسی یدنُمائی کی حد تک غالب نہیں رہی، قلی قطب شاہ، واجد علی شاہ اور بہادر شاہ کی اُردو مُلاّ وجہی، مرزا سرور اور شاہ نصیر سے مختلف ہے اس میں ہندیت کا چٹخارہ ہے یہ خطوط بھی اس مزہ سے خالی نہیں ہیں۔ جانِ عالم لکھتے ہیں۔

"میرے پیچھے بدخواہوں نے چاہا کہ ـــــــ اس ــــــ ـــــــ سے جلد ملاقات کا سبھیتہ ہو ـــ جی کڑا کر کے نجم النساء پھر اس کے گھر گئیں"۔

جانِ عالم نے بدر عالم کو جہانگیریاں بھیجی ہیں اس موقع پر لکھتے ہیں۔

" صندلی کلائیوں میں لہراوٹ ان کی مُبارک ہو۔ شاخِ گلاب میں سجاوٹ کی چمک ہو"۔

دہلی کے بعد لکھنؤ میں جو تہذیبی شمع روشن ہوئی وہ دربار کی مشعل سے۔ اس لئے یہاں اُردو ادب کو جو قدریں ملیں وہ بھی اُس دربار سے جس پر ایک محدود فارغ البال طبقہ کا قبضہ تھا دلّی کا ادب کبھی جامع مسجد کی سیڑھیوں سے بے نیاز نہیں

رہا لیکن لکھنؤ اوّل تو کھڑی بولی کے علاقہ سے دُور تھا اور دوسرے یہاں کی تہذیبی روایات تمام تر شہر کے جاگیرداروں اور رئیسوں سے وابستہ تھیں اس لئے اس کی نثر میں بھی بلا کا تکلّف اور تصنّع آگیا۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات نے ان صنائع کو برتا ہے لیکن بعض جگہ مصیبتوں نے اس برف کو پگھلا بھی دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آبِ رواں کا ایک چشمہ ہے جو پھوٹ بہا ہے۔ اس گئی گزری حالت میں بھی ان کی خو بو وہی تھی اور وہی پرانی روایات ان کو جان و دل سے عزیز تھیں اب سروری و جہانداری ختم ہو چکی تھی لیکن وہ اب بھی سلطانِ ملکِ حسن و جمال، اور خسروِ ماہ طلعتانِ شیریں مقال تھے۔ چنانچہ بعض خطوں میں واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات نے وہی تکلّفات اور تصنّع برتا ہے جو اس زمانہ کی عام خصوصیت ہے۔

"آٹھ پہر کبھی تمھارے دردندان کے تصوّر میں اشک بہاتی ہوں اور کبھی لب یاقوت گون کے دھیان میں دیدۂ خونبار سے لختِ جگر مثلِ عقیقِ احمر ٹپکاتی ہوں کبھی تمھارے سبز رنگ زمرّد رمانی کے خیال میں دستِ وحشت غیر مرجان سے اپنے عارض گلفام کو مارے طمانچوں کے لال کرتی ہوں اور کبھی بیغب خیال وصل کی تختی واسطے دفع خفقان کے سینہ پر دھرتی ہوں کبھی کاکل مشکیں کی یاد میں نیلم کی طرح آنکھوں میں ایسی تیرگی چھاتی ہے کہ ہر ایک آنکھ پتھرا کے نگینۂ سلیمانی بن جاتی ہے۔"

نگار محل لکھتی ہیں یہ رعایت لفظی بھی ملاحظہ ہو۔

"اچھا جوگی بیروگی نے اپنے روپ پر رجھایا، ہمیں بھی جوگن بنایا۔ اسی کُٹھتی میں باسا ہوا، جینے کا سانسا ہوا۔ تارِ گریبان زنار ہوئے، قشقہ کی جگہ داغِ حرمان نمودار ہوئے۔ اشکِ خونی گلے کا ہار ہوئے، مرگ چھالا ہے، نالہ سے ناقوس کا کام نکالا ہے۔ بھبھوتی خاک دھول ہے۔ کہنی بیراگن پنجہ ترسول ہے۔ گیسوئے مُشک بار اُلجھ اُلجھ کر جٹا بن گئے کسی سبزہ رخسار کے ہجر میں دل و جگر پانی کی طرح چھن گئے۔ شرابِ الست کے مست ہیں بے شراب مخمور ہیں پربھو کی دَیا سے جوگ روگ میں بھرپور ہیں اپنے کنور کنہیا کی پجاری ہیں جگت دھرم لٹا دھاری ہیں۔"

لکھنؤ میں نثر شاعری کی انگلی پکڑ کر آئی تھی۔ اس لئے اس میں اور نظم میں بہت کم فرق تھا اور قافیہ پیمائی کا جا بجا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ روش خطوں میں بھی نظر آتی ہے شیدا بیگم لکھتی ہیں۔

"مجمع جود و کرم، صاحب سیف و علم، حضرت سُلطان عالم زادہ اللہ عشقہ۔
بڑا ہے یہ ظُلم و ستم کہ تم نے محبّت نامہ نہ کیا رقم، سچ کہو تمہیں خدا کی قسم، کیوں ہوگئے ہم سے برہم، ہم کو اس کا بہت ہے غم، کس نے اُلفت کی ہے کم، اپنا تو فُرقت سے نکلتا ہے دم، کہ خیریت سے لائے تم کو ربِّ اکرم پھر ہم تم ہوں باہم اور نورِ چشم نگین آرا بیگم، تسلیم کرتی ہیں ہوکر خم۔"

یہی قافیہ پیمائی اشعار میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

سفر سے جلد آؤ جانِ عالم جمال اپنا دکھاؤ جانِ عالم

نظم لکھنا قابلیت اور علمیت کی دلیل تھی اور ایک پڑھے لکھے آدمی کا یہی طرۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ اکثر خطوط بھی منظوم لکھے جاتے۔ واجد علی شاہ کی بیگمات نے اکثر منظوم اشتیاق نامے لکھے ہیں جو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ذیل میں نواب شیدا بیگم کے ایک منظوم خط کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں[1]

بہار آئی کہاں تو ساقیا ہے تصوّر ہر گھڑی مجھ کو ترا ہے
زمرّد ہوگئی ساری زمیں ہے ہر ایک سو باغ میں سبزہ کھلا ہے

---

[1] مخزن اسرار سلطانی (قلمی) ص ۱۴۶ – ۱۴۷۔۔۔۔۔ مخزن اسرار سلطانی میں اس کے علاوہ بھی منظوم خطوط ہیں ملاحظہ ہوں صفحات ۹ – ۱۲ – ۱۴ – ۱۴۸ – ۱۴۹ – ۶۹ تا ۷۲۔

حور بیگم کے خط کے چند اشعار یہ ہیں ؎

اے جان جان بصورت جاں اعتبار کیا تم آؤ یا نہ آؤ ہمیں اختیار کیا
بے اپنے گل کے سیر گلستاں خراب ہے کیفیتیں دکھائے گی فصلِ بہار کیا
برہم ہوئے ہیں گیسوئے برہم کی یاد سے اب پوچھتے ہو تم سببِ انتشار کیا
گیسو کی آرزو کبھی عارض کا اشتیاق دیکھیں دکھائے گردشِ لیل و نہار کیا
ممکن نہیں جو کوچہ جاناں میں رہ سکے میرے غُبار سے ہے صبا کو غبار کیا
لو آؤ ایک دم مرے پہلو میں سو رہو گر اپنا جانتے ہو تم اے جان عار کیا
لاکھوں حسیں ہیں صورت جاناں کے شیفتہ ہم کس قطار میں ہیں ہمارا شمار کیا

کب ہے یقین زینتِ آغوش ہو حصول
اے حور ان کے دل پہ ہمیں اختیار کیا

مخزن اسرار سلطانی (قلمی) ص ۷۔

وہ پانی نہر میں ہے صاف جاری — کہ جس پر دل مرا لہرا رہا ہے
ملاریوں کی کہیں آتی ہے آواز — کسی جا شاخ میں جھولا پڑا ہے
وہ جوبن اب ہمارا ہے کہ ہر دم — پری بھی حور بھی ہوتی فدا ہے
مِسّی ہونٹوں پر اور آنکھوں میں سُرمہ — رچی ہاتھوں میں پاؤں میں حنا ہے
طلائی ہے پڑا موباف سر میں — چُنی ماتھے پہ افشاں خوش نما ہے
گلابی پائجامہ سُرخ کرتی — دوپٹہ گاچ کا دھانی رنگا ہے
مَلا ہے عطر مجموعے کا ایسا — کہ سارا مثلِ عنبر گھر بسا ہے
ولیکن بے تمہارے جانِ عالم — مرا اندر سے دل گھبرا رہا ہے
یہ ساون سب یوں ہی جاتا ہے خالی — جوں ایسے میں تم آؤ تو مزا ہے

میں شیدا جان و دل سے ہوں تمہاری
تمھیں میری نہیں پروا ذرا ہے

ان خطوں کو اس زمانہ کے مخصوص تاریخی اور تمدّنی حالات کی روشنی میں دیکھنا چاہئے۔ اس وقت ایک بساط اُلٹ چکی تھی دوسری بچھائی جا رہی تھی۔ جاگیرداری ختم ہو رہی تھی لیکن اس کی تہذیبی قدریں باقی تھیں۔ سرمایہ داری کی اینٹ رکھی جا چکی تھی لیکن اس کی بدولت جو اقدار رائج ہونے والی تھیں وہ ابھی معرضِ وجود میں نہیں آئی تھیں چنانچہ بادشاہ اور اُن کی بیگمات کی جو نفسی کیفیت تھی وہ بھی ان ہی خارجی عوامل کا نتیجہ ہے ان میں سے بعض خطوط ہندوستانی عورت کے دل کی پُکار ہیں۔ وہ محلات جو پردۂ مجبوری میں رہیں اور بادشاہ کے ساتھ کلکتہ نہ جا سکیں انھوں نے ان خطوں میں اپنے اشتیاق اور محبّت کا ذکر کیا ہے اسی طرح بادشاہ شوہر نے اپنی مصیبت اور فراق کی داستان کو درد انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ ان میں لکھنؤ کا لوچ اس کا بانکپن اور اس کا ابتذال ہے لیکن کوئی بے کراں جذبہ، کوئی بلند تصوّر، کوئی دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں ہے۔ ان کے پیچھے جو سماجی زندگی ہے ہوس ناک ادنیٰ قسم کی ہے۔ ان میں جذبہ کی دہکتی ہوئی آگ ہے۔ اس کی دھیمی آنچ نہیں ایک سستا رومانی انداز ہے جو ہمیں خواہش کے تنگ دائرے سے نکال کر وسیع فضا میں نہیں لے جاتا یہ خطوط لکھے نہیں گئے ریشم کی طرح بُنے گئے ہیں۔ کوئی جملہ جب تک وہ شبنم کے ایک ایک قطرہ سے پھول نہیں بن گیا اس گلدستہ میں شامل نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ساحری پیمبری کا درجہ اختیار نہیں کر سکتی۔

نصرتی کا سنِ وفات

(از جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی)

بیجاپور کے ملک الشعرا نصرتی کے حالات کے متعلق ہمارا سب سے پہلا ذریعہ معلومات عبد الجبار خاں ملکاپوری کا تذکرہ محبوب الزمن ہے نصرتی کی وفات سے متعلق اس کا بیان ہے کہ

"نصرتی تمام ریختہ گویان دکن میں ملک الشعرا تھا آخر ۱۰۹۵ھ ہجری میں فوت ہوا"[1]

اس کے بعد دکن میں اردو کا پہلا اڈیشن شائع ہوا، اور چونکہ نصرتی کے سنِ وفات سے متعلق کوئی نئی چیز اس وقت تک ہم کو نہیں ملی تھی، اس لئے ہم نے اس میں مندرجہ بالا بیان پر بھروسہ کرتے ہوئے سن وفات ۱۰۹۵ھ ہی رہنے دیا۔ اس کے بعد اردو سے قدیم (حکیم شمس اللہ قادری) اور اردو شہ پارے (ڈاکٹر زور) جیسی کتابیں شائع ہوئیں لیکن ان میں اس سے متعلق سی نئی معلومات کا اضافہ نہیں ہوا ہے، آج سے کچھ عرصہ قبل فتوت کا تذکرہ ریاض حسنی کا نسخہ بھی ملا اور اس میں نصرتی سے متعلق بعض نئی باتوں کے علاوہ اس کے انتقال کے متعلق بھی نئے معلومات تھے، فتوت نے اپنے تذکرہ میں نصرتی کے جو حالات لکھے ہیں ان کے ضمن میں حسب ذیل اقتباس خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

"وقتیکہ شاہ اورنگ زیب غازی انار اللہ برہانہ ولایت دکن را در تسخیر درآورد حکم نفاذ داد کہ سخن سخن سنجان این ملک را در نظر بگذرانند، بموجب حکم گذرانیدند۔ کلام نصرتی را برہمہ افضل فرمود بخطاب ملک الشعرائے ہند سرفرازی داد"[2]

چنانچہ جب دکن میں اردو کا تیسرا اڈیشن شائع ہونے لگا تو اس نئی اطلاع کے ماتحت ہم نے اس میں بھی ان سطروں کا اضافہ کر دیا۔

---

[1] تذکرہ محبوب الزمن جلد دوم صفحہ ۱۰۹۱

[2] فتوت کا تذکرہ ریاض حسنی مملوکہ دفتر دیوانی و مال حیدرآباد، ہم نے سب سے پہلے اس کا ذکر اپنے ایک مضمون میں کیا تھا دیکھو مقالات ہاشمی صفحہ ۲۲۵۔

"جب عالمگیر نے بیجاپور فتح کیا (۱۰۹۷ھ) اس وقت یہ زندہ تھا اور عالمگیر نے بھی اس کو ملک الشعرا کے خطاب سے سربلند کیا۔"[1]

اس کے بعد مولانا ڈاکٹر عبدالحق مدظلہ کی کتاب "نصرتی" شائع ہوئی اس میں مولانا نے نصرتی کے انتقال کے متعلق فتوت ہی کے بیان کو دُہرایا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ فتوت نے اپنے تذکرہ ریاض حسنی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعراء کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب پر افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعرائے ہند سے سرفراز فرمایا۔ مولوی عبدالجبار مرحوم نے تذکرہ شعرائے دکن میں ان کا سن وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انہیں کہاں سے حاصل ہوئی۔ اگر یہ سن وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عالمگیر نے بیجاپور کو ۱۰۹۷ھ ہجری میں فتح کیا تھا۔"[2]

اس سلسلہ میں کچھ دنوں پہلے تک کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں ہو سکا تھا لیکن حال ہی میں ہم کو نصرتی کے انتقال سے متعلق ایک قطعہ تاریخ ملا ہے جو اس کے سنِ وفات پر بالکل نئی روشنی ڈالتا ہے چنانچہ آج ہم اس قطعہ کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔

انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کے حسب خواہش حیدرآباد کے مشہور کُتب خانوں کی قلمی اردو کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی خدمت مجھے سُپرد کی گئی ہے، اس سلسلہ میں اب نواب سالار جنگ مرحوم کے کُتب خانہ کی قلمی کتابوں کا کام ہو رہا ہے۔ نواب صاحب موصوف کے کُتب خانہ میں "گلشن عشق" کے کئی نسخے بھی جن میں سے دو نسخوں[3] میں کاتبوں نے نصرتی کے انتقال کا تاریخی قطعہ بھی درج کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

قطعہ متضمن تاریخ فوتی نصرتی

ضرب شمشیر سوں یہ دُنیا چھوڑ　　　جا کے جنّت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آملا یک ستے　　　یوں کہے نصرتی شہید ہوئے
۱۰۸۵ ہجری

---

[1] دکن میں اُردو تیسری اشاعت ص۱۲۶۔

[2] نصرتی ازمولانا عبدالحق ص۱۶ اشاعت اول [3] یہ نسخے کُتب خانہ (۸۱ ۲ اور ۳۰) پر ہیں۔

"نصرتی شہید رہے" سے ۱۰۸۵ھ نکلتا ہے۔ گلشن عشق کے ان دو نسخوں میں سے ایک نسخہ ۱۰۸۹ھ کا لکھا ہوا ہے دوسرے نسخہ میں سن کتابت درج نہیں ہے۔ لیکن اس کی کتابت اور کاغذ وغیرہ کے دیکھنے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی شاید اسی عہد کا ہو۔ معلوم ہوتا ہے جن نسخوں سے یہ نسخے نقل کئے گئے ہیں ان میں تاریخ فوتی درج تھی۔

اس دریافت کی روشنی میں ہم کو نصرتی کے وفات کے متعلق اپنے نتیجہ پر نظر ثانی کرنی چاہیئے، جو ۱۰۸۵ھ ہے

نصرتی کی سب سے آخری تصنیف جس کا ہم کو علم ہے تاریخ اسکندری ہے، یہ ۱۰۸۳ھ ہجری میں تصنیف ہوئی ہے، شاید اس کے دو سال بعد ہی (۱۰۸۵ھ) اس کو کسی نے تلوار سے شہید کردیا۔

ہو سکتا ہے کہ نصرتی کا سن انتقال کا قطعہ عبدالجبار خاں کو معلوم ہو اور انھوں نے ۱۰۸۵ھ لکھا ہو، پریس کی غلطی سے بجائے (۸۵) کے (۹۵) طبع ہوگیا ہو۔

بہر حال اب یہ امر تحقیق ہوگیا ہے کہ نصرتی ۱۰۹۰ ہجری کے قبل شہید ہوگیا تھا اس لحاظ سے فتوحات کا بیان غلط ہوجاتا ہے، امید ہے کہ یہ تحقیق مورخین ادب اردو کے لئے مزید کاوش کا سبب ثابت ہوگی۔

فہرست کتب موصولہ برائے تبصرہ

۱۔ گلشن مترجم امانت بلال صاحب
۲۔ ادارۂ ادبیات اردو (انگریزی)
ناظم ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد
۳۔ نئے ہند کی تعمیر پبلیکیشنز ڈویژن
۴۔ پنج سالہ پلان سوالاً و جواباً منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ دہلی
۵۔ شرح دیوان غالب اردو نظم طباطبائی
۶۔ حسرت موہانی۔ تیسرا اڈیشن
عبدالشکور صاحب
۷۔ سراپائے رسول اعجاز الحق قدوسی
۸۔ بارگاہ رسالت میں شعر کی قدر
محمد یعقوب مسیدب

رسائل

۹۔ سالنامہ شاہراہ کراچی
۱۰۔ سالنامہ ادب لطیف لاہور
۱۱۔ سالنامہ سب رس حیدر آباد
۱۲۔ سالنامہ اردو لٹریری سوسائٹی
سینٹ جوزف کالج بنگلور

تبصرے

تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (۲ جلدیں) | مرتبہ: سید ہاشمی فرید آبادی
کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ

ناشر:- انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان، کراچی، قیمت جلد اوّل ۱۲/، جلد دوم ۱۲/

ہندوستان میں ملنے کا پتہ:- رائٹرس اِمپوریم لمیٹڈ، فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی۔ ۱ (سول ایجنٹ انجمن ترقی اردو)

سید ہاشمی فرید آبادی نے تقسیم ہند سے بہت پہلے عثمانیہ یونی ورسٹی کے طلباء کے لئے ہندوستان کی ایک تاریخ لکھی تھی۔ زیرِ تبصرہ کتاب اسی کا بہتر اور مفصّل اڈیشن ہے پہلی جلد مسلمانوں کی فتح سندھ سے شروع ہوکر اورنگ زیب کی وفات پر ختم ہوتی ہے۔ ابتدا میں مقدمہ کے طور پر مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے سیاسی و معاشی حالات کا ایک سرسری تذکرہ ہے۔ اس تاریخ میں مصنف نے صرف جنگوں اور فتوحات کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ مختلف ادوار کے تہذیبی و تمدّنی حالات کا جائزہ لینے کی بھی کوشش کی ہے۔ علمی و ادبی کارناموں کے ذکر کے سلسلہ میں فاضل مُصنّف سے بعض تسامح ہو گئے ہیں۔ ضیاءے برنی کی تاریخ فیروز شاہی اور عصامی کی فتوح السلاطین کو جو تغلق دَور کی تصانیف ہیں دَورِ شمسی میں شمار کیا گیا ہے۔ فوائد الفواد کو بھی شمسی دَور میں شمار کیا گیا ہے اور اس کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ حضرت نظام الدّین اولیا کا ابتدائی زمانہ ملوک شمسی کے دَور میں گزرا ہے۔ خزائن الفتوح بھی جس کا دوسرا نام (تاریخ علائی) خود اپنے زمانہ کا اعلان کرتا ہے شمسی دَور کی تصانیف میں شمار کی گئی ہے۔ معلوم نہیں کیوں خلجی اور تغلق کے زمانہ کے علمی و تہذیبی کارناموں شمسی دَور کے کارناموں کی طرح ذکر نہیں کیا گیا۔ اکبر کے دَور کے مشاہیر علم و ادب پر بیس صفحے لکھے گئے ہیں لیکن جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانہ کے مشاہیر علم و ادب کا تذکرہ کتاب کے آخری باب دگیارھویں صدی ہجری پر ایک نظر) میں کیا گیا ہے۔ اورنگ زیب کا دَور تاریخی تصانیف کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن اس کا ذکر بھی بہت سرسری طور پر ہوا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مُصنّف نے ہندی مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی، اور تمدّنی کارناموں کو تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور انداز بیان معاندانہ یا قوم فروشانہ نہیں ہے، پھر بھی اسے پڑھ کر نہ محمود غزنوی کی ادب نوازی و معارف پروری کا اندازہ ہوتا ہے، نہ بلبن کے جلال و جبروت کا نقشا سامنے آتا ہے اور نہ صولت شیر شاہی کی تصویر کھنچتی ہے۔ شاید یہ مصنف کے اسلوب تحریر کا قصور ہو۔ جو اسلوب اس کتاب پر

اختیار کیا گیا ہو وہ تاریخ کے لئے کسی طرح مناسب نہیں۔ شاید اسی لئے عبدالماجد دریابادی نے طنزاً اسے انشا کی کتاب کہا ہے۔ جوشِ اِنشا پردازی میں مصنف نے بعض نئی ترکیبیں گڑھی ہیں مثلاً زخم دار مسلمان، نالائق قبول، یہ ترکیبیں قابل قبول نہیں۔

دوسری جلد مغلوں کے زوال کی ابتدا سے شروع ہوکر لیاقت علی خاں کے حادثۂ قتل پر ختم ہوتی ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدیاں ہندوستان میں شورشوں اور ہنگاموں کا دور تھیں، اس دور میں تہذیبی و تمدنی کارناموں کی توقع نہیں ہوسکتی۔ ان دو صدیوں کی شورشوں، ہنگاموں اور خانہ جنگیوں کا ذکر مصنف نے تفصیل اور عمدگی سے کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرد ہونے کے بعد ایک نیا دور اور ایک نیا نظام (باب دہم) ہندوستان میں شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں سرسید کی کوششوں اور کارناموں کو مصنف نے خوبی سے اُجاگر کیا ہے لیکن دورِ سرسید میں سید مرحوم کے علاوہ مصنف کو اگر کوئی اہم شخصیتیں ملتی ہیں تو وہ حالی اور مولانا محمد قاسم ہیں۔ ندوۃ العلما اور شبلی کے بنا کردہ دارالمصنفین کا ذکر ضرور ہے لیکن قومی تعمیر کے سلسلہ میں خود شبلی کا ذکر نہیں اور نہ نذیر احمد اور ذکاء اللہ کا دارالمصنفین کو شبلی کا بنا کردہ بتایا گیا ہے یہ بھی صحیح نہیں۔ شبلی نے تو صرف اس کا خاکا تیار کیا تھا، بنا ڈالنے والے تو ان کے جانشین سید سلیمان ندوی مرحوم تھے۔

آزادی سے کچھ قبل اور آزادی کے فوراً بعد کے فسادات، خونریزیوں اور ہنگاموں سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ ایک طرفہ بیان ہے۔ پاکستان میں جو کچھ ہوا اس کا ذکر بھی ضروری تھا۔ مشرقی پنجاب کا قتلِ عام صحیح، سکھ ریاستوں میں قتل عام مسلم، لیکن مغربی پنجاب کے مظالم کا بھی کچھ ذکر ضروری تھا۔ تاریخ کی دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مغربی پنجاب کے مظالم کا بھی ذکر کیا جاتا۔

کتاب مجموعی حیثیت سے کالج کے طلبا کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ اور عام مطالعہ کے لئے بھی اچھی ہے۔ اگر فاضل مصنف اگلے اڈیشن میں محمد حسین آزاد کا اسلوب بیان ترک کرکے خود اپنے رفیق و رہنما عبدالحق کا طرز تحریر اختیار کریں تو کتاب کی افادیت میں بہت اضافہ ہوگا۔

پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو

مرتبہ۔ سید ہاشمی فرید آبادی
ناشر۔ انجمن ترقی اردو (پاکستان، قیمت۔ ہے
ہندستان میں ملنے کا پتہ۔ رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱ (سول ایجنٹ انجمن ترقی اردو)

انجمن ترقیٔ اردو نے مختلف حیثیتوں سے اردو کی جو خدمت انجام دی ہے اس

اُردو زبان کا مورخ بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ علمی و ادبی کتابوں کے تراجم، شعراء کے تذکرے، قدیم اساتذہ کے دیوان، دکھنی ادبیات انجمن ہی کی کوششوں سے اہل علم تک پہنچے۔ اُردو میں تنقیدی سرمایہ بھی انجمن ہی کی کاوشوں سے فراہم ہوا۔ انجمن ہی کی بدولت اُردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور وہ ہندوستان کے ان دور دراز گوشوں تک پہنچی جہاں پہلے اس کا گزر نہیں ہوا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد اس انجمن کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انجمن کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ اسی موقع پر انجمن کے موجودہ جوائنٹ سکریٹری سید ہاشمی فرید آبادی کی ترتیب دی ہوئی انجمن کی پنجاہ سالہ تاریخ شائع ہوئی۔ جس میں انجمن کی ابتدا سے ۱۹۵۳ء تک کے کارناموں کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ عبدالحق کی اُردو زبان کو زندہ رکھنے اور اسے زیادہ مقبول بنانے کی کوششوں کو خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ان کی اُردو دوستی، جد و جہد اور ایثار و قربانی کا تفصیل اور عمدگی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں قصیدہ کی جھلک آ گئی ہے۔ اور ان کے مقابلہ میں ان کے پیش روؤں کا جس انداز سے ذکر کیا گیا ہے وہ کچھ اچھا نہیں۔

شروع میں تمہید کے طور پر اُردو زبان کی ابتدا اور نشو و نما اور علی گڈھ تحریک سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سرسری اور سطحی ہے۔ محسن الملک کی جس بزدلی کی طرف اشارہ ہے وہ بھی کوئی وزن نہیں رکھتا۔ واردھا اسکیم کو سارجنٹ اسکیم کا ردِ عمل بتایا گیا ہے یہ صحیح نہیں۔ واردھا اسکیم، سارجنٹ اسکیم سے بہت پہلے وجود میں آ چکی تھی۔

کتاب کا چھٹا باب (تقسیم ہند کے بعد کے واقعات) خود عبدالحق کے قلم سے ہے اور نہایت تفصیل اور ایک درد بھرے دل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس کا مطالعہ بقول مرتب صرف انجمن کی تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ ہمارے ملک کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ کے نقطۂ نگاہ سے بھی مفید ہوگا۔

آخری باب انجمن ترقی اُردو پاکستان کے آئندہ پروگرام سے متعلق ہے۔

کتاب اچھے ٹائپ اور عمدہ کاغذ پر چھپی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ دو صفحے کے غلط نامے کے باوجود غلطیاں بہت رہ گئی ہیں۔

تلخیص الاردو | مرتبہ، سید ہاشمی فرید آبادی، کتابت، طباعت، کاغذ اوسط درجہ کے۔
ناشر۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، قیمت عہ

ہندوستان میں ملنے کا پتہ۔ رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ، [illegible] روڈ بمبئی [illegible]

یہ کتاب بھی انجمن کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر شائع کی گئی۔ اس میں انجمن کے مشہور

رسالہ اردو کے بیس سالہ مضامین کا انتخاب ہے۔ مجموعہ میں کل گیارہ مضامین ہیں۔ یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ جن مضامین کو اس مجموعہ میں جگہ دی گئی ہے وہ سب کے سب صحیح معنوں میں حاصل رسالہ ہیں لیکن مندرجۂ ذیل چار مضامین کے متعلق یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ نہایت اہم ہیں۔ وضع اصطلاحات علمیہ، (وحید الدین سلیم) ہجو فردوسی (محمود شیرانی) ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی، (مرزا فرحت اللہ بیگ) اردو میں دخیل الفاظ (عبدالحق) عبدالحلیم شرر کا مضمون —— عماد الملک تبرک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس سے کہیں بہتر مضمون خود عبدالحق نے عماد الملک پر لکھا ہے۔ آخری دو مضامین کے بجائے اگر مولوی عبدالحق کے دوسرے مضامین کا انتخاب ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے یہ مجموعہ قابلِ قدر ہے۔ (ع، ر، ق)

اصطلاحات معاشیات

از پروفیسر دلشاد کلانچوی، ایم اے۔ صفحات ۱۱۸ قیمت عہ، ملنے کا پتا:- دانش کدہ بھاولپور (پاکستان)

معاشیات پر اردو میں چھوٹی بڑی کئی کتابیں اہل فن نے تصنیف کی ہیں۔ پروفیسر دلشاد کلانچوی صاحب نے طلباء معاشیات کی سہولت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اچھے انداز سے مندرجہ بالا کتاب مرتب کی ہے۔ معاشیات کی انگریزی اصطلاحات کے ساتھ ان کا اردو ترجمہ اور پھر مختصر طور سے اصطلاحات کی تعریف ہے۔ علم معاشیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یقیناً یہ کتاب مفید اور کارآمد ہے۔ (ف)

ایک اور مشرقی کتب خانہ

(کتب خانہ الاصلاح، دسنہ، پٹنہ)
مرتبہ سید عبدالقوی دسنوی

کتابت، طباعت، کاغذ اوسط درجہ کے۔

ملنے کا پتا:- رائٹرز امپوریم لمیٹڈ، فیروز شاہ مہتہ روڈ فورٹ بمبئی۔

دسنہ صوبۂ بہار کا ایک مردم خیز گانو ہے۔ دنیائے اسلام کے نامور عالم مرحوم سید سلیمان ندوی یہیں کی خاک سے اٹھے تھے۔ ہمارے انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی یہیں کے رہنے والے ہیں۔ تاریخ گجرات کے ماہر جناب سید ابوظفر صاحب ندوی کا وطن یہی بستی ہے۔ اس وقت اس بستی کے رہنے والوں میں متعدد پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ ہیں۔ جہاں علم ہوتا ہے، وہاں کتابوں کا ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ دسنہ کے اہل علم اور نوجوان طلباء کی کوششوں سے یہاں ایک نہایت عمدہ لائبریری ہے جس میں نادر قلمی و مطبوعہ کتابوں کے علاوہ اخبار اور رسالے بہت بڑی تعداد میں محفوظ ہیں

اس لائبریری کو قائم ہوئے تقریباً ۷۵ سال ہوتے ہیں۔ اس سال اہلِ دسنہ اس کی گولڈن جوبلی منانا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم لائبریری کے سکریٹری نے یہ اٹھایا ہے کہ ایک (ادارہ) "مشرقی کتب خانہ" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں دسنہ کی مختصر تاریخ، وہاں کے متعدد اہلِ علم و اربابِ کمال کا مختصر تذکرہ اور نادر قلمی و مطبوعہ کتابوں اور رسالوں وغیرہ کا ذکر ہے۔ نوجوان سکریٹری نے اپنی بستی کے نوجوانوں کے ذکر میں کہیں کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ زبان بھی کہیں کہیں غلط ہو گئی ہے۔ 'کرکر' کا استعمال اکثر ہوا ہے۔ امید ہے کہ اگلے اڈیشن میں ان کی تصحیح ہو جائے گی۔

محمد حسن کالج، میگزین سہیل نمبر جون پور | "علی گڈھ میں شعر اور تنقید و ادب کے امام سہیل تھے۔"

"شعر و سخن سے قطع نظر ان (سہیل) جیسا ذہین شخص اب تک کہیں دیکھنے میں نہ آیا"
(ڈاکٹر ذاکر حسین خاں)

یہ اردو ادب کی بد قسمتی تھی کہ ایسے باکمال شخص کا کلام اس کی طبیعت کے لاابالی پن یا بے نیازی کی وجہ سے دنیا کے سامنے نہ آسکا۔ محمد حسن کالج ہمارے شکریہ کا مستحق ہے کہ اس نے سہیل کا بہت سا کلام اکٹھا کر کے اپنے کالج میگزین کا ایک خاص نمبر نکالا۔ شاعری کی یہ متاعِ گراں بہا حقیقت میں کالج کے پرنسپل جناب نیاز احمد صاحب صدیقی اور مدیر معارف جناب شاہ معین الدین صاحب کی کوششوں اور جد و جہد سے ہم تک پہنچی ہے۔

ابتدا میں مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے ایک مختصر سی تحریر "تابش سہیل" کے عنوان سے ہے، اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے نہایت اختصار کے ساتھ لیکن بلیغ انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ پھر شاہ معین الدین صاحب کا مختصر سا مقدمہ ہے جس میں کسی قدر مبالغہ کے ساتھ سہیل کی شخصیت کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی کا ایک مضمون جو تقریباً بیس برس پہلے علی گڈھ میگزین میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد مضامین رشید میں بھی شائع ہو چکا ہے، اس مجموعہ میں شامل ہے۔ یہ مضمون اس قدر دلچسپ ہے اور سہیل کی شخصیت کی ایسی صحیح تصویر اس میں پائی جاتی ہے کہ اس کے بغیر مجموعہ نامکمل رہ جاتا۔ سہیل کی شاعری پر تبصرہ مشہور نقاد آل احمد سرور نے کیا ہے اور نہایت تفصیل اور عمدگی سے کیا ہے۔ رسالہ محمد حسن کالج، جون پور اور دار المصنفین، شبلی منزل، اعظم گڈھ سے مل سکتا ہے۔ قیمت درج نہیں۔

(ع، ر، ق)

ضمیمہ (ب)

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں

اُردو مخطوطات

از

حامد اللہ صاحب ندوی

مثنوی کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ اور خاتمہ میں رسول اللہ پر درود و سلام بھیجا گیا ہے

ابتدا:

کہوں ایک قصہ میں کرتار کا — او رزاق مطلق ہے سنسار کا
محمد نبی سرور انبیاء — کہ اس تاج اقبال رفعت دیا
او صاحب سچا دین ایمان کا — او محبوب ہے اپنے سبحان کا

خاتمہ:-

اسے آگ دوزخ کی ہووے حرام — نبی کا یو دل سے سنے جو کلام
میں طالب ہوں رب کا ثنا بولتا — بچن کے جواہر سدا رولتا
بہ حق محمد علیہ السلام — علیک الصلوٰۃ علیک السلام

یہ مثنوی بیاض قصائد کے ساتھ مجلد ہے۔ بیاض کا ذکر آگے آئے گا۔

قصۂ جمجمہ و حضرت عیسیٰؑ

مصنف و سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۴۰، شعر فی صفحہ ۱۲،

خط نستعلیق، سائز ۶" × ۹"

مثنوی کا موضوع حضرت عیسیٰؑ اور کسی بادشاہ کے ایک بوسیدہ جمجمہ (کھوپڑی) کا مکالمہ ہے، جس میں جمجمہ اپنی شاہانہ زندگی، اور کافرانہ اعتقاد کی پوری کہانی کہہ سناتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کو دوبارہ زندہ کردیں۔ تاکہ وہ اپنی نئی زندگی خدا کی فرمانبرداری میں گذار سکے اور اس کا خاتمہ ایمان پر ہو، حضرت عیسیٰؑ دعا کرتے ہیں اور وہ زندہ ہوکر اپنی تقریباً ستر سال کی نئی زندگی خدا کی عبادت میں گذارتا اور مومن کی حالت میں مرجاتا ہے۔

ابتدا:-

کریما کارسازا بے نیازا — توئی صاحب کرم بندہ نوازا
توئی ہے بادشاہ دونوں جہاں کا — توئی ہے رب زمین و آسماں کا
کرے خالی او پھر اس کو بھرے تو — جلاوے مار کر، زندہ کرے تو

خاتمہ:-

سبھوں سے مل کے جنگل کو سدھارا — تو جا نگری لیا دریا کنارا
رکھے اللہ کی دل میں محبت — نہ رکھے دوسرے کسی کی مودت

جیا ستر برس در حبّ رحماں مراتب وہ گیا لے ساتھ ایماں

ترقیمہ:-

"ایں کتاب قصّۂ جمجمۂ بادشاہ... تمام شد بہ دست خط عزیم الدین (عظیم الدّین؟) تحریر فی التاریخ جمادی الثانی روز چہارشنبہ ... قصبۂ جے پر (جے پور؟)

مثنوی نہایت کرم خوردہ ہے۔

جمجمہ بادشاہ کے نام کی ایک مثنوی پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کُتب خانہ میں بھی موجود ہے، لیکن یہ مثنوی مذکورۂ بالا مثنوی سے بحر میں مختلف ہے۔ اور جعفر نامی کسی شاعر کی لکھی ہوئی ہے، اس کے ابتدائی اور اختتامی اشعار حسب ذیل ہیں۔

ابتدا:-

قوی حکم ہے قادر ذوالجلال کہ دا صفت بیچ قدرت کمال

نہ آدم نہ حوّا نہ کچھ عرش تھا نبی کے سبب سب کئے ہیں بجا

کیا حوض کوثر ستارے قمر منوّر ہوا ہے سو تیرا امر

خاتمہ:-

کہ فریاد کرتا ہوں میں بردری کہ اُن کوں کٹھن روز ہے محشری

کہ اس روز آسان کیجے سوتوں کہ جنّت منے تب سوں دائم رہوں

کہ جعفر امت بیچ کمتر غلام سو تیرے فضل سوں کرم کر مدام

علاوہ ازیں قصّۂ جمجمہ کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی کرنکا لائبریری میں موجود ہے، جس کو دوسری گیارہ مثنویوں کے ساتھ مجموعہ کی شکل میں مطبع صفدری بمبئی نے ۱۳۰۳ھ میں شائع کیا ہے، یہ مطبوعہ نسخہ مذکورۂ بالا مخطوطہ سے مختلف ہے، طرزِ بیان میں بھی اور بحر میں بھی، علاوہ ازیں اس مطبوعہ نسخہ میں مُصنّف نے اپنا نام عبداللہ ظاہر کیا ہے۔ اس کے ابتدائی اور اختتامی اشعار حسب ذیل ہیں۔

ابتدا:-

ناگہاں قدرت خدا سے یوں ہوا جن زمین و آسماں پیدا کیا

چھاجتی ہے اس ہی مالک کو بکھان جن نے سرجا ہے زقدرت کل جہان

خاک پانی سے عجب خلقت گھڑے

آپ پیدا کرکے ناپیدا کرے

خاتمہ:-

کہتا ہے عبداللہ مجھ پر کر کرم   باطفیل حضرتِ خیر الامم
یعنی آں ذات مبارک دستگیر   ہیں محی الدین جو پیرانِ پیر
معجزہ غیبی کا تو اب کر تمام   حضرت احمد نبی پر ہوں سلام

جُملہ شعر ۹۶

قِصّہ سیہ پوش

مُصنِّف شاہ رحمٰن، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۱۶، شعر فی صفحہ ۱۴،
خط نستعلیق، سائز ۶" x ۹"

مثنوی نہایت ہی کرم خوردہ ہے اس لئے کہیں سے دو چار شعر بھی مُسلسل نہیں پڑھے جا سکے خاص کر خاتمہ بالکل ہی کیڑوں کی نذر ہوگیا ہے جس کی وجہ سے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ اس کا مصنّف کون ہے، البتّہ مولانا یوسف کھٹکھٹے نے حاشیہ پر لکھ دیا ہے کہ اس کا مُصنِّف شاہ رحمان ہے۔

تذکرۂ اُردوٗ مخطوطات میں اس مثنوی کا ذکر موجود ہے، ڈاکٹر زور نے لکھا ہے "یہ ایک ناقص الاوّل مثنوی ہے جس میں بحالت موجودہ تقریباً ۱۵۰ ابیات ہیں۔ آخری بیت میں مُصنّف نے اپنا نام رحمان شاہ لکھا ہے" ممکن ہے دونوں مثنویاں ایک ہی ہوں، اس لئے کہ بحر بھی وہی ہے، طرز بیان بھی وہی اور واقعہ بھی وہی،

مثنوی کا موضوع محمود غزنوی کا ایک واقعہ ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح وہ اپنے رعایا کا حال معلوم کرنے کی غرض سے راتوں میں بھیس بدل کر جایا کرتا تھا، ایک رات جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک سیہ پوش وزیر کے گھر میں داخل ہورہا ہے تو فوراً اس کو دھرلیتا ہے اور چوری کے الزام میں اس کو قتل کرنے کا حکم دیدیتا ہے لیکن جب اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیہ پوش چور نہیں ہے بلکہ وزیر کی نوجوان لڑکی کا عاشق ہے، جو راتوں میں چھپ چھپ کر اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا تو وہ بہ جائے غم و غصّہ کے خوش ہوتا ہے اور اس سیہ پوش کی شادی وزیر کی لڑکی سے کرادیتا ہے۔

مثنوی کے اختتامی اشعار تو پڑھے نہیں جا سکے، البتّہ ابتدائی اشعار یہ ہیں:-

تواریخ نامہ میں دیکھا ہمن   جو سربستہ تھا سلطنت کا کہن

کہ محمود غزنی سے صاحب نظر ہوس کی گل میں نگر کی خبر
بدی نیکی عالم کی معلوم نئیں بنا دیکھ یو بات مفہوم نئیں
کسی کالی کیری نما شام کوں مگر دیکھوں اس روم ہور شام کوں
ظُلم ہے رعیّت میں یا عدل ہے قہر ہے نگر بیچ یا فضل ہے

اس مثنوی کا ایک نُسخہ بھی پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ذاتی کُتب خانہ میں موجود ہے اس نُسخہ کی ابتدا میں حسب ذیل تین شعر زیادہ ہیں :-

کہوں کیا صفت رب کی باقی نہیں قلم سے لکھی جائے جاتی نہیں
درود اں محمّد پہ بھیجو مدام کہ دل جان قربان انھوں پر مدام
کہ ہیں چار اصحاب صاحب کرام دیے زیب و زینت دُنیا کو تمام

یہ نُسخہ خط نسخ میں لکھا ہوا ہے اور اچھّی حالت میں ہے اس کا خاتمہ حسبِ ذیل ہے :-

ہمن عاجزوں پر تو کیتا کرم ملایا تو ہم دو کو رکھ کر شرم
خدایا بہ حق نبی اکرام بلا دونوں بچھڑوں کو باشادکام
الٰہی بہ حقِ محمّد رسول کہ اپنی دُعا کو تو کرنا قبول

یہ مثنوی سوداگر بچہ، محمود شاہ ورسیہ پوش وغیرہ کے نام سے متعدّد بار چھپ بھی چکی ہے۔

نادِ علی

مُصنّف شاہ علی، سنہ تصنیف ۱۱۹۰ھ، صفحات ۵۱، شعر فی صفحہ ۱۱، خط نستعلیق سائز ۴ x ۹

مُصنّف کے حالات معلوم نہ ہو سکے، یہ مثنوی اور دو مثنویوں، لگن عشق اور رسالۂ شریف کے ساتھ مُجلّد ہے لگن عشق کے مُصنّف احمد علی شاہ قادری اور رسالۂ شریف کے مُصنّف شریف علی شاہ قادری ہیں، ان تینوں مثنویوں کے مجموعی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں کے پیر و مرشد ایک ہیں، جن کا نام ابراہیم علی شاہ قادری ہے، نادِ علی (حضرت علیؓ) کو اپنی تمام رشد و ہدایت کا سرچشمہ قرار دیا ہے،

نادِ علی مسئلہ توحید کے بیان سے متعلق ہے، جس میں زیادہ تر قرآنی آیات و احادیث کا ترجمہ کیا گیا ہے اور عناصر خمسہ کے باطنی پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے

کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام کائنات کا مرکز توحید باری تعالیٰ ہے اور اس توحید کا صحیح ذوق حاصل کرنے کے لئے کسی مرشد کے ہاتھوں بیعت کرنا ضروری ہے۔

ابتدا میں وجہ تالیف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

پنچھی شاہ علی کا جو پایا جمال ۔۔۔ ہوا فیضِ نادِ علی کوں کمال
عمل ذکر کھولے ہیں نادِ علی ۔۔۔ خبر بھید سے جان ہووے بلی
اتھا بہوت دن سے اسی کا خیال ۔۔۔ یو توحید کی تالیف کرنا امال
مرے صاحب طالب ہوا اس بات کا ۔۔۔ رسالہ ہوا شوق اثبات کا
ہوے طالباں کو جو یہ فیض عام ۔۔۔ بہ برکت محمدؐ علیہ السلام

خاتمہ میں سنہ تصنیف، موضوع، تعداد ابیات، نام و مقام تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے:-

سنہ گیارہ سو نود سو ہجری اتھا ۔۔۔ بیاں وار توحید سارا کیا
پنج سو بیت دس آیت رسالے منیں ۔۔۔ کل ارشاد ہے اس میں سمجھو تمیں
رسالہ کا ہے نام نادِ علی ۔۔۔ حیدر آباد شہر میں ہوا منجلی

ابتدا:

ما خلقت الجن والانس ۔۔۔ الا لیعبدون
خلقتُ جن ہور انس پیدا کیا ۔۔۔ اپن معرفت کوں ہویدا کیا
اللہ اسم ذاتی ہے اثبات کر ۔۔۔ نفی غیر کے وہم سوں در گذر
یہی اسم ہر جسم میں ہے نہاں ۔۔۔ یقیں کل شیٔ محیط کا بیاں

خاتمہ:-

الٰہی دے توفیق ہووے من عرف ۔۔۔ اپس بوج ہوجا کر ہوئی عرف
تھی تاریخ بھی ماہ دسویں ذالحج ۔۔۔ تھا پنجشنبہ کا روز کعبہ کا حج
مرتب ہوا ہے رسالہ تمام ۔۔۔ یہ آخر کیا بیت کہو والسلام

ترقیمہ:-

"تمام شد رسالہ حضرت نادعلی شاہ قدس اللہ سرہ"

اس مثنوی کے آخر میں آٹھ صفحات کا ایک ضمیمہ ہے۔ جس میں ایک ترجیع بند اور دو غزلیں ہیں، ترجیع بند نظم میں شریف کا لفظ بہ طور تخلص استعمال کیا گیا ہے اور غزلوں

میں پیر ابراہیم علی شاہ کی تعریف کی گئی۔ یقیناً یہ ترجیع بند اور غزلیں شریف علی شاہ قادری ہی کی ہوں گی۔ جو ابراہیم علی شاہ کے مرید تھے اور شریف تخلص کیا کرتے تھے۔

ترجیع بند کا پہلا اور آخری بند حسب ذیل ہے :-

(۱)

منزل چار یک دم میں جاتے ہیں چل		او عاشق کہتے ان کو نورِ اٹل
مکاں لامکاں کو او ہر دم میں چل		کہتے ان کو ہوتا ہے ہر دم وصل
چلو سیر کر آئیں واجب نگر کا
یہ تیرا کو اڑاں کھُلے نو صدر کا

(۲)

شریف کوں بھی لے کر وہاں لگے تھے		مجھے جام مئی کا جو بھر کر دئے تھے
خاری سوں مٹی کی سماں پر گئے تھے		ہیں مرجہاں میں دہاں پھر چنے تھے
چلو سیر کر آئیں واجب نگر کا
یہ تیرہ کو اڑاں کھُلے نو صدر کا

جُملہ ۱۴ بند

نظموں کے مطلعے و مقطعے حسبِ ذیل ہیں۔

نظم نمبر ا

طالب ہوں من عرف کا کوئی اہل راز بولو		ہونا فقد عرف کیوں راز و نیاز بولو

والی ہیں جس کے سر پر پیر ابراہیم علی شاہ		مظہر علی ہیں سائل کر امتیاز بولو

جُملہ ۱۰ شعر

نظم نمبر ۲

برزخ صغریٰ کبریٰ سے چھوٹا بڑا		قرار اپنے رُخ پر نظر کو پھرا

عمل دم کا کھولے ہیں نادِ علی
خبر شرط ہے جان ہووے بلی

جُملہ ۱۰ شعر

لگن عشق

مُصنّف احمد علی شاہ قادری، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۳۸، شعر فی صفحہ ۱۱
خط نستعلیق، سائز ۶ x ۹

احمد علی شاہ کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے، جیسے کہ رسالۂ نادعلی کے تعارف میں لکھ دیا گیا ہے۔ یہ بھی حضرت ابراہیم علی شاہ قادری کے مُرید معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی جگہ اپنا تعلّق نادعلی کے ساتھ بھی ظاہر کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے۔

مجھے پیر کامل ہے نادعلے بتاتے ہیں ہر گھٹ میں دل کی گلی
اسی میں لگادل ارے کچ دلی تو بےہودہ پھرتا ہے کیوں ہر گلی
یو احمد علی دل سوں قربان ہو جیتے جان اپنے سوں بے جان ہو

یہ مثنوی بھی تصوّف ہی سے مُتعلّق ہے اس میں معرفت کے بعض اسرار کی تشریح کی گئی ہے اور خدا کو خودی میں جذب کرنے کے طریقے بتلائے گئے ہیں، آخر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک انسان خدا کو اپنی خودی میں اسی وقت جذب کرسکتا ہے جب وہ کسی کامل ہستی کو اپنا مرشد بنائے۔

نظم حسب معمول خدا کی تعریف سے شروع ہوتی ہے۔ اور خاتمہ میں مُصنّف نے اپنی مغفرت کی دُعا مانگتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ رسالہ بہ وقت سہ پہر روز یک شنبہ بہ تاریخ ۵ ر صفرالمظفر اتمام کو پہنچا۔

ابتدا:-

ہریک تن میں معنی ہے الحمد کا یو الحمد معنی ہے دل بند کا
دُنیا یو اسم ذات سوں سب بقا اسم ذات جاوے تو او تن فنا
اسم ذات نقطہ ہے ربّ ذات کا اسم ذات معنی کے نقطہ کو پا

خاتمہ:-

بہ تاریخ پنجم صفر ماہ کی ختم ہوئی کتابت لگن عشق کی
اتھا روز یک شنبہ او جشن کا بہ وقت ختم دن او سہ پہر تھا
مرتّب ہوا یو رسالہ تمام
محمّد پو بھیجو درود و سلام

ترقیمہ:-

"تمام شد این رسالۂ لگن عشق من تصنیف حضرت احمد علی شاہ قدس سرہٗ"

رسالۂ شریف

مُصنّف شریف علی شاہ قادری، سنہ تصنیف ، معلوم ، صفحات ۲۵، شعر فی صفحہ ۱۱، خط نستعلیق، سائز ۶" x ۹"

شریف علی شاہ کے ایک ترجیع بند اور دو نظموں کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، یہ مثنوی بھی انہیں کی ہے، اس مثنوی میں مسئلۂ وحدت الوجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ تمام چیزیں فانی ہیں، جو کچھ ہے وہ خدا ہے چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے۔

خدا کی خدائی ہے جس کو عیاں ۔۔۔ وو کس کی رکھے گا جہاں میں طماں
یہ فانی جہاں میں اسے کیا ہے کام ۔۔۔ نہ قاضی نہ مُفتی ہیں گرہ تمام
ہے قائمی جہاں کا او پروردگار ۔۔۔ کیا ایک نقطے سوں سب آشکار
اس نقطہ میں سوبخا ہے دو نو جہاں ۔۔۔ ہے معلوم اس کو سو بولے بیاں

مُصنّف کے مُرشد ابراہیم علی شاہ تھے، چنانچہ مثنوی میں کئی جگہ ان کی تعریف ملتی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے:-

عجب پیر ہے شاہِ نادعلی ۔۔۔ عنایت کئے سرورِ ہیلی
ثنا میں اُن کی کہاں لگ کروں ۔۔۔ اپس عشق کی آگ میں ڈوب مروں
کہ حضرت براہیم علی شاہ پیر ۔۔۔ کہ شمس و بدر ہور لطیف و منیر
کرم سوں او مرشد کے دیکھا پیا ۔۔۔ جو مرکہ پڑا تھا سو پھر کر جیا

ایک اور جگہ نہایت تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ میں اسلام و دین سے ناواقف تھا، بغض و حسد اور کینہ و کپٹ کی گندگی مجھ سے لپٹی ہوئی تھی، ایسے میں جس سمندر کے موتی نے اپنی روشنی سے میری اس تاریکی کفر کو توڑا وہ پیر ابراہیم علی شاہ ہیں، چنانچہ لکھا ہے:-

براہیم علی شہ خدا کے لطیف ۔۔۔ توں ہُشیار اس نام پراے شریف
صفت کیا کہوں پیر کی میں تجھے ۔۔۔ زباں نئیں جو بولوں صفت ہر کسے

ضمیمہ

مقالہ نُما

مُرتّبین

غالی جعفری

عصمت جاوید

فضل اللہ فاروقی

ضروری نوٹ۔

مقالہ نُما میں شامل شُدہ مضامین کی نقل حسبِ طلب دو آنے فی صفحہ کی اُجرت پر مہیّا کی جاسکتی ہے۔ تاہم کسی مضمون کی نقل ایک روپیہ سے کم اُجرت پر فراہم نہیں کی جائے گی۔

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱۔ ابوسلمہ شفیع احمد البہاری:

ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات

(برہان دہلی ۵۳ دسمبر، ۳۶۲-۳۷۸)

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت ماہ ستمبر ۱۹۵۳ء۔

اس میں اصول حدیث، اسناد حدیث، تخریجات حدیث، تدوین و تاریخ حدیث، مسند امام احمد بن حنبل، بلوغ المرام، شروح موطا امام مالک، شروح مشکوٰۃ، مصابیح، سنن دارقطنی، مسند امام اعظم، شرح معانی الآثار، اربعین، اوراد و اذکار ماثورہ اور حدیث کے مختلف موضوعات پر جو اردو میں کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کے اور مولفین کے نام اور ان پر مختصر نوٹس۔

۲۔ ابوالحسن علی:

مولانا جلال الدین رومی

(دوران کراچی ۵۳ دسمبر ۲۰-۱)

مولانا رومی کی مثنوی سے مولانا کے فلسفہ افکار و خیالات کی توضیح کے مناسب منتخب اشعار پیش کرکے وضاحت کی ہے۔

۳۔ دانی۔ احمد حسن:

بنگال میں اسلام

(ماہ نو کراچی ۵۳ ستمبر ۱۹-۲۳ اور ۵۰)

عہد محمدیہ سے قبل بنگال میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے کام پر روشنی ڈالتے ہوئے سلاطین، مشائخ، مبلغین اور صوفیا کرام کے مساعی جمیلہ کو سراہا ہے اور مسلمانوں کی فتح بنگال سے قبل بنگال میں اسلام کے داخلہ کی تاریخ پیش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کے بنگالی معاشرہ کے عمرانی و مذہبی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۔ ادارہ:

احتجاج نمبر چراغ راہ

(چراغ راہ کراچی ۵۳ء۔ اکتوبر۔ نومبر)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور اراکین جماعت اسلامی کو سزائے موت اور اس کے بعد چودہ سال کی سزا پر پاکستان اور دوسرے بعض اسلامی ممالک نے جو احتجاج کیا ہے اُن سب کو یکجا کردیا گیا ہے۔

۵۔ ادارہ:

مکتوبات مجدد الف ثانی

(چراغ راہ کراچی ۵۳ اگست ۲-۲۶)

حضرت مجدد کی گرفتاری دینی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ اس کی تفصیل معہ وجوہ بیان کی ہے۔ اور شیخ بدیع الدین، خواجہ محمد معصوم، اور میر محمد نعمان کے نام حضرت مجدد کے چند خطوط کو نقل کیا ہے۔ ان میں بیشتر وہی باتیں ہیں۔ آخر میں مجدد نے اپنی گرفتاری کی روداد کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔

۶۔ اشرف حسن تھانوی:

روح انتخاب

(نگاران کراچی ۵۳ ستمبر ۲۲-۲۸)

اس عنوان کے تحت مولانا اشرف علی تھانوی کے ارشادات نقل کئے ہیں۔ مولانا موصوف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن کی طرح فقہ و حدیث بھی وحی کے دائرے ہی میں آتے ہیں۔

۷۔ بدرالدین علوی:

عہد نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ اکتوبر ۲۶۵-۲۸۰)

اولاً ان اکابر علمائے اسلام کی رائیں پیش کی گئی ہیں جو اس بات کے قائل تھے کہ قرآن مجید رسول اللہ کی زندگی میں جمع ہو چکا تھا اور اس کی آیتیں اور سورتیں خود آنحضرت نے مرتب فرمائی تھیں۔ اس کے بعد ان روایات پر بحث کی ہے جو اس بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ قرآن مجید کی تدوین و ترتیب عہد نبوی کے بعد ہوئی اور ان روایتوں کا ضعیف و ناقابل قبول ہونا ثابت کیا ہے۔

۸۔ بدرالدین علوی:

عہد نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ ستمبر ۱۶۵-۱۸۵)

(معلومات کے نقطہ نظر سے یہ مقالہ کافی مفید ہے)

۹۔ تمیز الدین خاں:

مذہب کی ضرورت کیوں ہے؟

(العلم کراچی ۵۳۔ اکتوبر ۶۵–۷۰)

مذہب کی ضرورت کے اسباب بیان کرتے ہوئے مختصراً یہ دکھایا ہے کہ آیا الہام یا مذہب کے لئے کوئی عقلی بنیاد موجود ہے یا نہیں۔ (ترجمہ۔ اخلاص حسین)

۱۰۔ حافظ مجیب اللہ:

الرّد علی المنطقیین

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ جولائی ۴۴–۵۲)

۲۔ اس قسط میں ارباب منطق کے نظریہ کے ایجابی پہلو پر امام غزالی کی بحث کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

۱۱۔ سعید احمد رفیق:

عہد اسلامی میں اشاعت تعلیم

(العلم کراچی ۵۳، اکتوبر ۷۱–۸۳)

اس مقالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ عہد اسلامی میں کن کن ذرائع سے اور کس طرح تعلیم کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔

۱۲۔ شفیع احمد البہاری:

ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات

(برہان دہلی ۵۳ ستمبر ۱۶۷–۱۸۲)

۲۔ طبقات ابن سعد پر تھوڑی سی گفتگو کر کے ۱۸۵۷ء کے بعد کی لکھی ہوئی حدیثی یا متعلقہ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۳۔ ظفر احمد عثمانی:

اسلام میں نظام زمینداری و جاگیرداری

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ جولائی ۵–۱۹)

فتح الباری سے حوالے مع اقتباسات کے۔

۱۴۔ گوتو وسکی:

روس میں تلسی داس کی راماین سے دلچسپی

(ہندستانی ادب حیدر آباد دکن ۵۳ نومبر ۸–۱۹)

مشہور روسی عالم سنسکرت براننکوف کے رامائن کے ترجمے وغیرہ کا ذکر۔

۱۵۔ محمد البشیر الابراہیمی۔ علامہ:

مولانا مودودی کون ہیں؟

(فاران کراچی ۵۳ ستمبر ۲۴–۳۳)

عربی ہفتہ وار جریدے "البصائر" کے مدیر علامہ البشیر الابراہیمی کے مقالہ "من ھو المودودی" کا اردو ترجمہ اور مولانا مودودی کی گرفتاری پر محمد البشیر الابراہیمی اور جناب فضیل الورتلانی نے الجزائر کے مسلمانوں کی طرف سے گورنر جنرل اور وزیر اعظم پاکستان کے نام جو احتجاجی برقیہ بھیجا تھا اس کا بھی ترجمہ۔ مترجم رحمت باری۔

۱۶۔ محمد حمید اللہ۔ ڈاکٹر:

فراستہ النبی فی السلم والحرب

(فاران کراچی ۵۳ ستمبر ۱۸–۲۳)

غزوۂ خندق اور صلح نامۂ حدیبیہ کے بعض غیر معروف پہلوؤں کی روشنی میں فراست نبی کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ فراست نبوی کے باعث ہی اسلام سارے عرب میں پھیل گیا۔

۱۷۔ محمد علی شاہ:

قرآن مجید اور ترجمہ و تفسیر

(برہان دہلی ۵۳ جولائی ۳۳–۴۴)

یہ اس مضمون کی دوسری قسط ہے (باقی)

تذکرہ و سیرت نگاری

۱۸۔ امداد صابری:

رائے حکم چند

(دلی کالج اردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۵ ۱۱)

دہلی کے باشندے اور دلی کالج کے طالب علم تھے ۱۸۶۵ء میں ایم اے کیا اور کلکتہ یونیورسٹی میں اول آئے تھے۔ خدمت خلق کا مادہ ان میں بدرجۂ اتم تھا۔ تعزیرات ہند کی اردو شرح اور ضابطہ دیوانی و فوجداری کی اردو

شرح لکھی جو مقبول ہے۔ ایک قانونی رسالہ بھی نکالا تھا جو کافی عرصہ چلا۔ لا آف کنسنٹ کا پہلا اور سلیس ترجمہ کیا۔ حیدرآباد کی ملازمت کے زمانے میں دفعہ ۱۳ دیوانی کی مبسوط شرح کی جس کے قائل انگریز اور فرانسیسی بھی تھے۔

۱۹۔ پنڈت کیفی:

ماسٹر پیارے لال آشوب

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۵۳-۱۹۴۴)

ماسٹر صاحب ۱۸۳۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ قدیم دلی کالج اور آگرہ میں تعلیم حاصل کی ملازمت کے سلسلے میں کبھی دلی اور کبھی پنجاب میں رہے۔ ہر دو جگہ کے لوگ ان کا بڑا ادب اور لحاظ کرتے تھے۔ دہلی سوسائٹی کے جوزاور روح رواں تھے۔ پنجاب بکڈپو کے کیوریٹر بھی تھے۔ جدید شاعری کی طرف آزاد اور حالی کو انھیں نے متوجہ کیا۔ یہ جہاں بھی رہے اُردو کی ترویج و ارتقاء میں کوشاں رہے۔ ملازمت کے کاموں کے ساتھ ساتھ انھوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں ۱۹۱۴ء میں دہلی میں انتقال کیا۔

۲۰۔ جعفر مہدی:

دلی کالج کی چند شخصیتیں

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۱۹-۱۹۵)

تذکرہ کریم الدین کی روشنی میں دلی کالج کی چند شخصیتوں کا تذکرہ کیا ہے۔

۲۱۔ جعفری۔ اطہر حسین:

آقا حسین کاظم زادہ ایرانشہر

(آج کل دہلی ۵۳ء ستمبر ۲۷-۲۸)

ایران کے ایک بزرگ مصلح آقا حسین کاظم زادہ ایرانشہر مدیر ایرانشہر کی ادبی خدمات و نصائح اور مذہبی نقطہ نظر پیش کرنیکے بعد انکی ایک فارسی نظم نقل کی ہے۔

۲۲۔ جیلانی:

یسوع ناصری

(چراغ راہ کراچی ۵۳ء ستمبر ۱۹-۳۲-۳۵)

حضرت عیسٰی کے حالات زندگی اور ان کی تعلیمات۔

۲۳۔ جیلانی:

وہ جو مر نہ سکے — سُقراط

(چراغ راہ کراچی ۵۳ء، اگست ۱۸-۲۱،۲۶)

سُقراط اور اس کے فلسفے کا تذکرہ۔

۲۴۔ حسن چشتی:

اچاریہ ونوبا بھاوے

(آج کل دہلی ۵۳ء، اکتوبر ۴۷-۵۰)

گاندھی جی کی وفات کے بعد جس شخص میں ان کی تعلیمات کا سچا عکس ملتا ہے وہ اچاریہ ونوبا بھاوے ہیں۔ مضمون میں ان کے حالات زندگی خصوصاً ان کی سیاسی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۲۵۔ خواجہ عبدالرشید:

طالب آملی

(برہان دہلی، ۵۳ء ستمبر ۱۴۵-۱۶۶)

مقالہ نگار کو بہ صرف زرِ کثیر طالب آملی کا ایک دیوان ملا ہے۔ اس مقالہ میں طالب کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے اس دیوان کا تعارف اور جگہ جگہ سے انتخاب دیا ہے۔

۲۶۔ ڈونالڈ رابنسن:

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

(آج کل دہلی ۵۳ء ستمبر ۴۹-۵۱)

مصر جدید کے نابینا رہنما نامور عالم ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے مصر سے جہالت و قدامت پسندی کو دُور کرنے اور مفت ابتدائی تعلیم رائج کرنے کے سلسلہ میں ان کی خدمتوں اور سیاسی کارگزاریوں کا جائزہ لیا ہے۔ مترجمہ حبیبہ غازی الدین۔

۲۷۔ رفعت۔ مبارز الدین:

مولائے روم

(برہان دہلی، ۵۳ء، اکتوبر ۲۳۵-۲۱۳)

یہ مقالہ گلستان ادب حیدرآباد دکن کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۵ جون ۵۳ء میں پڑھا گیا۔ اس میں مولانا جلال الدین رومی کے مختصر سوانح حیات۔ اُن کی

شاعری اور ان کے فلسفۂ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ موقع موقع سے مثنوی اور اُن کے دیوان موسوم بہ دیوانِ شمس تبریز سے اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

۲۸۔ سری نیواس لاہوٹی:

میکسم گورکی

(سب رس ماہ جولائی ۳۰۔ ۱۷ او ۴۲)

گورکی کی زندگی کا سرسری جائزہ اور اس کے ادب پر تبصرہ۔

۲۹۔ سیّد عبداللہ:

اُردو سوانح نگاری سرسید کے زمانہ میں

(ماہِ نو کراچی ۳۰۔ اگست ۱۲۔ ۱۵)

اُردو سوانح نگاری ابتدا میں عربی اور فارسی سوانح نگاری کی مقلد تھی۔ مغربی اثرات کے نفوذ کے بعد اُردو میں سوانح نگاری کی ابتدائی کوششوں میں کسی حد تک مناظرانہ رنگ پایا جاتا ہے۔ شبلی اور حالی کے ہاں جیش تر اور شررکی سوانح عمریوں میں کم تر فنی محاسن پائے جاتے ہیں۔ تاہم شبلی کے ہاں سوبر جانہ انداز زیادہ ہے۔ آزاد کی سوانح نگاری تاریخی ناولوں کی حدود میں جا پہنچتی ہے۔

۳۰۔ سیّد مصطفےٰ علی بریلوی:

غالب جنگ نواب احمد خاں بنگش

(العلم کراچی ۴۳، اکتوبر ۴۳۔ ۴۴)

نواب احمد خاں کے زمانے کے سیاسی حالات اور ان کی زندگی وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۱۔ عبد الستار صدیقی:

ڈاکٹر اشپرنگر

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۱۰۔ ۲۵)

ڈاکٹر اشپرنگر کی زندگی اور کارناموں پر تفصیلی اور تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۲۔ قدیر احمد:

شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ خاں

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۱۳۹۔ ۱۵۲، ۱۷۶)

مولانا ذکاء اللہ کی زندگی، اور علمی وادبی کارناموں پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

۳۳۔ گوپی چند نارنگ:

دلی کالج کے چند پرنسپل

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۹۹۔ ۱۱۰)

۱۔ ڈاکٹر الواس شپرانگر ایم۔ ڈی۔ کتب خانہ اودھ کی کتابوں کی فہرست کے مرتب ہیں۔ دہلی کالج، مدرسہ کلکتہ۔۔۔ فورٹ ولیم کالج وغیرہ میں اُردو کے فروغ کے سلسلہ میں ہمیشہ کوشاں رہے۔

۲۔ فلکس بوترو۔ اپنی پرنسپلی کے زمانے میں دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی وغیرہ میں بڑی دلچسپی لی۔ عُمدہ کتابوں کے ترجمے کروائے۔ اور معیارِ تعلیم کو بلند کیا۔

۳۔ جے ایچ ٹیلر۔ دلی کالج سے ان کا تعلق پرانا تھا ویسے یہ ۱۸۳۷ء میں پہلی مرتبہ پرنسپل ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ حکومتی اداروں کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء میں گمراہ سرفروشوں نے انھیں قتل کردیا۔

۳۴۔ گیلانی ۔۔ اسعد:

مولانا مودودی ۔۔۔ اپنی نظر میں

(چراغ راہ: کراچی ۵۳ جولائی ۴۲۔ ۵۰)

مولانا مودودی کی تحریروں کی مدد سے ان کی خود نوشت سوانح حیات مرتب کی گئی ہے۔

۳۵۔ لطیف حسین ادیب:

نواب عبد العزیز خاں عزیز بریلوی

(العلم کراچی ۵۳ جولائی ۶۵۔ ۷۹)

عزیز بریلوی ۱۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے اور

۱۸۹۰ء میں انتقال کیا۔ ان کی مختصر زندگی بیان کرنے کے بعد ان کے اُردو اور فارسی کلام پر تبصرہ کیا اور انتخاب کلام پیش کیا ہے۔

۳۶۔ مختار الدّین احمد آرزو:

مولوی ضیاء الدین خاں

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی نمبر ۱۶۹-۱۷۵)

شمس العلماء ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں دہلی کالج کے طالب علم تھے اور ۱۸۶۴ء میں اسی کالج میں رفتہ رفتہ عربی کے پروفیسر ہو گئے۔ ان کی عربی و فارسی دانی کے بڑے بڑے قائل تھے۔ غالب سے ان کے تعلقات لیکن آخر میں کم سے کم تر ہونے لگے حتیٰ کہ ضیاء صاحب نے غالب کے قاطع برہان والے سلسلے میں ایک مقدمہ کے دوران میں ——

غالب کی مخالفت کی۔ غالب سے خط و کتابت بھی ہوئی۔ مولانا شاعر اچھے نہیں تھے۔ عربی اور اُردو میں کئی کتابیں لکھیں۔ انشائے اُردو میں اور لوگوں کے علاوہ غالب کے بھی خطوط درج تھے۔ غالباً ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا۔

۳۷۔ م۔ ن:

ابائی ابن کونان بے

(ہندستانی ادب حیدرآباد دکن) ۵۳، اکتوبر ۲۸-۳۴

قزاقستان کے شاعر اعظم نئے قزاقستانی ادب اور قزاقستان کی ادبی زبان کے بانی اور وسط ایشیائی قوموں کی ادبی تاریخ کی نامور ہستی ابائی ابن کونان بے کے حالات زندگی پیش کر کے ان کے ادبی کارناموں اور فنی صلاحیتوں کا جائزہ لیا گیا ہے

۳۸۔ مرزا شہباز بیگ:

خواجہ الطاف حسین حالی اور عربک اسکول

(دلی کالج میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۱۱۴-۱۱۵)

مولانا کا تعلق عربک اسکول سے ۱۸۹۲ء تک رہا۔ ۱۸۹۲ء میں، مستعفی ہو کر حیدرآباد چلے گئے۔ مولانا عربک اسکول میں چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کو فارسی پڑھایا کرتے تھے

دنگل دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جس روز دنگل نہ ہوتا باہر شہر میں گشت کے لئے نکل جایا کرتے تھے۔ ۱۸۹۱ء میں جب سر جیمز گورنر پنجاب نے مدرسہ غازی الدین خاں کو مرمت کروا کے اسکول کے لئے مرحمت کیا تو مولانا نے بچوں سے ایک نظم پڑھوائی۔ اسی طرح ۱۸۹۲ء میں محمڈن ایجوکیشن کانفرنس کے ساتویں جلسے کے موقع پر ایک نظم پڑھی تھی۔

۳۹۔ مجیب اللہ حافظ:

علامہ زاہد الکوثری

(معارف اعظم گڈھ ۵۳، اگست ۱۴۴-۱۳۶)

اس دور کے ایک مشہور و معروف مصری عالم کی خود نوشت سوانح حیات۔

۴۰۔ مناظر احسن گیلانی:

پہلا بہاری سپوت

(تہذیب پٹنہ ۵۳، اگست ۹)

ڈاکٹر وزیر خاں عظیم آبادی کے حالات اور عیسائی مبلغین سے اُن کے مناظروں اور ان کی علمی قابلیت وغیرہ کا ذکر ہے۔

۴۱۔ منظور حسین موسوی:

ضیاء الملک اعتماد الدولہ
میر فضل علی خاں بہادر سہراب جنگ

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۹۰-۱۱۱)

میر فضل علی صحیح النسب سید اور ان کے والد شاہی ملازم تھے۔ لکھنؤ کے فروغ کے زمانے میں ان کے والد میر غلام حسین دہلی سے لکھنؤ آ گئے اور اپنی بہن فیض النساء کی بدولت بادشاہ بیگم کے ملازم ہو گئے اور میر فضل علی مرزا سلیمان شکوہ کے یہاں نوکر ہو گئے۔ حالات و واقعات نے فیض النساء اور فضل علی کو بادشاہ بیگم کے قریب تر کر دیا۔ آغا میر کی بدولت دونوں شہر بدر ہوئے۔ مگر نصیر الدین حیدر کے زمانے میں پھر لکھنؤ آئے اور میر فضل علی عہدۂ نیابت پر فائز ہوئے۔ اپنے عمدہ انتظام اور بہ حسن سلوک اور نیکی کے سبب خاص و عام میں عزت پائی

ایک مدہوش انگریز نوجوان کی اہانت آمیز حرکت کے سبب دربار سے الگ الگ رہنے لگے۔ بادشاہ کی مرحمت کردہ خلعت لینے سے انکار کر دیا۔ اور عزلت گزینی اختیار کر لی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک لاکھ روپے بطور وقف دے کہ دلی میں کالج قائم ہو۔ دلی کالج میں طلبا اسی وقف سے مستفید ہو رہے ہیں۔

۴۲۔ میر ولی الدین:

فارابی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء، اگست ۹۷-۱۰۳)

محمد نام، ابو نصر کنیت اور فارابی نسبت ہے ۲۵۸ھ میں پیدائش اور ۳۳۹ھ سال وفات۔ فارابی کی علمی قابلیت۔ فلسفہ، ریاضی، سائنس، موسیقی اور مختلف علوم میں اس کی قابل قدر کتابوں کی فہرست اور ان کے تراجم یورپ کی جو مختلف لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں۔

۴۳۔ میر ولی الدین:

فارابی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء ستمبر ۱۸۶-۲۰۵)

۲۔ اس قسط میں فارابی کے فلسفے سے بحث کی گئی ہے

(باقی)

۴۴۔ میر ولی الدین:

فارابی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء، اکتوبر ۲۷۰-۲۸۶)

ابتدا میں ابو نصر فارابی کے اس خیال کی تغلیط کی گئی ہے کہ علم کو عمل پر ترجیح دینی چاہیئے اس کے بعد سیاسیات پر اپنی کتاب "مبادی آراء اہل مدینۃ الفاضلہ" میں اس نے سیاست پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے انہیں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ فارابی کے نزدیک اخلاقیات و سیاسیات کی بنیاد الٰہیات پر قائم ہے وہ مملکت کو جسم انسانی سے تشبیہ دیکر ساری دنیا کیلئے ایک مملکت کی تشکیل کی دعوت دیتا ہے، وہ شخصی حکومت کی تبلیغ کرتا ہے۔ لیکن ایسے ایک حاکم کی عدم موجودگی میں جس میں سب حاکمانہ صفات نہوں وہ افلاطون کی طرح فلاسفہ و حکما کی جمہوریت اشرافیت کا قائل ہے۔ فارابی نے جماعت اور شہر کی جو مختلف قسمیں بیان کی ہیں انہیں بھی تفصیل سے پیش کیا ہے اور فارابی کے خیالات کا افلاطون کے خیالات سے مقابلہ کیا ہے۔

۴۵۔ میکش اکبر آبادی:

مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر

(آج کل دہلی، ۵۳ء ستمبر ۵-۹)

خمخانہ جاوید اور مشاعرے کے گلدستے کے حوالہ سے مہاراجہ بلوان سنگھ بہادر تخلص بہ راجہ اردو کا شی راج د۔ زبان بھاکا کے حالات زندگی اور تصنیفات کا ذکر کرنے کے بعد ان کے مشکل زمینوں میں کہے ہوئے کچھ مطلع اور غزل کے چیدہ اشعار پیش کئے ہیں اور اس کے علاوہ ان کی مثنوی داستان گل سخن کا مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد اس سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔

۴۶۔ نورانی۔ امیر حسن:

منشی نول کشور

(تہذیب پٹنہ، ۵۳ء ستمبر ۹-۱۲)

منشی نول کشور کے ابتدائی مختصر حالات مطبع نولکشور کا قیام۔ قرآن شریف کی طباعت کا خاص اہتمام اور دوسرے مختصر حالات بیان کئے گئے ہیں۔

تاریخ و سیاسیات

۴۷۔ ادارہ:

انڈونیشیا

(چراغ راہ کراچی ۵۳ء ستمبر ۱۳-۱۸)

انڈونیشیا کی تاریخ، آزادی اور ڈاکٹر سوکارنو کے سیاسی عقائد پر تبصرہ کیا ہے۔

۴۸۔ انوار الحق حقی:

سولہویں صدی کا ایک سیاسی مفکر

(تہذیب پٹنہ ۵۳ء اکتوبر ۳۱-۳۸، ۱۴)

میکیاولی کے مختصر حالات اور اس کی معرکتہ الآرا

تصانیف "حکمراں" اور "مقالات" کا جائزہ اور اس کے زمانے کی سیاسی و مذہبی تحریکوں کی روشنی میں اس کے فلسفہ اور نقطۂ نظر کی توضیح۔

۴۹۔ جیلانی، بی اے:

قضیۂ نہر سویز

(چراغ راہ کراچی ۵۳ جولائی ۱۱-۱۴)

نہر سویز کی مختصر تاریخ اور اسے برطانوی اقتدار سے نکالنے کیلئے مصر کی جدوجہد کے مالہٗ و ما علیہ کا جائزہ لینے کے بعد مصر کی حکومت کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ مصلحت آمیز سمجھوتے سے کام لے اور فی الحال جمہوری پارلیمانی ذریعہ سے اصلاح کرکے قوم کی طبعی توانائی کو بڑھا دے۔

۵۰۔ مطلوب الحسن سید:

چند یادیں — چند نقوش

(ماہ نو، کراچی ۵۳ ستمبر ۴-۶)

محمد علی جناح کی سیاسی زندگی کے چند واقعات پیش کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، تند مزاج اور چڑچڑے نہیں تھے بلکہ بذلہ سنج بھی تھے اور یہ کہ عوام کے معاملہ میں کافی تحمل سے کام لیتے تھے، مضمون میں اُن کی سیاسی زندگی کے دوسرے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

۵۱۔ مناظر احسن گیلانی:

مسلمانوں کا اندلس

(معارف اعظم گڑھ ۵۳، نومبر ۹۴ تا ۳۶۲)

مسلمان مصنفین نے اندلس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسی کی بنیاد پر یہ مقالہ تیار کیا گیا ہے (باقی)

۵۲۔ میر سیادت علی خاں:

حجاج بن یوسف

(مسلسل، آخری قسط)

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن)، ۵۴ دسمبر ۹-۱۳)

حجاج بن یوسف کے عادات و خصائل پر بحث کرنے کے بعد مضمون نگار نے اس آخری قسط میں حجاج بن یوسف کی انتظامی اہلیت و صلاحیت تاریخی واقعات و شواہد سے پیش کی ہیں۔

۵۳۔ میر سیادت علی خاں:

حجاج بن یوسف
اپنی داخلی اور خارجی پالیسی کی روشنی میں

(سب رس حیدر آباد (دکن) ۵۳، اگست ۷-۵)

حجاج کی داخلی اور خارجہ پالیسی کا تجزیہ اور اس کی روشنی میں حجاج کی حکمرانی پر تبصرہ۔

۵۴۔ میر سیادت علی خاں:

حجاج بن یوسف
فتوحات سندھ

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۳ جولائی ۵-۷)

فتوحات سندھ کا تذکرہ:-

تنقید، ادب، لسانیات

۵۵۔ اثر۔ محمد علی خاں رامپوری:

رام پور اور داغ

(نگار لکھنؤ ۵۳، جنوری، فروری ۳-۶۰)

تذکرۂ خمخانۂ جاوید داغ کا قیام رام پور میں کم و بیش چالیس سال ظاہر کرتا ہے، احسن مارہروی جلوۂ داغ میں ۴۰-۴۵ برس مدت قیام ظاہر کرتے ہیں۔ مضمون نگار نے تاریخی واقعات کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ قیام زیادہ سے زیادہ تقریباً ۲۲ یا ۲۴ سال تھا۔ اس کے علاوہ داغ کے قیام رامپور سے متعلق مندرجۂ ذیل عنوانات کے تحت معلومات فراہم کی ہے۔ (۱) حضرت داغ بحیثیت افسر اصطبل (۲) داغ کی قیام گاہ (۳) داغ کے ہمعصر شعراء (۴) رام پور کے چند مشاعرے (۵) نواب مرزا خاں داغ کے کلام کی داد اور (۶) محفل علم و شعر کی برہمی

۵۶۔ انجمن خاں:

قومی ترانے

(آج کل دہلی، ۵۳ء نومبر ۷۔۴)

دُنیا کے قومی ترانوں کو آئندہ قسط میں پیش کرنے کی تمہید ہے ان ترانوں میں دُنیا کی تمام قوموں کی نفسیاتی اور ان کی آرزوں کی تصویر پیش کی جائے گی۔

۵۷۔ احمد مکی:

فلمی کہانیاں

(سب رس، حیدر آباد (دکن)، ۵۳ء اگست ۹-۱۶)

ہندوستان میں فلم سازی کی تاریخ پر مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے۔ اُردو ڈراموں اور فلمی کہانیوں پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

۵۸۔ اختر اورینوی:

داغ کی شاعری میں لب ولہجہ کی اہمیت

(نگار لکھنؤ ۵۳ء جنوری، فروری ۳۵۔۴۲)

یوں تو داغ کی انفرادیت کئی عناصر پر مشتمل ہے لیکن ان کے کلام میں لب ولہجہ کی بڑی اہمیت ہے۔ مضمون میں انکے اشعار پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ داغ کی غزل کے لب و لہجہ میں جوش تازگی، چہک اور مہک پائی جاتی ہے اس کی خوش گفتاری میں ظرافت کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ مزاح طنز چلبلی گدگدی پھبتی کے رنگ داغ کے یہاں عشق بازی کی رنگینی مستی و انبساط کے ساتھ رندانہ شوخی ہے۔ داغ کی زبان دانی اس کے لب و لہجہ میں تنوع اور رنگینی پیدا کرتی ہے۔ اس کے یہاں محاوروں کا استعمال بڑے سلیقے اور قرینے کا ہوتا ہے وہ بڑا فقرہ باز اور شیوہ بیان ہے۔

مختصر یہ کہ داغ غزل کے انحطاطی دور کی ترجمانی کرتا ہے لیکن پھر بھی اپنے محدود افق میں اور متعین سطح پر وہ ایک کامیاب فن کار ہے۔

۵۹۔ ادارہ:

حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خطوط مولانا سلیمان ندوی کے نام

(معارف، اعظم گڑھ ۵۳ء، اگست)

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے ۷ خطوط علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کے نام۔

۶۰۔ ادارہ:

مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم بنام مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء جولائی ۷۲۔۷۶)

چھ خط درج ہیں۔ ان میں تحفۂ سامی، تفہیمات الٰہیہ مکاتیب سنائی، سنائی کی دو مثنویوں وغیرہ کا ذکر ہے

۶۱۔ ادارہ:

مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم بنام مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء ستمبر ۲۱۱۔۲۱۶)

ادارہ معارف نے ایسے سات خط درج کئے ہیں جن سے ان دونوں حضرات کے آپسی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

۶۲۔ ادارہ:

مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد بنام مولانا سید سلیمان ندوی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء، اکتوبر ۲۶۰۔۲۶۵)

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری تھا۔ مولانا آزاد کے ان خطوط کا بڑا ذخیرہ دار المصنفین میں موجود ہے جسے معارف میں مسلسل شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے یہ ان خطوط کی پہلی قسط ہے جس میں مولانا آزاد کے چھ خطوط شائع کئے گئے ہیں۔

۶۳۔ ادارہ:

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے خطوط

(فاران کراچی ۵۳ء جولائی ۲۷-۳۴)

اس سے قبل شیروانی مرحوم کے خطوط فاران میں چھپ چکے ہیں۔ اس دفعہ ابوالحسن علی صاحب کے عطا کردہ آٹھ خطوط درج کئے گئے ہیں۔ ان میں سے چھ حکیم سید عبدالحئی، ایک ان کے بیٹے سید عبدالعلی اور ایک ابوالحسن علی صاحب کے نام ہے۔ ان میں شرح کلمۃ العین صدر الدین شیرازی، روح الامین خاں، رسالہ گجرات وغیرہ کا ذکر ہے۔

۶۴۔ ادارہ:

مکاتیب مولانا ابوالکلام بنام مولانا سید سلیمان ندوی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء نومبر ۳۷۹-۳۹۴)

مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مولانا ابوالکلام کے بارہ خط ہیں۔ ان سے ان کے آپسی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے ترجمان القرآن، تذکرہ وغیرہ کا بھی ذکر ہے۔

۶۵۔ اعجاز حسین:

داغ۔ ترجمان و رہنمائے دور

(نگار لکھنؤ ۵۳ء جنوری، فروری ۱۷-۲۴)

داغ کے زمانے کی طرز معاشرت اور سماجی زندگی کے علاوہ اس دور اور اس سے ماقبل ادوار کی زبان و طرز بیان کا جائزہ لینے کے بعد داغ کی شاعرانہ انفرادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ داغ نہ صرف اپنے دور کے ترجمان بلکہ رہنمائے دور بھی تھے۔ انھوں نے ایک دور اندیش فن کار کی طرح مستقبل کے مذاق اور اپنے زمانے کے بڑھتے ہوئے رُجحان کو سامنے رکھ کر زبان کو صاف اور سُلجھا کر کے ساتھ ساتھ اُسے پُر کار بنایا۔ وہ مثالی اخلاقیات اور فرسودہ روایات سے مغلوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے زمانے کے واقعات اور حسن و عشق کے اصلی و عملی پہلوؤں کو اپنے اشعار میں بے دھڑک نظم کیا۔ تیور تیکھا پن طنز اور شوخی ان کے کلام کے اجزائے لاینفک ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے کلام میں ادبیت، اصلیت اور بشریت سبھی کچھ شامل تھا جس کے باعث ان کے ہم عصر شعراء ان کی تقلید کرنے لگے۔

۶۶۔ اعجاز حسین:

اُردو کا ترقی پسند خمیر

(آج کل دہلی ۵۳ء، اکتوبر ۴-۹)

جس طرح انسان کے مزاج کی تعمیر میں ماحول اور تاریخی حالات اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح زبان کی ساخت میں بھی سماجی پس منظر اور واقعات کار فرما ہوتے ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں اُردو زبان کے خمیر اور واقعات و ارتقا کی روشنی میں اس خمیر کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اُردو کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی اس پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔

۶۷۔ افتخار احمد اعظمی:

زبان کیوں کر پیدا ہوئی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ء نومبر ۳۶۴-۳۷۱)

زبان کی پیدائش کے سلسلے میں ابتدائی دور حیات کی مجمل آوازوں اور فطری بولیوں پر بحث کی ہے۔

۶۸۔ افسر حامد اللہ:

میرؔ کی ظرافت

(آج کل دہلی، ۵۳ء، جولائی، ۱۴-۱۷)

ظرافت اور طنز کی مختصر تمہید کے بعد میرؔ کے بعض ایسے اشعار پیش کئے گئے ہیں جن میں انھوں نے طنز و ظرافت کی آڑ میں اپنے دور کے سماج اور سماج کے ناشدوں پر چوٹیں کی ہیں۔

۶۹۔ الطاف حسین حالی:

ایک غیر مطبوعہ خط

(دہلی کالج اُردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۳۳)

خواجہ غلام السیدین صاحب نے مولانا حالی

کے اس خط کو بہاں چھپوایا ہے۔ انھیں یہ خط شری بناری داس چترویدی کا سے ملا تھا۔ اس میں مُناجات بیوہ کے سنسکرت ترجمے اور چُپ کی داد کا تذکرہ ہے۔

۷۰۔ امتیاز علی خاں عرشی:

کُلیّاتِ طالب آملی

(بُرہان دہلی ۵۳ دسمبر ۴۷-۵۶)

کُتب خانۂ رام پور میں طالب آملی کے دیوان کے ۵ مخطوطے محفوظ ہیں، ان میں پہلا نسخہ کلیات کا ہے، دوسرا نُسخہ بھی کُلّیات کا ہے، تیسرے نسخہ میں صرف قصائد ہیں، چوتھا نُسخہ غزلیات پر مشتمل ہے، پانچویں نسخے میں علاوہ قصائد کے اور اصنافِ کلام موجود ہیں۔ مضمون میں ان پانچوں نسخوں کا تعارف ہے۔

۷۱۔ امداد صابری:

دہلی کالج کے چند شاعر

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر، ۱۹۳-۱۹۱)

شاہ نصیر، تعشق، احمد، غافل، شیدائی، محوی، اثر، بسمل صہبائی، ماسٹر ذاکر حسین رزمی، گمنام، صدیق، محمود، شعلہ، شور، رشد اور جاذب وغیرہ سے متعلق معلومات اور نمونۂ کلام درج ہے۔

۷۲۔ انصاری۔ شریف:

کلام داغ میں محبوب کا تصوّر

(نگار لکھنؤ سالنامہ جنوری فروری ۵۹ — ۷۵)

میر، جرأت، غالب اور مومن کے یہاں جو محبوب کا تصور ملتا ہے اس کی خصوصیات مختصراً بیان کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ ان مختلف تصوّرات نے داغ کے لئے پس منظر کا کام کیا۔ انھوں نے جرأت کی معاملہ بندی اور مومن کی رنگینی میں اپنے مذاق و پسند اور ذاتی جذبات و احساسات کا اضافہ کر کے ایک نیا انداز تغزل اور پھر اس کا ہوا محبوب پیش کیا۔ یہ محبوب شاہد بازاری ہے لیکن محض روایت یا تخئیل کی پیداوار نہیں۔ داغ کے اشعار پیش کر کے ان کے محبوب کی تصویر کھینچی ہے۔ اور بتلایا ہے کہ ان کا محبوب یکسر مجازی ہے۔ کیونکہ داغ کا عشق خالص جسمانی ہے اور وہ اپنے محبوب کو سوائے جسم کے کسی ذہنی حیثیت کا مالک نہیں سمجھتے۔

۷۳۔ انعام اللہ خاں ناصر:

حکیم سنائی

(بُرہان دہلی ———— ۱۸-۳۳)

حکیم سنائی کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔

۷۴۔ بشیر احمد صدّیقی:

بڑے شاعر بحیثیت معلم

(العلم کراچی ۵۳ جولائی ۴۶ — ۵۰)

بڑے شاعر نوع انسان کی مدد اپنے منصب کے تقاضے اور اپنے اقوال کے شرائط پورے کرنے کے لحاظ سے پیغمبروں کے بعد سب سے اچھے معلم ہیں۔ چنانچہ ڈانٹے، شکسپیر اور ملٹن کا اس سلسلے میں ذکر کیا اور ان کی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

۷۵۔ تمکین کاظمی:

داغ حیدرآباد میں

(تہذیب۔ پٹنہ، ۵۳۔ ستمبر)

داغ کے ورود حیدرآباد سے اُن کے انتقال تک جس جس دور سے داغ گذرے ہیں مختصر حال بیان کیا گیا ہے۔

۷۶۔ پریم پال اشک:

دہلی ورنیکلر سوسائٹی

(دلی کالج میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج میگزین ۱۳۸-۱۳۳)

دہلی ورنیکلر سوسائٹی کا تعلق دلی کالج سے ہے۔ اس انجمن نے اُردو زبان و ادب کی بڑی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اُردو زبان و ادب سے متعلق مختلف علوم و فنون کی کتابیں اُردو میں اس انجمن نے لکھوائیں اور ترجمہ ہی نہیں کروایا، بلکہ شائع بھی کیا۔ اس سوسائٹی کے کارناموں پر تفصیلی معلومات اس مقالہ میں درج ہیں۔

۷۷۔ پنڈت کیفی ـ برجموہن دتاتریہ:

سرقے سے چوری تک

(تہذیب پٹنہ، ۵۳، جون و جولائی ۵۹-۵۴)

اُردُو شاعری سے سرقے کی مثالیں پیش کی گئی ہیں اور اُردُو شاعری میں سرقے کی بُہتات کی توجیہہ پیش کی گئی ہے۔ اسکے علاوہ سرقہ کے قانونی پہلو کو پیش کرنے کے بعد یہ مشورہ دیا ہے۔ غیر زبان سے ترجمہ کرنے یا اس زبان کے کسی خیال کو ترقی دینے کے سلسلہ میں حوالہ دینا چاہیئے۔ خیال کو ترقی دینا مقالہ نگار کی نظر میں سرقہ بالجبر ہے۔

۷۸۔ جاوید وسشٹ:

مولوی امام بخش صہبائی

(دلی کالج اُردُو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۷۷)

امام بخش نام اور صہبائی تخلص تھا۔ ان کے والد مولانا محمد بخش کا سلسلہ حضرت فاروق رضؓ اور والدہ کا عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے۔ عبداللہ خاں علوی سے عربی و فارسی پڑھی اور دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۴۰ء میں دلی کالج میں فارسی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ ذاتی لیاقت و قابلیت کے ساتھ ہم عصر دلی کی ادبی ہستیوں نے ان کی طبیعت پر جلا کی۔ فارسی اُردُو دونوں میں شعری اور نثری کتابیں لکھیں اُردُو کلام کمیاب ہے۔ کلیاتِ صہبائی میں ان کا فارسی کلام اور نثری کارنامے درج ہیں۔ سرسید سے اچھے تعلقات تھے۔ علم دوست حضرات ان کے قدرداں تھے ۱۸۵۷ء میں بقول چند پھانسی دی گئی اور بقول بعض گولی ماردی گئی۔

۷۹۔ جلیل کریر:

غزل یا شاعری

(ادب لطیف لاہور، ۵۳، اگست ۵-۸)

ممتاز حسین کے مقالے بعنوان "غزل یا شاعری" میں غزل کو ناقابلِ اعتنا ٹھہرانے کے سلسلہ میں یہ دعوے پیش کئے گئے ہیں (۱) غزل میں مفہوم کی ادائیگی رموز کے ذریعہ ہوتی ہے۔ مگر نئے خیالات کی تبلیغ پرانی رمزوں کے ذریعہ ممکن نہیں (۲) قومی زندگی کے بہترین خیالات و جذبات کا اظہار مسلسل گوئی کے اصناف میں ہوا ہے اور غزل میں انتشار گوئی ہے۔ اور (۳) غزل میں سماجی قدامت پسندی ہے اور خیال سے گریز ہے۔ مقالہ ہذا میں ان دعوؤں کو غلط ٹھہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے بتایا ہے کہ نئے خیالات پرانے علائم کے پردے میں کامیابی سے ادا کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں جذبی اور فیض کے ایک دو شعر بھی پیش کئے ہیں مختلف اصناف سخن مختلف مقاصد کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔ غزل میں جس کا مقصد "آپ بیتی" کی ترجمانی کرنا ہے تاثر کی اکائی برقرار رکھی جاتی ہے۔ یہ کہنا کہ غزل میں سماجی قدامت پسندی ہوتی ہے غلط ہے اس لئے کہ کوئی صنف بنیادی طور پر قدامت پسند یا ترقی پسند نہیں ہوتی۔ سماجی حالات اس کے استعمال کی نہج مقرر کرتے ہیں۔

۸۰۔ جلیل کریر:

"ترقی پسند ادب"

(ادب لطیف لاہور، ۵۳، اکتوبر ۸-۵)

علی سردار جعفری کی کتاب ترقی پسند ادب پر تنقید جعفری صاحب نے بذاتِ خود ترقی پسند ادب کی تحریک میں حصہ لیا ہے۔ جعفری صاحب ادیبوں کے اس گروہ میں شامل ہیں جنھیں نقادوں کی آتش میں تپنے کا حوصلہ نہیں ہے مگر اس شدت سے ...سن نے انھیں تنقید میں سائنٹیفک نقطۂ نظر سے محروم کردیا۔ کتاب سے بعض حوالے پیش کرنے کے بعد نقاد نے جعفری صاحب کے بعض خیالات سے شدید قسم کا اختلاف کیا ہے۔ اور آخر میں کہا ہے کہ اُن تمام باتوں کے باوجود کتاب بڑی اہم ہے۔ اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو خود ترقی پسندوں کو بار بار پڑھنی چاہیئے اور ان پر عمل کرنا چاہیئے۔

۸۱۔ جلیل کریم:

غزل کا نیا مزاج

(ادب لطیف۔ لاہور۔ ۵۳ء جولائی ۸—۵)

غزل حالی تک داخلی احساسات کی ترجمان رہی حسرت موہانی نے شعوری طور پر غزل میں خارجیت کو جگہ دی۔ پھر ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے ساتھ ادبی نقطۂ نظر میں انقلاب آیا۔ مجاز، جذبی، فیض اس دور کے نمائندے ہیں، جوش و فراق کی شاعری کا عروج بھی اسی تحریک کے ساتھ ہوا۔ لیکن ابھی عوام کا مزاج تیار نہ تھا اس لئے خارجیت کا رجحان زیادہ مقبول نہ ہو سکا دوسری جنگ عظیم کے بعد صورت حال میں زبردست تبدیلی ہوئی۔ غزل میں خارجیت پوری طرح سرایت کر گئی اور یہ اس کے مستقبل کے لئے خوش آئند ہے۔

۸۲۔ جمیل نقوی:

انجمن ترقی اردو

(ماہ نو کراچی ۵۳ء دسمبر ۲۴—۲۳)

انجمن ترقی اردو (ہند) اور اب پاکستان کی ابتداء سے اب تک مختصر تاریخ اور اس کے کارنامے۔

۸۳۔ حسن عسکری:

قحط الرجال نہیں قحط اقبال

(ماہ نو کراچی۔ ۵۳ء دسمبر ۱۷—۱۴)

اردو ادب کی کم مائگی اس لئے نہیں ہے کہ پرانے اور نئے ادیبوں کو اچھے موضوع نہیں ملتے۔ بلکہ اردو لغات میں ۵۶ ہزار الفاظ میں سے کم سے کم ایک ہزار افعال تو ہوں گے ہی۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو سو افعال بھی مشکل سے مستعمل ہوں گے، پھر اردو میں طاقت کہاں سے آ سکتا ہے۔ ادیب اور قاری سب کا فرض ہے کہ اردو ادب میں لفظوں کو مغلوب کریں اور زیادہ سے زیادہ افعال کا استعمال کریں تبھی ادب کا جمود دور ہو سکتا ہے۔

۸۴۔ خواجہ احمد فاروقی:

داغ کے غیر مطبوعہ خطوط

(نگار لکھنؤ ۵۳ء جنوری ۴۹—۵۲)

مضمون میں داغ کے ان چند غیر مطبوعہ خطوط سے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں جو حمیدن بائی نقاب اور منی بائی حجاب کے نام یا ان سے متعلق ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ خطوط نسبتاً زیادہ دلکش ہیں۔ ویسے ان کے خطوط میں کہیں کہیں ان کی شوخی و شگفتگی، رندی و شاہد بازی، ادبی آگہی و گرویدگی کے نقوش بھی مل جاتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کے خطوط اعلیٰ پایہ کے نہیں۔

۸۵۔ خ۔ ا۔ ف:

محمد حسین آزاد کی ایک نظم

(دلی کالج میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۱۲)

دہلی اردو اخبار مورخہ ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء سے آزاد کی ایک نظم نقل کی گئی ہے جس میں ۱۸۵۷ء کے واقعے کی ہجری تاریخ نکالی ہے — ۱۲۷۳ھ۔ اسے تاریخ انقلاب عبرت افزا لکھا گیا ہے۔

۵۶۔ خ۔ ا۔ ف:

دلی کالج کی چند مطبوعات

(دلی کالج میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج میگزین

(۱۲۸—۳۲

تاریخ ابوالفدا، حفظ تقدیر (مولوی کریم الدین)، واقعات ہند (مولوی کریم الدین وغیرہ) مفتاح الافلاک (مولوی کریم الدین)، سوانح سکندر اعظم، عجائبات روزگار (رامچندر داس)، تواریخ انگلستان وغیرہ کا تذکرہ اور ضروری اقتباسات دئے ہیں۔

۸۷۔ درد۔ گورکھپوری:

اردو ڈرامے کا تدریجی ارتقا

(آج کل دہلی ۵۳ء ستمبر ۳۳—۳۸)

ڈرامے کی مختصر توضیح اور ہندوستان میں فن ڈرامہ

نگاری کا مختصر حال پیش کرنے کے بعد اُردو ڈرامے کے تدریجی ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے ۵ عناصر ترکیبی بتائے ہیں اور اس سلسلہ میں ہندوستانی تھیٹریکل کمپنیوں کی کارگزاریوں اور احسن لکھنوی، پنڈت بیتاب آغا حشر، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج وغیرہم کی خدمات کا ذکر کیا ہے اور اُردو ڈرامہ پر فلم اور ریڈیو کے اثرات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اُردو کی جدید ڈرامہ نگاری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۸۸۔ رحم علی الہاشمی:

ترجمہ کیسے کرنا چاہئے

(آج کل دہلی ۵۳ دسمبر ۳۶ — ۴۰)

ہماری تعلیمی و سماجی زندگی کی ہر آن بڑھتی پھیلتی زندگی کے سبب ترجموں کی سخت ضرورت ہے۔ ترجمے کے لئے متعلقہ زبانوں میں مہارت کی سخت ضرورت ہے اور ادائے مطلب پر قدرت بھی ہونا چاہئے فنی کتابوں کے ترجموں کے لئے متعلقہ فن پر عبور لازمی ہے لہجہ کا رکھ رکھاؤ بھی اہم ہے۔ ترجمے کے وقت لفظوں سے زیادہ توجہ مفہوم پر ہونی چاہیئے۔

۸۹۔ رشید احمد ارشد:

دورِ جاہلیت کے عرب شاعر

(العلم کراچی ۵۳ جولائی ۸۲ — ۹۳)

قدیم عربی شاعری پر ایک اجمالی نظر ڈالی ہے۔

۹۰۔ رفیعہ سلطانہ:

جدید اُردو ناول

(آج کل دہلی ۵۳ نومبر)

اُردو ناول کی ابتدائی مختصر تاریخ بیان کرنے کے بعد پریم چند، سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت، عزیز احمد قرۃ العین حیدر کے ناولوں پر تنقید کرتے ہوئے آخر میں کہا ہے کہ اُردو کا جدید ناول تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

۹۱۔ زرینہ کیدرنیا:

ایک سویت ناول نگار

(ہندستانی ادب حیدرآباد دکن ۵۳ جولائی ۸ — ۹)

فیودور گلاد کوف کی ناول نگاری کا تذکرہ۔

۹۲۔ زور محی الدین قادری:

اُردو کے آرمنی شاعر

(سب رس۔ حیدرآباد دکن ۵۳ اگست ۱۰ — ۱۵)

ابتدا میں آرمینیوں کے عہد اکبر میں ہندوستان میں وارد ہونے کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اور چند آرمنی شاعر جو ہندوستان ہی میں رس بس گئے تھے ان کے نام اور شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔

۹۳۔ زہرا سیدین:

مولانا حالی

(دلی اردو کالج میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج ۱۴۰ — ۱۴۳)

مولانا حالی کی قومی رہبری اور ان کے مقام شعر و ادب پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۹۴۔ سجاد ظہیر:

ایک خط

(تہذیب پٹنہ ۵۳ جون جولائی ۹ — ۱۰)

سجاد ظہیر کا ایک خط مورخہ ۸ اپریل ۵۳ء جو انھوں نے پاکستان سنٹرل جیل سے سہیل عظیم آبادی مدیر تہذیب کے نام لکھا۔

۹۵۔ سخاوت مرزا:

داغ کی اصلاحیں

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری فروری ۱۱۵ — ۱۱۸)

داغ کے سیکڑوں شاگرد تھے جنھوں میں سجادہ صاحب تلمیذ داغ کے اشعار اور ان پر داغ کی اصلاحیں درج ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ماشاءاللہ خاں اور مولوی کریم الدین جو تلامذہ داغ تھے کے ان اشعار کا ذکر کیا ہے جن پر داغ نے اصلاحیں کی تھیں

۹۶۔ سعادت علی خاں:

اقبال اور اسرار خودی

(آج کل دہلی ۵۳ء، اکتوبر ۱۱-۱۳)

اقبال کی شاعری، ان خصوصیات اور فلسفہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسرار خودی میں اقبال کی فکر نے شاعری کا جو پیکر تراشا ہے وہ حسین بھی ہے اور پرقوت بھی۔ اقبال اسرار خودی میں انسانی قلب کی گہرائیوں میں حقیقت کو تلاش کرتا ہے۔ وہ انسانوں میں قدرت کے جلوؤں کو بے نقاب دیکھتا ہے اور یہیں اسے اپنی خودی آشکارا کرنے کا موقع ملتا ہے۔

۹۷۔ سعید احمد رفیق:

ادب — کس لئے اور کیوں؟

(ادب لطیف لاہور ۵۳ء۔ اکتوبر ۹-۱۵)

مختلف نظریات ادب برائے زندگی فن برائے فن وغیرہ کا اصول اگر صحیح مان لیا جائے تو مضمون نگار کے نزدیک ادب کا مقصد فوت ہو جاتا ہے ادیب جو کچھ لکھتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ اور بہ قصد کے بارے میں لوگ بحث کر سکتے ہیں لیکن مقصد صرف زندگی ہونا چاہئے تبھی ادب خیالی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں قدم رکھے گا اور کامیاب ہوگا۔

۹۸۔ سیدہ یحییٰ:

اردو

(تہذیب پٹنہ ۵۳ء جون جولائی ۳۲-۳۶)

اردو اور ہندی کے باہمی تنازعہ پر روشنی ڈالنے کے بعد ہندوستان میں اردو کی بقا کے لئے دو تجویزیں پیش کی ہیں ایک تو یہ کہ اردو کو یوپی کی علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے جدوجہد کی جائے یا پھر اسے کلچری اقلیت کی زبان تسلیم کرانے کے لئے تحریک چلائی جائے مضمون میں دوسری تجویز کو مرجح قرار دینے کے بعد اس تحریک کے مالہ و ماعلیہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔

۹۹۔ شکیل الرحمٰن:

مخدوم — ایک شاعر

(تہذیب پٹنہ ۵۳ء جون جولائی ۲۰-۲۵)

مخدوم کی نظموں کی روشنی میں اس کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مخدوم نے انقلاب کی روح کو سمجھ لیا ہے انھوں نے رومان سے انقلاب کے درمیانی راستوں کو تیزی سے عبور کیا ہے ان کا سماجی شعور رچا ہوا ہے۔ باستثنائے چند ان کی رومانی نظموں میں سوز و گداز رچاؤ اور نغمگی ہے۔ ان کی بعض رومانی نظمیں احساس محرومی کا شکار ہیں۔

۱۰۰۔ شکیل الرحمٰن:

میراجی کی شاعری کے دو پہلو

(آج کل دہلی ۵۳ء اکتوبر ۲۳-۲۶)

میراجی کی شاعری میں خود پرستی، جنس پرستی، ابہام اور فراریت کے عناصر اتنے ہیں کہ ان میں صحت مند چیزوں کا ملنا بہت مشکل ہے، ابہام نے ان کی علاماتی نظموں کا بھی خون کر دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں کچھ قابل قدر عناصر بھی موجود ہیں "چل چلاؤ" "ابوالہول" "میں ڈرتا ہوں مسرت سے" "بلندیاں" "اغوا" "بعد کی اڑان" "کلرک" "نغمۂ محبت"، "ریل میں" اور افتاد ایسی نظمیں ہیں جن میں میراجی کے سماجی ماحول کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں اسی طرح ان کے بعض گیتوں میں زندگی کا نکھار بھی ہے اور اس کی کمزوریاں بھی ان کی بعض رومانی نظمیں بھی بڑی ستھری اور پاک ہیں۔

میراجی کے پاس نکھرا ہوا شعور نہیں ان کا شعور غیر شعور میں دبی ہوئی امنگوں کے دھوئیں سے لپٹا ہوا ہے۔

اگر ان کا شعور نکھرا ہوا ہوتا تو اردو کو ایک اہم شاعر مل جاتا۔

۱۰۱۔ شوکت سبزواری:

داغ کی شخصیت

(نگار، لکھنؤ ۵۳ جنوری، فروری ۱۲۱-۱۳۰)

بخلاف غالب و اقبال داغ کی شخصیت دو رنگی سے پاک ہے۔ اس کا ایک ہی پہلو ہے جو اس کے کلام خطوط اور روزانہ اعمال و افعال میں نظر آتا ہے۔ مضمون میں مکاتیب کے آئینہ میں ان کی شخصیت کے نقوش ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ داغ شوخ طبع زندہ دل، نفاست پسند، خوش پوش حسن پرست اور عیش پسند تھے لیکن عیاش نہیں اس لئے کہ ان کے خطوط کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند بھی تھے۔ مضمون میں ان ادبی نکتوں کو بھی پیش کیا ہے جو داغ کے خطوط میں پائے جاتے ہیں۔

۱۰۲۔ صباح الدین عبدالرحمٰن:

ملک الکلام عمید الدین سنامی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ نومبر ۳۳۲-۳۴۸)

امیر فخر الدین عمید عہد مغلیہ سے قبل کا ایک جلیل القدر فارسی شاعر ہے۔ اسی کے کلام اور زندگی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۰۳۔ صدیقی۔ ابو اللیث:

داغ کی شاعری میں رندی اور شاہد پرستی

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری، فروری ۱۰۱-۱۰۹)

نظیر اکبر آبادی، میر، مصحفی، جرأت، رنگین، انشا، واجد علی شاہ اختر اور مومن کی بنا ہی کا سرسری ذکر کرنے کے بعد داغ کی رندی و شاہد پرستی کے سلسلہ میں فریادِ داغ سے جس میں حجاب بائی اور داغ کے معاشقہ کا ذکر نظم ہے اشعار پیش کر کے ان پر تبصرہ کیا ہے اور داغ کی عشقیہ شاعری کے ارتقا پر بھی روشنی ڈالی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ داغ کے کلام میں عیش پرستی کے ساتھ ساتھ شدید قسم کی مذہبیت، اپنی معصیت کا اعتراف اور عفو کی طلب بھی پائی جاتی ہے۔

۱۰۴۔ صدیقی۔ ظہیر احمد:

فانی کا فلسفۂ غم و عشق

(آج کل دہلی ۵۳ ستمبر ۱۹-۲۷)

فلسفۂ غم و عشق کی تشریح کرنے کے بعد فانی کی شاعری کے ادوار کا مجملاً جائزہ لیا ہے اور ان کے فلسفۂ غم و عشق کا تجزیہ کیا ہے۔

۱۰۵۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم:

علامہ اقبال سے ایک ملاقات

(ماہِ نو، کراچی، ۵۳ ستمبر ۱۰-۱۱)

مضمون نگار نے علامہ اقبال سے اپنی آخری ملاقات کے تاثرات پیش کئے ہیں۔

۱۰۶۔ طالب جے پوری:

میر و فراق

(تہذیب، پٹنہ ۵۳، اگست)

جناب اثر لکھنوی نے فراق پر کوئی مضمون لکھا تھا، مضمون نگار نے اثر صاحب کے ان خیالات کی تردید کی ہے جو انھوں نے فراق سے متعلق قائم کئے تھے۔ مضمون نگار نے میر کی شاعری کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بعض مسائل مثلاً انسان دوستی کائنات سے رفاقت، وغیرہ فراق کے کلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ ثبوت میں مختلف اشعار پیش کئے ہیں۔

۱۰۷۔ طالب جے پوری:

میر و فراق

(۲)

(تہذیب، پٹنہ ۔ ۵۳ ستمبر ۲۴-۱۷)

مختلف موضوع مثلاً آفاق و کائنات کی عظمت و وسعت، انسان، جذبۂ عشق صبر، صداقت، خلوص گہرائی، غم کا انتہائی وجد آفریں احساس، لہجہ آواز وغیرہ جیسے کہ میر کے ہاں پائے جاتے ہیں اسی طرح فراق

کے ہاں) ہیں۔ مثال میں فراد کے شعار پیش کئے گئے ہیں۔

۱۰۸۔ اسلم انصاری :

ترجمے کے بنیادی مسائل

(ادب لطیف لاہور ۵۳ اگست ۹-۲۱)

ترجمہ کی افادیت و اہمیت پر روشنی ڈالنے کے بعد کامیاب ترجمے کے لئے چند قیود و شرائط متعین کئے ہیں مترجم کو جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے اس کے مزاج سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ایک زبان کے اندر کئی زبانیں ہوتی ہیں۔ مترجم کو ان ضمنی زبانوں کی خصوصیات سے واقف ہونا چاہیئے اور اصل کی لسانی خصوصیات کو ترجمہ میں منتقل کرنا چاہیئے۔ ترجمہ کا مقصد اصل کے خیال اور مفہوم کی ادائیگی ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے مترجم کو اصل اور ترجمہ دونوں کی زبانوں سے کماحقہٗ واقفیت ضروری ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مترجم کو آزادی ہے کہ وہ ترجمہ کی زبان میں مناسب الفاظ کی عدم موجودگی میں الفاظ گڑھے وہی الفاظ رائج ہو سکیں گے جو اس زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں کسی ادبی تصنیف کو ترجمہ کرتے وقت مقامی رنگ میں رنگ دینے سے اصل کی روح فنا ہو جاتی ہے۔ مترجم کو ہمیشہ لفظی ترجمہ سے گریز کرنا چاہیئے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ معانی بین السطور بھی سمجھے۔ مترجم کو ہر حالت میں مصنف کے منشا کی پابندی سخت ضروری ہے ہاں اگر مصنف کی بیانیہ کمزوری کی وجہ سے کوئی عبارت ژولیدہ ہو تو مترجم اُسے ترجمہ میں صاف کر سکتا ہے۔ یہ مترجم کا کام ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اصل میں عبارت کی ژولیدگی دانستہ ہے یا نادانستہ۔

۱۰۹۔ صدیقی۔ ابواللیث :

جنگ آزادی کا اثر زبان پر

(ماہ نو کراچی ۵۳ ستمبر ۱۲-۱۳ اور ۸۰)

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے اُردو پر غیر ملکی قوموں اور ان کی زبان کے اثرات کا جائزہ لینے اور اس سلسلہ میں فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی ادبی و لسانی خدمات پر روشنی ڈالنے کے بعد ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو زبان پر جو غیر ملکی خصوصاً برطانوی اثرات پڑے انہیں پیش کیا ہے۔ انگریزی کے جو الفاظ اُردو میں آئے وہ تین طرح کے تھے۔ دفتری یا عدالتی زبان سے تعلق رکھنے والے الفاظ، تہذیبی اور سماجی زندگی سے تعلق رکھنے والے الفاظ اور ادبی و علمی و فنی الفاظ اس سلسلہ میں سر سید احمد خاں کی خدمات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ سر سید اور حالی نے اپنے مضامین میں جو انگریزی کے الفاظ استعمال کئے ہیں ان کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ ایسے اور آرٹیکل انگریزی سے ہی اُردو ادب میں آئے۔ بعد کو انگریزی اصطلاحات کے ترجمے کئے گئے جو اب رائج ہو چکے ہیں۔

۱۱۰۔ ضمیر جعفری :

حفیظ کے ساتھ چند لمحے

(ماہ نو کراچی، ۵۳، اگست ۲، ۳۷-۹۲)

موجودہ صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں اُردو کے جن شعراء کو امتیازی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی علامہ اقبال کے بعد حفیظ کا نام سر فہرست ہے۔ اس میں خوبی تقدیر کے ساتھ ساتھ اس کے جوہر قابل کو بھی دخل ہے۔ اس کے ہاں لہجہ کی جدت، تکنیکی تجربات، نغمگی، مقامی رنگ، بحرل شاعری، دل نشین تغزل بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ تاہم حفیظ کا کلام خامیوں سے بری نہیں ہے۔

۱۱۱۔ عابد حسن منٹو :

ادب میں نقطۂ نظر کا مسئلہ

(ادب لطیف، لاہور ۵۳، اگست ۲۲-۲۶)

زندگی کے متعلق اس وقت دو ہی بنیادی نظریے موجود ہیں عینی اور مادی۔ انحطاط پذیر سرمایہ داری اور سامراجی آئیڈیالوجی کی بنیاد عینی فلسفہ ہے مضمون میں تجزیہ

کرکے بتایا گیا ہے کہ مالتھوس کا نظریۂ آبادی اور فرائڈ کا کا فلسفۂ تحلیل نفسی غایت کے اعتبار سے ایک ہیں اس لئے کہ دونوں طبقاتی نظام کو دائمی اور اس کے خاتمہ کو ناممکن بتاتے ہیں۔ اس کے برعکس زندگی کا مادی نقطۂ نظر سماج کو ازلی یا ابدی نہیں سمجھتا۔ وہ دُنیا کو مادی حقیقت اور شعور کو مادے ہی کی ارتقائی شکل سمجھتا ہے اور شعور کے صحیح استعمال سے سماج کی تبدیلی کو ممکن سمجھتا ہے۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کا یہی نقطۂ نظر ادب کی تخلیق میں رہبر ہونا چاہیئے اور ادب میں حزن و یاس، قنوطیت، پست ہمتی، تشکک، مقدر پرستی وغیرہ کے تمام منفی نظریات کی مخالفت کرنی چاہیئے۔

۱۱۲۔ عبادت بریلوی:

جدید شاعری کا انحطاط

(ماہ نو کراچی ۵۳ء، اگست ۲۳-۲۸)

جدید شاعری نئے نئے تجربات کی ایک داستان ہے جس میں تنوع اور ہمہ گیری قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ حالی و آزاد سے لیکر اقبال، جوش، فیض، اور مجاز تک اس میں ایک حُسن اور دلکشی ملتی ہے۔ لیکن بعد کے شاعروں نے نئے پن کی دھن میں جدید تر نظمیں لکھیں اور ایک غلط معیارِ شعر کو رواج دینا شروع کیا جس سے جدید اُردو شاعری انحطاط پذیر ہو گئی۔ اس سے زندگی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔

۱۱۳۔ عبدالسلام ندوی:

اُردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ء جولائی ۳۰)

۲۔ بھاشا کی یادگار ایہام کا خاتمہ مرزا مظہر جان جاناں ـــ سے ہوا اور ریختہ فارسی شاعری کی تقلید شروع ہوئی جو غالب وغیرہ تک جاری رہی۔ اسے فنی انقلاب کہہ سکتے ہیں۔ لکھنؤ میں خارجی مضامین کو زیادہ سے زیادہ اپنایا گیا۔ ذوق و نصیر نے اس کا تتبع کیا۔ بعد میں اُردو شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے نفس شاعری کے ذکر کے ساتھ مولانا حالی نے چند اصلاحی تجویزیں پیش کیں۔ مقالہ کے آخر میں حالی کے اعتراضات اور اصلاحی تجویزوں پر تبصرہ کیا ہے۔ (باقی)

۱۱۴۔ عبدالسلام ندوی:

اُردو شاعری میں انقلاب کیونکر پیدا ہوا
انقلاب کی عام تاریخ
(قسط ۳)

(معارف اعظم گڈھ ۵۳ء، اگست ۱۲۵-۱۴۴)

معنوی اصلاحات بیان کرلے کے بعد لفظی اصلاحات ـــ مثلاً بے تکلف لفظی صناعی، سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنا ان سے شعر کی خوبیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے مولانا حالی اسمٰعیل میرٹھی اور بعد کے شعرا نے اُردو شاعری میں بہت اہم کردار پیش کیا اور اُردو شاعری کو نکھارا اور سنوارا۔ مختلف مقالوں کو سامنے رکھتے ہوئے وضاحت کی گئی ہے کہ موجودہ دور میں اُردو شاعری میں قابل قدر اصلاحیں ہوئی ہیں۔

۱۱۵۔ عبدالمجید سالک:

اُردو صحافت

(ماہ نو کراچی ۵۴ء، اگست ۸-۱۸، ۵۰)

جام جہاں نما (۱۸۲۲ء) سے لیکر پیشوا (۱۸۹۹ء) تک کے اخباروں کا تذکرہ اور ان کی زبان و اسلوب کا نمونہ اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے موجودہ دور کے پرچوں اور ان کی خصوصیات کو بیان کیا ہے۔ ہندوستان کے اخباروں کے ساتھ پاکستان کے اخباروں کو بھی سامنے رکھا ہے۔

۱۱۶۔ عزیز قیسی:

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں عوامی جذبات

(سب رس حیدرآباد (دکن) ۵۳ء اگست ۷-۱۱)

نظیر اکبر آبادی کے دور کا پس منظر پیش کرنے کے بعد

اس کی نظموں اور شعروں کے انتخاب پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ نظیر کی شاعری حقیقت میں عوام کے احساسات وجذبات کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ نظیر نے عوام کو یقین دلایا ہے کہ ایک روشن مستقبل آئے گا اس نے عوام کی طرف سے کبھی آنکھیں بند نہیں کیں وہ مستقبل کا عظیم تر شاعر ہے۔

۱۱۷۔ علی کاظمی:

داغ پر ایک نظر

(نگار لکھنؤ ۵۳، جنوری فروری ۱۲۰)

داغ کی زندگی کے اہم واقعات مع تاریخ ایک فہرست کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔

۱۱۸۔ فاروقی۔ نثار احمد:

میر و فراق۔ معرضِ بحث میں

(تہذیب پٹنہ ۵۳، اکتوبر ۱۵۔۲۰)

میر و فراق میں کوئی تقابل ممکن ہے یا نہیں۔ اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر اور فراق میں تقابل ممکن نہیں۔ اس لئے کہ میر کا تصور عشق صوفیانہ اور فراق کا مادی ہے۔ میر کی تمام تر شاعری ان کی زندگی کا آئینہ ہے اور فراق کی شاعری کی بنیاد ان کے معاشرہ و ماحول پر اس بڑی حد تک نہیں۔ میر غم کا شاعر ہے اور فراق کی شاعری تخئیل سے عبارت ہے۔ یہ کہنا ایک لایعنی دعویٰ ہے کہ فراق نے کوئی نظریۂ حیات و کائنات بھی پیش کیا ہو۔ مختصر یہ کہ میر اور فراق میں زمین آسمان اور سیاہ و سفید کا فرق ہے۔

۱۱۹۔ فاروقی۔ نثار احمد:

اُردو شاعری میں رمزیت و اشاریت

(معیار میرٹھ ۵۳ نومبر ۱۳۔۱۵)

مضمون میں اُردو عشقیہ و غزلیہ شاعری کے وہ چند مخصوص علائم بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے بقول مقالہ نگار ذہنوں کا تجزیہ میں اور اسلامی نظریات کو کمزور کرنے میں لاشعوری طور پر زبردست کام کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان ہی علائم کے سہارے اُردو میں دہریت و اشتراکیت داخل ہوگئی ہیں اور اس طرح ادب میں تخریبی رجحانات پیدا ہوگئے ہیں جو زندگی میں جنس اور معاش سے بڑھ کر کسی اور بات کو مطلق اہمیت نہیں دیتے اس تخریبی رجحان کو روکنے کے لئے اور صحیح اسلامی ادب پیدا کرنے کے لئے مقالہ نگار نے اسلامی اصولِ تنقید کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

۱۲۰۔ فراق گورکھپوری:

داغ

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری و فروری ۹۸۔۱۰۰)

مقالہ نگار کے دل میں داغ کے اشعار تحسین و نفرین کے ملے جلے جذبات پیدا کرتے ہیں جن کا انھوں نے مقالہ ہذا میں تجزیہ کیا ہے۔ داغ کے کلام میں ان کے زمانے کی ساری خرابیاں ایک شانِ ہنگامہ آرائی کے ساتھ نظر آتی ہیں داغ کا تغزل واسوخت سہی لیکن اسے محض عامیانہ جذبات کا جادو بیان شاعر سمجھنا بھی پوری سچائی نہیں۔ دلی کی زبان کی لطیف اشاریت، مومن کے نفسیاتی تجزیوں کی پرچھائیاں اور اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جو بولی ٹھولی کی شکل میں وجود میں آتا ہے داغ کی زبان میں جذب ہوگیا تھا۔ اُردو کی کامیاب شاعری میں جو آج ہمیں سلجھاؤ نظر آتا ہے وہ سب کچھ داغ کا رہینِ منت ہے۔

۱۲۱۔ فصیح الدین بلخی:

عظیم آباد کا ایک جواں مرگ شاعر

(تہذیب، پٹنہ ۵۳، اگست)

مرزا علی رضا المتخلص بہ ضیا عظیم آبادی کی شاعری ان کے مختصر حالات زندگی اور انتخاب اشعار پیش کئے گئے ہیں۔

۱۲۲۔ فضل الرحمٰن:

نئے ادبی رجحانات

(معیار میرٹھ، ۵۳ء، اگست)

آج کل ادبی ذوق بڑی تیزی سے بدلتا جا رہا ہے جدید رجحانات ابھر رہے ہیں اور صحیح مقاصد متعین کئے جا رہے ہیں۔ ادیب دو گروہ میں بٹ گئے ہیں ایک ادب برائے ادب اور دوسرا ادب برائے زندگی۔ پھر آگے چل کر مضمون نگار نے اشتراکیت کے اصول وغیرہ پر طویل اقتباس دئے ہیں اور واضح کیا ہے کہ اشتراکی ادب زہر ہے۔

۱۲۳۔ فیض الرحمٰن اعظمی:

جوش کی انقلابی شاعری

(تہذیب پٹنہ، ۵۳ء، اکتوبر ۹ — ۱۴)

انقلابی شاعری کا مفہوم سمجھانے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جوش کی انقلابی شاعری نعروں کی شاعری ہے۔ وہ انقلاب کی ڈراؤنی تصویر کھینچتے ہیں جو انقلاب اور ارتقا کا صحیح نظریہ نہیں۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کی غربت کی تصویر بڑی لذت اور حسن کے ساتھ کھینچتے ہیں اور ان کے انقلابی رجحان کو اجاگر نہیں کرتے۔ ان کے ہاں تعمیری نقطۂ نظر کا فقدان ہے۔ دراصل جوش بنیادی طور پر شاعر انقلاب نہیں بلکہ شاعر شبابیات ہیں۔ لیکن جوش کی انقلابی شاعری کا تاریخی مقام اور اہمیت ضرور ہے۔ ان کی شاعری سے مجموعی طور پر انقلابی ضرور ہے کہ اس نے نئی نسل کے انقلابی شعرا کی ذہنی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔

۱۲۴۔ عطاء الرب صدیقی:

حالی کی واقعیت نگاری

(معیار میرٹھ، ۵۳ء جولائی ۱۲ — ۱۵)

حالی کے ہاں مقصدی واقعیت پائی جاتی ہے حالی کا نصب العین وہ ہے جو انھوں نے مسدس میں پیش کیا۔ حالی کی واقعیت نگاری اور حقیقت نگاری سے اردو ادب میں ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

۱۲۵۔ قاسم علی سجن لال:

پروفیسر رامچندر اردو صحافی کی حیثیت سے

(دلی کالج اردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۱۱۶—۱۲۲)

پروفیسر رام چندر ۱۸۲۱ء میں پیدا ہوئے ۱۸۳۱ء میں یتیم ہو گئے۔ باہمت ماں نے تعلیم جاری رکھی۔ کم عمری میں ایک گونگی بہری لڑکی سے شادی ہو گئی۔ پریشان حالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بالآخر دلی کالج میں سائنس کے پروفیسر مقرر ہوئے حساب اور سائنس وغیرہ سے متعلق کئی ایک مفید و مقبول کتابیں لکھیں۔ اردو کی خدمت ایک صحافی کی حیثیت سے بھی کی ہے ۱۸۴۵ء میں فوائد الناظرین نکالا۔ یہ علمی و ادبی پرچہ تھا۔ بعد میں خبریں بھی آخر میں چھپنے لگی تھیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے خیر خواہ ہند اور پھر اسے بدل کر محب ہند نکالا تھا۔ یہ قابل پروفیسر لائق ایڈیٹر اور پسندیدہ اخلاق کے آدمی تھے۔

۱۲۶۔ قاضی عبدالودود:

گلستانِ سخن

(دلی کالج اردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۹۵—۱۲۲)

دو بابوں میں صراحت کے ساتھ تحقیقی تبصرہ کیا ہے۔ صفحہ اور سطر کے لحاظ سے صاحب تذکرہ، مختلف شعرا، اردو زبان اور اس کے محاوروں وغیرہ سے متعلق ضروری اقتباسات ہی نہیں دئے بلکہ جہاں تہاں اختصار کے ساتھ مبصرانہ جملے بھی لکھے ہیں۔ اس مشہور تذکرہ کے مصنف اگرچہ مرزا قادر بخش مشہور ہیں لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ یہ صہبائی کا لکھا ہوا ہے۔ اقتباسات مرزا قادر بخش کی دلی اور خود ان کی زندگی کے جاننے میں مدد دیتے ہیں۔ علاوہ بریں اور دوسری ضروری باتیں بھی علم میں آتی ہیں۔ پہلا باب تذکرہ کے موضوع وغیرہ سے بحث کرتا ہے اور دوسرا باب ان پر تبصرہ کرتا ہے۔ گلستان سخن کا نام پہلے آثار المعاصرین رکھا گیا تھا۔

۱۲۷۔ قاضی عبدالودود:

کریم الدین اور گارساں دتاسی

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۹۸)

گارساں دتاسی کو اُردو سے بڑی دلچسپی تھی، لیکن وہ طبعاً غیر محتاط تھا۔ اُردو اور فارسی سے کافی واقفیت نہ ہونے کے سبب اس نے بے شمار بے بنیاد باتیں لکھ دی ہیں کریم الدین سماءالدین اور ان دونوں کے والد سراج الدین سے متعلق جو اطلاعات دتاسی نے دی ہیں ان میں سے ان کے تبدیل مذہب اور جان صاحب کی استادی سے بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ اس کا بیان کریم الدین اور سراج الدین کے بارے میں قابل قبول نظر نہیں آتا۔ جان صاحب کی استادی کا قصہ غلط ہے۔ آخر میں کریم الدین کی زندگی مختصراً پیش کی اور ان کی کتابوں کی فہرست دی ہے۔

۱۲۸۔ کلیم اللہ:

ادب، زندگی اور سیاست

(سب رس، حیدرآباد (دکن) ۵۳ جولائی ۸۔ ۱۲)

ہر دور اور ہر زمانے میں ادب کسی نہ کسی مقصد کا حامل رہا ہے۔ اور ادب کے تعلقات، زندگی اور سیاست سے، پر بحث چنانچہ سینکڑوں سال سے کسی نہ کسی صورت میں ہوتی چلی آئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب زندگی کے تقاضوں اور سیاست کے اثرات سے نہیں بچ سکتا۔

۱۲۹۔ کلیم اللہ:

مشرقی بنگال کا ایک قدیم اُردو جریدہ

(ماہ نو کراچی ۵۳، اکتوبر ۱۰ — ۱۴)

بنگالی زبان میں عربی و فارسی کے سرمایہ کے شامل ہونے اور اسے محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں جو انفرادی اور اجتماعی تحریکیں چلیں ان کا مختصر سا جائزہ لینے کے بعد اُردو کے سلسلہ میں وہاں جو کام ہوا، اس کا سرسری ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد مشرقی بنگال سے نکلنے والے ایک معیاری ماہنامے "اختر" کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے اسے عبدالغفور صدیقی جو خالد بنگالی کے نام سے مشہور تھے نکالتے تھے مضمون میں اختر کے قلمی معاونین کا ذکر اور اس میں شائع شدہ مضمونوں اور نظموں کے اقتباسات دئے گئے ہیں۔

۱۳۰۔ لکشمی نرائن وششٹ:

مولوی کریم الدین کے خود نوشت حالات

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ قدیم دلی کالج نمبر ۱۹۶۔ ۱۹۷)

مولوی کریم الدین کی تصنیف یا تصانیف سے ان کے حالات اخذ کر کے بیان کیا ہے۔

۱۳۱۔ مبارک حسین مبارک عظیم آبادی۔ ڈاکٹر:

داغ عظیم آباد میں

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری فروری ۸۵ ۔ ۸۹)

داغ کے عظیم آباد آنے کے اسباب، استقبال، جائے قیام، ان کی اہل شہر سے ملاقاتیں، ان کے اعزاز میں ہونے والے مشاعرے اور مدت قیام وغیرہ سے متعلق ذاتی معلومات اور تاریخ قدوم مصنفہ حضرت شاہ محمد یحیٰی شاگرد داغ جو انھوں نے داغ کے عظیم آباد آنے کے متعلق منظوم شکل میں لکھی تھی، ان کی بنیاد پر واقعات قلم بند کئے ہیں اور ان واقعات کی تصدیق کے لئے مثنوی فریاد داغ سے اشعار بھی پیش کئے ہیں۔

۱۳۲۔ متین طارق:

ادب کا مقصد

(معیار میرٹھ، ۵۳ جولائی ۲۰ — ۱۷)

ادب کا مقصد انسان کے جذبات عالیہ کو بلند کرنا ہے۔ لیکن موجودہ ادب سوسائٹی کے اخلاق و کردار کو تباہ و برباد کر رہا ہے۔

اس کے خلاف صالح اور بہتر ادب پیدا کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سوسائٹی کے اخلاق و کردار بلند ہوں۔

۱۳۳۔ مجتبیٰ حسین:

ظریف لکھنوی

(ادب لطیف لاہور ۵۴ء ستمبر ۱۷-۳۰)

ظریف کے حالات زندگی، اُن کی طنزیہ شاعری۔ اور ان کی ظرافت نگاری کا اُردو ادب میں کیا مقام تھا ان کے مختلف اشعار اور نظموں کے اقتباس پیش کر کے وضاحت کی گئی ہے۔

۱۳۴۔ محمد حسن عسکری:

نفسیات اور تنقید

(ماہ نو کراچی ۵۳ء، اکتوبر ۷ - ۹ اور ۵۶)

تنقید کے تین رُجحانات نفسیاتی، معاشی اور "خالص" کی تشریح اور ان کی خامیوں کا ذکر کرنے کے بعد نفسیاتی نقطۂ نظر کو بہتر بتا کر اس بات کا مشورہ دیا گیا ہے کہ ادبی تنقید کو نفسیات سے دامن نہیں بچانا چاہیئے بلکہ نفسیات کو ہضم کرنے کا طریقہ جاننا چاہیئے۔

۱۳۵۔ محمد فضل الرحمٰن:

ریڈیو ڈرامہ

(سب رس حیدرآباد ۵۳ء جولائی ۴۶ - ۴۹)

عام ریڈیو ڈرامے کے ارتقاء پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے کے ساتھ اس کی ٹکنیک سے بحث کی ہے۔

۱۳۶۔ محمد اجمل خاں:

ہندوستان کے قومی ترانے

(آج کل دہلی ۵۳ء دسمبر ۵ - ۱۲)

تصور وحدت انسانیت و مساوات اور ایک نسل یا گروہ کے تفوق و برتری کے تصور کے بیان کے بعد "گئی یک بیک جو ہوا پلٹ" (ظفر) کے مرثیہ ہند کو پہلا قومی ترانہ بتاتے ہوئے پیش کیا ہے۔ اس کے بعد (۲) ہند میں کیسو پھاگ مچوری (۳) اقبال (۴) چکبست (۵) شبلی (۶) بنکم چندر چٹرجی کے بندے ماترم مع ترجمہ وقار انبالوی اور (۷) جن گن من و ایسے ترانوں اور موقعے سے ان کے ترجمے مع متعلقہ واقعات و حادثات کے پیش کئے ہیں

۱۳۷۔ محمد امین زبیری:

تنقید حیات جاوید

(العلم کراچی ۵۳ء، اکتوبر ۸۰ - ۱۰۰)

صاحب مقالہ مولانا حالی کے مداحوں میں سے ہیں لیکن انھوں نے اپنی تمام محبت اور عقیدت کے باوصف حیات جاوید پر تنقیدی و تحقیقی نگاہ ڈالی اور اس کی غلط بیانیوں یا ادھوری بیانی کے مختلف واقعات کو بیان کیا ہے جس سے ہم یونیورسٹی کے انتظامات، سرسید کی زندگی، ان کے مذاق شعر و ادب سے متعلق مفید معلومات بہم پہنچتی ہیں۔

۱۳۸۔ محمد امین زبیری:

فن تاریخ گوئی

(العلم کراچی ۵۳ء جولائی [illegible] ۹۰)

حروف ابجد کی مدد سے مختلف واقعات کے تاریخی مادے فراہم کرتے اور پھر انھیں منظوم صورت میں ڈھال لیتے ہیں۔ حسب ضرورت تعمیہ اور تخرجہ سے کام لیتے ہیں۔ فدا، فارغ مرادآبادی، آل احمد مارہروی اور جلیل مانکپوری تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

۱۳۹۔ محمد حسن عسکری:

کچھ اُردو نثر کے بارے میں

(ماہ نو کراچی ۵۳ء اگست ۴ - ۷ و ۱۱۹)

شروع سے لے کر اب تک کی اُردو نثر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ آج کی بھی نثر اُردو کے ابتدائی قاعدے کی نثر ہے۔

اور یہ نثر اس سے زیادہ پیچیدگی یا نفاست کی متحمل نہیں، اور یہ صورت حال اس وقت تک نہیں بدلے گی جب تک اُردو نثر کے تمام اسالیب بیان کا مکمل جائزہ نہ لیا جائے۔ صرفیوں اور نحویوں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ تخلیقی کام کرنے والوں کے نقطۂ نظر سے۔

۱۴۰۔ محمد عثمان رمز :

نوح اور نوح اسکول

(معیار، میرٹھ ۵۳ ، اگست)

نوح ناروی ادب برائے ادب کے قائل۔ زبان الفاظ کی ترتیب۔ ان کی بندش اور پوری شاعری کا محور داستان حسن و عشق ہے۔ زمانہ کی انقلاب اور تبدیلی کا کوئی اثر نہیں نوح کے کئی شاگرد ہیں لیکن معدودے چند کے علاوہ کوئی بھی شاعرانہ خصوصیت کا حامل نہیں۔

۱۴۱۔ محمد عقیل :

ادب اور ابلاغ

(آج کل ، دہلی ۵۳ جولائی ۴۸۔۴۳)

ادب اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے کوئی ادب زندگی سے الگ ہو کر ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔ جب ادب میں مسائل حیات لائے جاتے ہیں۔ تو ابلاغ اور پروپیگنڈے کا شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ مضمون نگار نے آگے چل کر مثالوں سے وضاحت کی ہے کہ ہر دور کا ادب اپنے دور کا پروپیگنڈہ بھی رہا ہے اس لئے ترقی پسند ادیب پر اُن کے نظریئے کا پروپیگنڈہ کرنے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔

۱۴۲۔ محمد علی خاں اثر رام پوری :

فیروز رام پوری

(آج کل دہلی ۵۳ جولائی ۲۵۔۲۲)

محمد فیروز شاہ خاں فیروز رام پوری کے حالات زندگی اور ان کے اشعار کا انتخاب اور ان کی تاریخ گوئی کے چند نادر نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

۱۴۳۔ مختار الدین آرزو :

اقبال کے چند قدیم رقعات

(ماہ نو کراچی ۵۳ ، اگست ۲۹۔۳۱)

ان آٹھ خطوں میں بعض غیر مطبوعہ ہیں اور بعض ایسی کتابوں میں چھپے ہوئے ہیں جن تک عام نگاہیں نہیں پہنچتیں۔ مثلاً اصلاح سخن اور کلیات عزیز۔ یہ خطوط شوق سندیلوی، شیخ فرید احمد رشید احمد صدیقی مرتب کلیات خواجہ عزیز لکھنوی، اور انجمن شبان المسلمین کے نام ہیں اور ادبی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۴۴۔ مختار الدین آرزو :

علامہ اقبال کے دو خطوط

(ماہ نو کراچی ۵۳ ، اگست ۲۸ و ۹ کے درمیان)

علامہ اقبال کے دو خطوط : (۱) مورخہ ۲۹ اپریل ۱۹۳۲ء (۲) ۲۹ دسمبر ۱۹۳۴ء کے عکس۔

۱۴۵۔ مذاکرہ :

اُردو کی مزید ترقی کے امکانات

(ماہ نو کراچی ۵۳ جولائی ، ۸۔۳)

اس موضوع پر تین حضرات سید عبداللہ، عبادت بریلوی اور حامد علی خاں نے اپنے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے۔ اُردو کی پچھلی تاریخ۔ اس کی صلاحیت نشوونما، اور ترقی کے امکانات پر پاکستانی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی ہے۔

۱۴۶۔ مرزا ادیب :

اُردو ادب کا جائزہ

(ادب لطیف۔ لاہور ۵۳ ستمبر ۳۔۲۳)

پاکستانی ادیبوں کے ان مضامین نظم و نثر کا جائزہ لیا گیا ہے جو ۱۹۵۲ء کے پورے سال اور ۱۹۵۳ء کے چند ماہ میں ادبی رسالوں کے ذریعہ منظر عام پر آئے، جن میں، تنقیدی، افسانہ مزاحیہ نگاری اور شاعری پر ہلکے ہلکے اشارے کئے گئے ہیں۔

۱۴۷۔ مشر بال مکند :

رام دھاری سنگھ دِنکر

(آج کل ، دہلی ۵۳ نومبر ۱۵۔۱۳)

پروفیسر دِنکر ایک اچھے شاعر اور بہترین نثر نگار ہیں ان کی شاعری سے ہندوستانی سماج کی قومی تحریک کو تقویت ملی اور آگے بڑھنے کا پیغام۔ مضمون نگار نے ان کی شاعری کے چند نمونے بھی دیئے ہیں۔

۱۴۸۔ مظفر علی:

نذیر احمد — ایک نفسیاتی معاملہ

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۱۴۲-۱۶۸)

جس طرح نفسیات کا معمول اپنے خیالات و تجربات اور احساسات کو بیان کر دیتا ہے اسی طرح مُصنّف زندگی کو اپنی تصانیف میں پیش کرتا ہے۔ یہ زندگی اسکی اپنی ہوتی ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے ذریعہ اپنے خیالات اور جذبات کو بیان کرتا ہے۔ نذیر احمد کی بیشتر تصانیف کا موضوع عورت ہے وہ عورت کو خطرناک اچھا نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ وہ ردِّعمل ہے جو اپنی شریکِ حیات کے قبل شادی کے برتاؤ سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ اگر یہ ردِّعمل نہ ہوتا تو مرآۃ العروس وغیرہ نہ لکھی جاتیں اور اُردو ادب ان ذخیروں اور اس نسائی ادب سے محروم رہ جاتا۔

۱۴۹۔ مشرف انصاری:

اِنشائے بےخبر سے بےخبری

(ماہ نو کراچی ۵۳ء، اکتوبر ۱۵-۲۱)

خواجہ غلام غوث بےخبر کا اُردو خطوط نویسی میں درجہ متعیّن کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے اُردو خطوط کے مجموعے "فغانِ بےخبر" اور "رشک لعل و گہر" اور انشائے بیخبر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں مضمون میں "انشائے بیخبر" کے تعارف اور اس کی روشنی میں، ان کے اندازِ نگارش کا تجزیہ پیش کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اُردو خطوط نویسی کی تاریخ میں بےخبر رجب علی بیگ سرور اور مرزا غالب کی درمیانی کڑی ہیں انھوں نے مرزا غالب سے متاثر ہو کر اُردو میں جدید اسلوبِ نگارش اختیار کیا۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ بیخبر نے غالب سے پہلے اور غالباً رجب علی بیگ سرور سے بھی پہلے اُردو میں خط لکھنے شروع کئے۔

۱۵۰۔ مقصود حسین خاں:

مرزا غالب

(العلم کراچی ۵۳ء جولائی ۳۲-۳۵)

۱۔ غالب کے متعلق چند اختلافی رائیں پیش کرنے کے بعد غالب کی نثر نگاری پر تبصرہ کیا گیا ہے اور حسبِ منشا غالب سے قبل کی اُردو کی نثر کا جائزہ لیا ہے چنانچہ خواجہ گیسو دراز وغیرہم سے لیکر تحسین کی نو طرز مرصّع تک کا اس قسط میں تذکرہ کیا اور ان کی اہمیت دکھائی ہے۔

۱۵۱۔ ممتاز حسین:

غزل یا شاعری؟

(ادب لطیف لاہور ۵۳ء جولائی ۹-۲۶)

مقالہ نگار جہاں غزل پوری زندگی پر محیط نظر آتی ہے اُسے شاعری کے نام سے اور جہاں وہ زندگی کی وسعتوں سے کنارہ کش ہو کر صرف محبت کی باتوں اور گھاتوں کے حدود میں آجاتی ہے اُسے غزل کہتے ہیں۔ شاعری نہیں۔ اس خیال کو انھوں نے اُردو شعرا کی غزلوں کو سامنے رکھ کر زندگی اور سماج کے پس منظر میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور آخر "دل" کی باتیں کی ہیں۔

۱۵۲۔ منیری۔ شمس الدین:

ہندوستان میں فارسی

(تہذیب، پٹنہ، ۵۳ء جون جولائی ۶۰-۶۵)

مضمون میں اوّلاً یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان میں سنسکرت اور فارسی کا قریب قریب ایک ہی درجہ ہے اور دونوں زبانوں میں کئی اعتبار سے مشابہت پائی جاتی ہے اس کے بعد ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کا جائزہ لینے کے سلسلہ میں ایران سے آئے ہوئے شعرا عرفی، ظہوری، نظیری طالب کلیم، قدسی، حزیں وغیرہ اور ہندوستانی فارسی شعرا امیر خسرو، فیضی، غنی، بیدل غالب، شبلی، اقبال وغیرہ کی خدمات کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فارسی کے بڑے بڑے ہندو ادیبوں، مصنفوں، سوانح نگاروں مورّخوں اور محققوں کی خدمات کو بھی سراہا ہے اور آخر یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں فارسی کو سنسکرت کے برابر درجہ دینا چاہیئے۔

۱۵۳۔ ناشاد۔ محمد حنیف خاں:

فراق کی شاعری معرض بحث میں

(تہذیب، پٹنہ ۵۳ جون جولائی ۴۶-۴۷)

فراق پر آثر لکھنوی کے مضمون بعنوان "عشق یا ہوس" مطبوعہ تہذیب مئی ۱۹۵۳ء پر تنقید کرکے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ فراق کی شاعری اخلاقی اعتبار سے گری ہوئی نہیں ہے بلکہ ان کا نظریہ عشق ارضی ہے۔ رہی عروض کی یا زبان کی غلطیاں تو محض چند غلطیوں کی وجہ سے فراق کی عظمت میں فرق نہیں پڑتا۔ مضمون میں فراق کے اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام کے ابہام کی توجیہہ بھی پیش کی گئی ہے۔

۱۵۴۔ نثار عزیز:

ترجمے کے بنیادی مسائل

(ادب لطیف لاہور ۵۳ ستمبر۔ ۶۶-۶۷)

ظ انصاری کے مقالہ "ترجمے کے بنیادی مسائل" کا خلاصہ۔ درمقالہ کی افادیت پر مختصراً اشارے۔

۱۵۵۔ نذیر احمد:

کتاب نورس مصنفہ ابراہیم عادل شاہ کے مخطوطات

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ جولائی ۵۳-۶۹)

نورس کے آٹھ اہم مخطوطات کا ذکر مع ان کی خصوصیات کے۔

۱۵۶۔ نذیر احمد:

باقر کاشانی

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ نومبر ۳۷۱-۳۸۷)

باقر کاشانی محتشم کا شاگرد تھا۔ ایران سے ہندوستان آیا۔

سنجر کاشانی کی موت پر اس نے جو مرثیہ لکھا تھا اس کو پیش کیا گیا ہے۔

۱۵۷۔ نصیر الدین ہاشمی:

حفیظ دہلوی پھر دکنی

(العلم کراچی ۵۳ جولائی، ۲۷-۳۱)

حفیظ دہلی کے باشندے تھے بعد میں دکن گئے اور راجہ ہیبت رام اور پھر راجہ چندولال شاداں سے توسل اختیار کیا ۱۲۳۱ھ کے تین اساتذہ زبان اردو میں ان کا شمار ہوتا ہے مثلاً ناسخ، ذوق اور حفیظ۔ لیکن اردو کے تاریخ نگار۔ وں نے حفیظ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ دکن میں تاریخ گلزار آصفیہ، اور تذکرۂ شعرائے دکن وغیرہ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ تاہم حالات زندگی ناپید سے ہیں۔ شیخ حفیظ نام اور حفیظ تخلص ہے۔ غالباً امامیہ مذہب رکھتے تھے۔ تیر کے قائل تھے۔ مزاق و کلام میں بڑی رفعت و شگفتگی پائی جاتی ہے۔

۱۵۸۔ نصیر الدین ہاشمی:

کیا اُردو اقلیت کی زبان ہے؟

(سب رس۔ حیدرآباد۔ ۵۴، اگست)

ریاست حیدرآباد میں مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے اعداد و شمار پیش کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اُردو زبان اقلیت کی زبان نہیں ہے۔

۱۵۹۔ نصیر الدین ہاشمی:

قدیم اُردو کے دو نایاب قصص انبیا

(العلم کراچی ۵۳، اکتوبر ۱۰۱-۱۰۹)

اس مضمون میں (۱) قصص انبیا مصنفہ قی۔ قی اور (۲) قصص الانبیا معروف بہ ریاض مسعود از غوث جامی کا تعارف کیا ہے (اول الذکر کا تذکرہ نوائے ادب، جنوری ۱۹۵۳ء میں مختصراً ہو چکا ہے۔ دونوں نایاب ہیں اور اب سے پہلے اہل علم حضرات سے ان کا تعارف نہیں ہوا تھا۔

۱۶۰۔ نفیس سندیلوی:

داغ کے بعض مشہور تلامذہ

(نگار لکھنؤ ۵۴ جنوری، فروری ۱۳۱-۱۳۶)

داغ کے بعض تلامذہ، احسن مارہروی، اختر۔ بینوا

امکس دہلوی، آصف، اقبال، بیباک شاہجہانپوری، بیخود دہلوی، جگر مرادآبادی، جوش ملسیانی، حسن بریلوی، رسا بلندشہری، سائل دہلوی، سیماب اکبرآبادی، آغا شاعر دہلوی، طیش مارہروی، مبین مچھلی شہری، محمود رامپوری، ناطق گلاوٹھوی، نسیم بھرتپوری اور نوح ناروی کے مختصر حالات زندگی اور ان پر مختصر تبصرہ۔

۱۶۱- نفیس سندیلوی:

داغ اور ان کے معاصرین

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری، فروری ۵۳- ۴۴)

داغ کے غیر معروف معاصرین کے مختصر ذکر کے بعد انکے مشہور و معروف معاصرین جو رامپور میں ان کے ہم صحبت رہے یعنی منیر شکوہ آبادی، تسلیم لکھنوی، امیر مینائی اور جلال لکھنوی کے مختصر حالاتِ زندگی پیش کئے ہیں اور ان کے تلامذہ و تصانیف کا مختصر حال لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ان معاصرین کا داغ کے کلام سے موازنہ کر کے داغ کو ممتاز ٹھہرایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ داغ اور ان کے معاصرین کے متحد المضامین اشعار پیش کئے ہیں۔

۱۶۲- نوح ناروی:

فصیح الملک حضرت داغ دہلوی

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری، فروری ۲۷- ۳۴)

مضمون میں ذاتی معلومات کی بنا پر داغ سے متعلق وہ واقعات بیان کئے گئے ہیں جو جلوۂ داغ مرتبۂ احسن مارہروی میں یا دوسری کتابوں میں درج نہیں اور آخر میں ان کے کلام پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔

۱۶۳- نیاز احمد:

آغا بابر

(راہ نو، کراچی ۵۳ جولائی ۲۴- ۲۳)

آغا بابر مزاح نگار کی حیثیت سے ۳۶ء میں وارد ہوئے تھے اب تک انھوں نے بہت سے افسانے لکھے اور کامیاب ہے وہ جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کرنے پر قادر ہیں۔

۱۶۴- وزیر آغا:

طنزیہ و مزاحیہ شاعری اودھ پنچ سے پہلے

(ادب لطیف لاہور ۵۳ ستمبر ۱۵- ۹)

اُردو زبان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں اودھ پنچ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے پھر آگے چل کر اودھ پنچ سے ڈیڑھ سو سال پہلے کی اُردو طنزیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے جو سودا سے شروع ہو کر غالب پر ختم ہوتی ہے۔ مختلف شعراء کے اشعار حوالہ میں پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً سودا۔ مصحفی۔ نظیر اکبرآبادی۔ انشا، غالب وغیرہ۔

۱۶۵- وفا راشدی:

اُردو زبان اور بنگال کے ہندو ادیب

(آج کل دہلی ۵۳ جولائی، ۲۱- ۱۸)

بنگال کے چند ایسے اُردو کے ہندو ادیب جن کا ذکر اُردو تذکروں میں نہیں ہے اور جنھوں نے اُردو کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے ان کے مختصر حالات۔

۱۶۶- وقار عظیم:

آغا حشر کا فن

(راہ نو کراچی، ۵۳، اگست ۱۷- ۲۲ و ۴۹)

آغا حشر نے ۳۲، ۳۳ سال ڈرامے لکھے۔ اس مدت میں ان کی مقبولیت بڑھتی رہی مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ زمانے کی طلب اور بدلتے ہوئے مذاق کو سامنے رکھ کر انھوں نے ڈرامے لکھے اور اپنی تخلیقات کو فن کے نقطۂ نظر سے بھی بلند کرتے رہے آغا حشر کے فن اور مقبولیت کے یہ دو بڑے راز ہیں۔ مقالہ میں حسب ضرورت مثالیں دی ہیں۔

۱۶۷- وقار عظیم:

ڈراما آغا حشر سے پہلے

(راہ نو کراچی، ۵۳ جولائی ۱۷- ۱۰)

مضمون نگار نے امانت کو اُردو کا سب سے پہلا

ڈراما نگار ثابت کرتے ہوئے اندر سبھا سے مختلف مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے بعد مداری لال کی "اندر سبھا" افسوس کی بزم سلیمان اور حیدر کی "جشن پرستان" میں اس کے بعد زنق بنارسی، طالب بنارسی، حافظ عبداللہ، احسن لکھنوی، بیتاب بریلوی کے ڈراموں کے نام مختصر تاریخ اور مثالیں پیش کی ہیں۔

۱۶۸۔ وقار عظیم:

طرز داغ میں رنگ مومن کی جھلکیاں

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری، فروری ۷۶-۸۴)

مومن کے تغزل کی خصوصیات بتانے کے علاوہ مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ داغ کے کلام میں شخصیت کی نمایاں انفرادیت کے باوجود مومن کے انداز فکر و نظر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں کبھی کبھی تو داغ کی انفرادیت مومن کے رنگ میں ڈوب جاتی ہے مختصر یہ کہ داغ کو داغ بنانے میں اور چیزوں کے علاوہ مومن کے تغزل کو بھی خاصا دخل ہے۔ اس دخل نے خیال و اظہار بیان دونوں کے اعتبار سے داغ کے کلام میں اچھے نتائج پیدا کئے۔

۱۶۹۔ ولی الرحمٰن کاکوی۔ سید:

نقش جمیل پر ایک تنقیدی نظر

(معارف اعظم گڑھ ۵۳، اکتوبر ۲۸۷-۲۹۲)

پروفیسر جمیل مظہری کی نظموں کے مجموعہ نقش جمیل پر تبصرہ، مقالہ میں جمیل مظہری کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لینے کے بعد ان کے کلام میں تبصرہ نگار کو جو زبان و بیان کی خامیاں نظر آتی ہیں انھیں تفصیل سے پیش کیا ہے۔

۱۷۰۔ ہارون خاں شروانی:

حسرت موہانی کے سیاسی رجحانات

(۲)

(آج کل دہلی ۵۳ جولائی ۱۰-۵)

مولانا حسرت موہانی کے سیاسی خیالات و کردار مختلف ادوار میں ان کی تحریر اور شاعری کے مختلف اقتباسات سے واضح کیا گیا ہے۔

۱۷۱۔ ہنس راج رہبر:

پریم چند کا آخری ناول

(ادب لطیف لاہور ۵۳، اکتوبر ۲۰-۲۶)

منگل سوتر پریم چند کا آخری ناول ہے، بیماری کی حالت میں لکھنا شروع کیا تھا، چار باب لکھنے پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اگر وہ اسے پورا کر سکتے تو گیا گئودان سے زیادہ کامیاب ہوتے، مقالہ نگار نے گئودان سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منگل سوتر گئودان سے زیادہ کامیاب ہوتا اس میں گئودان کی بعض کمزوریاں نہ ہوتیں۔ کیونکہ پریم چند کا ذہنی ارتقا برابر جاری تھا۔

۱۷۲۔ یاسین علی خاں:

داغ کی شاہد پرستیاں

(نگار لکھنؤ ۵۳، جنوری، فروری ۱۱-۴۱)

داغ کے ہاں ملازم رکھی ہوئی گانے والیوں کے سرسری ذکر کے بعد منی جان حجاب سے داغ کے معاشقہ کے آخری دور کا حال جبکہ داغ بوڑھے ہو چکے تھے تفصیل سے پیش کیا ہے۔

۱۷۳۔ یاسین علی خاں:

داغ کی اصلاحیں

(نگار لکھنؤ ۵۳ جنوری، فروری ۱۱۸-۱۱۹)

داغ کے طریقۂ اصلاح کا ذکر کرنے کے بعد آصف ساوس، عبدالصمد صفی، نواب میر حسن علی خاں امیر حیدر آبادی، اکبر علی خاں افسوں اور رشید مقصود حسن حیرت کے اشعار اور ان پر داغ کی اصلاحیں پیش کی ہیں۔

آرٹ

۱۷۴۔ ادارہ:

تاج محل

(آج کل دہلی ۵۳، ستمبر ۵۳)

مقبرہ تاج محل کی تعمیری خصوصیات کا مختصر ذکر

کرنے کے بعد اس کی مرمت کے سلسلہ میں بھارت سرکار کی سعی جمیلہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۷۵۔ امین الرحمٰن ۔ راجہ:

کلاسیت کا مفہوم

(ادب لطیف لاہور، ۵۳، اگست ۷ سے ۱۹)

یونانی ادب اور آرٹ کی تاریخ کو چھ دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن میں سے پانچویں دور کو جو ۵۰۰ سے ۳۰۰ ق م تک پھیلا ہوا تھا کلاسیکی دور کہا جاتا ہے۔ یونانی ادب کا کلاسیکی دور ہومر سے شروع ہو کر سکندر اعظم کی وفات تک پھیلا ہوا ہے۔ مضمون میں قدیم یونانیوں کے ادب اور آرٹ کا تجزیہ کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ وہ ایک ہی قسم کے منطقی قوانین کے تابع تھے جس کی وجہ یونانی تہذیب کی اہم خصوصیت تعقل پسندی ہے۔ مضمون میں کلاسیکی آرٹ کی خصوصیات اور ہمسایہ ملکوں پر اس کے اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور اس کی مقبولیت کی توجیہہ بھی کی گئی ہے۔ کلاسیکی آرٹ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔

۱۷۶۔ عبدالرحمٰن چغتائی:

معمار تاج

(ماہ نو کراچی، ۵۳، اگست ۴۸-۵۶ و ۹۲)

معمار تاج استاد احمد لاہوری اور ان کے خاندان کے حالات کو پیش کیا ہے۔

۱۷۷۔ عبدالرحمٰن چغتائی:

معمار تاج

(۲)

(ماہ نو کراچی، ۵۳ ستمبر ۲۲-۲۶، ۵۰)

استاد احمد معمار لاہوری، معمار تاج کے خاندان سے تعلق رکھنے والے معماروں کی تعمیر کی ہوئی مختلف عمارات کا ذکر کیا ہے اور ان کے فنی کمالات کا جائزہ لیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ محمد امان نثار کی شاعری سے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

۱۷۸۔ عبدالرحمٰن چغتائی:

معمار تاج

(۳)

(ماہ نو کراچی ۵۳، اکتوبر ۴۹-۵۴)

معمار تاج کی تیسری قسط۔ اس میں معمار تاج، معمار لطف اللہ لاہوری کے کمال فن کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ کمال فن معمار لاہوری کے خلوص، شرافت، استقلال، اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔ مضمون میں تاج محل کی تعمیری خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مضمون نگار نے اپنے تاثرات بھی پیش کئے ہیں۔

۱۷۹۔ محمد ایوب قادری:

ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟

روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات

(العلم کراچی، ۵۳، اکتوبر ۱۲-۳۴)

۱۔ اس عنوان کے تحت روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارتوں کا تذکرہ مع ان کی خصوصیات کے بیان کیا ہے (باقی)

معاشرتی حالات

۱۸۰۔ عبدالحمید ۔ پروفیسر:

اشپنگلر کے نظریۂ تمدن پر ایک نظر

(فاران، کراچی ۵۳ ستمبر ۱۱-۱۷)

اسلامی تمدن کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اشپنگلر کے نظریۂ تمدن پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ ہیگل اور مارکس کی طرح اشپنگلر بھی ہر دور کو ایک وجود عضوی سمجھتا ہے جو مقالہ نگار کی نظر میں ایک زبردست غلطی ہے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ قوموں کی قوت ارادی نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اشپنگلر نے تمدن

کی زندگی اور موت میں جبریت کے عنصر کو غالب سمجھتے ہوئے نہ صرف سماج میں قنوطیت کا بیج بویا بلکہ انفرادی زندگی میں ترقی کے سب راستے مسدود کر دئے۔ مضمون میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فرد کو سماج کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہئے۔

۱۸۱۔ قاضی عبدالحمید:

آج انسانیت بیمار ہے

(العلم کراچی ۵۳ء، اکتوبر ۹۔۔۔۱۶)

انسانی تمدن کے تمام شعبوں میں اس وقت ایک قسم کا انتشار پایا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے نئی زندگی کے آثار بھی دکھائے ہیں۔

اقتصادیات

۱۸۲۔ شری رام سرنا:

ترکی کے میوہ جات

(آج کل دہلی ۵۳ء دسمبر ۴۱۔۔۔۴۵)

ترکی کے مختلف میووں اور ان کی کاشت کی کیفیات کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۸۳۔ محمد عثمان خاں:

زمین اور اس کی معدنیات

(العلم کراچی ۵۳ء جولائی ۶۔۔۔۶۴)

زمین سے حاصل شدہ معدنیات کا تذکرہ۔

۱۸۴۔ وحید یوسف زئی:

زمین اور زرخیزی

(سب رس ۵۳ء جولائی ۵۷۔۔۔۶۰)

زمین کی زرخیزی کے سلسلے میں دوسرے ممالک میں جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا تذکرہ۔

تعلیمات

۱۸۵۔ ابوالکلام آزاد:

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

(ہندستانی ادب، حیدرآباد دکن ۵۳ء نومبر ۴)

ہندستان کی قومی تعلیم کا نقشہ کیا ہونا چاہئے کے موضوع پر مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک ریڈیائی تقریر۔

۱۸۶۔ آل احمد سرور:

دہلی کالج

(دلی کالج اردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۸۔۔۔۱۱)

دہلی کالج کے طریقۂ تعلیم، و کارناموں کا ہلکا سا جائزہ۔

۱۸۷۔ خواجہ احمد فاروقی:

دہلی کالج

(دلی کالج اردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۵)

موجودہ نمبر کی خصوصیات بیان کرنے سے پہلے دلی کالج پر تاریخی تبصرہ کیا ہے۔

۱۸۸۔ سعید احمد:

ہمارا مسئلۂ تعلیم

(۲)

(برہان دہلی ۵۳ء دسمبر ۵۔۔۔۱۷)

دوسری قسط۔ اس میں یونیورسٹیوں میں طلبا کی گری ہوئی اخلاقی حالت اور ڈسپلن کی عدم موجودگی کے اسباب تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اور طلباء کی اخلاقی حالت کو سدھارنے اور ان میں ڈسپلن قائم کرنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

۱۸۹۔ قاسم علی سجن لال:

قدیم دہلی کالج کے کچھ حالات ہم عصر اخباروں کی زبانی

(دلی کالج اردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۳۔۔۔۲۰)

قدیم دلی کالج کی تعلیم اور انتظامات وغیرہ پر ہمعصر اخبارون

کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ اخبارات دہلی اُردو اخبار فوائد الناظرین اور قران السعدین وغیرہ ہیں۔ ان سے اقتباسات بھی لئے ہیں۔

۱۹۰۔ گوپی چند نارنگ:

ایک خط

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۱۵۵-۱۵۹)

نیشنل آرکائیوز سے لے کر سید حامد علی خاں جو دلی کالج کے معطی نواب اعتماد الدولہ وزیر اودھ کے دلالہ تھے، اُردو میں انگریزی سے ترجمہ کرکے چھاپا ہے۔ یہ خط گورنر جنرل ہنری لارڈ آکلینڈ کے نام ہے، وراس میں دلی کالج کے نظم و نسق کی خرابیوں اور کوتاہیوں پر اعتراض اور ضروری اصلاح کے لئے التماس ہے۔ گورنر جنرل اس خط کو پاکر برہم ہوا تھا۔ اس کا جواب بھی مع ترجمہ کے درج ہے۔

۱۹۱۔ محمد امین زبیری:

خواتینِ اسلام کی تعلیم قدیم

(العلم کراچی ۵۳ء جولائی ۹-۱۶)

حضرت عائشہ سے لے کر بیگم آف بھوپال تک کی خواتین اسلام کی علمی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۹۲۔ مرزا محمود بیگ:

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۲۸-۱۰)

دلی کالج کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے اس کی تدریجی ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۳۔ ہربنس لال:

قدیم دہلی کالج گارساں دتاسی کی نظر میں

(دلی کالج اُردو میگزین ۵۳ء قدیم دلی کالج نمبر ۷۶-۸۶)

گارساں دتاسی ہر سال کے آخر میں اُردو ادب پر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ ۱۸۵۰ء سے لیکر ۱۸۶۹ء تک کے تبصرے اس کے خطبات میں اور ۱۸۶۱ء سے ۱۸۷۴ء تک "مقالات دتاسی" میں درج ہیں۔ ان میں جگہ جگہ قدیم دلی کالج اور اس کے افراد کا ذکر ملتا ہے۔ مقالہ نگار نے مطبوعہ اجزا کے ترجموں کو اس مضمون میں پیش کیا ہے۔

نفسیات

۱۹۴۔ ظفر احمد صدیقی:

فرائڈ کے نظریۂ تعبیرِ خواب پر ایک تنقیدی نظر

(تہذیب پٹنہ، ۵۴ء جون، جولائی ۲۶-۳۱)

فرائڈ کے نظریۂ تعبیرِ خواب کی تردید۔ مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فرائڈ کے نظریات سائنسی صداقت کے درجہ کو نہیں پہنچتے۔ اس کے یہاں اکثر سائنس کے بھیس میں بہت سے غیر یقینی مفروضات اور توہمات چھپے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کے نظریات کی بنیاد بے شمار مفروضوں پر قائم ہے جو بذات خود محتاج جواز ہوتے ہیں۔ اس کے اصول دور از کار ہیں۔ اس کے تجزیہ خواب کے اصول اتنے پُر فریب ہیں کہ ان کی مدد سے آپ ہر خواب میں جنسی رُجحانات دریافت کر سکتے ہیں اور کسی کا خواب لے کر (جیسا کہ مقالہ نگار نے تجربہ کیا تھا) اس کو کسی دوسرے کے سر منڈھ سکتے ہیں۔ مضمون میں فرائڈ کی بیان کردہ چند خواب کی تعبیریں پیش کر کے ان کی تکذیب کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۹۵۔ مسیح الزماں:

احساسِ کمتری کا ایک رُخ جھینپ

(آج کل، دہلی ۵۳ء، اکتوبر ۳۴-۳۷)

انسان مزاج کے اعتبار سے خارجی اور داخلی ہوتے ہیں۔ خارجی مزاج والوں میں جو مجمع کو پسند کرتے ہیں جھینپ نہیں ہوتی۔ بلکہ جھینپ صرف داخلی مزاج والوں میں ہوتی ہے لیکن پھر بھی ہر داخلی آدمی جھینپو نہیں ہوتا۔ جھینپ احساسِ کمتری کا ایک رُخ ہے جسے تنہا پسندی اور زیادہ شدید کر دیتی ہے۔ مضمون میں جھینپ مٹانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔

نسائیات

۱۹۶۔ متین طارق :

عورتوں کے لئے لمحۂ فکریہ

(معیار پٹنہ۔ ۵۳ نومبر ۲۲ — ۲۷)

تحریک آزادی نسواں کی بینہ خرابیوں اور یونان و یورپ میں اس تحریک کی ناکامی کا جائزہ لینے کے بعد یہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عورت کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ وہ ماں ہو اور اپنے بچوں کی تربیت میں لگی رہے تاکہ معاشرتی نظام تدریجی نشو ونما پائے اسلام نے جو عورت کا درجہ متعین کیا ہے مضمون میں اس کی صراحت کی گئی اور اُسے سراہا گیا ہے۔

۱۹۷۔ سید مصطفےٰ علی بریلوی:

بی بی صاحبہ بنگش

(العلم کراچی ، ۵۳ جولائی ، ۱۷—۲۳)

نواب احمد خاں بنگش کی بیگم کے حالات وغیرہ درج ہیں۔

متفرقات

۱۹۸۔ ا۔ا :

جسم انسانی کی نشو ونما کیلئے معدنیات کی اہمیت

(ہندستانی ادب حیدر آباد (دکن) ۵۳ اگست ۲۱-۲۲)

چند ایک معدنیات جسم انسانی کی نشو ونما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ یہ بتایا ہے کہ وہ معدنیات کن کن غذاؤں سے مل سکتی ہیں۔

۱۹۹۔ اقبال صدیقی :

منڈا زبان پر ایک طائرانہ نظر

(آج کل دہلی ۵۳ ستمبر ، ۴۶—۴۸)

چھوٹا ناگ پور کی غریب آدیباسی کی ممتاز ترین شاخ مُنڈا قوم کے حسب [illegible] سے متعلق دو نظریے پیش کرنے کے بعد منڈاؤں کی زبان کی خصوصیات اور غیر ملکی زبانوں اور سنسکرت کے اثرات کا ذکر کرنے کے بعد منڈا ادب کا جائزہ لیا ہے اور اس زبان کے دو گیت مع ترجمہ پیش کئے ہیں۔

۲۰۰۔ الطاف گوہر:

بنگلا زبان ایک تاریخی جائزہ

(ماہ نو کراچی ، دسمبر ۵۳)

بنگال میں مسلمان حکمرانوں کے اقتدار کے مختلف ادوار میں وہاں کی معاشرت و زبان پر کیا اثر پڑا اور پھر بنگلا۔ فارسی، عربی سے کس طرح متاثر ہوئی۔ وضاحت کرنے کے بعد پھر عیسائی مشنریوں سے لے کر بنکم چیٹرجی کے دور تک بنگلا کو سنسکرت آمیز روپ میں پیش کرنے کی کوششوں کی وضاحت کی ہے۔

۲۰۱۔ ایم، اے رحیم :

رومن رسم الخط میں مسلم ناموں کو صحت کے ساتھ لکھنے کی معیار بندی

(العلم کراچی ۵۳ جولائی ، ۴۱— ۴۵)

مسلم ناموں کو صحیح طور پر رومن رسم الخط میں لکھنے کی ضروری صورتیں بتائی ہیں۔

۲۰۲۔ پشپ پرتھوی ناتھ :

جدید کشمیری شاعری

(آج کل دہلی (شعر و شاعری) ۵۳، اگست ۲۴-۲۰)

جدید کشمیری شاعری نوعمر ہوتے ہوئے بھی آج ہندستان کی کسی بھی زبان کی جدید شاعری کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔

کشمیر کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے ، پہلا دور ۱۸۳۰ء سے پہلے، دوسرا ۱۹۴۷ء تک ، تیسرا ۱۹۴۷ء کے بعد۔

کشمیر کے چند شعرا اور ان کے کلام کا اُردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۰۳۔ دردائی۔ معین الدین:

بودھ مت کے عہد میں بنگالی زبان و ادب

(تہذیب، پٹنہ ۵۲ جون، جولائی ۱۲ — ۱۵)

بودھ مت کے دور میں بنگالی زبان و ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ڈکارناوا، ڈاک بچن، اور کھنار بچن کا مختصر تعارف پیش کرنے کے بعد سوتیا وادا اور رہاجیا مسلک پر لکھی ہوئی کتابوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

۲۰۴۔ دُگل کرتار سنگھ۔

نئی پنجابی شاعری

(آج کل دہلی (شعر و شاعری نمبر) ۵۲ اگست ۹)

پنجابی شاعری کی ابتدائی تاریخ اور قدیم شعرا، شیخ فرید شکر گنج گورو نانک وغیرہ کے مختصر تذکروں کے بعد نئی پنجابی شاعری کے سب سے پہلے شاعر بھائی ویر سنگھ اور ان کے بعد کے شعرا کے تذکرے اور ان کی خدمات اور ان کی شاعری کے چند نمونے اردو میں پیش کئے گئے ہیں۔

۲۰۵۔ دنکر رام دھاری سنگھ:

ہندی شاعری میں تحریک اتحاد

(آج کل دہلی ۵۳ نومبر ۱۱ — ۸)

پروفیسر دنکر کے ہندی مضمون جو آج کل ہندی میں چھپا اس کا ترجمہ ہے۔ مضمون نگار نے اُن ہندی شعرا کے حساسات و خیالات اور شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی ساری قوموں کے اتحاد ہی سے ہندوستان اور سارے ہندوستانی آزادی خوش حالی اور ترقی کے زینے پر چڑھ سکتے ہیں۔

۲۰۶۔ ڈ۔ جیرو:

برطانوی اسکولوں میں فلموں کے متعلق تعلیم

(ہندوستانی ادب حیدر آباد دکن ۵۳ اگست ۲۰ — ۲۱)

برطانوی اسکولوں میں فلموں کے متعلق دلچسپی نہ صرف لی جاتی بلکہ ان پر تنقید و تبصرہ بھی ہوتا ہے اور بعض اسکولوں نے اپنے اپنے نصاب میں "فلموں کی جانچ کے مضمون" کو بھی داخل کرلیا ہے۔ اور یہ سرگرمی بڑھتی ہی جارہی ہے۔

۲۰۷۔ ڈی۔ ال۔ دت:

نیشنل لائبریری آف انڈیا

(ہندوستانی ادب حیدرآباد دکن ۵۳ اگست ۱۶ — ۱۷)

کلکتے کی نیشنل لائبریری آف انڈیا کی خصوصیات کا ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا ہے۔

۲۰۸۔ رہبر ہنس راج:

ہندی شاعری میں جدید رجحانات

(آج کل دہلی (شعر و شاعری نمبر) ۵۳ اگست ۲۱ — ۲۵)

اُردو شاعری کی طرح ہندی شاعری کا نیا دور ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے۔ ہندی شاعری کو چار ادوار پر تقسیم کیا گیا ہے (۱) بھارتیندو جگ، (۲) دوی ویدی جگ (۳) پرساد جگ اور (۴) پرگتی شیل جگ یعنی ترقی پسند۔ پھر ان چار ادوار کے شعرا۔ ان کے خیالات، و جذبات بدلتے ہوئے زمانہ کے ساتھ ان کے انداز فکر اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری کے انتخابات پیش کئے گئے ہیں۔

۲۰۹۔ ستیارتھی دیویندر:

نئی ہندی شاعری

(آج کل دہلی (شعر و شاعری نمبر) ۵۳ اگست ۱۱ — ۱۷)

بیسویں صدی کا آغاز ہندی شاعری کی ایک نئی تاریخ سے ہوا۔ اس دور کے شاعروں اور ادیبوں نے نثر اور شعر کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی اس سلسلہ میں میتھلی شرن گپت کو بہت شہرت حاصل ہوئی دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۵ء تک کا ہے۔

اس سلسلہ میں مختلف شعرا کے نام اور کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔

۲۱۰۔ شیر جنگ:

جان ولف گانگ گوئٹے

(آج کل دہلی ۵۳ دسمبر ۱۶ — ۲۴)

گوئٹے کی شاعری اور ادب پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

۲۱۱۔ فکر تونسوی:

ایک عوامی صنف سخن

(تہذیب پٹنہ، ۵۳، اکتوبر ۲۱ — ۲۵)

پنجابی شاعری کی ایک صنف سخن "بولی" کے اشعار پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ ان میں ہماگیر دارانہ کلچر اور سامراجی استحصال سے کسان کی رومانی اور جذباتی زندگی میں پیدا ہونے والے اضطراب کی صحیح عکاسی ملتی ہے، یہ بولیاں کسی ایک مخصوص شاعر کی کہی ہوئی نہیں ہوتیں۔ بلکہ عہد بعہد جنم لیتی، پروان چڑھتی اور آگے بڑھتی ہوئی پنجاب کے ایک ایک گاؤں میں پھیل جاتی ہیں۔ پنجابی بولی دو مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے دونوں مصرعوں کے ہم وزن وہم قافیہ ہونے کی قید نہیں ہوتی کبھی کبھی مصرعہ اولیٰ کم ارکان کا اور مصرع ثانی زیادہ ارکان کا ہوتا ہے۔

۲۱۲۔ کرشنا راؤ گوپال۔ کے۔

نئے دور میں جدید تلنگی شاعری

(آج کل دہلی (شعر و شاعری نمبر) ۵۳، اگست ۴۲-۴۴)

تلنگی ادب میں گیارہویں صدی سے بیسویں صدی تک شاعری نے مختلف رنگ و ادب میں نشو و نما پائی تلنگی شاعری میں اٹھارھویں اور بیسویں صدی ایک تاریک دور ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے نیا دور شروع ہوتا ہے اور اس نئی زندگی کے بانی ویریشلنگم اور ترویتی کولو ہیں۔ موجودہ دور تک تلنگی شاعری میں بھی دوسرے ترقی پسند شاعر ہوئے جن کے نام اور ان کی شاعری کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۲۱۳۔ کینرک ہکسن:

بچوں کے لئے فلمیں

(معارف اعظم گڑھ ۵۳ نومبر ۲۷ — ۲۸)

بچوں کے لئے فلموں کی ضرورت اور انگلستان میں اس سلسلے کے ہونیوالے کاموں کا ذکر۔ (ترجمہ)

۲۱۴۔ محمد عثمان۔ رمز:

فلسفۂ قنوطیت

(معیار پٹنہ، ۵۳ نومبر ۱۶ — ۲۱)

برہمنیت و بدھ مت میں دنیا کو سراب بتاکر یا اسے رنج و غم کا گہوارہ سمجھ کر ترک دنیا کی تعلیم دینے والے قنوطی فلسفوں کی بینہ خامیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے ساتھ ہی ساتھ شوپن ہار، اور عیسائی مفکروں کے قنوطیت زا فلسفوں کی بینہ خامیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شوپن ہار اور عیسائی مفکروں کے قنوطیت زا فلسفوں کا جائزہ لینے اور اردو شاعری میں قنوطیت پسندی کے داخلہ کی توجیہہ اور اردو شاعری سے اس قبیل کے اشعار پیش کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دنیا کو فریب یا مایا سمجھنا، من گھڑت فلسفہ کے علاوہ کچھ نہیں۔ آخر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سلسلہ میں اسلامی نظریہ صالح اور صحت مند ہے جو دنیا کو آخرت کی کھیتی اور انسان کو خلیفہ کہتا ہے۔ یہ نظریہ نہ تو برہمنیت، بدھ مت، اور تصوف و رہبانیت کی طرح تج عزلت کا درس دیتا ہے اور نہ عملی جد و جہد کو مادیت پرستوں کی طرح اسی دنیا تک محدود کرتا ہے۔ اسلام قنوطیت کی جڑ کاٹتا اور انسان میں رجائیت پیدا کرتا ہے۔

۲۱۵۔ محمد عثمان خاں۔

دنیا کے مشہور کوہ آتش فشاں

(العلم کراچی ۵۳، اکتوبر ۴۴ — ۵۳)

دنیا کے مشہور آتش فشاں پہاڑوں کی کیفیات بیان کی ہیں۔

۲۱۶- یوسیس:

ماں کی بائبل

(ہندستانی ادب حیدر آباد دکن، ۵۲، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

امریکہ کے ایک ادارہ نے بچوں کی تربیت پر ایک کتاب "انفنٹ کیر" کے نام سے ۱۹۱۴ء میں شائع کی تھی جو اپنی معلومات کی وجہ سے امریکہ میں اتنی مقبول ہوئی کہ اسے ماں کی بائبل سمجھا جاتا ہے۔ اس کتاب کے آٹھ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور جدید ترین ایڈیشن میں بچوں کی پرورش کے متعلق جدید ترین معلومات شامل کی گئی ہیں۔ مضمون میں اس کتاب کا مختصر تعارف ہے۔

تبصرے

۲۱۷- ادارہ:

(آج کل دہلی، ۳۰ نومبر، ۵۸-۵۵)

احوال غالب

مُرتبہ مختارالدین آرزو۔ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت ۹ رُوپے۔

ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اُردو (ہند)، علی گڑھ۔

آفتاب تازہ

سکندر علی وجد کا مجموعۂ کلام، کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت ۴ رُوپے۔

چیتنا پرکاش لمیٹڈ، بیگم بازار، حیدر آباد

وجد

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے وجد کے نام سے سکندر علی وجد کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا ہے، ٹائپ میں چھپا ہے، کاغذ نہایت اچھا ہے، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

کیف الم

بسمل سعیدی ٹونکی کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے، جس میں ۲۰۰ صفحے، کتابت و طباعت اچھی، قیمت للعہ

شکست زنداں

مُرتب غلام ربانی تاباں۔ ناشر۔ انڈین لٹریچر سوسائٹی جامعہ نگر دہلی۔ قیمت فی جلد تین رُوپے۔ ایشیائی ممالک کی آزادی جدوجہد سے متعلق مختلف شعرا کی نظموں کا یہ مجموعہ ہے

آہٹیں

نریش کمار شاد کے کلام کا پانچواں مجموعۂ کلام۔ قیمت سوا دو رُوپے۔

ناشر۔ رسالہ بیسویں صدی دہلی،

مادۂ مخمور

مخمور دہلوی کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر۔ کتب خانہ رحیمیہ اُردو بازار دہلی۔ ۲۲۴ صفحات۔ کاغذ کتابت عمدہ۔ قیمت ۳ رُوپے۔

مرقع افکار

طالب کاشمیری کے کلام کا مجموعہ۔ ناشر اتحاد نظامی بک ایجنسی بدایوں۔ قیمت۔ دو روپے۔

رقص بسمل ۲/۱۲

دودھ اور خون ۲/-

صدیقہ بیگم سیوہاردی کے افسانوں کا مجموعہ۔ ناشر آزاد کتاب گھر دہلی۔ کتابیں حسن ظاہری و باطنی کی دولت سے مالا مال ہیں۔

تنقیدی آئینے

پروفیسر بشیر علی صدیقی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ، ناشر سلیم بشیر علی۔ محلہ سوتھ بدایوں۔

قیمت: ایک روپیہ آٹھ آنے۔

۲۱۸- ادارہ:

دُنیا کی انعامی کہانیاں ۵۱-۱۹۵۰ء

(چراغ راہ، کراچی ۳-۵، اگست ۴۶-۴۸)

یہ مجموعہ دُنیا کے پانچ ملکوں کے بائیس ججوں کا متفقہ انتخاب ہے۔ چونکہ انتخاب ہر ملک کے ادب سے کیا گیا

اس لئے یہ سارے موجودہ ادب کے ادبی رجحانات کا صحیح عکس سمجھا جاسکتا ہے۔ تاہم ان کہانیوں میں زندگی کا واضح تصور نہیں آرٹ کا نمونہ بھی ناقابل قبول ہے۔ ساری کہانیوں پر ابہام کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ (مطبوعہ۔ اردو پریس، الہ آباد)

۲۱۹۔ افقر موہانی:

ناشاد کانپوری

(ہندستانی ادب ۵۳، اکتوبر ۱۶ — ۱۸)

بابو سری دھر پرشاد نگم (ایم اے ڈپٹی کلکٹر بارہ بنکی المعروف بہ ناشاد کانپوری کے مجموعۂ کلام "کیف سرمدی" پر تبصرہ بقول تبصرہ نگار، ناشاد کے کلام میں جاذبیت و دلکشی نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے اور انداز بیان بہت کچھ دوسروں سے علیحدہ اور نادر ہے۔ مضمون میں ناشاد کے اشعار بھی بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔

۲۳۰۔ س:

تنقید اور عملی تنقید

(برہان دہلی ۵۵، ستمبر ۱۹۱ — ۱۹۲)

یہ سید احتشام حسین صاحب کی چند تنقیدوں کا مجموعہ ہے۔ موصوف مغربی اصول تنقید کے ماننے اور برتنے والے ہیں۔ ترقی پسندی، اعتدال پسندی اور منصفانہ صلاحیت تنقید کے اعتبار سے نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ اپنے محسوسات کو صاف اور واضح و دلنشیں انداز کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ "غالب کا تفکر"۔ "اقبال کی رجائیت" "اکبر کا ذہن"۔ "حسرت کی غزلوں میں نشاطیہ عنصر"۔ "سرشار کا رنگ سخن" بہت اہم اور مفید ہیں۔

دوسرے مضامین بھی لائق مطالعہ ہیں۔ تقطیع متوسط۔ کتابت و طباعت اعلیٰ۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔

قیمت مجلد معہ گرد پوش، تین روپے بارہ آنے، پتہ:۔ آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل۔ دہلی۔

۲۲۱۔ سعید احمد:

مختصر سیرت قرآنیہ

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(برہان دہلی ۵۳ ستمبر ۱۸۳ — ۱۸۹)

نفس اسلام کا جو مفہوم قرآن سے مستنبط ہوتا ہے وہی احادیث میں بھی ملتا ہے۔ اس گفتگو کے بر تعامل امت کے عنوان کو پیش کیا ہے۔

۲۲۲۔ سعید احمد:

مختصر سیرت قرآنیہ

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(برہان دہلی ۵۳ جولائی ۵۔۔۔)

۲۔ تبصرہ کی دوسری قسط۔

۲۲۳۔ سعید احمد:

مختصر سیرت قرآنیہ

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(مسلسل ۵)

(برہان دہلی ۵۲، اکتوبر ۲۴۰ — ۲۴۳)

پروفیسر احسن صاحب نے اپنی کتاب مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمدؐ میں جمہور اسلام کے خلاف اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایک یہ بات کہ قرآن مجید اب تک نزول کے مطابق مدون نہیں کیا گیا اس وجہ سے قرآن کو صحیح طور پر سمجھا بھی نہیں گیا۔ ناقد کے خیال میں یہ بات صحیح نہیں۔ اس کے ثبوت میں احادیث و روایات سے پروفیسر صاحب کے خیال کی تردید کی گئی ہے۔

خط و کتابت کا پتہ

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲ دادا بھائی نوروزجی روڈ بمبئی ۱

ناشر:۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی

مطبع۔ رحمن پرنٹرس بلڈنگ جی جی ہسپتال بمبئی

Vol. 5] [illegible] 1954 [No. 2

NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY JOURNAL

OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Published Every

JANUARY & APRIL
JULY & OCTOBER

Annual Subscription
Inland & Pakistan:
Rs. 3/- postage extra.

Foreign:
Shilling 8

Price each Copy:
Re. 1/-

All remittances to be made to:

The Writers' Emporium Limited.

PEOPLES' BUILDING, SIR PHIROZSHAH MEHTA ROAD, BOMBAY 1.

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ماہ جولائی ۱۹۵۴ء

جلد ۵ شمارہ ۳

چندہ سالانہ تین روپے } علاوہ محصول ڈاک
ششماہی دو روپے

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

فہرست مضامین

شذرات

گذشتہ سہ ماہی اُردو دوست اصحاب کے لئے بڑی حد تک ایک مسرت بخش، ہمت زا اور اُمید افزا سہ ماہی تھی، اس سہ ماہی میں ملک کے مختلف علاقوں میں، اُردو کی حفاظت، ترقی اور توسیع کے سلسلہ میں مختلف اجتماع ہوئے، اِن اجتماعوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ہر فرقہ، ہر جماعت اور ہر نقطۂ خیال کے لوگوں نے شرکت کی، اس حیثیت سے حیدرآباد کی کانفرنس سب سے اہم تھی، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہندی ادبیات سے متعلق کام کرنے والے ذمہ دار لوگوں نے عملی حصہ لیا، اس کے علاوہ اس کے مختلف اجلاس، مختلف مفید و تعمیری مضامین کیلئے وقف تھے، یہ تو کانفرنس کی ظاہری افادیت تھی، لیکن اس کا سب سے دل خوش کن پہلو یہ ہے کہ وہاں کے اُردو ہندی کے محققوں نے یہ طے کیا ہے کہ جس طرح اس وقت تک قدیم دکنی شعراء کا کلام فارسی رسم الخط میں شائع کیا گیا ہے اسی طرح یہ تمام دکنی ذخیرہ ہندی میں بھی منتقل کر دیا جائے، جس کے لئے ان کو حکومت کی مدد بھی مل گئی ہے اور کام بھی شروع کر دیا گیا، خدا کرے یہ کام اُردو اور ہندی دونوں کے قریب کرنے میں کامیاب ثابت ہو۔ اسی طرح کا ایک علمی و ادبی اجتماع مدراس میں بھی اُردو سیمینار کے نام سے ہوا، اور اس نے نہ صرف مدراس شہر بلکہ اس کے مختلف حصوں میں اُردو سے متعلق ایک نئی حیات بخش تحریک شروع کر دی ہے، اور اس کا ایک بڑا ثبوت کرنول کا وہ اجتماع ہے جس میں نہ صرف صوبہ کے لوگوں نے شرکت کی بلکہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور دوسرے رہنماؤں نے بھی اپنی موجودگی سے اس کی کامیابی کو یقینی بنا دیا، صوبہ مدراس میں اُردو کی یہ ترقی و توسیع بڑی حد تک ہمارے محترم و مخدوم ڈاکٹر عبدالحق صاحب (افضل العلماء) کی بے غرضانہ کوششوں کا نتیجہ ہے، اللہ پاک ان کو تادیر ملک و قوم کیلئے سلامت رکھے، ہم بہت سے لوگوں کو علم ہے کہ ان کی اور صرف ان کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ مدراس کے علاقہ میں کم از کم ایسے نصف درجن تعلیمی ادارے اور کالج ہیں جہاں اُردو کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی ہے، انیسویں صدی کی ابتداء میں اُردو ادب کی نشر و اشاعت میں جہاں کلکتہ اور اس کے فورٹ ولیم کالج نے بڑی خدمت انجام دی ہے، وہیں مدراس اور اس کے فورٹ سینٹ جارج نے بھی بڑی حد تک دکنی ادب کی حفاظت و اشاعت میں کچھ کم کام نہیں کیا ہے، اور جہاں تک اُردو زبان و ادب کا تعلق ہے مدراس بنگال سے بہت زیادہ ستائش کا مستحق ہے، ہم کو اُمید ہے کہ مدراس ایک مرتبہ پھر اُردو کی خدمت میں تمام صوبوں کے لئے ایک مثال ثابت ہوگا، اسی سلسلہ کی ایک خبر یہ بھی ہے کہ اترپردیش کی حکومت نے جو اُردو زبان کے سلسلے میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہے اعلان کیا ہے کہ آئندہ سے وہ اُردو تصانیف پر بھی انعام دیا کرے گی، البتہ شرط یہ ہے کہ لکھنے والا اسی پردیش میں ہو اور کتاب اسی پردیش میں شائع کی گئی ہو، ہندستانی اکیڈمی کے متعلق بھی اس کے رویہ میں کافی تبدیلی ہوگئی ہے، خدا کرے یہ لطف و کرم دیرپا ثابت ہو، اگر حکومت ابتداء ہی سے یہ رویہ اختیار کرتی تو شاید دستخطوں کی مہم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت نے ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں اُردو کو جو جگہ دی ہے وہ اس کو جلد یا بدیر ختم کرنے کی ضامن ہے، اُردو صرف انگریزی کے بدلے لی جا سکتی ہے، اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب ہر لڑکا ہندی سنسکرت وغیرہ لازمی پڑھے گا تو اس کے ساتھ ابھی چند برسوں تک تو انگریزی ہی کو ترجیح دے گا، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جب تک انگریزی نصاب سے خارج نہ ہو جائے اُردو کیلئے کوئی جگہ نکل ہی نہیں سکتی اور اس کی براہ راست اثر کالج کی پڑھائی پر پڑے گا۔

اُترپردیش کے لوگوں کی ذہنیت کا ایک دوسرا ثبوت وہ رویہ ہے جو وہاں کے چوٹی کے بعض نیتاؤں اور دوداؤں نے دارالمصنفین کے سلسلہ میں اختیار کر رکھا ہے، لوگ سمجھا دینا ہے کر پریاگ اور کاشی کی پوتر بھومی تک کو یہ دیکھنا

طرح بھی گوارہ نہیں کہ دارالمصنفین یا اس قسم کے کسی ادارہ کو بھی جو تقریباً چالیس سال سے علم و ادب کی خدمت ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ قوم پرستی اور تحریک آزادی کا ایک بڑا مرکز رہا ہے حقیر سے حقیر بھی مالی امداد دی جائے۔ اس علمی و ادبی ادارہ کے خلاف الزامات کی لمبی لمبی فہرستیں شائع کی جا رہی ہیں، اور اس کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش ہو رہی ہے بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اب اتر پردیش کی مجلس مقننہ کے ایک رکن نے تو انجمن ترقی اردو کو بھی خالص فرقہ وارانہ جماعت ہونے کا اعلان کر دیا ہے سوچنا یہ ہے کہ آخر ہم کس طرف جا رہے ہیں اور اس کا انجام کیا ہوگا۔

اس قسم کی تحریکوں کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ اردو والوں کو اپنا حق ثابت کرنے کیلئے عملی ثبوت مہیا کرنا پڑتا ہے چنانچہ بہار کے اردو بولنے والوں نے بھی اپنے صوبہ میں حکومت کی طرف سے اردو کے ساتھ غیر ہمدردانہ رویہ دیکھ کر دستخطوں کی مہم شروع کی تھی اور بہت ہی کم عرصہ میں انھوں نے دس لاکھ دستخط جمع کر لئے، اس سلسلہ میں جون کے آخری ہفتہ میں ایک کنونشن بھی منعقد ہوا تھا، خدا کرے بہار کی یہ سعی مشکور ہو، اسی سلسلہ کی ایک کڑی بہار یونی ورسٹی کی اردو سے غفلت ہے، پٹنہ کے علاوہ سارے صوبہ کے کالجوں کا الحاق بہار یونی ورسٹی سے ہے لیکن اردو ایم، اے وغیرہ کی تعلیم کیلئے شاید ہی ایک آدھ جگہ کوئی انتظام ہو، کیا یونی ورسٹی اس طرف توجہ کرے گی؟۔

گزشتہ سہ ماہی میں ہمارے دو قدیم اردو دوست بزرگواروں کا انتقال ہو گیا۔ ان میں سے ایک جناب باقر علی تھے، جنھوں نے اپنی تمام عمر صوبے میں اردو کے ابتدائی مدارس قائم کرنے میں صرف کی اور وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی اردو کی خاموش علمی ادبی خدمت کرتے رہے، وہ مرہٹی اور دوسری زبانوں پر بھی کافی عبور رکھتے تھے۔ جناب باقر علی مرحوم اگر ابتدائی تعلیم سے متعلق تھے تو جناب خان بہادر ہدایت اللہ ثانوی تعلیم کے سلسلہ میں صوبہ میں سب سے اونچے مقام کے مالک تھے۔ وہ علی گڈھ کے ایک پرانے طالب علم تھے اور اپنے ساتھ سرسیدؒ کی ساری تعلیمی روایات لائے تھے انھوں نے تقریباً چالیس سال تک اردو کے ذریعہ ثانوی تعلیم کا کامیاب تجربہ کر کے سارے صوبہ میں اردو کے ثانوی مدارس کے قیام کا راستہ صاف کر دیا، اور آج پونہ میں جتنی بھی اردو ادب و تعلیم سے متعلق زندگی ہے وہ انھیں کی مرہون منت ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے ان کا رتبہ بہت بلند تھا، یہ ہمارے کاروان رفتہ کے دو آخری مسافر تھے، اب اس صوبہ میں کوئی بھی اس تجربہ کا نہیں رہا۔ خداوند تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ اور ہم کو ان کی اردو کے سلسلہ میں بے غرضانہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

نوائے ادب کے ابتدائی دور میں اس کی پالیسی مستقل طور سے متعین نہیں ہوئی تھی اور اسی لئے اس میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب کے سلسلے میں بھی بعض مضامین شائع ہوئے تھے لیکن جب بورڈ بنایا گیا تو اس نے طے یہ کیا کہ نوائے ادب کو صرف اردو کے تحقیقاتی مضامین تک محدود رکھا جائے، اس لئے آئندہ اس رسالہ میں کسی ایسے موضوع پر جس کا تعلق اردو سے نہ ہو، کوئی مضمون شائع نہ ہو سکے گا۔ البتہ اس شمارہ میں احمد آباد کے فارسی شاعر جلالی احمد آبادی کے سلسلہ میں ایک مضمون شائع ہو رہا ہے اور وہ اس لئے کہ اس کی پہلی دو قسطیں مندرجہ فیصلے کے پہلے شائع ہو چکی ہیں۔

کچھ عرصہ سے ہماری زبان یعنی اردو کو دیوناگری خط میں لکھے جانے سے متعلق ایک بحث چھڑی ہوئی ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہر زبان ہر رسم الخط میں کسی نہ کسی صحیح طور سے لکھی جا سکتی ہے، لیکن یہاں صرف ایک سوال یہ ہے کہ ہندی و اردو کی ہیئت کو دیکھنے کے بعد اگر اردو کو ہندی حروف میں لکھا گیا تو اس کا کیا نام ہوگا۔ کیونکہ ہمارے خیال میں اردو ہندوستان کی مشترک زبان کو فارسی رسم الخط میں لکھنے کا آخری نام ہے۔ ورنہ غالب تک اپنے دیوان کو ڈھائی جز کا ہندی کا دیوان ہی کہتے تھے۔ اس مشترک زبان کو فارسی خط میں لکھنے کا آغاز اسی اصول پر ہوا جس اصول پر ترکی نے عربی کو چھوڑ کر رومن خط اختیار کر لیا ہے کہ اس سے وہ اپنے ہمسایوں سے قریب تر ہو جاتا ہو، اسی طرح فارسی رسم الخط کو ہندوستان میں بھی یہ کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستان کے مغرب اور جنوب مشرق کے لوگوں سے قریب تر ہو جائے اور ایشیا کے ... دوسرے سے قریب ہو رہا ہے اور ہندوستان ایشیا و افریقہ کی رہنمائی کا دعویدار ہے، یہ مناسب ہے کہ یہاں کی زبان کو ... زیادہ سے زیادہ لکھا جائے۔ اگر آج یہ تجویز مان لی گئی تو اردو کوئی زبان ہی نہیں رہ جاتی۔

گجرات کی مثنویاں

(از ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی ایم۔اے،پی۔ایچ۔ڈی)

گجرات کی مثنویوں کے سلسلہ میں ہم تیرھویں صدی تک کی مذہبی اور اخلاقی مثنویوں کے متعلق عرض کرچکے ہیں۔اس نوع کی مثنویوں کے باب کو بند کرنے سے پہلے گیارھویں بارھویں تیرھویں اور چودھویں صدی کی چند تازہ دریافت شدہ مثنویوں کی بھی صراحت کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ان کے علاوہ کئی اور مثنویاں ہوں گی جو ابھی ہماری دسترس سے باہر ہیں۔آئندہ گجرات کی بزمیہ اور رزمیہ مثنویوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

عبدالملک بھروچی

عبدالملک گجرات کے شہر بھروچ کا باشندہ تھا۔اس کے حالات کہیں نہیں پائے جاتے صرف اس کی مثنویوں سے اس کے وطن اور زمانۂ حیات پر روشنی پڑتی ہے۔یہ گیارھویں صدی ہجری کے اواخر کا شاعر ہے۔اس کی تین مثنویاں ملی ہیں۔(۱) مولود نامہ دوسری تین سو اڑتیس شعر کی مثنوی وفات نامہ رسولؐ بمبئی یونی ورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے اور تیسری مثنوی شیخ عبدالقادر محی الدین جیلانی کی مدح سے متعلق ہے۔مدح محبوب سبحانی اور مولود نامہ کی نشان دہی ڈاکٹر محی الدین زور نے اُردو مخطوطات میں کی ہے۔زور صاحب کا بیان ہے کہ "یہ ڈھائی سو اشعار کی ایک مثنوی ہے جس میں آنحضرت پیغمبر اسلام کی ولادت کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔مصنف کا بیان ہے کہ اس کا ماخذ احادیث نبوی ہیں[1] وغیرہ زور صاحب نے آخری تین اشعار بھی درج کئے ہیں"۔

عاجز غریب عبدالملک لیا یا محمد سوں پناہ — بخشے الٰہی توں اسے تیرے کرم سوں سب گناہ
میرا بھروچ ہے گاوطن جس جاگہ احمد کاٹ لیں — بھولوں کے کمیں جنگل منے اکثر ملیں وے باٹ لیں
نوا سے ہزار اوپر لکھی تاریخی ہجرت کی جدہاں — اس سال اسے مولود میں لکھ کرسنائی جگ جہاں

آخری شعر سے زور صاحب نے ۱۰۰۹ھ نکالا ہے لیکن یہ ۱۰۰۹ھ نہیں ہے بلکہ

[1] اُردو مخطوطات جلد اوّل ص ۲۳

[redacted]

۱۰۹۰ھ ہونا چاہئے۔ قصے کو نوآے لکھا ہے اس کی تصدیق اس شاعر کی دوسری مثنوی وفات نامہ سے ہوتی ہے۔ وفات نامہ میں سنہ تصنیف اور وطن کے متعلق مندرجہ ذیل اشعار ہیں:۔

غریب امیدوار عاجز بھڑوچی ان کی رحمت کا — کہیں عبدالملک عاجز خدا ساروں کوں بخشے گا
وطن مدت سوں وہ میرا بھڑوچ اس نربدا اوپر — ولیکن ہوں سو میں سیّاح رہتا ہوں اس جہاں بھیتر
ہزار گئے تھیں نی ستاسیں محمدؐ کی سو ہجرت کے — لکھے تھیں تب سو یہ احوال میں نے اس محمدؐ کے

آخری شعر سے سنہ تصنیف ۱۰۸۷ھ نکلتا ہے۔ لہٰذا شاعر کا ایک مثنوی ۱۰۹۰ھ میں اور دوسری ۸۷ سال کے بعد لکھنا بعید از قیاس ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس نے وفات نامہ ۱۰۸۷ھ میں لکھا اور اس کے تین سال کے بعد مولود نامہ بھی نظم کر ڈالا۔

مولود نامہ کے ابتدائی چند شعر یہ ہیں۔

یا الٰہی شکر تیرا کس زباں سوں ہوں کروں — توں خدا صاحب سبھوں کا حکم تیرے میں رہوں
تیں کیا پیدا محمدؐ جس نبی سوں (دیں) سب ہوا — عرش کرسی لوح تینوں اور قلم چوتھا کیا
توں خدا خالق زمیں اور آسماں کا بالیقیں — تیں فرشتے آدمی پیدا کیا دنیا و دیں[51]

مثنوی در مدح محبوب سلطانی تقریباً پچاس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے ابتدائی اور آخری اشعار یہ ہیں:۔

محی الدّین سلطان قادر اہے — تجکوں جاں کرے یاد حاضر اہے
محی الدّین ساچا توں سلطان اہے — دیون ہار توں دان ایمان لہے

جو اس کی طرف سوں ہوا منبع عیاں — دو میم کا گنج ہیرا کیا ہو بیاں
سو عبد الملک عبد بندہ مکیں — حقیقت خداوند سوں ...... (کرم خوردہ)[52]

شاعر تخلص کی جگہ اپنا پورا نام لاتا ہے۔ پہلی مثنوی میں لفظ عاجز اور تیسری میں عبد بندہ وغیرہ محض عجز و انکسار کے خیال سے استعمال کیا ہے۔

محمد شفیع ۔ قصۂ بی بی ارواح

محمد شفیع نام کا ایک شاعر ۱۱۳۰ھ میں بمقام بڑودہ ایک مثنوی قصۂ بی بی ارواح کے نام سے منظوم کرتا ہے۔

---

۵۱ اردو مخطوطات ص۲۴۴ ۔ ۵۲ اردو مخطوطات جلد اول ص۱۴۳

سنہ الف اوپر ہوئے صد دو سی ہوا یوں قصّہ کا سمجھنا سبھی
بتاریخ فرخ دوئم آمد رجب تمام تب کیا ہے یو قصّۂ عجب

مثنوی ۲۶۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ ایک شعر میں اپنے پیر و مرشد محمّد امین کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔

اہیں پیر مرشد محمّد امیں اونو کی توجیہ سیں چھوٹے (؟) یقیں
دو صد بیت اوپر ساٹھ نیز محمّد شفیع ابن عبدالعزیز
کیا قصہ میں بڑ دو دے منیں خدا اسکوں بخشے سو عصیاں سیں

یہ ایک اخلاقی مثنوی ہے۔ اس میں ایک پاک باز عورت کا قصّہ بیان کیا گیا ہے قصّہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بیوی کو اپنے بھائی کے سپرد کرکے سفر پر جاتا ہے۔ جب عورت کا خاوند کئی منزلیں دور ہوچکا تو بدنظر بھائی اپنی بھابھی کے سامنے اپنے ناپاک ارادے کا اظہار کرتا ہے۔ عورت کسی طرح اس کے پھندے سے چھوٹ کر بھاگ نکلتی ہے۔ ایک جگہ ایک کشتی پر سوار تھی کہ کشتی بان نے اس پر ڈورے ڈالے۔ کشتی غرق ہوجاتی ہے، اور یہ عورت ایک تختہ پر اپنا اسباب لے کر بچ نکلتی ہے۔ اسی طرح دو ایک جگہ ہوسناکی کا شکار ہونے سے بال بال بچتی ہے اور دامن بچا کر نکل جاتی ہے۔ آخر ایک شہر میں قیام کرتی ہے اور اپنا وقت عبادت پر گذارتی ہے۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد شہر والوں کو اس سے فیض پہنچنے لگتا ہے لوگ جوق در جوق اس کے پاس دُعا کے لئے آتے ہیں اس اثنا میں اس کے خاوند کا بھائی، کشتی بان وغیرہ سب اپنے کرتوتوں کی سزا پاتے ہیں اور اندھے ہوجاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی دُعا کے لئے اسی کے پاس آتے ہیں۔ اس کا خاوند بھی اپنی بیوی کی تلاش میں یہاں پہنچتا ہے۔ آخر کار عورت اپنے خاوند کو پہچان لیتی ہے دونوں ملتے ہیں اس کی دُعا سے خاوند کا بھائی، ملّاح وغیرہ دوبارہ بینائی پاتے ہیں اور نادم و شرمسار واپس جاتے ہیں۔

مثنوی کے چند شعر یہ ہیں۔

میری اہلیا کوں جو سونپا تجھے کہ بھابی تماری اہے دو بھی
خبر کھانے پینے کی لیجو تمن کسی بھانت عاجز نہ کریو تمن
(کہا) کیا بھائی نے میں تمارا سخن قبول سب کیا اپنے دل میں ہمن
پیچھوں اہلیا بھائی کوں سونپ کر سفر کوں چلیا دو راہی ہوکر

بوجھا بھائی نیں دور گیا ہے سہی | کیتک منزلاں پر سو پونچا دہی
پیچھے بھابی کوں جا کہی یوں ندا | کہ تن جان تموں پر کیا میں فدا
کہ عاشق ہوں تجھ پر ہوں بیست سال | نہ آئی کہ ہیں ہات میرے ابتال
یہ ہے بھائی میرا گیا ہے سفر | کہ آؤ ملیں ہم تمیں یک دگر
کہ غائب ہوا ہے تمارا خصم | نہیں دیکھتا ہے کہ آوے شرم (وغیرہ)

رحمت

اگرچہ رحمت اللہ احمد آبادی ایک بہت پُرگو شاعر تھا لیکن اس کی زندگی کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں رحمت، رحمت اللہ اور حافظ تخلص کرتا تھا رحمت کا زمانۂ حیات بارھویں صدی کا نصف اوّل تھا۔ ہر ایک پُرانی بیاض میں اس کا کوئی دکھڑا (نظم کی قسم) یا مثنوی یا نعت پائی جاتی ہے معلوم ہوتا ہے اس نے مذہبی اخلاقی اور صوفیانہ کئی مثنویاں لکھی ہیں ان میں سے اس کا مولودنامہ مشہور ہے۔ یہ ۱۲۴۵ھ میں احمد آباد کے ایک صوفی زادے سید امان اللہ شائع بھی کر چکے ہیں۔ مخزن شعرا اور حدیقۂ احمدی نے بھی اس شاعر کا ذکر کیا ہے۔ مغزن شعرا میں ایک شعر کے ساتھ یہ عبارت ہے:۔

"رحمت تخلص رحمت اللہ نام بود کہ در احمد آباد اقامت می داشت درعوام مشہور راست۔ منہ

دلا اب تو فرقت میں جاتی ہے جان | مجرّب کوئی اب دوا کر تلاش" ص۱۴

مولودنامہ کی حکایت دوم کے آخر میں چند شعر ایسے ملتے ہیں جن سے اس کے وطن، تخلص وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔

۱ اگر ایک شخص تھا سو بغداد میں | ہے لاکھوں ایسے احمد آباد میں
۲ کہ تحقیق ولیوں کا یہ شہر ہے | نبی کی محبت کا یہی بحر ہے
۳ کہ ہے شہر گجرات دارالعلم
۴ ہیں کئی مرد و عورت بھی پر فدا | ذکر ان کا ہے احمد سیدا
۵ کہ مولود کرتے ہیں دل جان سوں | وہ تعظیم دیتے ہیں مہمان کوں
۶ خصوصاً کہ مسجد ہے دہ کھالیا | یہ چشمہ ہے اس جاگ میں جاریا
۷ گویا بارہ دن تیئں وہاں عید ہے | کہ مجلس کے اوپر عجب دید ہے

۸　کہ روح مبارک وہاں ہے گذر　　نہ مانے سو آکر کرے ایک نظر
۹　ہے اعمال سنت نہیں واں رسوم　　اہی جاگ میں ہے میرا زاد و بوم
۱۰　وہ صحبت نے مجھ میں کیا ہے اثر　　کہوں ہندی مولود خیر البشر
۱۱　پیچھے ہیں عقل کا چلایا فرس　　صدی بارھویں تھی باون برس ۱۱۵۲ھ
۱۲　کہ منزل کو پہنچا یہ فضل الہ　　دیگر فضل ...... رسالت پناہ
۱۳　..........................　　.........................
۱۴　یہ مولود کر رحمت اللہ تمام　　ذکر میں سو مشغول رہ صبح و شام

شعر نمبر۹ میں اس نے محلہ کھاڑیا کی مسجد کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ محلہ ہندوؤں کی گنجان بستی کا علاقہ ہے۔ یہاں اب تک ایک مسجد کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس پر ایک مسلمان نے قبضہ کر لیا اور اسے نجی مکان ظاہر کیا۔ عدالت میں اس پر مقدمہ بھی چل چکا ہے۔ اس مقام پر پہلے مسلمانوں کے چند گھر تھے اب ایک دو باقی ہیں۔ گمان غالب ہے کہ اسی جگہ رحمت کا مکان بھی ہوگا۔ شعر نمبر۹ میں شاید لفظ زاد و بوم اپنے جائے قیام کے لئے استعمال کیا ہے یہ اشارہ احمد آباد شہر کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے۔

اس کے کلام کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ رحمت ایک صوفی منش شخص تھا اور ترک دُنیا کر کے تبلیغ اسلام و تعلیم اخلاق کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا اس کے چند شعر یہ ہیں۔

تجرید کوں دلوں سے کی اختیار ہم نے　　اب خلق کے ملن سے پکڑا کنار ہم نے
ٹوٹی سی جھونپڑی میں محفوظ ہیں ہمیشہ　　رُخصت کیا قبیلہ ہور بھائی یار ہم نے
کہنہ حصیر اوپر اب اکتفا کیا ہے　　چھوڑے پلنگ اب خوش پنبہ دار ہم نے
....　　..........................
دل میں ہے یاد ہُو کی رحمت غضب سے گُذرے　　کی ترک ذکر جنت ہور فکر نار ہم نے

مثنویوں کے ایک قلمی مجموعے[۱] میں رحمت کے کئی ٹکڑے اور دو مثنویاں ہیں۔ ایک بزمیہ مثنوی لیلیٰ مجنوں اور دوسری 'جان کی مینا' مثنوی ہے اس مثنوی میں فلسفۂ حیات اور بے ثباتی دُنیا کو تمثیل میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی مجموعے میں رحمت کے دو مخمس بھی پائے جاتے ہیں۔

---

[۱] مملوکۂ پروفیسر ندوی صاحب۔

مثنوی 'جان کی مینا' میں نفس و روح سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ اے مینا تجھے اس پنجرے سے دلبستگی ہوگئی ہے۔ اس عیش میں تو سب کچھ بھول گئی ہے۔ تجھے نہ اللہ کی یاد آتی ہے نہ رسول کی نہ خلفا کو تو کبھی یاد کرتی ہے۔ تیری سہیلیاں جو عرش پر پہنچ چکی ہیں وہ عرش بریں سے تیرے اس رویئے کو دیکھ کر روتی ہیں۔ ایک دن تو بلی (موت) کا لقمہ بن جائے گی اور لوگ تیرے پنجرے کو جلد از جلد زمین میں دفن کردیں گے۔
مثنوی صرف ۱۷۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں پر بزمیہ مثنویوں کے سلسلہ میں مفصل عرض کیا جائے گا۔

پربین

لفظ پربین دراصل پروین ہونا چاہیئے۔ پروین گجرات کا شاعر تھا اس کی ایک مثنوی قصۂ ہیرا لال دستیاب ہوئی ہے۔ یہ مثنوی "نازنیں پٹھان"، "شیخ نتھو" اور "حبشی اور بامنی" کے طرز کی مثنوی ہے۔ مذکورہ تین مثنویوں کے متعلق ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ تبلیغ اسلام کے لئے ایک یہ بھی طریقہ اختیار کیا گیا تھا کہ مثنوی کا ہیرو مسلمان ہوتا ہے اور ہیروئن ہندو ہوتی ہے۔ ایک کی زبان اُردو ہوتی ہے اور دوسرے کی گجراتی۔ دونوں میں مذہب اور معاشرت کی برتری پر بحث ہوتی ہے اور آخرکار ہیروئن اپنا مذہب ترک کرکے مشرف بہ اسلام ہوجاتی ہے۔ یہ طرز تبلیغ اس زمانہ میں بہت مقبول معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ایک ہی استعمال کی گئی ہے۔ مثنوی ۱۰۳ اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۶ھ ہے۔

سنہ بارہ سو پہ گئے سولہ سال　　　کہا ہے یہ قصہ جو میں حال حال
کہ پربین قصہ کوں اب کر تمام　　　ہوئے کفر سب دین کے پائے نام

قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ گجرات میں ریوا ندی کے کنارے گرنالے (پانی کا بڑا نالہ) کے قریب چاندوت (احمد آباد کے قریب) قصبہ ہے اسی کے مقابل ایک نادوت نامی قصبہ ہے۔ اس جگہ ہیرا نامی ایک براہمن عورت تھی۔ ہیرا ایک روز ندی پر پانی بھرنے گئی جہاں اسے ایک پٹھان نے دیکھا جو قصبہ ڈھبوئی (احمد آباد سے چند میل پر ہے) سے آیا ہوا تھا۔ پٹھان دیکھتے ہی اس پر فریفتہ ہوگیا اور اظہار عشق شروع کردیا۔ ہیرا پٹھان کو بہت برا بھلا کہتی اور ڈراتی دھمکاتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں مذہبی بحث چھڑ جاتی ہے۔ خان اسلام کی تعریف کرتا ہے اور ہیرا اپنے مذہب کی

خو بیاں بیان کرتی ہے لیکن جب ہیرا لاجواب ہو جاتی ہے تو ہیرا، خان کی بات مان لیتی ہے اور اس کے ساتھ ڈھیبوئی چلی جاتی ہے جہاں قاضی کے ہاں دونوں کا عقد ہو جاتا ہے۔

اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

نگر ایک گرنالے چاندوت ہے — مقابل اسی کے سونادوت ہے
تہیں یک سے یک نار نازک وسے — کہ ناگر براہمن اسی جگ بسے
بہت حُسن کی میں نے دیکھی جھلک — زباں سیں میں تعریف کھوکب تلک

خان کو ڈانٹتی ہے!

اے ہینڈیا چل تہیں جانے پھری — تنے وات کہوں چھوں ہوے ہوں پھری
(اے جا پیچھے سے۔ واپس چلا جا — تجھے بات کہتی ہوں اب میں دوبارہ)
سی لو لو کرے چھے مارا کان ماں — جسے آبرو تاری ایک آن ماں
(کیا بک بک کرتا ہے میرے کان میں — جائیگی آبرو تیری ایک آن میں)
سیانو تھئی بے تھیو چھے گنوار — مارا بامنوں نی توں کھاشِس مار
(سیانا ہو کر ہوا ہے گنوار — میرے برہمنوں سے تو کھائیگا مار)
ہوں وات کہوں چھوں تنے داج تھی — موڈو چھے نہ لیجہو کہیں لاج تھی
(میں باتیں سُناتی ہوں تجھے شرم نہیں — بڑا ہے بے شرم کچھ شرم نہیں)

خان کہتا ہے:-

ترے بن مجھے کچھ سو بھاتا نہیں — تجھے اب لئے بن سو جاتا نہیں

ہیرا کہتی ہے:-

ارے چل پڑو شوں کرے چھے گمان — کہ پھاٹو چھے نیمو نہ ٹوٹی کمان
(ارے چل جا کیا کرتا ہے گمان — کہ (ابھی) پھٹا ہے نیمہ نہ ٹوٹی کمان)

آخر تنگ آکر کہتی ہے:-

کہ ایوی تتوں سات کرتی چھوں وات — وچن ایک آلو تو آؤں چھوں سات
(کہ ایسی تمہارے ساتھ کرتی ہوں بات — وعدہ ایک دو تو آتی ہوں ساتھ)
جیوا بول بولیا تیوا پال جو — نہ گالی نہ بھیلی منے آل جو
(جیسا بول بولا ایسا پالنا — نہ گالی والی مجھے دینا)

تاری ماری مایا جے لاگی پچھے آج   تارے کارنے سردے چھوڑی چھے لاج
تیری میری محبت جو لگی ہے آج   تیرے کارن سے سب چھوڑی ہے آبرو

سب سے آخر میں شاعر تصوف کا رنگ دیتا ہے۔

کہاں کی وہ ہیرا کہاں کا وہ لال   کہاں ہے وہ خورشید کہاں ہے بلال
سخن لال ہیرا کی نسبت کری   پرکھ اس کی بوجھے کوئی گوہری
کسی کوں کسی کا کرے پائمال   کسی کوں کرے ایک پل میں نہال

شاعر نے مثنوی کے نام میں بڑی جدت سے کام لیا ہے۔ ہیرا لڑکی کا نام ہے اور پٹھان کو لالا کہتے ہیں اس سے لال بنا لیا اس طرح ہیرا اور لال کی مناسبت آگئی اور ہیرا لال ہندو نام بھی ہو گیا۔

عباد اللہ

عباد اللہ گجرات کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تین مثنویاں حضرت اسماعیل (۲) جبرئیل و میکائل اور (۳) زن بے وفا دستیاب ہوئی ہیں۔ کسی مثنوی سے شاعر کے وطن اور حالاتِ زندگی کا پتہ نہیں چلتا۔ مثنوی "زن بے وفا" اور "حضرت اسماعیل" میں اپنی زبان کو گوجری کہتا ہے۔ مثنویوں میں سنہ تصنیف بھی نہیں پایا جاتا۔ صرف ایک جگہ مثنوی لکھنے کی تاریخ اور دن بتاتا ہے۔ تخلص میں پورا نام عباد اللہ استعمال کرتا ہے۔

قصہ حضرت اسماعیل۔ حضرت اسماعیل کو قربانی کے لئے لے جانے کا مشہور قصہ شاعر نے منظوم کیا ہے۔ یہ مختصر مثنوی بندوں کی ترکیب پر ہے اس کا ایک ابتدائی بند یہ ہے :-

راوی ست میں نے یہ سُنا   جو ہے کتابوں میں عیاں
اس کا کروں میں اب بیاں   اندر زبان گوجری

اور آخری بند اس طرح ہے :-

دُنیا کی رغبت سیں جُدا   ہو کر رہیں ہر دم سدا
ہو میں (ہیں) عباد اللہ خدا (فدا) ؟   توں حق کی راہ میں ہر گھڑی

دوسری مثنوی جبرئیل و میکائل ایک سو پچاسی اشعار پر مشتمل ہے۔

ہے اس میں ایک سو پچاسی ابیات   نبی کے نام پر تم بھیجو صلوات

عبادالله جیسے بندوں میں گنہگار خدا بخشے گناہاں آپ غفار

مثنوی کا مرکزی خیال سخاوت کی ترغیب ہے۔ ایک دفعہ جبرئیل اور میکائیل میں یہ بحث ہوتی ہے کہ قوم اسرائیل میں سے جود و سخا کی نیک خصلت جاتی رہی۔ اس بات کو پایۂ تحقیق تک پہنچانے کے خیال سے دونوں فرشتے زمین پر وارد ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک مریض بن جاتا ہے اور دوسرا طبیب کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایک شہر کی ایک سڑک پر مریض کے ارد گرد لوگ جمع ہوجاتے ہیں طبیب یہ نسخہ تجویز کرتا ہے کہ اگر انسان کے بچّہ کو ذبح کرکے اس کا خون حاصل کیا جائے تو اس مریض کا علاج ہو سکتا ہے۔ اسی شہر میں ایک سخی مرد کے کئی بچّے تھے۔ جن میں سے صرف ایک جوان زندہ رہ گیا تھا۔ جب اس سخی کو اس واقعہ کا پتہ چلتا ہے تو وہ فوراً اپنے جوان بچّے کو ذبح کرکے اس کا خون اس مریض کے لئے دیتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد دونوں فرشتے آسمان پر چلے جاتے ہیں اور دوبارہ حکم الٰہی سے فقیر کے بھیس میں اسی شہر میں آتے ہیں وہی سخی تاجر انھیں کھانا کھلاتا ہے۔ یہ فرشتے اس تاجر کے تمام بچّوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔

تیسری مثنوی "زن بے وفا اور حضرت عیسٰی" کا خلاصہ یہ ہے:-

میاں بیوی کا ایک جوڑا آپس میں بڑی محبّت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان دونوں نے آپس میں معاہدہ کر لیا تھا کہ دونوں میں سے کوئی ایک مرجائے تو دوسرا دوبارہ شادی نہ کرے۔ اتفاق سے عورت مرگئی تو مرد وعدہ کے مطابق عورت کی قبر کی مجاوری کرتا رہا۔ اس طرح بیس سال گذار دئے ایک روز مرد تنہائی سے اکتایا ہوا بیٹھا تھا کہ حضرت عیسٰی آئے اور مرد کی پریشانی کی وجہ دریافت کی حضرت عیسٰی نے واقعہ سننے کے بعد کہا کہ اگر تو اپنی آدھی عمر اپنی عورت کو بخش دے تو تیری بیوی کو زندہ کردوں۔ اس پر مرد راضی ہوگیا تو حضرت عیسٰی نے عورت کو زندہ کر دیا۔

اس کے بعد دونوں میاں بیوی ایک جنگل میں سے گذر رہے تھے کہ مرد کو نیند آگئی۔ اسی اثناء میں اس جگہ سے ایک پادشاہ کا گذر ہوا اور اس نے اس حسینہ دجمیلہ پر ڈورے ڈالے۔ عورت سے پادشاہ نے مرد کے متعلق دریافت کیا تو عورت نے بتایا کہ یہ ایک ڈاکو ہے جو مجھے زبردستی لے جارہا ہے اس پر پادشاہ عورت کو اپنے ساتھ لے کر چلا گیا۔ جب مرد نیند سے جاگا اور اپنی بیوی کو نہ پایا تو رونے چلانے

لگا۔ آخر کسی نے اسے بتایا کہ اس کی عورت پادشاہ کے ساتھ چلی گئی ہے۔ یہ مرد پادشاہ کے دربار میں پہنچا اور اپنی بیوی کو واپس لوٹا دینے کی درخواست کی۔ مرد نے پادشاہ کو تمام واقعہ سُنایا اس موقع پر حضرت عیسیٰ بھی وہاں پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر عورت نے وہیں دم توڑ دیا۔

شاعر اپنی زبان کو گوجری کہتا ہے:۔

اول زبان سوں کھوؤں سخن	سنیو تمیں سب یار رے
حق نے کھولا میرا دہن یوں	بات کھوؤں ہر بار رے
عیسیٰ نبی کے وقت میں یوں بات ہے سنیو تمیں
گجری سنے کہتا ہوں میں نادر سخن ہر بار رے

آخری دو شعر یہ ہیں:۔

ذی القعدہ کے مہینے منے روز جمعہ پورا ہوا	وقت عصر قصہ کتیں کم کر کیا تیار رے
یارب عباداللہ کتیں توفیق دیجو سانچ کی	محبوب کی برکت بدل دکھلائیے توں دیدار رے

راقم کے پاس ایک بیاض ہے جس میں عباداللہ کی ایک غزل درج ہے۔

مشتاق ہوں رہتا ہوں ہر صبح شام یارب	دکھلا میں اب کہتا ہوں عالی مقام یارب (؟)
جب کے زمیں کوں چھوڑوں جاؤں میں وہاں میں	دو جگ کے پادشاہ کوں بھیجوں سلام یارب
وہ وقت کب ہوویگا ایک دم حرم میں بیٹھوں	بھر بھر پیوں ادب سوں زمزم کا جام یارب
کتہ میں کعبہ اندر جا داخل کردوں میں	سینے سیتی لگاؤں سو چاروں مقام یارب
دل انتظار میرا مدت سیں ہو رہا ہے	اب دور کر میں پوچھوں سب چھوڑ کام یارب
یک مرتبہ جنوں نے دیکھا ہے جگ مبارک	ہوئی ہے اس کے اوپر دوزخ حرام یارب
مطلب عباداللہ بر لیا توں اب شتابی	صاحب کوں چھوڑ کس کن مانگے غلام یارب

صالح

شاعر تخلص صالح کرتا ہے۔ یہی اس کا نام ہونا چاہیئے۔ اس نے ۱۰۷ اشعار کی مختصر مثنوی میں پیغمبر کا ایک معجزہ منظوم کیا ہے۔ مثنوی کا نام بھی معجزۂ حجر لکھا ہوا پایا جاتا ہے شاعر نے سنہ تصنیف بھی نہیں دیا ہے۔ مثنوی کی زبان کو دیکھتے ہوئے گمان غالب ہے کہ یہ تیرھویں صدی کی مثنوی ہے۔ مثنوی چندوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح کی مثنوی

۱۲۱۲ھ میں محمد دین نے تاریخ ملک سورٹھ کے نام سے لکھی ہے۔ اسی طرز پر جیلا اشرکی بھی ایک مثنوی پائی جاتی ہے۔ صالح کی مثنوی نظیر کی مناجات (میری بار کیوں دیر اتنی کری) کے انداز پر ہے۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

حمد و ثنا اس پاک کوں   عالم کوں جن پیدا کری
پانی آنے لئی خاک کوں   انسان کی صورت گھڑی
تنہا یوں کاوے یار ہے   دانائی پر اسرار ہے
بے عیب اور ستار ہے   اس کائی کوئی ہمسری
ہر چیز کا معبود وے   ساجد ہمیں مسجود وے
ہر جا دیکھو موجود وے   خالی نہ اس بن تل بھری
بر عاصیاں غفار ہے   وے واحد القہار ہے
بر مشرکان جبار ہے   از جن و صد آتش پری

نہیں کرنے کو باور تمیں   سن بوجھکے سارے جنے
قصہ تیمّم کا اب کہیں   خوش دل زبان گوجری

صالح نے یہ قصہ کہا   مقبول ہووے جا بجا
ہے امر بھی یوں کر سدا   ہر یک کو لاگے خوشتری

جمال الدّین

جمال الدّین گجرات کا ایک مثنوی نگار ہے۔ اس کی چار طول طویل مثنویوں کا پتہ چلا ہے۔ (۱) "سکندر ذوالقرنین" (۲) "قصہ شاہجہاں و روشن زحل" (۳) قصہ روشن میاں سوداگر و شمسو ددا" (۴) "قصۂ عیلی گوہر و اچھو گلاب" وغیرہ۔ مذکورہ چاروں مثنویاں مطبع کریمی بمبئی ۱۳۱۳ھ میں شائع کر چکی ہے۔ شاعر نے چار سو سے سات سو شعر کی مثنویاں لکھی ہیں لیکن کسی جگہ اپنے حالات زندگی، وطن وغیرہ کا ذکر نہیں کرتا۔ سنہ تصنیف بھی صرف ایک مثنوی میں درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بارھویں صدی کے نصف آخر کا شاعر ہے۔ مطبوعہ مثنویوں میں زبان کے متعلق لفظ ہندی ملتا ہے لیکن سکندر نامہ کا

ایک قلمی نسخہ بمبئی یونیورسٹی میں بھی موجود ہے۔ اس میں زبان کے متعلق لفظ گجری[1] پایا جاتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

قصّہ اصل تھا فارسی اسکوں اتارا گوجری   جو کوئی پڑھے جو کوئی سنے تقدیر بوجے گوہری

مطبوعہ نسخہ میں یہی شعر اس طرح ہے:۔

قصہ اصل ہے فارسی اوسکو لکھا ہندی منے   جو کوئی پڑھے جو کوئی سنے ہووے خوشی وہ دل منے

معلوم ہوتا ہے مطبوعہ نسخہ میں مرتّب نے تصرف سے کام لیا ہے۔

سکندر نامہ۔ اس مثنوی کا مرکزی خیال تقدیر اور تدبیر کا جھگڑا ہے۔ قصّہ اس طرح ہے کہ دو بھائی مختلف ملکوں کے حکمران ہیں۔ ایک تقدیر پہ شاکر ہے اور دوسرا تدبیر پر ایمان رکھتا ہے۔ اپنے نظریے منوانے کے لئے برسوں دونوں میں جنگ ہوتی ہے آخرکار دونوں سکندر ذوالقرنین کے دربار میں جاتے ہیں اور اس سے اس مسئلہ میں آخری فیصلہ چاہتے ہیں۔ سکندر ان نظریوں پر غور و خوض کرتے ہیں اتنے میں یہ رفع حاجت کے لئے جاتے ہیں۔ یہاں ایک بڑا پرندا آتا ہے اور انہیں اُڑا لے جاتا ہے اور ایک قلعہ میں لے جاکر ڈال دیتا ہے۔

سکندر قلعہ کی دیوار پہ چڑھ کر دیکھتے ہیں تو ایک طرف فوجوں کے پرے دوسری طرف موجیں مارتا ہوا سمندر، تیسری طرف ایک غار اور چوتھی جانب اژدہے نظر آتے ہیں۔ یہ خوفزدہ ہوکر واپس اُتر جاتے ہیں۔ انہیں ایک دروازہ دکھائی دیتا ہے۔ اس دروازہ سے اندر جاتے ہیں تو نہایت خوش نُما باغ نظر آتا ہے۔ اس باغ میں ایک شہزادی آرام کر رہی ہے اور اس کے پاس ایک بچّہ جھولے میں جھول رہا ہے۔

سکندر کو دیکھتے ہی بچّہ رونے لگتا ہے۔ ملکہ اٹھ جاتی ہے اور سکندر سے گفتگو کرتی ہے۔ سکندر اپنا حال سُناتے ہیں اور ملکہ اپنا حال سُناتی ہے کہ وہ شاہ مدنین کی ملکہ ہے یہ اس کا بچّہ ہے۔ نجومیوں نے کہدیا ہے کہ سکندر کے ہاتھوں یہ مارا جائے گا اس لئے اسے بارہ سال کسی محفوظ جگہ پر رکھّا جائے۔ سکندر ملکہ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ کوئی سکندر اسے نہیں مار سکتا۔ آخر بارہ سال ختم ہوجاتے ہیں اور یہ تینوں باہر جانے کو ہیں کہ بچّہ باغ سے ایک پھل توڑ کر لاتا ہے اور سکندر سے اُسے کاٹنے کو کہتا ہے۔ سکندر چاقو سے کاٹ کر پہلے ملکہ کو کھلاتے ہیں اور پھر اسی چاقو کی نوک سے بچّہ کے منہ میں دیتے ہیں اتفاق سے بچّہ کو چھینک آتی ہے اور چاقو کی نوک اس کے تالو

[1] راقم کے پاس بھی اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں لفظ 'گوجری' ملتا ہے۔

میں گھس جاتی ہے اور فوراً مرجاتا ہے۔ سکندر یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہی پرندہ آتا ہے اور انہیں ان کے اپنے دربار میں چھوڑکر آتا ہے۔ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ایک پل کی پل میں ہوا ہے اور دونوں بھائی بھی وہیں بیٹھے ہیں، اس کے بعد سکندر اپنا فیصلہ دیتے ہیں کہ تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔

مثنوی چار سو شعر پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ مثنوی کے آخری چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

قصہ اصل ہے فارسی اوس کو لکھا ہندی منے
جو کوئی پڑھے جو کوئی سُنے ہووے خوشی وہ دل منے

بیتاں سنی ہیں چار سو پوچھو عزیزاں دوستاں
اس میں حقیقت سب لکھی دیکھو خدا کی قدرتاں

عاصی جمال الدین تو تقدیر پر شاکر رہو
اس میں اشارہ ہے بڑا جو سر پڑی سو سب سہو

احمد نبی محبوب پر بھیجو درود اں اور سلام
اے امتی محبوب حق بھیجو یہ ہر یہ تم مدام

قلمی نسخہ میں تیسرا شعر اس طرح ہے:۔

عاصی جمال الدین تو تقدیر پر شاکر رہے
اس میں اشارت ہے بڑی جسکے پڑے سر وے سہے

یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ شاعر نے سنہ تصنیف کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

قصۂ عیسیٰ گوہر و اچھو گلاب۔ یہ مثنوی دو سو چالیس ابیات پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی سے بھی شاعر کا مقصد تقدیر کے کرشمے بتانا ہے۔ آخری شعر میں شاعر اپنا نام محمد جمال بتاتا ہے۔ آخری اشعار یہ ہیں:۔

دو سو اور چالیس بیت کا قصہ عجب نادر بنا
بوجھو لکھا تقدیر حق ایدوستاں باب الجنا

محمد جمال موقوف کر پورا نہ ہووے عشق من
غالب رکھو تقدیر کو سچ ہے یقیں نیں عیب من

مثنوی سے یہ پتہ نہیں چلا کہ شاعر نے یہ قصہ کہاں سے لیا ہے۔ اپنی دوسری مثنویوں میں ماخذ کے متعلق بیان کرتا ہے۔

حمد و نعت میں چند اشعار کہنے کے بعد اصل قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ شہر مچھلی نگر پر حماد نامی ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ سب سے

چھوٹے کا نام عیلی گوہر تھا۔ تینوں بڑے بھائی اس سے حسد کرتے تھے۔ ایک روز بادشاہ چھوٹے بیٹے سے کسی بات پر خفا ہوگیا۔ گوہر اپنے باپ کو یہ دکھلانے کے لئے کہ وہ بھی تقدیر کا مالک ہے گھر چھوڑ کر اپنی بیوی اچھو گلاب کے ساتھ چل کھڑا ہوا۔ ایک مقام پر دریا عبور کرنے کے لئے وہ دونوں کشتی پر سوار ہوئے راستہ میں کشتی غرق ہوگئی تو دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہوکر مختلف مقامات پر جانکلے، اچھو گلاب ایک ریاست ہیرانگر کے کنارے پر پہنچی۔ وہاں اس نے ایک باغ میں قیام کیا۔ جب اس شہر کے بادشاہ کو پتہ چلا تو اس باغ میں پہنچا لیکن اچھو گلاب نے چُپ سادھ لی تھی اس لئے بادشاہ واپس آیا اور اس کی خدمت کے لئے ایک لونڈی بھیج دی۔ گوہر ایک اور مقام رستم پہاڑ پر جانکلا، یہاں کے بادشاہ نے اپنی لڑکی بی بی انم گوہر سے بیاہ دی۔ ایک دن گوہر اپنی دوسری بیوی انم کو لے کر چلا پھر وہی کشتی غرق ہونے کا حادثہ پیش آیا۔ انم اسی ہیرانگر کے کنارے پر نکلی اور اچھو گلاب کے ساتھ رہنے لگی اور گوہر ایک اور مقام پر نکلا غرض اس طرح تین اور حادثے پیش آتے ہیں اور ہر وقت یہی ہوتا رہا کہ ہر ایک بیوی ہیرانگر کے کنارے نکلتی رہی اور اچھو گلاب کے ساتھ رہنے لگی۔ آخرکار گوہر بھی اتفاق سے ہیرانگر جاپہنچا اور وہاں کے بادشاہ کو تمام قصہ سُنا کر پانچوں بیویوں کو لے کر اپنے وطن واپس ہوا۔ باپ اپنے بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے پورا قصہ بیان کیا اور اپنی بات ثابت کر دکھائی کہ وہ بھی قسمت کا دھنی ہے۔

تیسری مثنوی " قصۂ روشن میاں سوداگر اور شمسو ددا" آٹھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں عورت کے تریا چرتر (مکروفریب) کو ظاہر کیا گیا ہے۔ شاعر نے اس کا سنہ تصنیف نہیں دیا ہے۔ صرف مہینہ اور تاریخ پائی جاتی ہے۔ اس کے آخری اشعار یہ ہیں۔

بیتاں کہے دہی، ہیں آٹھ سو قصّے سنے اے دوستاں
جو کوئی پڑھے گا اس کتیں ہر ایک کے ہو وے خاطرنشاں
شعبان کی چاند رات کو قصّہ کے تئیں پورا کیا
سنیو تمیں اے دوستاں کریو مرے حق میں دعا
آخوند جمال الدین تو قصّہ کے تئیں کردے ختم
احمد نبی کے نام پر بھیجو درود اں اور سلام

قصّہ یہ ہے۔ ایک سوداگر روشن میاں کو ان کی بدقماش بیوی نے تجارت

کے بہانے سے دوُر سفر پر بھیج دیا تاکہ جلد واپس نہ آسکے، اس خیال سے اُس سے فرمائش کی کہ جب تک 'تریا چرتر' نہ ملے واپس نہ لوٹنا۔ روشن میاں کسی اور ملک میں گئے جہاں سے لوٹتے وقت انہیں 'تریا چرتر' کا خیال آیا کسی نے انہیں ایک کٹنی شمسو ددا کے پاس بھیج دیا۔ شمسو نے روشن میاں کو اطمینان دلایا کہ وہ اس شرط پر ان کے لئے 'تریاچرتر' حاصل کرے گی کہ جیسا وہ کہے ویسا یہ کرلیں۔ روشن میاں نے منظور کیا۔ شمسو نے انھیں زنانہ لباس پہنایا اور پادشاہ کے ہاں یہ کہہ کرلے گئی کہ اس عورت روشن کنور کا خاوند میرے پاس اسے نقد رقم کے عوض رہن رکھ گیا ہے لہذا جب تک وہ نہ آئے اس وقت تک اسے محل میں رکھا جائے۔ پادشاہ نے منظور کرلیا اور اپنے دو وزیروں میں سے ایک وزیر گل فیل شیر کی بیوی کے پاس مصاحب کے طور پر رکھ دیا چونکہ یہ وزیر شاہی کام کے سلسلہ میں باہر گیا ہوا تھا۔ پہلے ہی دن روشن میاں کا راز کھل گیا لیکن گل فیل شیر کی بیوی گل شیرمن کے بھی چلچن خراب تھے اس نے روشن میاں کا راز فاش نہیں کیا۔ جب گل فیل شیر واپس آیا تو اُس کی بیوی نے اُسے قتل کرکے دفن کردیا اور یہ ظاہر کیا کہ روشن کنور "روشن میاں" کے ساتھ اس کا خاوند فرار ہو گیا۔ اب شمسو ددا کے ساتھ روشن میاں پادشاہ کے پاس اپنی بیوی کو لینے آیا۔ پادشاہ نے یہ طے کیا کہ گل فیل شیر کی بیوی گل شیرمن سے اس کا عقد کردیا جائے۔ اس طرح دوبارہ روشن میاں اور گل شیرمن ساتھ رہنے لگے۔ شمسو ددا نے روشن میاں کو بتایا کہ ابھی بہت کچھ 'تریا چرتر' باقی ہیں، اس مرتبہ شمسو ایک بین لائی اور روشن میاں کو گوتیا بنا کر اپنے ساتھ محل کے قریب ایک مندر میں لے گئی۔ روشن میاں کا گانا سُن کر محل سے شہزادی جیبہ وہاں پہنچی۔ شمسو نے جیبہ کو شراب پلاکر مست کر دیا اور باہر جاکر کوتوال، گل شیرمن وغیرہ سے کہہ دیا کہ پادشاہ کی بیٹی کسی کے ساتھ عیش کر رہی ہے۔ کوتوال نے اس جگہ قفل ڈال دیا اور سپاہیوں کا پہرہ بٹھلاکر صبح کا انتظار کرنے لگا تاکہ پادشاہ کو اس کی خبر کرے۔ جب گل شیرمن نے یہ سُنا تو وہ بھاگی ہوئی ایک رقاصہ گلنار کے پاس پہنچی اور واقعہ بیان کیا۔ گلنار نے روشن میاں کو چھُڑانے کی یہ ترکیب نکالی کہ چند لونڈیوں کے ساتھ ایک طشت میں اشرفیاں اور پوجا کا سامان لے کر مندر پر پہنچی۔ سپاہیوں کو کچھ دے دلاکر دروازہ کھلوایا اور اندر جاکر جیبہ کو گل شیرمن کے کپڑے پہنا کر باہر لے آئی صبح جب پادشاہ آیا تو دیکھا روشن میاں اپنی بیوی کے ساتھ ہیں۔

پادشاہ سے روشن میاں نے کہا کہ میری بیوی کو کسی نے نہیں

غائب کردیا۔ اس کی محبت میں گھربار چھوڑ کر مندر میں بیٹھا تو مجھ پر الزام لگایا جاتا ہے۔ بادشاہ شرمندہ ہوا اور اس کی بیوی کے عوض میں اپنی بیٹی حبیبہ سے اس کا عقد کر دیا۔ بعد مدت روشن میاں اپنی بیگموں حبیبہ، گل شیرمن اور گلنار کو لے کر اپنے وطن گئے۔ شہر تھوڑی دور تھا کہ گل شیرمن نے روشن میاں سے کہا کہ آؤ پہلے چل کر تمھاری پہلی بیوی کا حال دیکھ لیں یہ دونوں رات کو گھر پہنچے تو بیوی کو ایک حبشی کے ساتھ داد عیش دیتے ہوئے پایا۔ گل شیرمن نے حبشی کا سر کاٹ لیا اور دونوں واپس لوٹ آئے صبح اپنی بیوی کو بلا بھیجا۔ جب بیوی پہنچی تو روشن میاں نے کہا کہ بیوی تمھاری فرمائش کے مطابق میں 'تریا چرتر' لایا ہوں یہ کہہ کر ایک صندوق دیا۔ بیوی نے صندوق کھولا تو حبشی کا سر پایا۔ شاعر قصہ کو یہاں ختم نہیں کرتا بلکہ چند ابیات اور اس مطلب کی بڑھا دیتا ہے کہ کچھ مدت کے بعد روشن میاں وفات پا جاتے ہیں اور آخر کار ان کی تینوں بیویاں بھی ان کی محبت میں گھل گھل کر مرجاتی ہیں۔

جمال الدین کی چوتھی مثنوی قصہ شاہجہاں و روشن زحل ہے۔ اس کے متعلق بزمیہ مثنویوں کے باب میں عرض کیا جائے گا۔

غلام رسول آدا

غلام رسول المتخلص بہ آدا احمد آباد کا ایک شاعر ہے۔ اگرچہ اس کا زمانہ حیات تیرھویں صدی کا اواخر اور چودھویں صدی کا اوائل ہے اور اس کا کلام گذشتہ زمانہ کی تمام مثنویوں کے مقابلہ میں ترقی یافتہ صورت میں پایا جاتا ہے تاہم کسی جگہ اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

ادا کی دو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں۔ ایک قصۂ بدیع الزماں ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۸۸ھ ہے اور ۷۸۴ ابیات پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی مطبع فتح الکریم بمبئی سے ۱۳۰۸ھ ۱۸۹۰ء میں شائع ہو چکی ہے۔ دوسری مثنوی قصۂ گھنگ و سپاہی ہے اس کے اشعار کی تعداد ۲۰۲۷ ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۷۰ھ ہے۔ یہ مثنوی بھی مطبع فتح الکریم نے ۱۳۰۸ھ میں شائع کی ہے۔

دونوں مثنویوں کے آخر میں شاعر اپنے وطن، سنہ تصنیف اور تعداد ابیات کے متعلق چند شعر لکھتا ہے۔

میں عاصی ہوں میرا اسم ہے رسول — الٰہی میری عرض کیجئے قبول
کہ بارہ سو اٹھاسی کے درمیاں — نثر کا کیا نظم یہ داستاں
مبارک تھا ماہ ربیع الاول — کیا ختم جمعہ کے دن بے بدل
نثر داستاں چمن میں رسول — لگائے جو ہیں نظم کے خوب پھول
عزیزو یہ قصہ کو دل شاد میں — بنایا شہر احمد آباد میں
میں عاصی ہوں میرا ہے نام رسول — مجھے کہتے ہیں سب غلام رسول

....

....

کہ بیتاں ہیں چھ سو پہ اسی نے چار — نہیں فرق کچھ گن کے کرلیو شمار
رسول اب تو کر یہاں سے قصہ تمام — محمد پہ نت ہو درود و سلام

(قصۂ بدیع الزماں)

میں ہوں ساکن شہر احمد آباد — خدا کے فضل سے ہوں خرم و شاد

....

....

ہوئے تھے جبکہ تیرہ پہ سن چار — بنا قصہ یہ رنگیں رشک گلزار
یہ رنگیں داستاں کی اسے مجو — ہیں بیتاں چار سو پر ساٹھ اور دو
جب آخر اس کی نوبت آ کے پہنچی — وہ تھی دسویں ربیع الآخر کی
ادا تجھ کو مدد ہیں حضرت پیر — پسند خلق ہے بس تیری تقریر

(قصۂ سپاہی ٹھگ)

قصۂ بدیع الزماں داستان امیر حمزہ سے لیا گیا ہے۔ ابتدا میں چند شعر حمد و نعت میں ہیں اس کے بعد اصل قصہ یوں شروع ہوتا ہے کہ امیر حمزہ نے نوشیرواں کی بیٹی سے عقد کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ نوشیرواں نے پیغام منظور کیا لیکن اہل دربار نے اس رشتہ کی مخالفت کی۔ با ایں ہمہ نوشیرواں نے اپنی بیٹی امیر حمزہ کے عقد میں دیدی۔ تمام رعایا اور قریبی ریاستوں کے لوگ نوشیرواں کے اس طرز عمل سے ناخوش تھے لہذا ہر طرف سے کافروں نے امیر سے لڑنے کی ٹھان لی۔ امیر کے ساتھ بعض مقامات پر جنگ ہوتی ہے لیکن ایک بھی پہلوان ان کے مقابلہ میں نہیں ٹھہرتا۔ فتح و ظفر کے بعد امیر گیلان گئے

گیلان کے پادشاہ کنجال کو بھی شکست دے کر اس کی بیٹی سے نکاح کر لیا اور پادشاہ کو دائرۂ اسلام میں شامل کریں۔ کنجال کی بیٹی کو حمل قرار پاتا ہے اسی دوران میں امیر نے اپنی حاملہ بیوی کو اس کے باپ کے سپرد کرکے کسی وجہ سے کوچ کیا۔ کنجال کی بیٹی کو جب لڑکا پیدا ہوا تو کنجال نے اس نومولود کو مار ڈالنے کی کوشش کی لیکن ایک عورت کو اس پر رحم آیا اس نے بچّہ کو ایک صندوق میں بند کرکے دریا میں بہادیا۔ اتفاق سے ایک کنارے پر یہ صندوق چند پریوں کو دکھائی دیا۔ پریاں بچّہ کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئیں لیکن خضر نے آکر بتایا کہ یہ بچّہ امیر کا ہے اور اس کا نام بدیع الزماں ہے۔ پریاں بچّہ کو کوہ قاف میں لے جاکر پرورش کرتی ہیں۔ بدیع الزّماں بڑے ہوکر اتفاق سے اپنے ہی باپ امیر کے مقابلہ میں لڑنے گئے۔ بدیع الزماں کو جب امیر مار ڈالنا چاہتے ہیں تب ایک پری آکر امیر کو بتاتی ہے کہ یہ انہیں کا بچّہ ہے۔ اس مقام سے بدیع الزماں اپنے باپ امیر کے ہمرکاب رہتے ہیں۔

شاعر نے محض مثنوی کہنے کے خیال سے یہ قصّہ منظوم کیا ہے ورنہ اس میں مذہبی تبلیغ نہیں پائی جاتی صرف ایک دو مقام پر اس بات کا اشارہ پایا جاتا ہے۔

کیا تب امیر نے یو دل میں سچا کہو کلمہ حضرت ابراہیم کا
تو کلمہ انھوں نے پڑھا شوق سے کفر کے نکل کر جو وہ طوق سے

یا کنجال کی بیٹی کے متعلّق کہا ہے۔

مسلمان اس کو بنائے تبھی نکاح میں امیر کے وہ آئی تبھی

آدا کی دوسری مثنوی 'سپاہی و ٹھگ' ہے۔ حمد و نعت اور مدح خلفائے راشدین کے بعد قصّہ یوں شروع ہوتا ہے۔

ایک ٹھگ اور ایک جوان سپاہی کسی شہر میں ایک بنئے کے گھر کے سامنے کرایہ پر مکان لے کر شاہانہ ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بنیا اس ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر بہت مرعوب ہوتا ہے۔ ایک دن دو سپاہی آتے ہیں اور ان ٹھگ شہزادوں کو پیغام دیتے ہیں کہ آپ کے قبلہ والد بزرگوار آپ دونوں کو یاد فرماتے ہیں۔ دونوں شہزادے جواب دیتے ہیں کہ ہمیں بارہ ہزار کا قرض ادا کرنا ہے یہ رقم اگر ہمارے والد روانہ کریں تو ہم قرض ادا کرکے آجائیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ٹھگ بنئے کے پاس بارہ ہزار میں اپنی انگشتری رہن رکھنے کی غرض سے جاتا ہے۔ چونکہ بنئے نے یہ سب تماشا دیکھا تھا

اور ان کی گفتگو سُنی تھی لہٰذا بارہ ہزار روپیہ دینے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتا۔ دوسرے روز رات کو ایک ٹھگ بنیئے کے گھر سے یہ انگشتری بھی چُرا لاتا ہے اور صبح کو بارہ ہزار روپیہ لے کر اپنی انگشتری واپس لینے جاتا ہے۔ انگشتری نہ ملنے پر بنیا بارہ ہزار روپیہ سے ہاتھ دھوتا ہے پھر دونوں ٹھگوں میں اپنی اپنی برتری پر بحث ہوتی ہے اور یہ طے پاتا ہے کہ اس کا فیصلہ پادشاہ کرے گا۔ ایک رات یہ دونوں پادشاہ کے محل پر پہنچتے ہیں اور اپنے ساتھ ایک اونٹ کے پاؤں کاٹ کر لے جاتے ہیں۔ کسی طرح دربانوں کو قتل کر کے پادشاہ کی آرام گاہ میں پہنچ کر خادموں کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پادشاہ کی آنکھ کھلتی ہے تو خادموں سے کوئی کہانی سُنانے کو کہتا ہے۔ سپاہی ٹھگ اپنا ہی قصہ سُناتا ہے۔ جب پادشاہ کی آنکھ لگ جاتی ہے تو پلنگ کے سونے کے پائے نکال کر اونٹ کے پاؤں اس کی جگہ لگا دیتے ہیں اور اپنا راستہ لیتے ہیں۔ صبح پادشاہ یہ ماجرا دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور شہر میں مُنادی پھیری جاتی ہے کہ چوروں کو ان کی چالاکی کے لئے انعام دیا جائے گا۔ دونوں ٹھگ دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور انعام پاتے ہیں۔

قصہ نہایت دلچسپ ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نے کہاں سے لیا ہے یا اس کا طبع زاد قصہ ہے شاعر نہایت پُرگو ہے بعض جگہ فارسی اشعار بھی کہہ جاتا ہے۔

نشستہ بر در اقدس سپہ چار بخواب آں مست بودند مثل نیخوار
شہنشاہ فلک بر تخت زریں شدہ جلوہ کناں با جاہ و تمکیں

بعض جگہ تعلی کی بھی لیتا ہے۔

زمین شعر عمدہ جاں جاں سے پکڑ لاتا ہوں مضموں آسماں سے
سخن کے بکھیر اب تو لعل و گہر تو لیں اہل مجلس سبھی گود بھر
سخن کے گلستاں میں اے رسول لگا کئی طرح کے تو رنگین پھول

مثنوی بدیع الزماں، 'سحرالبیان' کی بحر میں ہے اور قصہ' ٹھگ و سپاہی گلزار نسیم' کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ زبان اور روانی کے لحاظ سے دونوں مثنویاں اچھی ہیں۔

سبھو

غلام محمد نام اور سبھو تخلص تھا۔ سورت کے رہنے والے تھے۔ صاحب مخ گجرات اور سید نورالدین فائق مُصنف شعرائے گجرات کا بیان ہے کہ تحصیل

علم کے بعد سمجھو زیارت حرمین شریفین کے لئے گئے وہاں سے لوٹنے کے بعد شہزادہ محمد جہاں خلف محمد اکبر شاہ ثانی کی مصاحبت میں دہلی گئے۔ بادشاہ زادہ نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور خلعت فاخرہ عطا کیا۔ سمجھو کچھ مدت تک دہلی میں رہے اور حکیم مومن خاں مومن اور استاد ابراہیم ذوق سے مشورۂ سخن کیا دہلی سے واپسی پر حیدر آباد دکن کا رخ کیا، دیوان چندو لال کا زمانہ تھا ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور زمرۂ ملازمین میں یہ داخل کر لئے گئے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ حیدر آباد سے کیوں اور کب لوٹ آئے مگر وہاں سے آنے کے بعد ۱۲۶۰ھ کے بعد نجم الدولہ ممتاز الملک حسین یاور مومن خاں والئ کھمبایت کی سرکار میں عہدۂ وکیل انگریزی پر فائز ہوئے۔ فائق کے بیان کے مطابق ۱۲۶۸ھ یعنی شعرائے گجرات کے سنہ تصنیف کے زمانہ میں بھی یہ کھمبائت میں اسی عہدے پر سرفراز تھے۔ سنہ ولادت و وفات سے ہم لاعلم ہیں۔

سمجھو کو اردو فارسی میں دست رس حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سمجھو عربی سے نابلد تھے لیکن طعن اغیار سے غیرت کو ٹھیس لگی تو قلیل عرصہ میں عربی میں بھی اچھی مہارت حاصل کر لی۔ مصنف شعرائے گجرات نے سمجھو کی تعریف میں لکھا ہے "اگر عسجدی وقت گویم سزاوار است اگر فردوسی عہد خوانم روا است کلام اعجاز بیانش الہامی است وغیرہ"

سمجھو اور ان کے شاگرد منظور کا کلام چمن بے نظیر میں پایا جاتا ہے ایک جگہ سمجھو نے تعلی کی ہے۔

بعد عزلت کے ہوا تھا یہ سخن کا چرچا پھر مسیحائی سمجھو سے جلا سورت میں

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

اب بھرا ہے شہرہ سمجھو سے سارا ملک یہ تھی ولی کے بعد خالی سرزمیں گجرات کی

صاحب تاریخ گجرات کے بیان کے مطابق ایک دیوان ریختہ۔ سلام۔ مجرے۔ ایک فارسی تذکرہ خزینۃ الشعراء اور تین مثنویاں سمجھو نے یادگار چھوڑی ہیں لیکن ان میں سے اب تک صرف ایک مثنوی افیونی نامہ اور مختلف بیاضوں میں غزلوں کا پتہ چلا ہے۔ ان کے شاگردوں میں منظور اور علوی عیدروسی قابلِ ذکر ہیں۔

افیونی نامہ

حبذا کیف حضرت تریاک زیر پا جس کے سیر ہفت افلاک
مثل صندل اسے لگاتے ہیں لالہ رو اس کو سر چڑھاتے ہیں

قاطع نزلہ یہ نہ گر ہوتی — زندگانی ہی . دسر ہوتی
آنسو آنکھوں سے بند کب ہوتے — عمر بھر نزلے والے سب روتے
اس سے نزلہ اگر نہ کچھ کم ہو — ناک میں پھر نہ کام سے دم ہو
رنگ اس کا برنگ کنچن ہے — زرد رُو اس کے آگے کندن ہی
اُس نے لی آن بان سونے کی — مالوہ اس سے کان سونے کی
کیا لکھوں وصف حضرت تریاک — لذّت عیش و قوت امساک
دل کی جب تک نہ یہ تمنّا لے — بات چالے نہ دیوے ٹھہرا لے
خود تو ہے تلخ پر نشا شیریں — جان شیریں کرے فدا شیریں
اس سے برباد نام گٹکی کا — لے نشا اس کا کام گٹکی کا
فرش سے عرش تک ہے دل کو طیر — آنکھیں بند اور کل جہاں کی سیر
ہے تغافل میں اس کے ہشیاری — ظاہرا خواب و خُفیہ بیداری
گرچہ ظاہر میں چشم بند رہے — اس کا بیہوش ہوش مند رہے
جو ہے اس کے خمار کا جھونکا — بس ہے بادِ بہار کا جھونکا
داغ غم اس کا اس قدر کھایا — پوست لالہ نے اپنا کھینچوایا
سوسن اس سے فقط نہ محزوں ہی — جام لالہ بن اس کے پر خون ہی
غم سے لالہ نے اس کے دل چیرا — پی کے خشخاص ہو گئے شیرا
خال خوبان ہے حبۂ افیون — خشک نافہ کا رشک سے ہی خون
ہے یہ رنگنے سے کچھ نہیں خالی — اس سے آنکھوں میں آئی ہی لالی
ڈورے آنکھوں کے لال ہوتے ہیں — صید خوبوں کے جال ہوتے ہیں
نشہ اس کا ہے نور دل بے شک — حسن کے دیکھنے کی ہے عینک
راہ چلنے میں تقویت آوے — اس سے منزل بخوبی کٹ جاوے
دوست باوفا ہے بے شک یہ — جان جاوے نچھوڑے تب تک یہ
جب کہ آنکھوں میں رنگ لائے ایم — پھر ہے زیرِ نگین ہفت اقلیم
نہ ملا گرچہ لالہ نے چاہا — داغ دل کو کسو نے کا بجھایا
جبکہ نکلا کسو نیا افیون سے — پھر سیاوش کے کم نہیں خون سے
عرق بید مشک قربان ہے — نشہ کی لہر زلف پیچان ہے

قطرہ میں بحر کا طلاطم ہے — اس کا جھونکا فلاطون کا خم ہے
پر کسو بنے سے جب کہ ہو کف دست — جام جم اس کے آگے پھر ہے پست
جون گہر بحر میں نشے کے ہیں غرق — سوجھی ہے لے کے غرب سے تا شرق
کف خوباں میں جب کسو نب ہو — لگے موسیٰ کا دست بیضا ہو
شکم شیر گاؤ میں بونے — ہو خجل سحر سامری اِس سے
لُطف صہبا ہے اس کا افزوں تر — خون مینا ہے اس کی گردن پر
ساغر بادہ کو خجل یہ کرے — آنکھیں بھر لا کے سر کو پھوڑ مرے
رشک سے اس کے رہ گئی ہے دنگ — دل ہی دل میں گھٹے ہے اپنے بنگ
چاہیئے اس کے ساتھ شیرینی — دیکھیئے پھر نشے کی رنگینی
قند ہر بات میں گھُلے ہے پھر — گل کے مانند دل کھُلے ہے پھر
خون فرہاد بس کسو پیتا ہے — جان شیریں کو کس کی پروا ہے
آسمان سیر ایک گھوڑا ہے — اور مُعلّف پھر اس پہ کوڑا ہے
وصف سمجھو بڑھا دیا میں نے — عیب تھا پر ہُنر کیا میں نے
ورنہ دونوں سے مجھ کو ذوق نہیں — مطلقاً بلکہ ان کا شوق نہیں
پر ہیں نواب میس فرماتے — بضرورت ہیں خرچ میں لاتے
نجم دولہ خطاب اُن کا ہے — بندہ اک ماہتاب اُن کا ہے
ہیں بہادر حسین یاور خان — بلکہ ہیں در حسین یاور خان
یہ مطلب ہے ان کی خوشنودی — ہے خوشی اُن کی میری بہبودی

نظم گو یہ پسند حضرت ہو
اس کا انعام مجھکو رخصت ہو

منظور

شیخ محمد منظور ولد شیخ عبد اللہ بلدرم التریمی الیمنی القریشی منظور تخلص کرتے تھے ان کے آباؤ اجداد عرب سے ہندوستان تجارت کے سلسلہ میں آئے اور سورت میں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوگئے۔ ان کا آبائی مکان سورت کے محلہ سید واڑہ میں چند سال پہلے تک موجود تھا اس خاندان کا چشم و چراغ میاں محمود بلدرم منظور کا پوتا پندرہ سال ہوئے دنیا سے جوان چل بسا۔ راقم کے اُن سے دوستانہ مراسم تھے۔

منظور نے قدیم طریقہ کے مطابق خانقاہ عید روسیہ کے مکتب میں عید روسی خاندان کے بزرگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور بعدۂ سورت کے ایک عالم فاضل معلم ابراہیم معلم و خطیب جامع مسجد بمبئی کے سامنے زانوے ادب تہہ کیا۔ ایک مثنوی میں اپنے اُستاد کی تعریف و توصیف میں چند شعر بطور نذر عقیدت سُپرد قلم کئے ہیں۔

منظور کو خُدا نے علم و ادب کے ساتھ شعر و سخن کا بھی ذوق عطا کیا تھا۔ ابتدا سے اس کی طرف طبیعت مائل تھی۔ اس زمانہ کی علمی ادبی صحبتوں نے منظور کو اپنے شوق کو پورا کرنے کا موقع دیدیا اور سونے پہ سُہاگہ سمجھو جیسے اُستاد باکمال نے ان کا ہاتھ پکڑا تو یہ اپنے اُستاد کی زندگی ہی میں اُستادان فن کی صف اوّل میں جگہ پانے کے قابل ہوگئے۔

منظور نے ۱۳۰۸ھ میں انتقال کیا ان کے ایک شاگرد نے ولادت و وفات کا قطعہ کہا ہے۔ جناب مولوی محمد منعم صاحب باعکلہ خطیب جامع مسجد بمبئی ؎

کامل عصر محمد منظور افتخار علماء و فضلا
رخت بربست چو سوے فردوس شور و فریاد و فغان شد پیدا
سن میلاد فرح افزایش بود از شاعر سورت پیدا
۱۲۳۷ھ

چوں برآں لفظ الم افزودم یافتم سالِ وفات او را
یعنی منعم بدلِ زار و حزیں الم شاعر سورت گفتا
۱۳۰۸ھ

منظور اُردوٗ اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ صاحب تاریخ گجرات کے بیان کے مطابق منظور سے نثر اور نظم میں کل سات تصانیف یادگار ہیں۔ ۱۲۸۶ھ میں سورت سے منظور الاخبار کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا لیکن برس چھ مہینے ہی میں اس کا عدم و وجود برابر ہوگیا۔ فارسی دیوان کا تو پتہ نہ چلا مگر اُردوٗ غزلوں کا ایک ردیف وار مجموعہ بمبئی سے ۱۲۶۹ھ میں شائع ہوچکا ہے۔ غزل اور مثنوی دونوں میں دبستانِ لکھنؤ کے پیرو تھے۔

منظور جہانی اور جگر سوز دو بزمیہ مثنویاں بھی منظور سے یادگار ہیں۔ اول الذکر کا سنہ تصنیف ۱۲۶۵ھ اور موخر الذکر کا ۱۲۶۹ھ ہے۔ دونوں مثنویاں بمبئی سے شائع ہوچکی ہیں۔ مجموعۂ کلام اور مذکورہ بالا مثنویاں جناب عبدالقادر صاحب منیجر دواخانہ

معین الصحت سورت کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان مثنویوں کے متعلق بزمیہ مثنویوں کے سلسلہ میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ منظور نے دیوان دکنی بھی مرتب کیا تھا۔ یہ ۱۲۹۰ھ میں بمبئی سے شائع ہوچکا ہے۔ نثر میں ایک اور تصنیف گلدستہ نشاط و سرور بھی پائی جاتی ہے ، ۲ شعر ت ایک مثنوی اپنے استاد سجو کی مثنوی افیونی نامہ کے جواب میں یعنی در مذمت افیون بھی لکھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۲۶۵ھ ہے اور بمبئی سے سجھو کی مثنوی کے ساتھ شائع ہوچکی ہے۔ منظور کی ایک اور مثنوی دریا موج بھی دستیاب ہوئی ہے۔ اس کا موضوع دریائے تپتی کا سیلاب ہے۔ بتاریخ ۱۲ ذی قعدہ بروز یکشنبہ ۱۳۰۰ھ میں دریائے تپتی میں بہت ہولناک سیلاب آیا تھا۔ شہر کے بیشتر حصوں میں دریا کا پانی پھیل گیا تھا۔ نواب اور بخشی اپنے ہاتھیوں پر سوار ہوکر مختلف حصوں میں تین روز تک اشیائے خور و نوش تقسیم کرتے رہے اور دیگر افسران اعلیٰ نے شہر میں پانی گھس نہ آئے اس کی روک تھام کیلئے بڑی جد و جہد کی ۔ انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا تھا۔ اس زمانہ کے میونسپل سکریٹری ننھو میاں کی خدمات نہایت قابل داد تھیں۔ مثنوی کے ابتدائی حصہ میں ملکہ وکٹوریہ۔ لارڈ رپن۔ سر فرگسن گورنر بمبئی۔ کلکٹر مسٹر وائٹ اور نواب میر غلام بابا۔ بخشی میر عظیم الدین۔ میرزا ذوالفقار علی۔ قاضی میر معصوم علی۔ راؤ بہادر جگ جیون داس۔ گلاب داس پرسوتم داس۔ ڈوسابھائی۔ منوچہرجی۔ جمشید جی اینٹھی وغیرہ اکابر شہر کی تعریف و توصیف اور خدمات پر قریب ۸۶ اشعار لکھے ہیں۔ مثنوی کا دوسرا حصہ سیلاب کی تفصیلات اور اہل بمبئی کے جود و سخا سے متعلق ہے اور یہ ۳۱۳ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار یہ ہیں

۱۸۸۳ء علیسوی کا سنو تم بیاں — اٹھارہ سو اور تھے تراسی عیاں
جو لائی کی تاریخ تھی دوسری — بجے سات شب کے تو تپتی چڑھی
اسی وقت سے آمد آب تھی — رواں زور سے موج سیلاب تھی

شیخ بہادر بخشو میاں نے تاریخ تصنیف کہی ہے ؎

چو شد ایں مثنوی سیل تصنیف — ز فکر شیخ منظور دل آگاہ
عبور بحر تپتی سال خوب است — شود ایں نسخہ اش مقبول دلخواہ
۱۳۰۰

نمونۂ کلام ۔ دریائے موج

تھی شدت بہت ریل و برسات کی — خراب اوس گھڑی سب کی اوقات تھی

اساس الملکان خوب تھا جن کے پاس — وہ ذی آبرو ہوگئے بے اساس
ہوا گھر کا اسباب سب سیل برد — رہا کچھ جوں خسم مٹی میں زرد
ہوا حال غربا کا یاں تک تباہ — تھے آنکھوں میں آنسو تو ہونٹوں پہ آہ
مکان غریباں شدہ برج حوت — شدہ دردِ الجوع زاں بہر قوت
نہ از بہر خوردن طعامی بماند — نہ از بہر نوش آب جائی بماند
علاوہ الم بے لباسی کا تھا — تھی آب رواں کی بدن پر قبا (کپڑا)
جو تھے اہل قدرت اور اہل اساس — ملا موج دریا کا ان کو لباس (کپڑا)
ہوئے پارسی جب کہ زیر و زبر — تو کشتی کو سمجھے وہ کشتی مگر (کشتی)
جو گرجا ہے تپتی کنارے کے پاس — ادھر چوک بازار ہے خوش اساس
سحر کو ادھر سے بڑھا زور آب — کیا شہر بازار اوس نے خراب
محلوں میں سیلاب کا زور تھا — تو ہر گھر میں گھر والوں کا شور تھا
خدا کے لئے کشتی لاؤ شتاب — ہے اب ریل سے گھر کے طبقے سحاب
نہ ہم مثل بارش زمیں پر گریں — ہوں غرقابہ یا بط سے تیرتے پھریں
کنارے پہ ہے جو کمیٹی کا باغ — لگی واں سے ریل آئے پھر با فراغ
جو سیلاب کا زور تھمتا نہ تھا — قدم اسپ تازی کا جمتا نہ تھا
ہر ایک کو بہ کو بحر زخار تھا — دم سرد کا گرم بازار تھا
غریبوں کا نالہ لب بام تھا — تھا ماتم سرا شہر کہرام تھا
سنبھلنے کی گردوں نے فرصت نہ دی — بنی جوئے اشک اون کی تپتی ندی
تھی طوفان نوح نبی کی سی دھوم — ہوا کو بکو کشتیوں کا ہجوم
تھی خاکی بگولے کی گردش جہاں — نظر آئے کشتی کے واں بادباں
جہاں گاڑیاں گھوڑے دوڑاتے تھے — وہاں بجرے مچھوے نظر آتے تھے

افیونی نامہ

وصف افیون کے لکھنے کا ہو اثر — خامہ پینک سے ہے جھکائے سر
کیا ہیوست کو اس کی کیجئے رقم — ہوگئی خشک بس زبان قلم
خشک خون تن کو زار کر دیوے — گل اگر ہو تو خار کر دیوے

گل جو عادی ہو اس کا صبح و شام — غنچہ سان سر بجیب رہوے مدام
نازنینوں کو بھی ہے اس سے نیاز — سجدۂ سہو ہے بس اس کی نماز
جائز اس میں نہیں قعود و قیام — بن رکوع و سجود سب ہے حرام
تیرا آسا اگر جوان دیکھا — کھائی افیون تو پھر کمان دیکھا
فکر باطل ہے اک زمانے کی — کس کو فرصت ہے سر اٹھانے کی
تین دن اس کو گر فرشتہ کھائے — آسمان کی طرف وہ سر نہ اٹھائے
چاہ کر آپ کو ڈبونا ہے — پیسے دے کر غلام ہونا ہے
اس سے خون خشک اور نحیف ہو تن — ہے یہ خونخوار جان کی دشمن
ناتوانی کو ہے ہمیشہ زور — یہ سلیمان کو بھی کردے مور
آدمی کی بگاڑ دے سیرت — جیتے جی کر دے مُردہ کی صورت
اس کے جو آئے چاٹ اور دم میں — زرد رو ہووے سارے عالم میں
مدت العمر اسیر ہوتا ہے — اس کا کھایا حقیر ہوتا ہے
بعضے مرضوں کی یہ دوا ہے پر — مرض الموت سے ہے خود بدتر
اس کو غرہ کو کھائے تو تا سلخ — منہ تو کیا زندگی بھی ہووے تلخ
اس سے کیا خاک ہو کسی کو فتوح — قابض ایسی کہ مثل قابض روح
ہے یہ تعزیر اس کے کھانے میں — قید ہوتے ہیں پاخانے میں
بیٹھے دل تنگ مثل غنچۂ گل — پیچ کھاتے ہیں صورت سنبل
پہر دن گزرے سونگھتے بدبو — غنچۂ گل ہو تو کچھ فراغت ہو
یہ دعاگو ہیں بس فراغت کے — بند دروازے ہیں اجابت کے
اس کا کھانا ہے انفعال اتم — سرکشوں کی ہے اس سے گردن خم
اس کا کھانا ہے اک وبال جاں — جیسے ہونا ہے سیر بھوکھ کہاں
ایسے عاشق ہیں چیز شیریں کے — کوہکن کے رقیب ہیں جیسے
اپنا کھاتے ہیں آپ گوشت مدام — آنکھیں چیتوں کی طرح بند دوام
ان کو کھانے سے گر ہو کچھ رغبت — جھو کے کھانے سے ہووے کب فرصت
لوگ ہنستے ہیں خود ہیں پینک میں — ہاتھ جاری ہیں دونوں خشتک میں
آدمیت کا ذکر کیا ہے لیک — چاہے کھجلانے کو کھریرا ایک

گر چمن کو ہوا لگے اس کی — کبھی آنکھیں کھُلیں نہ نرگس کی
ہے کسو بیٹھے کے وقت آپس میں — جھوٹے چلے ہزارہا قسمیں
عُذر ظاہر میں ہے یہ مطلوب — کچھ زیادہ جو اور دیں تو خوب
یہ تو فی الواقعی بُری ہے مگر — اس کا ہمدم ہے اس سے پھر بدتر
کون وہ یعنے حقۂ پر پیچ — قبر کی جس کے آگے بد بو ہیچ
ہر نفس جس سے زندگی برباد — سوختہ عقل معاش و فکر معاد
جاگتے میں ہے یا کہ خواب میں ہے — جیتے جی جان اک عذاب میں ہے
منھ کے آگے چلم کی آگ کی بھانپ — منخریں اور منھ میں دود کے سانپ
کوئی غنچہ دہن پیئے اس کو — اُس کے بوسہ سے جی کو نفرت ہو
اس کا اک گھونٹ بھی اگر پیجے — غرغرے سو گلاب سے کیجے
اوج بر اوج ہے نشہ ہر دم — دم عیسیٰ ہے حقہ کا ہر دم
بس تماشائی بحر اور بر ہے — دور قلیان موج عنبر ہے
اس سے اک مو برابری نہ کرے — ہمسری گیسوے پری نہ کرے
سنبل اس رشک سے نہ کیوں جل جائے — زلف خوبان کے بھی دھوئیں یہ اوڑائے
صدقہ اس کی چلم پہ بلبل ہو — جل گئے پر بھی جس میں اک گل ہو
نَے قلیان نے شکر سے ہے خوب — کیونکہ شکر لبوں کی ہے مرغوب
اس کو ہر دم ہے قُرب محفل میں — کیوں نہ کٹ جائے نیشکر دل میں
نیشکر اس سے تلخ کام مدام — ہے گرہ در گرہ بس اس کا کام
پیچ پیچے کا زُلف پیچاں ہے — یہ نہ ہو گر تو دل پریشاں ہو
طرفہ تیغ دو دم ہے اس کا کُم — قطع جس سے ہو ہر طرح کا غم
خوبرو اس کو مُنھ لگاتے ہیں — بخوشی اس کے دم میں آتے ہیں
تازہ ہر دم ہے آبرو اس کی — بزم میں جا ہے روبرو اس کی
اس سے جُز حق کوئی سخن نہ کہے — شاہ بھی ہو پہ دم ہی مار رہے
لب دلیری سے کام بر آوے — یہ بہ پیغام بوسہ دلوادے
حُقہ ہے یار و ہمدم خاطر — اس سے برباد ہو غم خاطر
بس یہ افیون کا یار ہے دل سوز — گرم ہنگامہ اس سے ہے شب و روز

خُقّہ کش کے یہاں جو آگ نہو   جائے دوزخ میں آگ لینے کو
ادب آدمیّت اس سے کم   منہ کو نئے سے لگی ہوئی ہر دم
خود نشہ میں ہیں چُپ نہ گفت شنید   جیسے تیغ دو دم کے ہیں یہ شہید
پیچوان ان کا ایسا آئے نظر   منہ سے آنتیں نکل پڑیں باہر
اس کی خاطر کریں فسوں سازی   بس یہ بالکل ہے شغل دم بازی
گر نہ بد واقعی یہ سرکش ہو   زہرہ کیوں آب و سر پہ آتش ہو
حُقّہ کے واسطے سلام کریں   دم دلا سے کے سو کلام کریں
مرتے ہیں نام پہ یہ حُقّہ کے   جیتے بھی ہیں تو حُقّہ کے دم سے
حُقّہ ہے پائخانے میں بھی پسند   گل تمبا کو ہے انہیں گل قند
حُقّہ دینے میں ہے جوان کو درنگ   دودھ کی طرح ہووے ان کا رنگ
پیچ نیچے کی طرح کھاتے ہیں   شعر طعنہ سے یہ سُناتے ہیں
کشتی حُقّہ رار وان سازی   نہ کہ گیری و لنگر اندازی
مجکو اس نظم کی تھی خواہش   پر کھی میں نے حسب فرمایش
طعن مجُکو نہیں گوارا ہے   نہ کنایہ ہے نے اشارا ہے
بلکہ بعضے ہیں مہرباں میرے   کہ جو عادی ہیں ایسی چیزوں کے
عذر گُستاخی ان سے ہے منظور   کیونکہ معذور ہیں سدا معذور
للہ الحمد ہے یہ عین شعور   ہوئے تارک جو بندگان حضور
ہیں جو منصف، وہ بولے سب سن کر   ترک تریاک و حقہ ادلا تر

معاصرین سے التماس

ہم اپنے معاصرین سے ملتمس ہیں کہ "نوائے ادب" کے ضمیمۂ مقالہ نُما کی ترتیب کو جامع اور ہمہ گیر بنانے میں، ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں جس کی بہترین صورت یہ ہے کہ اپنی مطبوعات و رسائل کی ایک ایک جلد مندرجۂ ذیل پتوں پہ ارسال فرمائیں۔

(۱) سکریٹری دائیٹرس امپوریم لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵۸ بمبئی ۱
(۲) سکریٹری انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
۹۲، دادا بھائی نوروزجی روڈ بمبئی ۲

محمود میاں رونق

سید حسن صاحب، اسسٹنٹ پروفیسر صدر شعبۂ فارسی
(پٹنہ کالج، پٹنہ)

رونق کے جو ڈرامے گجراتی رسم الخط میں میرے پاس ہیں اُن میں طباعت کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ ان ہی غلطیوں کی وجہ سے بعض جگہ اشعار ناموزوں ہوگئے ہیں۔ بعض جگہ الفاظ کے غلط چھپ جانے سے شعروں کا مطلب خبط ہوجاتا ہے۔ جہاں تک ہو سکا ہے میں نے اشعار کو موزوں بنانے کی کوشش کی ہے، اس پر بھی اگر بعض نقل کردہ اشعار ناموزوں ہیں تو اصل کتاب کا قصور ہے۔ میں نے ان مقامات پر خط کھینچ دیا ہے۔ سید حسن

رونق اُردو کے اوّلین ناٹک نگاروں میں سے تھے۔ امانت مُصنّف اندر سبھا کے بعد جس بزرگ کا نام اُردو ڈراما نگاری میں آتا ہے، وہ رونق ہی کا ہے۔ اُردو میں ڈراما نگاری پر پہلی اور مستقل و باضابطہ تصنیف نور الٰہی محمد عمر صاحبان کی کتاب، ناٹک ساگر، ہے جہاں تک راقم السطور کو علم ہے، پہلے پہل اسی کتاب میں رونق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس ناٹک نگار کے متعلق جس قدر غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے شاید ہی کسی دوسرے مُصنّف کے بارے میں پھیلی ہو۔ رونق کے نام، کام اور وطن، سب کے متعلق بے احتیاطی اور بے پروائی کی وجہ سے غلط باتیں مشہور کر دی گئی ہیں۔

رونق کا تذکرہ مندرجۂ ذیل کتابوں اور مضامین میں پایا جاتا ہے:-

کتابیں۔

۱۔ ناٹک ساگر

۲۔ رام بابو سکسینہ کی تالیف ہسٹری آف اُردو لٹریچر (اصل کتاب بزبان انگریزی)

۳۔ تاریخ ادب اُردو۔ از مرزا حسن عسکری، رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب کا اُردو ترجمہ،

۴۔ اُردو میں ڈراما نگاری۔ از بادشاہ حسین حیدر آبادی۔

۵۔ اُردو ڈراما۔ از عبد السّلام خورشید۔

۶۔ ادب اور زندگی (مضمون بعنوان ہندوستانی ناٹک) از مجنوں گورکھپوری۔
۷۔ خم خانہ جاوید۔ از لالہ سری رام۔ جلد سوم۔

مضامین۔

۱۔ نامۂ احسن۔ از سید مہدی حسن احسن لکھنوی۔ مطبوعہ رسالہ بہارستان لاہور، بابت جنوری ۱۹۲۷ء
۲۔ ہندوستانی ڈرامے۔ از حکیم یوسف حسن۔ مطبوعہ رسالہ نیرنگ خیال لاہور بابت جولائی ۱۹۲۷ء
۳۔ اُردو ڈراما، از محمد حسین ادیب، مطبوعہ رسالۂ ہمایوں، لاہور بابت جون ۱۹۳۴ء
۴۔ ڈراما آغا حشر سے پہلے، از وقار عظیم، مطبوعہ رسالہ 'ماہ نو' کراچی، بابت جولائی ۱۹۵۳ء
۵۔ آغا حشر اور ان کے بعض معاصرین۔ از ڈاکٹر عبدالعلیم نامی، مطبوعہ رسالہ نوائے ادب بمبئی بابت جولائی ۱۹۵۳ء
۶۔ اُردو ڈرامے کا تدریجی ارتقا۔ از درد گورکھپوری۔ مطبوعہ رسالہ آج کل، دہلی، بابت ستمبر ۱۹۵۳ء

مذکورۂ بالا کتابوں اور مضمونوں کے حوالے سے میں یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ قابل مُصنّفوں اور مضمون نگاروں نے کبھی تو لاعلمی اور کبھی بے پروائی کی وجہ سے رونق کے متعلق کیا کیا غلط فہمیاں پھیلائی ہیں اور اصل حقیقت کیا ہے۔

سب سے پہلے رونق کے نام کا معاملہ سامنے آتا ہے۔ خم خانۂ جاوید، میں اُن کا نام محمود میاں بتلایا گیا ہے ناٹک ساگر میں نام نہیں دیا گیا ہے، صرف تخلّص کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ احسن لکھنوی، رونق کے ہم عصر تھے۔ لیکن انھوں نے بھی اپنے مضمون میں ان کا اصلی نام نہیں بتایا ہے بلکہ صرف 'منشی رونق مرحوم' لکھا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے ان کا پورا نام مع تخلّص یعنی محمود میاں رونق، لکھا ہے۔ لیکن ان کے مترجم مرزا احسن عسکری صاحب نے نام کو اُڑا کر صرف رونق لکھا ہے۔ حکیم یوسف حسن صاحب نے ان کا نام میاں محمود خاں بتایا ہے۔ بادشاہ حسین حیدر آبادی نے صرف تخلّص سے یاد کیا ہے، عبدالسلام خورشید نے انھیں منشی محمد میاں رونق کہا ہے۔ مجنوں گورکھپوری،

وقار عظیم، محمد حسین ادیب، درد گورکھ پوری اور عبدالعلیم نامی صاحبان نے صرف تخلص ہی لکھنا پسند کیا ہے۔

جس طرح رونق کے نام کے بارے میں تاریخ نگاروں نے تھوڑا اختلاف پیدا کر دیا ہے، اسی طرح رونق کے وطن کے متعلق بھی غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ احسن لکھنوی حکیم یوسف حسن اور عبدالسلام خورشید کے سوا باقی سب متذکرہ بالا مصنفوں اور مضمون نگاروں نے انہیں بنارسی لکھا ہے۔ احسن لکھنوی نے ان کو دکھنی بتایا ہے۔ حکیم یوسف حسن نے ان کا وطن ' احمد آباد ضلع دکن' لکھا ہے۔ عبدالسلام خورشید نے ناٹک ساگر، اور احسن لکھنوی دونوں کی رائیں بیان کی ہیں۔

سب سے زیادہ دل چسپ غلط فہمیاں رونق کی تصانیف کے متعلق پیدا ہوئی ہیں۔ 'خم خانۂ جاوید' میں اتنا لکھا ہے کہ "متعدد ناٹک انگریزی سے ترجمہ کیجئے"۔ لیکن کسی ناٹک کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ 'ناٹک ساگر' میں بھی رونق کی کسی تصنیف کا تذکرہ نہیں ہے۔ احسن لکھنوی نے ان کی تصانیف اور شاعری پر تنقید کی ہے اور ایک ناٹک "محمود شاہ کا تماشا" کا تذکرہ کیا ہے۔ جسے ان کی تصانیف کا 'گل سرسبد' بتایا ہے اور یہ لکھا ہے کہ "عاشق کا خون" لکھ رہے تھے اور کسی محبوب کے ستائے ہوئے تھے، جفا شعار معشوق کی کج ادائی کی تاب نہ لاسکے اور اُسترے سے گلا کاٹ کر مرگئے۔ عاشق کا خون نکلنے سے پہلے خونِ عاشق کی خبر باہر نکلی"۔ رام بابو سکسینہ نے اپنی انگریزی کتاب میں رونق کے صرف ایک ناٹک ' انصاف محمود شاہ' کا نام لکھا ہے۔ اور یہ لکھا ہے کہ " یہ ناٹک بمبئی میں ۱۸۸۲ء میں گجراتی 'کیرکٹر' میں طبع ہوا تھا"۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ 'گل سرسبد' اور 'گجراتی کیرکٹر' کے فقروں سے مابعد کے مصنفوں نے کیا کیا معنی نکالے ہیں۔ عبدالسلام خورشید نے احسن لکھنوی کی عبارت کو توجہ سے نہیں پڑھا۔ انھوں نے 'گل سرسبد' کے مطلب کو بالکل نہیں سمجھا اور لکھ مارا کہ 'آپ (رونق) کے دو مشہور ڈرامے، گل سرسبد' اور عاشق کا خون ہیں (اردو ڈراما۔ صفحہ ۲۱، طبع اوّل، مکتبہ اردو، لاہور)۔ رام بابو سکسینہ کے قابل و فاضل مترجم مرزا احسن عسکری نے جنھوں نے برسوں مرکزی حکومت کے دفتر کے کاغذات کا اردو ترجمہ کیا ہوگا، لفظ 'کیرکٹر' کا (جس کے معنی حروف کے ہیں) ترجمہ زبان کردیا۔ (تاریخ ادب اردو۔ صفحہ ۱۵۲ حصۂ نثر)۔ اس غلط ترجمہ کی وجہ سے بادشاہ حسین حیدرآبادی کو عجیب مغالطہ ہوا۔ انھوں نے مرزا عسکری کے ترجمے کو مآخذ بنا کر لکھا کہ " رونق کا

ایک ڈراما انصاف محمود شاہ جو گجراتی زبان میں ہے بمبئی سے شائع ہوا" اور اس پر اپنی طرف سے اس اڈیٹوریل نوٹ کا اضافہ کیا۔ "بمبئی میں قیام کی وجہ سے غالباً انہیں گجراتی زبان میں کافی دخل ہوگیا تھا" (اردو میں ڈراما نگاری۔ صفحہ ۱۲۶) وقار عظیم اور ڈرد گورکھپوری دونوں نے زبان کے مضمون کو مبہم ہی رہنے دیا ہے کیونکہ انھوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "ان کا ایک ڈراما انصاف محمود شاہ ۱۸۸۲ء میں گجراتی میں چھپا تھا (وقار عظیم)" "انصاف محمود شاہ ان کا مشہور ڈراما ہے جو گجراتی میں ۱۸۸۲ء میں بمبئی سے شائع ہوا ہے (ڈرد گورکھپوری)

رونق یا ان کے عہد کے دیگر ناٹک کاروں کے بارے میں جو اس قدر غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اُس دَور کے ناٹک اب تقریباً ناپید ہیں۔ اردو ادب میں پہلے ڈراما کو کوئی رُتبہ حاصل نہیں تھا۔ لوگ ڈراما کو مہذب اور متین چیز نہیں سمجھتے تھے۔ اور اعلیٰ درجے کی سوسائٹی میں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی۔ یہ صنف ادب اُس وقت پست درجے کے شاعروں اور کم سواد مُصنفوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو ادب کے مورّخوں یا تذکرہ نگاروں نے ناٹکی تصنیف کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور اُردو ناٹک عدم اعتنا کی وجہ سے ضائع ہوگئے۔ موجودہ دَور میں جب نقّادوں اور مورخوں نے ادھر التفات کیا تو تمام تصانیف لاپتہ ہوچکی تھیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ابتدائی دَور کے ناٹک اور ان کے گانوں کی کتابیں پارسی کمپنیاں چھپواتی تھیں اور ان میں زیادہ تر گجراتی رسم الخط استعمال ہوتا تھا۔ کیونکہ تجارتی نقطۂ نظر سے یہ طریقہ زیادہ نفع بخش تھا۔ اُردو ادب کے اکثر تاریخ نگاروں کو گجراتی رسم الخط سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کتابوں سے لاعلمی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سُنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے جو جی میں آیا لکھ دیا۔

میرے پاس ابتدائی دَور کے ناٹک نگاروں کی متعدد تالیفات کے ساتھ ساتھ رونق کے بھی چند ناٹک موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے رونق کے کچھ حالات بتائے جاسکتے ہیں اور ان کی تصانیف کے متعلق تھوڑی بہت رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ رونق کے یہ سب ناٹک گجراتی رسم الخط میں ہیں۔

رونق کے ان ناٹکوں پر مُصنّف کا نام اس طرح درج ہے، "منشی محمود میاں متخلّص بہ رونق"۔ ان میں سے اکثر ناٹک مُصنّف کی زندگی میں چھپے ہیں لہذا اس نام کو صحیح مان لینا ہوگا۔ حکیم یوسف حسن صاحب نے اپنے مضمون میں رونق کے ناٹک

"سیف السلیمان، عرف مرحوم معصوم، کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے مُصنّف کا نام "میاں محمود خاں صاحب رونق" بتایا ہے۔ چونکہ حکیم صاحب کے قول کے مطابق یہ ناٹک اُن کے پاس موجود ہے لہذا ان کی تحریر میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن اتنا تو ضرور یقین ہے کہ حکیم صاحب نے یا کاتب نے رونق اور ناٹک کے نام میں کچھ تبدیلی کر دی ہے۔ جس ناٹک کا حکیم صاحب نے تذکرہ کیا ہے اس کا اصلی نام سیف السلیمان عرف معصوم معصومہ، ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ 'خاں' کا لفظ بے احتیاطی سے حکیم صاحب یا کاتب نے بڑھا دیا ہو۔ برٹش میوزیم کی لائبریری میں جو ہندوستانی زبان کی مطبوعات کی فہرست ہے اُس میں بھی رونق کا نام صرف 'محمود میاں' دیا ہوا ہے۔

رونق کے وطن کے متعلق جو ناٹک میرے پاس ہیں اُن سے کسی بات کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ان ناٹکوں کی زبان سے اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ بنارسی نہیں بلکہ دکنی تھے۔ احسن لکھنوی نے بھی اُن کے بنارسی ہونے کی خیال کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ اُن کے لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بمبئی کے ساکن تھے۔ احسن لکھنوی رونق کے ہم پیشہ اور ہم عصر تھے۔ وہ جس قدر یقین کے ساتھ اس امر کے متعلق کہہ سکتے تھے کوئی دوسرا نہیں کہہ سکتا تھا۔ حکیم یوسف حسن نے بھی رونق کو دکنی ہی بتایا ہے کیونکہ سیف السلیمان، پر اُن کا وطن "احمد آباد ضلع دکن، لکھا ہوا ہے۔ لیکن یہاں پر 'احمد آباد' کے نام کی وجہ سے شُبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر 'احمد آباد' سے مُراد وہ احمد آباد شہر ہے جو بمبئی صوبے میں ہے تو پھر رونق گجراتی تھے۔ اور اگر 'دکن' کا کوئی قصبہ یا گاؤں مُراد ہے تو رونق یقیناً دکنی تھے۔

رونق کب تک حیات تھے؟ اس کے متعلق بھی صحیح طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ 'خُم خانۂ جاوید' کے مولف کا خیال ہے کہ 'وہ ۱۸۹۲ء کے قریب حیات تھے اور بمبئی میں رہتے تھے۔ اب (یعنی ۱۹۱۷ء جبکہ یہ کتاب لکھی گئی) عرصہ سے کچھ حال معلوم نہیں۔ احسن لکھنوی ۱۸۹۳ء میں پہلے پہل بمبئی پہنچے ہیں تو رونق کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن احسن لکھنوی نے یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ اُن کے بمبئی پہنچنے سے کتنے برس پہلے رونق مر چکے تھے۔ اس سلسلے میں ہمیں سب سے زیادہ مستحکم سند خود رونق کی تصنیفات سے ملتی ہے۔ ناٹک "فریب فتنہ" پر جو ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا ہے، مُصنّف کا نام سرورق پر "منشی محمود میاں متخلص بہ رونق" ہے۔ لیکن

ناٹک "جفائے ستمگر" میں جو ۱۸۸۶ء میں دوبارہ طبع ہوا ہے، مُصنّف کا نام یوں درج ہے۔ "مرحوم منشی محمود میاں متخلص بہ رونق" چند اور ناٹکوں میں بھی جو ۱۸۸۶ء کے بعد طبع ہوئے ہیں اور جن کی دوسری اشاعت ہے، رونق کو مرحوم ہی لکھا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رونق کا انتقال ۱۸۸۶ء میں ہوگیا تھا۔ "فریب فتنہ" کی اشاعت اس سال اُن کی موت سے پہلے اور 'جفائے ستمگر' کی دوسری اشاعت موت کے بعد ہوئی۔ اس طرح 'خم خانۂ جاوید' کے مولف کا قول غلط ثابت ہوجاتا ہے۔

رونق کے ۹ (نو) ناٹک میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ اور وہ سن طباعت کے لحاظ سے بقرار ذیل ہیں:-

۱۔	عجائبات پرستان	عُرف	بہارستان عشق	۱۸۸۳ء	بمبئی
۲۔	غرور رعد شاہ	عُرف	چندا حور و خورشید نور	ستمبر ۱۸۸۵ء	بمبئی
۳۔	فریب فتنہ	عُرف	چاہت زر	۱۸۸۶ء	بمبئی
۴۔	جفائے ستمگر	عُرف	گھڑی کی گھڑیال	۱۸۸۶ء	بمبئی
۵۔	نقش سلیمانی	عُرف	شدّادی بہشت	۱۸۸۸ء	بمبئی
۶۔	حاتم بن طے	عُرف	افسر سخاوت	؟	۔ (دوسری اشاعت)
۷۔	طلسم زُہرہ	عُرف	رنج کا بدلہ گنج	؟	
۸۔	خواب محبّت	عُرف	نادان کی دوستی اور جی کا جنجال	؟	
۹۔	عاشق کا خون، دامن پہ دھبہ	عُرف	دولت کا پیار، چاہت سے عار	؟	(دوسری اشاعت)

مذکورۂ بالا ناٹکوں میں نمبر ۶، ۷، ۸، اور ۹ پر، سال طباعت مُندرج نہیں ہے۔ لیکن سرورق پر مُصنّف کے نام اور تخلّص کے ساتھ 'مرحوم' لکھا ہوا ہے لہٰذا ان کے سال طباعت ۱۸۸۶ء کے بعد ہی ہو سکتے ہیں۔ ناٹک ۶ اور ۹ کی دوسری اشاعت ہے۔ ان کی پہلی اشاعت ۱۸۸۴ء یا اس سے پہلے ہوچکی تھی۔ کیونکہ 'عجائباتِ پرستان' کے آخری صفحے پر جو ۱۸۸۴ء میں چھپا ہے، ناٹکوں کی ایک فہرست درج ہے، اس فہرست میں یہ دونوں ناٹک یعنی 'حاتم بن طے' اور 'عاشق کا خون' شامل ہیں۔ احسن لکھنوی کے مضمون سے یہ گمان ہوتا ہے کہ 'عاشق کا خون' رونق کا آخری ناٹک تھا جسے وہ شاید مکمّل نہ کرسکے۔ لیکن اس تفصیل

سے پتہ چلتا ہے کہ عاشق کا خون، کے بعد بھی رونق نے کئی ناٹک لکھے۔ دوسرے یہ کہ 'عاشق کا خون' کا جو نسخہ میرے پاس ہے وہ مکمل ہے۔

ناٹک نمبر۵ یعنی نقش سلیمانی، الفریڈ ناٹک کمپنی کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ فہرست بالا کے باقی سب ناٹک گروہ وکٹوریا ناٹک کمپنی کے لئے لکھے گئے تھے اور اُسی کے حکم سے 'اظہار' (شائع) کئے گئے تھے۔

مذکورۂ بالا ناٹکوں کے سوا رونق نے اور بھی بہت سے ناٹک لکھے ہیں۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں جو اُردو مطبوعات ہیں اُن کی فہرستوں میں رونق کے مندرجۂ ذیل ناٹکوں کے نام مع سال طباعت شامل ہیں:۔

۱۔	بے نظیر بدر منیر	بمبئی	۱۸۷۹ء
۲۔	لیلیٰ مجنوں	"	۱۸۷۹ء
۳۔	انجام الفت	"	۱۸۸۰ء
۴۔	پورن بھگت	"	۱۸۸۰ء
۵۔	سیف السلیمان	"	۱۸۸۰ء
۶۔	ہما شنا (؟)	"	۱۸۸۰ء
۷۔	عاشق صادق	"	۱۸۸۰ء
۸۔	انصاف محمود شاہ	"	۱۸۸۲ء
۹۔	غرور رعد شاہ عرف چندا اور خورشید نور	دہلی	۱۸۹۰ء
۱۰۔	نور الدین اور حسن افروز	"	۱۸۹۰ء
۱۱۔	کالکا بھوگ عرف گھڑی کی گھڑیال	"	۱۸۹۰ء
۱۲۔	چنبیلی گلاب	بمبئی	۱۸۹۶ء
۱۳۔	میاں پٹّو اور بی کھٹمل	"	۱۸۹۶ء

پہلی فہرست اور دوسری فہرست میں دو ناٹک مشترک ہیں۔ یعنی غرور رعد شاہ، اور گھڑی کی گھڑیال، جس کا پہلا نام پہلی فہرست میں 'جفائے ستمگر' اور دوسری فہرست میں 'کالکا بھوگ' ہے۔ اس طرح رونق کے ناٹکوں کی تعداد بیس ہوتی ہے۔ لیکن 'عجائبات پرستان' کے آخر میں ناٹکوں کی جو فہرست ہے اُس میں دو تین ناٹک اور بھی ہیں جو رونق کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسوس یہ کہ اس فہرست

میں مُصنّف کا نام درج نہیں ہے۔ رونق کے مذکورہ بالا سب ناٹکوں کے نام سلسلے سے آتے ہیں، اور اس کے درمیان 'ستم ہاماں'، 'فسانہ عجائب'، اور ظلم اظلم عرف جیسا دو ویسا لو، کے نام بھی موجود ہیں۔ 'ظلم اظلم' کے متعلق تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناٹک رونق کی تصنیف ہے۔ کیونکہ اس کی ایک غزل جسے مشہور گویّا ہرجی اردشیر نے گایا تھا بزم نشاط، عرف سونگ بُک مرتبہ پنڈت کنور گوری پرشاد ہمدم اکبرآبادی، مطبوعہ ۱۹۱۶ء (چھٹا ایڈیشن) میں شامل ہے۔ اور اس غزل میں رونق کا تخلّص موجود ہے۔

اس طرح رونق کے ناٹکوں کی مجموعی تعداد ۲۳ ہوتی ہے۔

ناٹک ساگر، کے مُصنّفوں اور سکسینہ کے قول کے مطابق رونق کا تعلّق ابتدا میں اوریجنل تھیٹریکل کمپنی سے تھا۔ اور وہ اس کمپنی کے لئے ناٹک لکھا کرتے تھے جو ناٹک میرے پاس موجود ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے وکٹوریہ ناٹک کمپنی اور الفریڈ تھیٹریکل کمپنی کے لئے بھی ناٹک لکھے تھے۔ وکٹوریہ ناٹک کمپنی کے لئے لکھے ہوئے ناٹکوں میں اُس دَور کے مشہور ایکٹر مسٹر خورشید جی بالی والا اداکار کی حیثیت سے حصّہ لیا کرتے تھے۔

امانت نے اندرسبھا لکھ کر اُردو ڈراما کا جو نمونہ پیش کیا تھا، اُردو ناٹک نگار مُدّتوں تک اسی کی تقلید کرتے رہے۔ رونق نے بھی اسی طرز کو اپنایا۔ ان کے ناٹکوں کے پلاٹ زیادہ تر مشہور قِصّوں یا قدیم داستانوں سے ماخوذ ہیں، ان میں مافوق الفطرت ہستیاں، جِن، دیو، دیوی، پری، وغیرہ اشخاص ڈراما کی حیثیت سے نمودار ہوتی ہیں اور غیر فطری کارنامے انجام دیتی ہیں۔ داستان کا محل وقوع یا تو خیالی پرستان ہوتا ہے یا مصر، کنعان، وغیرہ، اشخاص ناٹک کی گفتگو تقریباً تمامتر نظم میں ہوتی ہے۔ غرض ان ناٹکوں کے قصّے کا تعلّق کسی طرح بھی ہماری روز مرّہ کی زندگی سے نہیں ہوتا۔ ان کا اصلی مقصد تو تفریح و تفنّن ہے لیکن یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے ذریعے اخلاق کی دُرستگی ہو۔ لہٰذا ان میں حق و باطل کی جنگ اور نیکی و بدی کی کشمکش دکھائی گئی ہے، لیکن ان میں تصویر کا ایک ہی رُخ ہوتا ہے۔ ہر حالت میں حق کو باطل پر اور نیکی کو بدی پر فتح حاصل ہوتی ہے، جھوٹا اور بدکار ہمیشہ ناکام و نامراد ہوتا ہے اور سچّا اور نیکوکار ہمیشہ سرخرو و کامران ہوتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ ان ڈراموں کا اختتام زیادہ تر طربیہ ہوتا ہے۔ قصّہ کے درمیان ہیرو، جو ہمیشہ مثالی سیرت کا مالک ہوتا ہے، عارضی طور پر رنج و مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے، لیکن انجام خوشی و خرمی پر ہی ہوتا ہے۔ ان ناٹکوں میں نیکی اور بدی کی جو قوتیں معرکہ آرا ہوتی ہیں وہ خارجی ہیں، اگر ان قوتوں کا تصادم داخلی طور پر ہوتا تو اُس سے ذہنی اُلجھن پیدا ہوتی اور کردار کی تعمیر ہوتی اور اگر یہ قوتیں کسی سماج کے اندر مصروف رزم دکھائی جاتیں تو اس سے کوئی اجتماعی مسئلہ پیدا ہوتا۔ لیکن ان ڈراموں میں ان قوتوں کا تعلق محض افراد کے بیرونی حالات سے ہے۔ ایک بُرا آدمی دوسرے اچھے آدمی کو مغلوب و مفتوح کرنا چاہتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا نہ تو سیرت نگاری کا موقع ملتا ہے اور نہ کسی معاشرتی مسئلے کا تجزیہ ہی کیا جا سکتا ہے۔

احسن لکھنوی نے "انصاف محمود شاہ غزنوی عُرف اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" کو رونق کا 'گُل سرسبد' بتایا ہے۔ مجھے اس ناٹک کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اُن نو ناٹکوں کے مطالعہ کے بعد جو میرے پاس موجود ہیں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ 'عاشق کا خون' رونق کا شاہکار ہے۔ یہ ڈراما سر سے پا تک ایک غنائی ناٹک ہے، اس کا ہیرو ایک مصوّر ہے جو ایک زر پرست حُسن فروش دوشیزہ 'مست ناز' سے محبت کرتا ہے۔ مست ناز نے عاشق سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور اپنے خط میں اس بات کا قول و قرار بھی کر لیا تھا۔ لیکن بعد میں جب اُس کی ملاقات ایک مالدار شخص 'ابن امیر' سے ہو جاتی ہے تو دُنیاوی مال و دولت کی لالچ میں وہ عاشق سے بے وفائی کرتی ہے اور ابن امیر سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن اُسے اُس خط کی فکر ہو جاتی ہے جو اُس نے عاشق کو قول و قرار کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اور وہ اُسے واپس لینے عاشق کے پاس جاتی ہے۔ عاشق، جسے اپنی چچیری بہن دلنواز سے مست ناز کی شادی کی خبر پہلے مل چکی ہے، خط دینے سے انکار کر دیتا ہے۔ مست ناز پہلے تو عاشق کی خوشامد کرتی ہے لیکن جب عاشق انکار کرتا ہی جاتا ہے تو مست ناز آخر میں اُسے دھمکی دے کر واپس چلی جاتی ہے اور 'اسفل' سے مل کر عاشق کو جان سے مروا ڈالنے کی سازش کرتی ہے۔ 'اسفل' فرتوتہ کا بھائی ہے جو ایک قہوہ خانہ کی مالکہ ہے۔ بھائی بہن مل کر مسافروں کو لوٹتے ہیں، اس کا مال و اسباب چھین لیتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو مار بھی ڈالتے ہیں۔ 'اسفل' پیسہ کی خاطر دُنیا میں ہر بُرا کام انجام دے سکتا ہے۔ لیکن اُس نے انسان کا دُودھ پیا ہے اور

اُس کے دل میں رحم کی ابھی تک گنجائش ہے۔ جب 'مست ناز' اُسے عاشق کے قتل پر مامور کرنا چاہتی ہے تو وہ پہلے اُسے خوشامد سے خط وصول کرنے کا مشورہ دیتا ہے چنانچہ اُسی کے مشورے کے مطابق وہ عاشق کے یہاں خط مانگنے جاتی ہے۔ جب وہ ناکام ہوتی ہے تو 'اسفل' سے عاشق کا کام تمام کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ 'اسفل' کسی بہانے سے عاشق کو گھر سے باہر بُلواتا ہے۔ اور اُس کو قتل نہیں کرتا بلکہ رُو پوش کر دیتا ہے۔ اور عاشق مصلحتاً ایک 'آوارہ' کا بھیس بدل لیتا ہے۔ 'اسفل' کے اطمینان دلانے پر 'مست ناز' ابن امیر سے شادی کر لیتی ہے۔ لیکن اُس کا اندیشہ اب تک رفع نہیں ہوتا کیونکہ جس خط کی اُسے تلاش تھی وہ اُسے اب تک نہیں ملا تھا۔ وہ بار بار 'اسفل' سے اس خط کا تقاضا کرتی ہے اور 'اسفل' جواب دیتا ہے کہ عاشق کے جیب سے وہ خط نکلا ہی نہیں تھا۔ 'اسفل' سے بگڑ جاتی ہے، لیکن رازدار اور ہم سازش ہونے کی وجہ سے اُس سے بگاڑ نہیں کر سکتی۔ اسفل اُس کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اُس سے خوب روپیہ اینٹھتا ہے۔ ادھر 'دلنواز' کو عاشق کے غائب ہو جانے سے تشویش ہوتی ہے اور وہ عاشق کے چند دوستوں کی مدد سے حالات سے واقف ہو جاتی ہے۔ 'ابن امیر' کا وزیر بھی مست ناز کے جُرم سے باخبر ہو جاتا ہے۔ یہ سب مل کر ایک سازش کے ذریعہ ابن امیر کے سامنے مست ناز، سے جُرم کا اقبال کرا لیتے ہیں۔ جب بھید کُھلتا ہے تو ابن امیر مست ناز کو اپنے سامنے سے نکال دیتا ہے اور مست ناز خنجر سے خود کشی کر لیتی ہے۔ عاشق بہت مغموم ہوتا ہے، لیکن دلنواز جو مُدّت سے اُس سے خموش محبّت رکھتی ہے، اُسے تسلّی دیتی ہے۔

اس ناٹک کا پلاٹ بہت دلچسپ اور پیچیدہ ہے۔ اور اس میں سیرت نگاری کا نمونہ بھی ملتا ہے۔ خصوصاً 'اسفل' کا کردار بہت جاندار ہے۔ وہ ایک ایسا کردار ہے جو ہماری سوسائٹی میں اکثر موجود رہتا ہے۔ اس کی سیرت میں خود غرضی، لالچ، اور کٹھورتا کے ساتھ ساتھ انسانی ہمدردی بھی ہے۔ وہ موقع سے فائدہ اُٹھانا خوب جانتا ہے اور فطرت نسوانی کی کمزوری سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ لیکن اُسے ظلم و بے وفائی سے نفرت بھی ہے۔ قارئین کے دل پر 'اسفل' کے کردار کا نُمایاں نقش پیدا ہو جاتا ہے۔

اس ناٹک کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی مافوق الفطرت عنصر نہیں ہے۔ اور اس امر کے باوجود کہ ناٹک کا مقام 'کنعان' ہے۔ اس کے تمام

واقعات ہند کی سرزمین میں بھی پیش آسکتے ہیں۔

رونق جذبات و احساسات کی مُرقّع کشی کی اچھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ 'عاشق کا خون'، میں ان کی اس صلاحیت کا عُمدہ ثبوت ملتا ہے۔ رونق خود عاشق مزاج تھے۔ اور اُن کو ایک کج ادا اور جفاکار معشوق سے پالا پڑا تھا۔ جس نے اُن کے دل کو بھی نرم و نازک احساسات کا گنجینہ بنادیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ اس ناٹک کے ہیرو کے مُنھ سے اپنے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ عاشق اور مست ناز کا ایک مکالمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ عاشق کے الفاظ سراپا سوز و الم کی تصویریں ہیں۔

مست ناز:-

عاشق یہ تیرے سر کا نگہباں خدا رہے　　میری دُعا یہی ہے تو شاداں سدا رہے
کس کو پسند تجھ سا نہیں دل رُبا رہے　　جس کو تو چاہے دل سے وہ تجھ پر فدا رہے
کر اور کو پسند تو، اور دُور رکھ مجھے
میری قسم تو عشق سے معذور رکھ مجھے

عاشق:-

تجھ کو رکھوں میں عشق سے معذور مست ناز　　جُز تیرے اور کو کروں منظور مست ناز
تو مجھ سے ہونا چاہتی ہے دُور مست ناز　　جُز تیرے جابر[1] ہو گا یہ رنجور مست ناز
واللہ تیرے فراق میں مرجاؤں گا صنم
میں نوجوانی میں ہی گذر جاؤں گا صنم

(عاشق کا غم کھانے سے بے اختیار رونا، مست ناز کا عاشق کو چھاتی سے لگانا)

مست ناز:-

رُو رُو کے اپنا جی نہ دُکھا میری جان تو　　اس عشق میں ہے کتنا ہوا ناتوان تو
رنج و الم میں اپنے نہ رکھ دل کو، مان تو　　بہتر ہے اب تو یہی، میرا چھوڑ دھیان تو
اور اپنے جلد کر مجھے اصرار سے رہا
ہونے میں آج آئی ہوں تجھ یار سے جُدا

(عاشق کا جوش میں آکے کمر سے نکال کر مست ناز کو دینا)

---

[1] جابر کی "ر" تقطیع سے خارج ہو جاتی ہے۔

عاشق :-

خنجر لے یہ تو اور مجھے پہلے قتل کر لاشے کو بدلے غسل کے کرنا لہو میں تر
عوض کفن کے خاک اوڑھا دینا جسم پر کر دفن شعر لکھ یہ میری قبر پر مگر
عاشق یہ وہ ہے جو فقط حسرت میں مرگیا
پورا وفا کا کام زمانے میں کرگیا

مست ناز :-

قائل تری وفا کی ہوں ، سو بار دل رُبا تو میرا جان نثار ہے دلدار ، دل رُبا
مجھ کو نہ اپنا رکھ تو گرفتار دل رُبا یہ عرض کر قبول مری ، یار دل رُبا
میں نے تجھے جو لکھے وہ سب پیار نامے دے
اپنی محبتوں کے تو اقرار نامے دے

(عاشق کا آہستگی سے اپنے مقرر خیال سے مست ناز کو واقف کرنا)

عاشق :-

رہتا ہے داغ جیسے ہمیشہ قمر کے ساتھ جیسے اُفق نمود سدا ہو سحر کے ساتھ
جس طرح جان رہتی ہے نت جانور کے ساتھ بینائی کو جوں لاگ ہو اپنی نظر کے ساتھ
اقرار نامے یوں ہیں وہ میرے جگر کے ساتھ

(مست ناز کا گھبراکر عاشق کو عاجزی و پیار سے منانا)

مست ناز :-

نہ مجھ سے صنم بے وفائی کرو وہ کاغذ دو اپنی صفائی کرو
نہ بھولوں گی احسان یہ تابہ زیست جو تم میری مشکل کشائی کرو
مجھے دام میں تم نہ رکھو اسیر مری کوئی صورت رہائی کرو

رونق کو موسیقی سے بہت گہرا لگاؤ ہے۔ انھوں نے اپنے ناٹکوں میں ہندی کی بہت سی عمدہ دھنوں اور راگ راگنیوں سے کام لے کر ترنم و نغمہ کا دریا بہادیا ہے۔ اس کے ساتھ انہیں انگریزی، برمی اور آرستانی نغموں سے بھی واقفیت ہے اور "عاشق کا خون" میں ان غیر ملکی دھنوں کو ہندوستانی گانوں اور غزلوں میں سمو کر پیش کیا ہے۔ رونق غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے مغربی اور مشرقی دھنوں کے امتزاج سے سامعین کے لئے 'فردوس گوش' کا سامان مہیا کیا ہے۔ مذکورۂ بالا ناٹک میں

مندرجۂ ذیل غیر ملکی گانے پیش کئے گئے ہیں

(۱) From Foo Choo Foo I Came

اسے 'جھنجھوٹی' سے ملاکر پیش کیا گیا ہے۔

(۲) برمی قومی ترانہ کی بھوپالی سے آمیزش کی گئی ہے۔

(۳) آئرشانی نغمہ Garryowen کو 'ضلع بلاول' کی طرز کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔

(۴) انگریزی کے مشہور گانے Rosalie the prairie flower کو کلیان سے ملایا گیا ہے۔

رونق کے عہد کے ڈراما نگاروں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنے ناٹکوں میں اکثر اصنافِ سخن کے نمونے داخل کر دیتے تھے۔ چنانچہ رونق کے ناٹکوں میں بھی رُباعی مثلث، مخمس، غزل، قطعہ، مثنوی، مستزاد، مرثیہ اور ہندی چھند سب موجود ہیں لیکن ان سب میں غزل کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل رونق کی محبوب چیز معلوم ہوتی ہے۔ اُن کے ناٹکوں کے تقریباً ہر صفحے میں ایک یا دو غزلیں ضرور موجود ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے اُن کی غزلوں کی تعداد کافی ہوجاتی ہے۔ یہ غزلیں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق ناٹک کے کسی خاص موقع اور محل سے ہوتا ہے اور جن کو ناٹک سے الگ کر لینے سے اُن کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسری قسم کی غزلیں عام طرز کی ہیں۔ اول الذکر قسم کی غزلوں میں شاعر کا تخلّص نہیں ہوتا، لیکن موخرالذکر قسم کی غزلوں میں شاعر کا تخلّص بھی ہوتا ہے۔ احسن لکھنوی لکھتے ہیں کہ رونق کی کلیات کو شیخ عبداللہ نے اصلاح دے کر اپنی مِلک بنا لیا ہے۔ رونق کے ناٹکوں میں غزلوں کو نکال کر اُن کے دیوان کا معتدبہ حصّہ از سرِنو مرتب ہوسکتا ہے۔ ان غزلوں میں زبان اور فن کی متعدّد غلطیاں موجود ہیں۔ کہیں کہیں شاعر کا مطلب صاف طور پر ادا نہیں ہوا ہے، کہیں بحریں اُفتاں و خیزاں ہیں، کہیں حروف اوزان سے خارج ہوگئے ہیں، اور جگہ جگہ بندش بھی سُست ہے۔ گانے میں یہ خامیاں چھپ سکتی ہیں لیکن ان پڑھنے میں ان کا عیب فوراً نمایاں ہوجاتا ہے۔ یہ غزلیں درحقیقت شاعر کا خام مواد ہے جو تھوڑی سی توجہ اور اصلاح سے پکّی جنس ہوکر بازار میں آسکتا تھا

لیکن اپنی خامیوں کے باوجود، ان غزلوں میں حسن کے دل کش مرقعے، عشق کے اثر آفریں جذبات، حکمت و معرفت کے بلند پایہ مضامین، اور نصیحت و اخلاق کے کارآمد نکتے بکثرت سے ملتے ہیں، انھیں خصوصیات نے احسن لکھنوی کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اور وہ یہ رائے ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکے کہ "ان کے ڈراما میں غزلیں بھی ہیں اور غزل کی زمین تجویز کرنے میں ان کو ایک خاص ملکہ تھا۔"

خُمِ خانۂ جاوید میں رونق کی غزلوں کے مُندرجۂ ذیل نو اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

گردشِ تقدیر سے اپنے بھی ہوجاتے ہیں غیر		تیشۂ فرہاد دشمن ہوگیا فرہاد کا
کس قدر تھا تشنہ کام آپ خنجر الحفیظ		ہر لبِ زخمِ جگر پر شکر ہے جلّاد کا
ٹھہرائے شوقِ شہادت دم لے اے ذوقِ تپش		ہاتھ قبضے پر ذرا جمنے تو دے جلّاد کا
نو اسیرِ زُلف ہوں، کیا جانوں رسم و راہِ عشق		رفتہ رفتہ آئے گا ڈھب نالۂ و فریاد کا

بھر کے ساقی نے شبِ مہ میں جو ساغر رکھ دیا		زاہدوں نے طاق پر سب حور و کوثر رکھ دیا
عاشقوں کو امتیازِ دیر و کعبہ کچھ نہیں		اُن کا نقشِ پا جہاں دیکھا وہاں سر رکھ دیا

جنوں میں ہوش دامن کا نہ غم ہے کچھ گریباں کا
نہ یہ معلوم کیوں اُدھڑا، نہ یہ مفہوم کیوں ٹانکا

سر جائے تو کچھ غم نہیں مطلب تو بر آئے		وہ قتل ہی کو آئے بلا سے مگر آئے

عاشق کو حور و خلد سے کیا کام واعظو		اُجرت ہے یہ تو آپ سے مزدور کے لئے

میرے پاس جو ناٹک موجود ہیں اُن کی غزلوں کے چند اشعار انتخاب کرکے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

زباں سے کچھ تو کہو، دل رُبا سُنو تو سہی		خموش بیٹھو نہ بہر خُدا، سُنو تو سہی
او شاہِ حُسن کرو ایک بوسہ تو خیرات		تمھارے حق میں کریں گے دُعا سُنو تو سہی
تمھارے قدموں کی سوگند پنجۂ فرقت		ہمارا گھونٹ رہا ہے گلا، سُنو تو سہی

دوست دشمن کے ہو، اور دوست کے دشمن تم ہو
اے بتو، نازم خدا جانتے کیا فن تم ہو

خونِ عاشق کا نہیں مٹتا ہے دھبہ ہرگز
حشر تک دھوتے رہا کرتے گو دامن تم ہو

رحم کرتے تمھیں دیکھا نہ کبھی عاشق پر
سینے میں دل کی جگہ رکھتے کیا آہن تم ہو

آج تک گھر تھا تمھارا، اس میں اب اللہ ہے
اے بتو بت خانۂ دل اپنا بیت اللہ ہے

جاننا مشکل بہت ہے منزلِ عشق و ہوس
راہ میں ہے گمرہی تو گمرہی میں راہ ہے

روضۂ رونق پہ چلئے فاتحہ کے واسطے
سنتے ہیں اپنے ہم مشرب کی وہ درگاہ ہے

خدا کی ہے بے شک رضا راستی
قبولو برائے خدا راستی

ہے سچے کو دنیا میں راحت مدام
بلا ٹالتی ہے سدا راستی

وہ قیمت میں کم ہے جو جھوٹی ہے چیز
ہے سچے تری بے بہا راستی

بستی کو کرتا پسند ہے اور نہ ویرانے کو دل
کس جگہ جاؤں بھلا میں اپنا بہلانے کو دل

کچھ تو سامانِ طرب دیتا تھا جو دیتا تھا دل
ہم نے دل پائے الٰہی محض ترسانے کو دل

آدمی ہیں وہ بھی جو پیتے ہیں خم ہائے نشاط
ترسے یاں اک بادۂ عشرت کے پیمانے کو دل

جیتے تھے تب تک کہ جب تک جینے میں تھا کچھ بھی حظ
چاہتا ہے اب تو رونق اپنا مرجانے کو دل

مندرجۂ ذیل غزل ناٹک 'حاتم بن طے' ہے۔ اسے ہرمرجی اردشیر نے گراموفون ریکارڈ کے لئے گایا تھا۔

جہاں پر شمع ہوتی ہے وہاں پروانا آتا ہے
پری رو ہوتے ہیں جس جا وہیں دیوانہ آتا ہے

شرابِ وصل کا طالب ہوں میں اے ساقئ الفت
ترا اب تک نہیں گردش میں کیوں پیمانہ آتا ہے

نہ شرما جان تو مجھ سے، کروں گا ورنہ میں رسوا
کہ مست ناز مجھ کو نالۂ مستانہ آتا ہے

جفا میں طاق ہو تم اور ستم میں شہرۂ آفاق
مگر یہ بھی تو کہیئے کچھ کرم فرمانا آتا ہے

نہ ہو کر رونق بزمِ حسیناں تم اے شاہِ حسن
تو کیوں دل ہائے عاشق کا تمھیں نذرانہ آتا ہے

رونق کو لمبی بحروں اور مشکل ردیفوں میں غزل کہنے کا بھی شوق ہے۔ طویل بحروں

میں رفتار Tempo اور ترنّم Rhythm پیدا کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ڈراما خصوصاً منظوم ڈراما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اُردو میں طویل بحریں اُس عہد میں انگریزی کے Blank Verse (نظم بے قافیہ) کی گویا قائم مقام کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ رونق نے بہت سی غزلیں مشکل ردیف اور لمبی بحروں میں لکھی ہیں جن میں سے چند کے اشعار انتخاب کرکے درج ذیل کئے جاتے ہیں

نہ فلک پہ گئے نہ تو خاک ہوئے   یہ بھی نہ ہوئے وہ بھی نہ ہوئے
نہ نجس ہی بنے نہ تو پاک ہوئے   یہ بھی نہ ہوئے وہ بھی نہ ہوئے
نہ تو گل کی روش کھل کھل کے ہنسے   نہ تو نالہ کرکے قفس میں پھنسے
بنے شاد نہ ہم غمناک ہوئے   یہ بھی نہ ہوئے وہ بھی نہ ہوئے
نہ تو رونقِ عالم ہائے ہوئے   نہ خرابیٔ دنیا وائے ہوئے
نہ تو جہل نہ تو ادراک ہوئے   یہ بھی نہ ہوئے وہ بھی نہ ہوئے

اے نسیم جب تجھے جانوں میں   مرے گل کی بو تو چمن سے لا
ہے قسم تجھے اُسی زُلف کی   جو ختن میں وہ تو ختن سے لا

اے رشک گل خار ہجر تیرا، ہمارے دل میں اٹک رہا ہے
تو دامن اپنا غُبار وصلت، اسے کس لئے یوں جھٹک رہا ہے

اسی طرح رونق نے "مگر رحم اُس کو ذرا بھی نہیں" اور "اِسے دوں یا اُسے دیدوں" ایسی لمبی ردیفیں بھی استعمال کی ہیں۔

رونق نے اپنے ناٹکوں میں اُردو کے مشہور شاعروں کی بھی متعدد غزلیں گانے کے لئے استعمال کی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آتش کی ایک، غالب کی تین، ذوق کی چھ، رند کی چار، بہادر شاہ ظفر کی دو، داغ کی ایک، رنگین کی ایک، اور ماہر لکھنوی کا ایک، غزلیں نقل کی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک غزل فتح محمد تائب کی اور دو غزلیں نامعلوم شاعروں کی بھی ہیں۔ یہ تعداد میں نے اُن نو ناٹکوں سے حاصل کی ہے جو میرے پاس موجود ہیں۔ دوسرے شاعروں کی ان غزلوں میں بھی زیادہ تر وہ ہیں جو طویل اور

مترنم بحروں میں ہیں یا جن کی ردیف لمبی ہے۔ چنانچہ ذوق کی مندرجۂ ذیل غزلیں نقل کی گئی ہیں۔

(۱) الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج اُس کے کوچے میں شور بِاَیِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ہے

---

(۲) کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ہوگی سانس اڑی، دو گھڑی کے بعد

---

(۳) بُلبُل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دُور اور شکستہ پر

---

(۴) موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غُسلِ میّت ہی ہمارا، غُسلِ صحت ہو تو ہو

اسی طرح داغ کی مُندرجۂ ذیل غزل نقل ہوئی ہے:۔
ستم ہی کرنا، جفا ہی کرنا، نگاہِ اُلفت کبھی نہ کرنا
تمھیں قسم ہے ہمارے سر کی، ہمارے حق میں کمی نہ کرنا

ایک غزل فارسی کی بھی ملی ہے۔ ناٹک میں جو فُٹ نوٹ ہے اُس میں یہ تحریر ہے کہ "یہ غزل جناب معلی القاب مرزا بیدل صاحب ملک الشعرائے سلفِ فارسی کی ہے"۔ (۹) وہ غزل یہ ہے:۔

موے سر کردم سُفید اما خیالت در سرست	اخگر پنہاں تہہ ایں تودۂ خاکستر ست

یہ غزل کُلیّاتِ بیدل میں نہیں ملتی۔ لیکن بیدل کا رنگ اس غزل میں اس قدر نُمایاں ہے کہ رونق کی بات مان لینی پڑتی ہے۔

رونق کے ڈراموں میں کہیں کہیں نثر بھی استعمال ہوئی ہے۔ اور اس نثر کی خصوصیت یہ ہے کہ بالکل سادہ ہے جس میں عام گفتگو ہوتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہو۔
"مثل ہے کہ جاہل کی دو تو فاضل کی چار، اور نہیں سمجھے تو دیوار سے سر مار، ایسا ہی میں نے وُہ گونگے لڑکے کو ڈھونڈنے کے لئے بہری

دو آنکھیں، اور دو کان، چاروں چیزوں کو کام میں لایا، اتنا ہی نہیں، مگر یہ دیوان خانے کے کونے وغیرہ کو چھوڑ کر جو کھلی جائے ہے وہاں بھی دیکھا، ارے یہ تو کیا، مگر اس مکان کی مٹی بھی اپنی عقل کی چلنی میں چھانی، لیکن کچرے کی طرح بھی وہ نظر نہیں آیا۔ اور اس کے سوا جلسہ تو ہو ہی نہیں سکتا، باعث کہ بسنت کے موسم کا تو سوانگ وہی لائے گا، برکھا، سیالا، اور گرمی یہ تین موسم کے سوانگ تو تیار ہیں، اب فقط وہ گونگا لڑکا چاہئے، اچھا چاند، تیرے سوا یہ مشکل کون آسان کرے گا اس لئے اندیشہ کرنے کے پہلے تدبیر کر، لیکن وہ مہتاب جو میری معشوق ہونے والی ہے وہ تو کہتی ہے کہ وہ پھر پنڈاروں کے پاس چلا جائے گا۔"

(جفائے ستمگر)

"ٹھہرئے آپ کے واسطے میں بہت سا مزیدار پکوان لا حاضر کرتی ہوں۔" (طلسم زہرہ)

"کیا تو منھ سے گونگی ہے جو تجھے جنگل میں کوئی چھوڑ کے چلا گیا۔ اگر میں تیری مدد کو نہیں پہنچتا تو تُو اُسی جنگل میں بھوک کے مارے ہلاک ہو جاتی نہیں؟" (نقش سلیمانی)

رونق کے ڈراموں میں مزاحیہ عنصر بھی ہے۔ لیکن یہ عنصر اصل پلاٹ سے جُدا نہیں ہے جیسا کہ مابعد کے اکثر خصوصاً آغا حشر کے بعض ڈراموں میں ملتا ہے۔ رونق کے ناٹکوں کا یہ مزاحیہ عنصر قصّہ کے کرداروں کی گفتگو سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں وہ فحاشی اور عُریانی نہیں ہے جو بعد کے ڈراموں میں داخل ہو گئی تھی۔ کم ازکم اُن ڈراموں میں جو میرے پاس موجود ہیں یہی وصف دیکھنے میں آتا ہے۔ ان ناٹکوں میں سب سے زیادہ مذاقیہ حصّہ 'عجائبات پرستان' میں ملتا ہے۔ بلکہ اس ناٹک کے اصل پلاٹ کی بُنیاد ہی کچھ حد تک مزاح پر ہے۔ ملک بہارستان کی شاہزادی گلبدن سے چند شخص عشق کرتے ہیں، ان میں شمشاد سچّا عاشق ہے، باقی ایران کا بادشاہ، والیٔ کشمیر اور جنگلی شاہ جھوٹے عاشق ہیں۔ یہ تینوں جھوٹے عاشق، گلبدن سے اپنا عشق جتا کر اُس کو اپنے اوپر ریجھانا چاہتے ہیں۔ گلبدن تینوں کے ساتھ استہزاء و تمسخر سے گفتگو کرتی ہے اور اُن کا مذاق اُڑاتی ہے، گلبدن کی باتیں ہنسی پیدا کرتی ہیں۔ والیٔ کشمیر کے عشق جتانے پر جواب دیتی ہے:

(گاتا)، ذرا سچ کہو میرے سر کی قسم　　مرے عشق کا بھرتے ہیں آپ دم
چڑیلوں سے بھی کیا ہے کشمیر اُجاڑ　　جو آئے یہاں مجھ پہ کر کے کرم
چچا جی کوئی اور کو ڈھونڈ لو　　بھتیجی تمھاری کہاتی ہیں ہم

جب والیٔ کشمیر اصرار کرتا ہے تو گلبدن ذرا بگڑ کر کہتی ہے۔

وہ مثل ہے مان یا مت مان، ہیں مہمان ہم　　ٹھوکروں سے لائیں حضرت کا بجا فرمان ہم
بار ناز اپنا ہے بھاری دب مروگے بوجھ سے　　اے خمیدہ قد نہ سمجھیں کیوں تمھیں نادان ہم
گھاس سی ڈاڑھی ہے منہ پر تس پہ ہے مرنیکا شوق　　اے جناب عالی تمھیں سمجھے تھے اک انسان ہم
جاؤ یاں سے سیدھے سیدھے اے خمیدہ قد شتاب　　تھوک دیں گے ورنہ منہ پر آپ کے اس آن ہم

اسی طرح جب شاہ ایران ایک فارسی غزل گا کر اپنی محبّت کا اظہار کرتا ہے تو گل بدن جواب دیتی ہے۔　　(ٹھمری)

محبّت کا یہ بھی بھلا کوئی سِن ہے　　ضعیفی کی راتیں ہیں مرنے کا دِن ہے
بایں ریش وفش مجھ سے آئے بیاہنے　　حیا بھی تمھاری کوئی شرم بھی نہ ہے (؟)
اے ابّا یہ مجھ سی پری پر ہیں عاشق　　خبیث ان سے مادم خجل ان سے جن ہے

جنگلی شاہ اپنے ایک مصاحب "شاعر شاعران" کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اور اسی شاعر کی لکھی ہوئی ایک غزل گلبدن کو ریجھانے کے لئے گا گا کر سُناتا ہے۔ جس سے شاہِ بہارستان بے حد آزُردہ ہوتا ہے اور اُس کے حکم سے دونوں دربار سے نکال دئے جاتے ہیں۔ وہ عروس سخن کو اپنے قبضہ میں لانا چاہتا ہے۔ لیکن شاعری اُسے پھٹکار دیتی ہے اور اُسے آخر کو 'جاہلی' کی آغوش محبّت میں پناہ ملتی ہے۔ یہاں کچھ شُبہ پیدا ہوتا ہے کہ 'شاعر شاعران' کے پردے میں رونق نے شاید اپنے کسی حریف کی ہجو کی ہے۔

پچھلے صفحوں میں رونق کے ناٹکوں سے جو مختلف اقتباسات پیش کئے گئے ہیں اُن کے مطالعے سے اُن کی زبان کے متعلّق کچھ اندازہ ہوا ہوگا۔ رونق اور اُن کے ہم عصر اور ہم پیشہ مصنّفوں کی زبان کے متعلّق نقّادوں نے سخت اعتراض کیا ہے، اور اسی وجہ سے اُن کے ڈراموں کو دائرہ ادب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس زبان کو مرزا محمد ہادی رسوا نے "مچھلی بازار کی بول چال" سے تعبیر کیا ہے۔ مابعد کے نقّادوں نے اسی رائے کی حمایت کی ہے۔ لیکن اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ رونق کے عہد میں اُردو کے مُستند ادیب و شاعر ڈراما نگاری کو ایک مبتذل پیشہ سمجھتے تھے اور اسی

طرح اعلیٰ طبقے کے لوگ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے تھیٹر دیکھنا معیوب و مخرب اخلاق سمجھتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈراما نگاری کمتر درجے کے شاعروں کے حصّے میں آگئی اور تماشہ بینوں میں زیادہ تر تعداد جاہل اور بازاری لوگوں کی ہوتی تھی جن کے سمجھنے کے لئے زبان کو بازاری اور عام فہم بنانا ضروری تھا، تو اس اعتراض کی اہمیت کم ہوجاتی ہے بعض مصنّفوں نے اپنی کم علمی اور بعض ڈراما نگاروں نے تیسرے درجے کے کثیر التعداد تماش بینوں کی تفریح اور تفہیم کے لئے قصداً عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ فن تمثیل کے بعض نقّادوں کا تو یہ خیال ہے کہ مکالمہ کی زبان ہی وہ ہونی چاہیئے جو بازار میں بولی جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جو زبان عام بول چال اور گلی کوچوں کی ہوگی اس میں فصاحت اور صحت تلاش کرنا بے سوُد ہوگا۔ رؔونق کے ناٹکوں کی زبان بھی بہت حد تک غیر فصیح اور نحوی اغلاط سے معمور ہے۔ لیکن اس پر دکنی اور گجراتی زبانوں کی گہری چھاپ ہے۔ اور بعض غلطیاں تو وہ ہیں جو ہمیں اُردو شاعری کے باوا آدم یعنی وؔلی دکنی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہم کو رؔونق کے دکنی ہونے کا اور زیادہ یقین ہوجاتا ہے۔ بمبئی میں قیام کے باعث گجراتی زبان سے رؔونق کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ اس کے علاوہ خود دکنی زبان پر گجراتی کا بہت زیادہ اثر ہے۔ رؔونق نے اکثر موقعوں پر وؔلی دکنی کی پیروی کی ہے یا یوں کہئے کہ ان دونوں کی زبان میں اکثر اعتبار سے مماثلت ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) دو ہندی الفاظ یا ایک ہندی اور ایک فارسی لفظ کے درمیان فارسی واوُ عطف کا استعمال وؔلی اور رؔونق دونوں کے یہاں ملتا ہے۔

وؔلی دکنی:-

پایا ہوں وؔلی سلطنت ملک قناعت اب تخت و چھتر حق میں مرے ارض و سما ہے

رؔونق:-

نورِ عالم سے ستمگر شاہ کی شادی ہے آج اُس کے جلسے کا مرے والد کے سر ہے کام و کاج

(۲) ہندی اور فارسی الفاظ ملاکر ترکیب اضافی بنانا دونوں کے یہاں جائز ہے۔

وؔلی:-

مجھ کوں ہے دارالامن پیو کا نقشِ چرن

پیوں کا نقشِ چرن مجھ کو ہے دارالامن

رونق :-

ہر اک چمن چاہ کا مالی نہیں ہوتا محتاجی سے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا

(۳) 'کیا کرنا' (کیا کریں، یا کیا کرے کے معنی میں) دونوں کے یہاں استعمال ہوا ہے۔

ولی :-

براگی جو کہاتے ہیں اسے گھر بار کرنا کیا ہوئی جوگن جو کوئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا

رونق :-

نہ سر ٹکرانا ہم نے تو بھلا اے یار کیا کرنا نہیں تو پھیرتا ہے حلق پر تلوار کیا کرنا

(۴) 'اگر جو' کا ساتھ ساتھ استعمال ولی اور رونق دونوں کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔

ولی :-

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا اسکوں پہاڑ ہووے کوہ طور کا تماشا

رونق :-

دیویں گے پنڈاروں گے ہم جو ہاتھ میں تجھے اگر (جفائے ستمگر صفحہ ۹)

مذکورہ بالا مثالوں کے علاوہ رونق کے یہاں دکنی زبان کے اور بھی نمونے ملتے ہیں۔ ایک لفظ 'حیاتی' ہے جو 'حیات' کے معنی میں مستعمل ہے۔ یہ محاورہ غالباً دکن کا ہے۔ چنانچہ میر حیدر شاہ آفسر مدراسی نے اپنے ناٹک موسوم بہ قصۂ آرام دل و حسن افروز معروف بہ شعلۂ عشق" میں جو مطبع مفرح القلوب کراچی میں ۱۸۸۳ء میں طبع ہوا ہے، اس لفظ کو نظم و نثر میں کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ رونق کے یہاں بھی یہ لفظ ایک بار استعمال ہوا ہے۔

باقی رہے گا نام خداوند پاک بس جو شے کہ ہے حیاتی وہ ہوگی ہلاک بس

(غرور رعد شاہ، صفحہ ۲۴)

آفسر مدراسی کے مندرجۂ بالا ناٹک میں 'اِس' اور 'اُس' کی جگہ 'یہ' اور 'وہ' استعمال ہوئے ہیں۔ رونق کے یہاں بھی یہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت کے ناٹک کاروں نے زیادہ تر دقیانوسی زبان سے کام لیا ہے اور جدید ترقیوں کا اثر قبول نہیں کیا ہے۔

آفسر مدراسی :-

.... اے جنت سکون، اے رشک مسیحا بچنے کی نہ صورت ہے یہ بیمار کی صورت

رونق:-

تب میں نے وہ معصوم کو چھاتی سے لگایا وہ گونگا وہی تھا جسے چوروں نے چُرایا

رونق نے اپنے اشعار میں اکثر الفاظ کو اُسی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا ہے جس طرح وہ عام گفتگو میں رائج تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عروضی، اعتبار سے بہت سے حروف ساقط ہوجاتے ہیں۔

پہلے یہ تذکرہ ہوچکا ہے کہ رونق کی کُلّیات پر شیخ (غالباً حافظ) عبد اللہ نے قبضہ کر لیا ہے۔ حافظ عبد اللہ، رونق کے ہم عصر اور ہم پیشہ تھے، وہ چتورہ ضلع فتحپور کے رئیس تھے اور انھوں نے ایک تھیٹریکل کمپنی بنام انڈین امپیریل تھیٹریکل کمپنی قائم کی تھی جس میں خود بھی اداکاری کرتے تھے اور اُس کے لئے ڈرامے بھی لکھتے تھے، انھوں نے رونق کے بعض ڈراموں پر بھی اصلاح دے کر اپنے نام سے شائع کردیا ہے۔ چنانچہ حافظ صاحب کا مشہور ناٹک "مرقع مہر انگیز و قباد معروف بہ نقش سلیمانی و بہشت شدّاد" درحقیقت رونق کے ناٹک "نقش سلیمانی عُرف شدادی بہشت" کی ہوبہو نقل ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ رونق کی لسانی اور عروضی خامیوں کی اصلاح کردی ہے مندرجۂ ذیل اقتباس سے اس امر کا اندازہ ہوگا۔

رونق کے ناٹک نقش سلیمانی کے پہلے سین میں بادشاہ خود سے ہمکلام ہوتا ہے

بادشاہ:-

نہیں اب زیست کی اُمید مجھے میری خُدایا ہے مجھے اس درد نے بے جان بالکل ہی بنایا ہے
شہنشاہی تو میں نے کی ہمیشہ دار فانی میں موافق وعدہ کے پیغام اجل کا اب تو آیا ہے
مگر سونپوں کسے شاہی نہیں فرزند ہے مجھ کو بوقت مرگ ابرغم یہ میرے دل پہ چھایا ہے
عنایت ایک دُختر تو کیا ہے فضل سے اپنے نہیں اُس سے چلے شاہی، یہ اندیشہ سمایا ہے

اسی گفتگو کو حافظ عبد اللہ کے ناٹک "مرقع مہر انگیز و قباد" میں ملاحظہ کیجئے:-

مظفر شاہ:-

نہیں کچھ زیست کی امید اب مجکو خدایا ہے غمِ وارث نے جیتے جی مجھے بے جاں بنایا ہے
شہنشاہی بہت کی میں نے اس دُنیائے فانی میں مگر افسوس پیغام اجل اب مجکو آیا ہے
نہیں مرنے کا مطلق غم رہوں گا زندہ میں کبتک جوانی چل بسی اب مُنہ ضعیفی نے دکھایا ہے
مگر سونپوں کسے شاہی نہیں رکھتا پسر کوئی دلِ محزوں پر ابرِ غم دم آخر یہ چھایا ہے

عطا کی ہے مجھے خالق نے بس اک صالحہ دُختر پر اُس سے ہوگی کب شاہی یہ اندیشہ سمایا ہے
پورے ناٹک میں اصلاح کا یہی رنگ ہے۔ اس کے علاوہ حافظ صاحب نے موسیقی کے اعتبار سے بھی اس میں بہت سا اضافہ اور ترمیم کی ہے۔ اور اسٹیج کی مناسبت سے پردہ کی بھی ترتیب بڑھادی ہے۔ حافظ صاحب کے مصنّفہ ناٹکوں کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ شُبہ ہوتا ہے کہ اُن کے اور ناٹک بھی رونق کے ڈراموں کی نقل ہیں۔ مثلاً "انجام نیک و بد انسان معروف بہ سیف السلیمان" "تماشائے دلپذیر عُرف بےنظیر و بدرمنیر" "خون عاشق جانباز معروف بہ جفائے مست ناز، ظلم عمران مردود معروف بہ عدل سلطان محمود، اور تحفۂ سیزدہم صدی معروف بہ فریب فتنہ و نتیجۂ بدی"

مذکورۂ بالا بیانات سے یہ ظاہر ہوگیا ہوگا کہ رونق کس پایہ کے ڈراما نگار تھے اور اُن کے ڈراموں کی اُردو میں کیا اہمیت ہے۔ رونق کے ساتھ نقّادوں نے غیر مُنصفانہ اور غیر ہمدردانہ سلوک کیا ہے۔ درحقیقت رونق ہماری ہمدردی اور شکرگزاری کے مستحق ہیں۔ اپنی بساط بھر اور محدود دائرے میں اُردو تمثیل نگاری کی وہ جس قدر خدمت کرسکتے تھے انھوں نے کی ہی، اُنھوں نے اور اُن کے رفقاء کار نے ہندوستانی اسٹیج پر اُردو کو مقبول بنانے میں جو کوششیں کیں وہ لائق تحسین ہیں۔ اُردو کے مُستند ادیبوں نے اسٹیج کا بائیکاٹ کیا ہی تھا، اگر رونق اور اُن کے ہم عصر ڈراما نگار بھی اس پر قبضہ نہ کرتے تو بمبئی اور اُس کے گرد و نواح میں اُردو کی وہ حیثیت باقی نہیں رہتی جس کی وہ آج حامل ہے۔

رونق فطری طور پر ذہین، طبیعت دار اور جدّت پسند تھے، ان میں ایک اچھے ڈراما نگار اور خوش گو غزل نویس بننے کی بہت عُمدہ صلاحیت پوشیدہ تھی۔ لیکن قسمت نے اُنہیں بمبئی کے پردیسی (کوسمو پولیٹن) ماحول اور پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکوں کی تجارتی ذہنیت کا شکار بنادیا۔

جلالی ۔ احمد آبادی

(۳)

(سید اکبر علی صاحب ترمذی گورنمنٹ کالج اجمیر)

(گذشتہ قسط میں ہم نے لکھا تھا کہ اذکار الاطہار کا کوئی نسخہ دستیاب نہو سکا لیکن اب ہمیں یہ لکھتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ اذکار کے تین قلمی نسخے مقامی کُتُب خانوں سے دستیاب ہوئے ہیں اذکار کا ایک نُسخہ احمد آباد کے قاضی صاحب کے کُتُب خانہ میں موجود ہے، دوسرا نُسخہ شیخ احمد بن برھان مشہور بہ میاں مخدوم کے سجادہ نشین فاضل میاں صاحب کے کُتُب خانہ میں محفوظ ہے تیسرا نُسخہ حضرت پیر محمد شاہ صاحب کے کتُب خانہ میں ملتا ہے[لے]، اس نُسخہ کے آخری صفحہ پر ایک ترقیمہ ہے جس سے پتہ چلتاہے کہ خلیل الرحمٰن بن محمد حسن المدنی نے زیر بحث نُسخہ ۱۰ رذی الحجہ ۱۰۷۵ھ کو بمقام حسن ابدال تمام کیا اس تذکرہ میں حضرت علیؑ سے لے کر حضرت قُطب عالم بُخاری تک یعنی قریباً پچیس بزرگوں کے مختصر سوانح حیات محفوظ ہیں)

(۶) جمعات شاہیہ

یہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے اور ان میں حضرت سیّد محمّد سراج الدّین شاہ عالم قدس سرہ کے جمعات درج ہیں ان جمعات کو حضرت شاہیہ کے ملفوظات کہنا نامناسب نہ ہوگا مرآت احمدی کا مُصنّف مرزا علی محمّد خان لکھتا ہے "جمعات شاہی مشتملہ ہفت جلد کہ ملفوظ شاہیہ و متضمن اسرار ربانیہ است"[سے]

عنُوان کتاب ــــ ا

حضرت شاہیہ کا یہ معمول تھا کہ جمعہ کے روز لوگوں کو شرف باریابی دیتے اور ہفتہ کے باقی دن عبادت و ریاضت الٰہی میں مصروف رہتے، جمعہ کے دن لوگوں کا ایک جم غفیر آپ کے آستانہ پر حاضر ہوتا۔ مُرید اور عقیدت مند اسی روز آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوتے جمعہ کے علاوہ آپ سے ملاقات قریباً ناممکن تھی اگر بادشاہ وقت حاضر

لے میں اپنے محترم دوست ضیاء الدین ڈیسائی کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میری توجہ اس نُسخہ کی طرف دلائی۔ سے خاتمہ مرآت احمدی (کلکتہ) ص ۴۲

ہوتا تب بھی آپ اپنے حجرہ سے باہر نہ نکلتے[۱] لیکن بعض ملفوظات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ خاص خاص مواقع پر جمعہ کے علاوہ بھی لوگوں کو شرف باریابی بخشتے، لیکن چند مستثنیات سے قطع نظر آپ اپنے معمول کی سختی سے پابندی کرتے اور جمعہ کے علاوہ اپنے حجرہ سے باہر نہ نکلتے یہی وجہ ہے کہ ہمارے مولف نے حضرت شاہیہؒ کے ملفوظات کے اس مجموعہ کو "جمعات شاہیہؒ" کے نام سے موسوم کیا

جمعات شاہیہ کی ایک جلد ــــ!

ہم اوپر عرض کر آئے ہیں کہ جمعات شاہیہ سات جلدوں پر مشتمل ہے لیکن ہمیں سخت افسوس ہے کہ بے حد کوشش کے باوجود ہم جمعات کی تمام جلدوں کا سراغ نہ لگا سکے۔

ڈاکٹر باقر علی صاحب ترمذی مرحوم نے مولانا عبد الملک بنیانی پر ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس میں موصوف نے بنیانیوں کی اصل پر بحث کرتے ہوئے جمعات شاہیہ کی چوتھی جلد سے ایک اقتباس نقل کیا ہے[۲]۔ ڈاکٹر عبدالحق نے بھی شیخ فرید الدین گنج شکر کے حالات بیان کرتے ہوئے شیخ کا ایک ہندی منظوم قول جمعات کے حوالہ سے نقل کیا ہے[۳]۔ عبدالحق صاحب نے حضرت قطب عالم اور حضرت شاہ عالم کے اکثر اقوال جمعات شاہیہ ہی سے اخذ کئے ہیں لیکن جلد کا نمبر بیان نہیں کیا[۴]۔

گذشتہ قسط میں ہم عرض کر آئے ہیں کہ جمعات شاہیہ کی ایک جلد کا قلمی نسخہ احمد آباد کے قاضی صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے مولف نے کتاب میں کسی جگہ بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا کہ زیر بحث نسخہ جمعات کی کون سی جلد ہے۔

سید ہاشم بن کمال الدین محمد اکبر کرار بخاری کی صحائف السادات کا ایک قلمی نسخہ احمد آباد کے قاضی صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے صحائف کے پہلے تذکرے کے ساتویں تبصرے میں سید ہاشم حضرت قطب عالم کی صاحب زادی بوالملکہ جہاں کا ذکر کرتے ہوئے جمعات شاہیہ کی پانچویں جلد کا اس طرح حوالہ دیتے ہیں " والدہ ایشان (ملکہ جہاں) بی بی سلطان خاتون بنت خداوند خان صدیقی کہ مشہور بابو رجائی و زیر ظفر خان کہ ابتدائی سلطنت گجرات از فرق اسلامیہ از دہست بودہ و ابو رجا کیست عبدالرحمٰن بن امیر المومنین ابی بکر

---

[۱] مرآت سکندری ص ۱۱۱۔ [۲] معارف بابت اکتوبر ۱۹۴۲ء [۳] اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۷ [۴] اُردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۹۔

صدیق است رضی اللہ عنہما[۱] و نسب خداوند خاں مذکور بحضرت صدیق الرحمٰن بدین نمط می پیوندد خداوند خان بن ملک حسین ..... بن امیرالمومنین ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہم چنانچہ در جلد پنجم جمعات شاہیہ مسطور است" خداوند خان کا بعینہ یہی سلسلۂ نسب جمعات شاہیہ کی زیر بحث جلد کے انتیسویں "جمعہ" میں درج ہے چنانچہ یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ جمعات کا زیر نظر نسخہ جمعات شاہیہ کی پانچویں جلد ہونی چاہیئے۔

سنہ تالیف

جمعات شاہیہ کی تمام جلدیں ہمارے سامنے موجود نہیں چنانچہ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ جمعات کا آغاز کب ہوا اور مؤلف نے سات جلدیں کب تمام کیں لیکن جمعات کی زیر بحث جلد کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ۱۰۲۳ھ کی تالیف ہے چنانچہ انتیسویں[۲۹] جمعہ میں سید محمد حضرت قطب عالم کی ایک کرامت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "د ایں خانہ زاد (سید محمد) گوید تا امروز کہ روز شہور سنہ ہزار و بست و دو است آں آہن و چوب و سنگ ممزوجہ متحدہ در بٹوہ موجود است"[۲] مؤلف کے اس بیان کے پیش نظر یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ ۱۰۲۲ھ میں سید محمد جمعات کی زیر نظر جلد لکھنے میں مصروف ہوں گے اور تقریباً اسی عرصہ میں یہ جلد تمام ہوئی ہوگی۔

سنہ کتابت

جمعات کی تالیف کے قریباً چھ سال بعد ہمارے مؤلف کے صاحبزادے سید جلال مقصود عالم نے زیر نظر نسخہ آگرہ میں کتابت کیا چنانچہ اس مخطوطہ کے آخری صفحہ پر یہ عبارت ملتی ہے "تمت ھذہ المجلدات من الجمعات الشاھیہ باحسن توفیق اللہ الملک العلام صخیرب (ضحوۃ) عید الفطر ثمان وعشرین و الثامن الاعوام فی دارالسلطنۃ اکرہ و تشرفت بتمیمقہ اقل الخلیفۃ بل لیس الحقیقۃ محمد المدعو بجلال بن مولنا ھذا الکتاب سمی حبیب اللہ و محبوبہ نظام الدین ابی البرکات السید محمد متع اللہ العالمین بطول بقایہ و نعمۃ لقایہ ابن السید جلال الدین حسین ..... سراج الدین ابی البرکات السید محمد الحسینی الرضوی المخاطب بخطاب شاہ عالم محبوب اللہ"[۱]

---

[۱] سید ہاشم کی اس توضیح نے اس خاندانی کنیت کا عقدہ حل کر دیا۔

[۲] اس مضمون کی پہلی قسط میں ہم نے غلطی سے یہ عبارت سید محمد کی طرف منسوب کی تھی (باقی اگلے صفحے پر)

ماخذ

جمعات شاہیہ کے صفحات پر ہمیں فارسی کے علاوہ عربی کتابوں کے اقتباسات بھی ملتے ہیں یہاں پر ان تمام کتابوں کا ذکر طوالت سے خالی نہ ہوگا چنانچہ ہم ان چند مشہور کتابوں کی فہرست پیش کرتے ہیں جن کا ذکر جمعات کے اوراق میں ملتا ہے۔

(۱) شیخ شہاب الدین السہروردی کا رسالہ اعلام الھدی اور (۲) عوارف المعارف (۲) شیخ عبداللہ بن اسعد یافعی یمنی کی روضتہ الریاحین فی حکایات الصالحین (۳) مولانا سعید الدین کی شرح مقاصد (۴) شیخ عین القضاۃ مولانا عین الدین ہمدانی کی تمہیدات عین القضات (۵) سید حسینی کی نزہت الارواح (۶) ابوالحسن علی بن عثمان الہجویری کی کشف المحجوب (۷) فرید الدین عطار کا تذکرۃ الاولیاء (۸) محمد بن محمد الحافظی (خواجہ پارسا) کا رسالہ مناقب خواجہ بہاء الدین المعروف بہ نقشبند (۹) سید محمد گیسو دراز کی خاتم الادب (کتاب خاتمہ) اور (۱۰) اسماء الاسرار (۱۱) خاقانی کی تحفتہ العراقین (۱۲) علامہ شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ تبریزی کی مشکواۃ المصابیح (۱۳) ابی عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری کی بخاری (۱۴) ابی الحسین مسلم بن الحجاج کی مسلم (۱۵) ابوعیسٰی محمد بن عیسٰی ترمذی کی ترمذی (۱۶) نظام الدین محمد چشتی کی قوایم العقائد (۱۷) ابوالیث سمرقندی کی تنبیہ فقیہ (۱۸) شیخ ابی محمد روزبہانی کی کتاب الانوار (۱۹) شیخ ابو منصور ماتریدی کی بحرالحقائق (۲۰) قیصری کی شرح خصوص (۲۱) علامہ تفتازانی کی شرح العقائد (۲۲) الغزالی کی احیاء العلوم اور (۲۳) منہاج العابدین (۲۴) شیخ علاء الدولہ السمنانی کی عروۃ الوثقی ان کے علاوہ حضرت شاہ عالم کے رسائل مثلاً (۲۵) رسالہ محمدیہ (۲۶) رسالہ رضویہ۔ (۲۷) رسالۂ صادقیہ (۲۸) رسالۂ باقریہ (۲۹) رسالۂ حسنیہ (۳۰) رسالہ جلالیہ (۳۱) رسالہ اشرفیہ (۳۲) رسالہ کاظمیہ (۳۳) رسالۂ مفاتیح خزائن (۳۴) مولانا فضل اللہ بن ضیاء عباسی کی جواہر جلالی (۳۵) عبداللطیف نہروالہ کی زادالعاشقین (۳۶) سید عثمان المعروف بہ شمع برہانی کی مدارج المعارج (۳۷) شیخ فرید الدین محمد بن دولت شاہ کی کنوز محمدی۔

آخری تین تصانیف بخاری خانوادہ سے متعلق ہونے کے علاوہ گجرات کی تحقیقات

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) لیکن استاذی ڈار صاحب (جنھیں اب مرحوم لکھتے ہوئے کس درجہ تکلیف ہوتی ہے) نے میری توجہ اس غلطی کی طرف دلائی اور بتایا کہ یہ بیان سید جلال کا ہے جو اس نسخہ کے کاتب ہیں۔

سے تعلق رکھتی ہیں چنانچہ ان کتابوں پر قدرے تفصیلی بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

(۱) زاد العاشقین

اس کتاب کے مصنف کا نام شیخ عبد اللطیف ہے۔ آپ کا مختصر ترجمہ مرآت احمدی میں ملتا ہے[51]۔ عبد اللطیف کے والد کا نام شیخ جمال الدین تھا جو مخدوم جہانیاں کے مرید اور پیشکار تھے آپ ۷۴۳ھ میں پٹن تشریف لائے اور ۸۰۴ھ میں وفات پائی[52]۔ عبد اللطیف کا سلسلۂ نسب شیخ صدر الدین سے اس طرح جا ملتا ہے عبد اللطیف بن جمال الدین بن سراج الدین بن صدر الدین[53]۔ شیخ صدر الدین شیخ حسام الدین عثمان کے خواہر زادہ تھے جو نظام الدین اولیاء کے خلیفہ گذرے ہیں[54]۔

شیخ عبد اللطیف حضرت قطب عالم کے خلیفہ اور اپنے زمانہ کے ایک بلند پایہ عالم تھے آپ نے کل نو کتابیں یادگار چھوڑیں[55] لیکن ان میں اللطائف البرہانیہ[56] اور زاد العاشقین خاص طور پر مشہور ہیں۔ نویں اور دسویں صدی ہجری میں زاد العاشقین تصوف کی ایک معیاری کتاب سمجھی جاتی تھی زاد العاشقین کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کی دو شرحیں لکھی گئیں (۱) سید احمد شیرازی کی منیۃ العارفین (۲) شیخ عبد الغنی الغنی کی حلاوۃ العارفین۔ زاد العاشقین کا کوئی قلمی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا لیکن اس کی دونوں شرحیں پیر محمد شاہ صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔

(۲) مدارج المعارج

مدارج المعارج کے مصنف کا نام سید عثمان بن علاؤ ہے لیکن آپ شمع برہانی کے لقب سے مشہور تھے۔ آپ نے بچپن ہی میں حضرت قطب عالم سے شرف ارادت حاصل کیا اور اپنی عمر کا اکثر حصہ اپنے مرشد کی خدمت میں بسر کیا[57]۔ سید محمد جعفر بدر عالم بخاری اپنی صد حکایت، کی ستیسویں حکایت میں حضرت عثمان کو عریضی سید بتاتے ہیں[58]۔

---

[51] خاتمہ مرآت احمدی (بمبئی) ص ۸۰–۷۷۔ [52] ایضاً ص ۷۵، [53] ایضاً ص ۷۵، [54] ایضاً ص ۷۴، [55] ایضاً ص ۷۷، [56] لطائف برہانیہ کا ایک قلمی نسخہ پیر محمد شاہ صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے [57] خاتمہ مرآت احمدی (بمبئی) ص ۱۹ [58] صد حکایت کا ایک قلمی نسخہ بھڑوچ کے قاضی صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔ اس کی ایک نقل پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کے کتب خانہ میں موجود ہے میں ان کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس نسخہ سے استفادہ کی اجازت دی۔

آپ نے دریائے سابرمتی کے کنارے عثمان پور نامی ایک گاؤں آباد کیا[۵۱] جو آج کل اسی نام سے مشہور ہے۔ آپنے ۸۶۳ھ میں انتقال فرمایا[۵۲] اور عثمان پور میں پیوندِ خاک ہوئے۔ سید عثمان کو تصوف کے علاوہ شاعری سے بھی دل چسپی تھی، مرآت احمدی کے مُصنّف نے آپ کی ایک فارسی غزل نقل کی ہے[۵۳]۔ مرآت احمدی کے مُصنّف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ آپنے بہت سی کتابیں تالیف و تصنیف کیں لیکن ان میں سے مدارج المعارج خاص طور پر مشہور ہے[۵۴]۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ ہم اسے صرف اقتباسات کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔

مدارج کے اقتباسات جمعات شاہیہ کے علاوہ جعفر بدر عالم کی روضات شاہیہ اور سیّد ہاشم بن کرار بخاری کی صحائف السادات میں بھی پائے جاتے ہیں، ان اقتباسات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مدارج کا تعلق تصوّف سے ہونا چاہیئے۔ نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب میں مُصنّف نے اپنے پیر و مرشد حضرت قطب عالم کے خوارق عادات بیان کئے ہیں۔

(۳) کنوز محمّدی

کنوز محمّدی کے مُصنّف کا نام شیخ فرید الدّین محمّد بن دولت شاہ ہے شیخ فرید کو حضرت سیّد محمّد شاہ عالم سے شرف ارادت حاصل تھا۔ چنانچہ یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ شیخ فرید نے اپنے مُرشد کے نام کی مُناسبت سے اپنی تصنیف کا نام کنوز محمّدی رکھا ہوگا اور کنوز محمّدی کے اقتباسات کے پیش نظر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کنوز محمّدی حضرت شاہیہ کے فضائل و کرامات کا مجموعہ ہونی چاہیئے۔ سیّد جعفر بدر عالم نے اپنی صد حکایت اور اعمال و اشغال میں شیخ فرید کی کتاب کا نام کنوز محمّدیہ لکھا ہے۔

شیخ فرید کے سوانح حیات کا ہم سُراغ نہ لگا سکے لیکن کنوز محمّدی کے اقتباسات کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ شیخ فرید حضرت شاہیہ کا ہم عصر اور ۸۷۵ھ تک بقید حیات تھا کیونکہ اکثر و بیشتر جمعات سے شیخ فرید کے دربار شاہیہ میں موجود ہونے

۵۱ مرآت سکندری ص ۷۹۔ خاتمہ مرآت احمدی (بمبئی) ص ۲۔ ۵۲ ظفر الوالہ جلد اوّل ص ۳۲۔ ۵۳ خاتمہ مرآت احمدی (بمبئی) ص ۲۰۔ ۵۵ اعمال و اشغال کا ایک قلمی نسخہ بھڑوچ کے قاضی صاحب کے کُتُب خانہ میں موجود ہے ہم قاضی صاحب موصوف کے مشکور ہیں کہ انھوں نے ہمیں اس نسخہ سے استفادہ کرنے دیا۔

کے ثبوت ملتے ہیں۔[۵۱]

دربار شاہیہ

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کے بسیط برّ اعظم میں صوفیائے کرام نے اسلام کی وہ خدمت انجام دی ہے جو بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہوں سے بھی نہ بن پڑی، قرونِ وسطیٰ میں درویش کی خانقاہ اور صوفی کے آستانے کی اہمیت کسی بادشاہ وقت کے دربار سے کم نہ تھی بادشاہ کا دربار خاص ہوتا تھا صوفی کا آستانہ عام ہے

گیر و دار حاجب و دربان درین درگاہ نیست

حضرت شاہیہ کے آستانہ کی شان و شوکت بادشاہ وقت کے دربار سے کسی طرح کم نہیں تھی آپ اپنے معمول کے مطابق جمعہ کے روز لوگوں کو شرفِ باریابی دیتے اس روز رسول آباد[۵۲] میں ایک دربار شاہی منعقد ہوتا جس میں سلاحدار مرصع تلواریں لئے دائیں اور بائیں جانب کھڑے رہتے اور آپ کے دربار میں قصب کے پردے آویزاں ہوتے اور زربفت کا فرش بچھا رہتا۔[۵۳] ملک بن محمد بن قطب الدین اور سید حسن بن بدہ سلاحداری کا فرض انجام دیتے[۵۴]

آستانہ شاہیہ پر جمعہ کے روز لوگوں کا ایک جم غفیر جمع ہوتا اس اژدحام میں امراء اور سلاطین کے علاوہ راجاؤں کے لڑکے بھی ہوتے[۵۵] آپ کے آستانہ پر گھوڑوں اور ہاتھیوں کا ہجوم دیکھ کر ایک اجنبی یہی خیال کرتا کہ یہ کسی با اثر امیر کا دربار ہوگا۔[۵۶] حضرت شاہیہ سے نیاز حاصل کرنے کی غرض سے لوگ دور دور سے آتے۔ آستانہ شاہیہ پر حاضر ہونے والے ارادتمندوں میں بنبانیوں[۵۷] کے علاوہ باشندگان اوچھ[۵۸] کی ایک اچھی خاصی تعداد ہوتی، مختصر یہ کہ دربار شاہیہ کی اہمیت سلطان وقت کے دربار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ (باقی)

---

[۵۱] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ نمبر ۲۵ و ۳۰۔ [۵۲] رسول آباد احمد آباد کے جنوب میں قریباً ایک میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور آج کل شاہ عالم کے نام سے مشہور ہے [۵۳] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ [۵۴] ایضاً جمعہ ۸۔ [۵۵] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۳۳۔ [۵۶] مرآت سکندری ص۹۵ [۵۷] اکثر بنبانیوں کو مخدوم جہانیاں سے شرف ارادت حاصل تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں حضرت شاہیہ سے بھی عقیدت تھی —

[۵۸] اوچھ اس وقت مغربی پنجاب کی ریاست بہاولپور میں واقع ہے قرون وسطیٰ میں اسماعیلی داعیوں اور بخاری صوفیا کی وجہ سے اسے بڑی اہمیت حاصل تھی [۵۹] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۱ اور ۱۷۔

تبصرے

(۱) طبِ فریدی، مُصنّف، فرید الدّین۔ تقطیع متوسّط، طباعت ٹائپ،
صفحات ۲۱۵۔ قیمت: آٹھ روپے ۸ر

(۲) تحقیق البحران، مُصنّف، حکیم احمد اللہ خاں دہلوی۔ تقطیع متوسّط، طباعت ٹائپ،
صفحات ۲۵۔ قیمت: ۱۲ر

(۳) سفینۃ النجّات فی احوال جہازات، مُصنّف، غلام غوث خاں۔ تقطیع متوسّط،
طباعت ٹائپ، قیمت: ۱۲ر

مدراس میں قلمی کتابوں کا ایک سرکاری کتُب خانہ ہے۔ حکومت اس کی بیش بہا کتابوں کو مختلف علمائے فن سے مُرتّب کرا کے شائع کرتی ہے۔ طبِ فریدی اس سلسلہ کی ۲۳ ویں کڑی ہے۔ اس کے مُرتّب جناب افضل العلما حکیم عبد القادر احمد صاحب فاضل تکمیل الطب کالج لکھنؤ ہیں، کتاب ۳۸ ابواب پر مُشتمل ہے، ہر باب ایک خاص مرض کے سلسلہ میں ہے اور اس کے علاج کے لئے مفرد ادویہ تجویز کی گئی ہیں۔

امامِ فن بقراط کا مقولہ ہے کہ مرض کا علاج مریض کے ملک کے عقاقیر سے ہی بہتر ہے لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ جب عقاقیر کے برگ و چھال و گل و ثمر سے کما حقہٗ بصیرت و آگاہی ہو، متعدّد دواؤں کے مُرکّب نسخوں کے مقابلہ میں مفردات (کم سے کمتر اجزا) سے معالجہ کرنے میں حذاقت فن ہی تسلیم نہیں ہے بلکہ کاملین فن کا معمول رہا ہے۔

ملک میں مفید عقاقیر کی بہتات ہے، اگر طبِ عربی کو باقی رکھنا ہے تو جہد للبقا کرنا ہی ہوگا، صحیح جُستجو و تحقیقات کے بعد ہند و پاکستان کو یورپ و امریکہ سے درآمد کی ہوئی اکثر دواؤں اور مُرکّبات سے مستغنی کر سکتے ہیں، عربی، فارسی، اُردو میں متعدّد مُستند و غیر مُستند کتابیں موجود ہیں، ان پر عبُور حاصل کر کے غیر مطبوعہ عقاقیر کے افعال و خواص کی تحقیق میں بقائے کمال فن کا راز مُضمر ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی اصلاح و تحقیق میں محنت کر کے مُفید بنانے کی سعی کی گئی ہے، فارسی کے ساتھ اگر اس کا اُردو ترجمہ بھی ہوتا تو اس کی افادی حیثیت بڑھ جاتی۔

کتاب کی قیمت زیادہ ہے لیکن اہلِ ذوق کے لئے گراں نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے اس کے مُرتّب بھی حکیم عبد القادر صاحب ہیں، اس کے مُصنّف حکیم احمد اللہ خاں دہلوی اپنے عہد کے ایک مشہور اور حاذق طبیب تھے، انھوں نے اپنی

یہ تصنیف نواب امیرالہند والاجاہ محمد علی خاں بہادر حاکم کرناٹک کی خدمت میں پیش کی تھی۔
امراض میں بحران وہ حالت ہے جس میں مریض میں انقلاب اور تغیر عظیم ہوتا ہے جس سے مرض یا تو شدید تر ہوجاتا ہے یا خفیف تر، اگر معالج حاذق و تجربہ کار نہیں ہے تو صحیح تدبیر سے عاجز رہ کر ہلاکت کا سبب ہوجاتا ہے طبِ یونانی جب اپنے عروج پر تھی۔ تشخیص امراض کے اصول و قواعد سے صحیح تشخیص و معالجہ کرکے ہر قسم کے مزمن و مہلک امراض کے ازالہ کرنے میں اپنا کرشمہ دکھا کر متحیر کر رکھا تھا۔
آج جبکہ طب عربی کے زیست و موت کا سوال ہے، ضروری ہے کہ اطباء تحقیقات قدیمہ کے ماہر ہوکر تشخیص امراض کے نت نئے اصول و قواعد جو پیدا ہورہے ہیں ان میں ملکہ پیدا کریں۔
مدراس گورنمنٹ اورینٹل سیریز نے کتاب کو شائع کرکے توجہ دلائی ہے، توقع کرنی چاہیئے کہ حاملانِ فن اس کے مطالعہ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاکر ناشر کی حوصلہ افزائی کریں گے معالجین کے لئے مستحسن اقدام ہے۔ قیمت بلحاظ صفحات زیادہ ہے۔
(۳) اس سلسلہ کی یہ تیسری کڑی ہے۔ اس کے مولف نواب غلام غوث خاں والی کرناٹک ہیں۔ دکن میں اگرچہ کرناٹک کی چھوٹی سی اسلامی ریاست تھی لیکن اس کا دربار علمی و ادبی حیثیت سے بہت اہم اور عظیم المرتبت ہے، علامہ بحرالعلوم اور مولانا باقر آگاہ اسی دربار سے وابستہ تھے۔ اس کے حکمرانوں نے نہ صرف علماء و فضلا کی ہمت افزائی اور دستگیری کی بلکہ بڑی حد تک ان میں سے بعض خود اہل قلم تھے، موجودہ رسالہ انھیں میں سے ایک کی تصنیف ہے اس کے مرتب جناب رحیم احمد صاحب فاروقی، ایم۔اے لکچرار آرٹس کالج مدراس ہیں۔
فن جہاز رانی، عرب مسلمانوں کے ایجادات و اختراع کی مرہون منت ہے۔ تیرھویں صدی ہجری میں اس فن کے اصول و قواعد طریقہ شناخت جہاز وغیرہ جو رائج تھے ابواب و فصول میں تقسیم کرکے اہل ذوق کے لئے معلومات کا مفید ذخیرہ پیش کیا ہے سوا سو سال پہلے کی اصطلاحیں اور طریق ہائے جہاز رانی و مختلف ممالک کے پرچموں کی نشان دہی کی گئی ہے اس فن میں گذشتہ صدیوں میں کافی ترقی ہوجانے کے باوجود اہل ذوق کی معلومات کے لئے گزشتہ فن جہاز رانی پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ جو لوگ فن جہاز رانی سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لئے مفید اور کارآمد کتاب ہے۔
تینوں کتابیں گورنمنٹ اورینٹل سیریز مدراس سے مل سکتی ہیں۔

(ع۔ س)

(۱) نئے ہند کی تعمیر، صفحات ۳۶،
قیمت درج نہیں۔

(۲) پہلا پنج سالہ پلان، سوالات اور جوابات، صفحات ۲۷
قیمت ۴/

(۳) معاوضے کی درمیانی اسکیم، صفحات ۴۴
قیمت ۲/

ملنے کا پتہ :- پبلیکیشنز ڈویژن، منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ، گورنمنٹ آف انڈیا دہلی۔

مرکزی حکومت عوام کی معلومات کے لئے وقتاً فوقتاً ملک کے معاشی اور انتظامی مسائل پر مختلف زبانوں میں رسالے شائع کرتی رہتی ہے، یہ تینوں رسالے بھی اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔

پہلے دو کتابچے حکومت ہند کے پلاننگ کمیشن کی طرف سے شائع کئے گئے ہیں "نئے ہند کی تعمیر" آرٹ پیپر پر بہت خوبصورت چھاپا گیا ہے۔ ہر صفحہ پر تصاویر ہیں، اس کتابچہ میں ہندوستان کی تعمیری ترقی کے سلسلہ میں جہاں جہاں کام ہو رہے ہیں اور جن جن صنعتوں کو ترقی دی جا رہی ہے ان کو وضاحت سے پیش کیا ہے۔

ہندوستان کے پنج سالہ پلان کے بارے میں یہ کتابچہ معلومات افزا ہے۔ شروع میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی ایک تقریر کا خلاصہ ہے۔

(۲) دوسری کتاب میں پہلے پنج سالہ پلان کو سوالات و جوابات کے ذریعہ حکومت کے ترقیاتی منصوبوں کو عوام تک پہنچانے کی کامیاب کوشش ہے۔ اعداد و شمار کے ذریعہ اس کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ حکومت نے کس قدر رقم منظور کی کتنی خرچ ہوئی اور کتنی آئندہ برسوں میں خرچ ہونی ہے۔ اپنے ملک کی ترقیاتی اسکیموں کو سمجھنے میں اس سے کافی مدد ملتی ہے۔ اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے قیمت کچھ بھی نہیں۔

(۳) تیسری کتاب معاوضے کی درمیانی اسکیم۔ شروع میں وزیر بحالیات شری اجیت پرشاد جین کی تقریر ہے۔ جس میں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کی "پھر بساؤ" اسکیم کی وضاحت کی ہے، کتاب میں ایسے اجڑے ہوئے لوگوں کو معاوضہ دینے کے قواعد و اصول بتائے گئے ہیں کہ کس طرح وہ حکومت سے اپنے حقوق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب مغربی پنجاب سے آئے ہوئے لوگوں کے لئے بہت مفید اور کار آمد ہے۔ عام لوگوں کے لئے حکومت ہند کی "پھر بساؤ" اسکیم کے بارے میں معلومات افزا۔ (ف)

نوائے وقت

از پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر،
کاغذ، کتابت و طباعت: عمدہ۔ قیمت: دو روپے

ناشر:۔ دی انٹرنیشنل امپوریم لمیٹڈ، پیلس بلڈنگ، سرفیروز شاہ مہتہ روڈ، بمبئی ۱

پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر بمبئی کے مشہور کالج سینٹ زیویرس کالج کے طالب علم ہیں اور ایک عرصہ سے وہیں اُردو و فارسی کے پروفیسر بھی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ان کے تقرر کے بعد سینٹ زیویرس کالج میں اُردو کی فضا قائم ہوئی اور طلباء نے ان کی رہنمائی میں کالج اور یونیورسٹی میں طلبا کے وظائف اور تمغے مقرر کرنے کی مہم شروع کی اور ایس ایس سی (میٹرک) سے لے کر بی۔ اے تک اُردو میں تمغے مقرر کرادئے۔ انٹر کالجیئٹ تحریری و تقریری مقابلوں کا آغاز کیا۔ اس سعی میں انھوں نے مختلف جلسے اور پروگرام کئے۔ انھیں موقعوں پر پروفیسر موصوف نے استقبالی تقریریں کیں جن میں حسب موقع ضمنی طور پر مشترکہ زبان (اُردو) اُردو شاعری، غالب، اقبال اور اکبر کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا۔ نوائے وقت انھیں تقریروں کا مجموعہ ہے۔ ایک مختصر مقالہ پنڈت "کیفی کی شاعری" جو بمبئی میں یوم کیفی پر پڑھا گیا تھا۔ اس مجموعہ میں شامل ہے۔ "سینٹ زیویرس کالج میں اُردو" کے عنوان سے ایک ضمیمہ آخر میں درج ہے۔ یہ ضمیمہ زیویرس کالج کی اُردو سے متعلق خدمات پر روشنی ڈالتا ہے۔ موصوف نے غالب، اقبال اور اکبر سے عقیدت مندی کا اظہار کیا ہے۔ مقالہ "کیفی کی شاعری" خاصا ہے۔ "گاندھی جی اور زبان کا مسئلہ" میں گاندھی جی کے خیالات کی توضیح کی ہے۔ بعض بعض مقامات پر افراط و تفریط کا شکار ہوگئے ہیں۔ تاہم ہم ان کی اس پہلی کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں اور آئندہ حزم و احتیاط سے کام لینے کی گذارش کرتے ہیں۔ ("ع۔ ج")

رسالہ سویرا، ۱۳ و ۱۴ مشترکہ خاص نمبر

ترتیب دینے والے:۔ احمد راہی۔
نذیر احمد چودھری

قیمت: تین روپے ناشر:۔ نیا ادارہ، لاہور۔

ترقی پسند ادب کے ترجمان کی حیثیت سے اُردو دُنیا میں "سویرا" نے ایک بلند مقام پیدا کرلیا ہے۔ موجودہ خاص نمبر جولائی، اگست، ستمبر اور اکتوبر کا مشترکہ شمارہ و نمبر ۱۳ و ۱۴ پر مشتمل ہے۔ گٹ اپ عمدہ ہے۔ کتابت بھی اچھی ہے۔ تاہم کاغذ معمولی ہے۔ لیکن موجودہ دَور میں کسی اُردو رسالے کا ۲۰۰ صفحوں کا خاص نمبر نکالنا بہرحبت قابل تعریف ہے۔ مقالات میں عوامی ادب، ترقی پسند ادب کا سماجی پس منظر اُردو شاعری میں حُبِّ وطن کی روایت، پاکستانی موسیقی کا ڈھونگ اور سیاسیات عالم دیکھے اور مقالہ نگاروں کے مطالعے اور تجربے کے شاہد ہیں۔ لوہسون کی داستانِ حیات کے سلسلہ میں "ایک مکان۔ ایک منزل"

بڑا خوب صورت مضمون ہے۔ پہلا پتھر، جلاوطن اور شکستہ کنگورے کامیاب طویل افسانے ہیں۔ افسانۂ طنز، خاک کے تحت کالا سورج، اندھیرا اور اندھیرا، ڈرم لینڈ، ٹھنڈی آگ، چھوٹی سی بیرے دل کی تلیا، اے من، پہلا گاہک، جاندار مختصر افسانے اور طنزیں ہیں۔ شعری حصّہ حسب معمول اچھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سویرا میں افسانوں اور نظموں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ بڑا اچھا ہوتا جو ترقی پسند ادب کی ترجمانی کے سلسلہ میں تحقیقی و تنقیدی مقالات بھی زیادہ تعداد میں شامل کئے جاتے۔ موجودہ نمبر بحیثیت مجموعی اچھا اور لائق مطالعہ ہے۔ (ذ۔ ع۔ ج")

ادبِ لطیف۔ لاہور، سالنامہ ۱۹۵۴ء

ایڈیٹر:۔ میرزا ادیب،
زر سالانہ۔ پاکستان میں، آٹھ روپے،
غیر ممالک میں بارہ روپے، سالنامہ کی قیمت:۔ تین روپے۔
مطبوعہ، مکتبۂ اُردو لاہور۔

ادبِ لطیف کا زیرِ نظر سالنامہ فروری اور مارچ ۱۹۵۴ء کا مشترک شمارہ ہے۔ پاکستان میں کاغذ کی کمیابی کے باوجود تین سو سے زاید صفحات پر ایک ضخیم نمبر نکالنا مکتبۂ اُردو کی جواں ہمتی پردال ہے۔ بہ لحاظ کیفیت بھی یہ سالنامہ اعلیٰ درجہ کا ہے جس میں چوٹی کے کئی ادیب یکجا جمع ہیں۔ افسانوں میں غلام عبّاس کا افسانہ "اوور کوٹ" معرکہ کی چیز ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے نوجوان کا امیہ ہے جو متوسط طبقہ کا فرد ہونے کے باوجود "اوورکوٹ" کی نقاب اوڑھ کر سرمایہ دار طبقہ میں داخلہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس کی موت سے زیادہ المناک اس کی اس سعی ناشکور کا انکشاف ہے۔ منٹو، جس نے کالا قانون، نعو اعد دیوانہ شاعر جیسی انقلابی کہانیاں لکھی تھیں، انگڑائیاں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "کفن دفن" ایک مفلس مگر خود دار شوہر کی کہانی ہے، جو فیّاض سرمایہ داری کا قائل نہیں معلوم ہوتا۔ ابراہیم جلیس کا افسانہ "نشی حور ایک رقاصہ ہے" ایک جاپانی گیشا پر بڑا کامیاب افسانہ ہے۔ یہ امریکیوں کے دستبرد کی المناک کہانی ہے۔ "ادب کے بادا لوگ" ذہنی طور پر کسن شاعروں اور ادیبوں پر طنز ہے۔ تسنیم سلیم چھتاری اور سیّد خلیل احمد کے طویل مختصر افسانے "بہ انداز دگر" اور "شمع بجھتی ہے تو......" دل چسپ افسانے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر سیّد خلیل احمد زبان کے معاملہ میں زیادہ محتاط ہوتے۔ اصغر بٹ کا ڈرامہ "چھوٹے میاں" دلچسپ ہے اس میں چھوٹے میاں کو ایک غیر معمولی زیرک بچّہ کی صورت میں بڑی کامیابی سے پیش کیا گیا ہے، میرزا ادیب کا ڈرامہ "بیٹا" ایک کامیاب تمثیل ہے۔ پلاٹ کا موڑ دلچسپ ہے، کلید کامیابی

(حصّہ دوم) دوم درجہ کی چیز ہے۔ مقالوں میں ڈاکٹر محمد حسن کا مقالہ "اُردو ادب میں رومانوی تحریک" (قسط دوم) خیال انگیز ہے۔ اُردو ادب پر جتنی تاریخیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں رومانوی تحریک کے ایک مستقل موضوع کا فقدان ہے۔ مقالہ نگار نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ "میر کا تصوّر دردمندی" میں موضوع کے اعتبار سے کوئی نیا پن نہیں۔ میر کے ابتدائی حالات زندگی اور ان کے دَور کے سیاسی حالات پر عبدالحق، اثر لکھنوی وغیرہم نے کافی لکھا ہے۔ مقالہ ہٰذا میں اس پر کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے۔ البتّہ مقالہ کے آخری حصّہ میں ایک نیا پن ضرور ہے نفسیاتی نظریات (جن کی صحت اب بھی محلِ نظر ہے) کی روشنی میں میر کو ایذا پسند (میسا کونسٹ) ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اوّل تو نفسیاتی نظریات کے اقتباس پیش کرنے میں غیر ضروری تطویل سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محض چند اشعار کی بنیاد پر ہم میر کو "ایذا پسند" ثابت نہیں کر سکتے، تاوقتیکہ عملی زندگی میں ان کی ایذا پسندی کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ منظفر علی سیّد کا مقالہ "کلاسیک کیا ہے"، مختصر مگر جامع ہے۔ مقالہ میں کلاسیکی ادب کی افادیت کو سراہا گیا ہے۔ پروفیسر صفدر حسین کا مقالہ "لکھنوی ادب کا پس منظر" تاریخ ادب کے طالب علموں کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ حصّۂ نظم کے سلسلہ میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس سالنامہ میں ان شُعراء کی نظمیں اور غزلیں درج ہیں جن سے اُردو داں طبقہ کم و بیش روشناس ہے۔ مثلاً فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری، عندلیب شادانی، عبدالحمید عدم، باقی صدیقی، عبدالمجید بھٹی، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی، قیوم نظر، خلیل الرحمٰن اعظمی وغیرہ۔ اُمّید ہے کہ سالنامہ ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔ "ع، ص"

ضمیمہ (ب)

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں

اُردو مخطوطات

از

حامد اللہ صاحب ندوی

زباں تو نہیں نا مجھے جان تھا | نہ ایمان تھا نا مجے گیان تھا
نہ میں جانتا تھا کہ میں کون ہوں | نہ اسلام نا دین نا نور کوں
جُدا جانتا تھا ہر یک کس کی ذات | بغض ہور تکرار غیبت سنگات
یو محیط کے پانی میں موتی دسا | اندھارا مرے تن کا اس دم کھسا

ابتدا:۔

تو ہیں ساقی ہے بزم گلفام کا | دیون ہار توں عشق کے جام کا
توہیں ہے توہیں ہے توہیں ہے توہیں | توہیں سب جگت کا سو مالک توہیں
توہیں لامکاں کا علے نور ہے | توہیں سرِ آگاہ کا سور ہے

خاتمہ:۔

الٰہی حشر کوں مرے نین میں | بھرا ہور ہے طرفتہ العین میں
الٰہی دے رحمت مرے کار کوں | مرے تن سوں رد کر نفس خار کوں
الٰہی دے توفیق مجھ حشر کی | براہیم علی شاہ کے درس کی

ترقیمہ:۔

"ایں رسالۂ شریف و نسخۂ لطیف من تصنیف حضرت شریف علی شاہ قادری مدظلہٗ العالی قدس سرہٗ۔"

وصل نامہ

مُصنّف مرتضٰی، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۲۸، شعر فی صفحہ ۱۱،
خط نستعلیق سائز ۴" x ۶"

مُصنّف کے حالات معلوم نہ ہو سکے، ساری مثنوی میں صرف ایک جگہ خاتمہ میں اس نے اپنا نام لیا ہے۔

سُنو مرتضٰی تھیں تیں اب سخن | بچن کے سو درجک تے کاڑیا رتن

اس کے علاوہ اُس نے اپنے پیر و مرشد حضرت شعبان کا بھی تذکرہ کیا ہے:۔

کہ بزرگ جیتے ہیں جو شعبان پیر | کیا مجھ کوں وحدت سے روشن ضمیر
اپس لب لگا کر دیا مے کا جام | کیا بزم ساقی میں مجھ کوں مدام
جو کوئی تشنہ گر ہو کو آدے ادھر | اسی کو پچھ دیتا ہوں میں جام بھر

مثنوی میں وحدت الوجود کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ خاتمہ پر تعداد اشعار مثنوی کے موضوع اور نام کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

ہوا ختم خطبہ وصل کا تمام — کہ آزادگی کا سراپا مقام

ابتدا:۔

اول توں اتھا گنج مخفی کے بیچ — لیا صفت ساتوں بھی اس بیچ کھینچ
گرد، یوں رہیا بے خودی کے اندر — سمندر کے سینہ میں ہے جوں گہر
او جاگا تو ایسا ہے سرِّ نہاں — بغیر ہو نہ آواز ہے کچھ وہاں

خاتمہ:۔

اسی سینچ کہنا پڑیا بالضرور — ہوا نظم ساقی مجلس کوں دور
ہوئے بیت پورے تیں سو پنچ او — بھید او نئیں سو پائے گا ایک گنج او
ہوا وصل نامہ مرتب تمام — بہ حق محمد علیہ السّلام

اس مثنوی کا ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو میں بھی موجود ہے، جس کا نہایت تفصیل کے ساتھ تذکرۂ اُردو مخطوطات میں تعارف کرایا گیا ہے، اس سلسلہ میں بہت سے اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں ان کے مقابلہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض جگہ اہم اختلافات ہیں، چنانچہ مصنف کے مرشد سے متعلق جو اشعار تذکرہ میں درج ہیں اس میں "شعبان" کے بجائے "سلطان" کا لفظ ہے، اسی طرح تعداد ابیات سے متعلق جو شعر نقل کیا گیا ہے اس میں ان کی تعداد تین سو پانچ کے بجائے تین سو اُنتیس ہے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر زور نے مرتضیٰ کے حالات پر روشنی ڈالنے کی بھی کوشش کی ہے مگر بعد میں خود ان کو شک ہوا ہے کہ یہ وہ مرتضیٰ[۱] نہیں ہے جس کے حالات وہ لکھ رہے ہیں۔

رموز المکاسبین

مصنف شہ صدر الدّین، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۱۱، شعر فی صفحہ ۱۳، خط نستعلیق، سائز ۶" x ۹"

اس مثنوی سے مصنف کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ متعدد جگہ انھوں

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۂ اُردو مخطوطات ص ۱۲۵

نے اپنا نام شہ صدرالدّین استعمال کیا ہے، چنانچہ دوسرا ہی شعر ہے:۔

گوش جاں سوں اب سنو صاحب یقیں کیا کہتا ہے نظم یں شہ صدرالدّین

مثنوی کے نام کی طرف نفس کتاب میں کہیں کوئی اشارہ نہیں ہے لیکن مثنوی کے اوپر یہ جُملہ سُرخ روشنائی میں لکھا ہوا ہے:۔

"این رسالۂ رموز المکاسبین از تصنیف صدرالدّین قتال قدس سرۂ العزیز است"

لیکن لائق مُرتّب نے کہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ یہ نام ان کو کہاں سے ملا۔

تذکرۂ اُردوٗ مخطوطات میں بھی اس مثنوی کا تعارُف کسب محویت "کے نام سے ملتا ہے، اس کے علاوہ ڈاکٹر زور نے شہ صدرالدّین کے متعلق تذکرۂ اولیائے دکن وغیرہ کے حوالوں سے جو کچھ لکھا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"اولیا کے تذکروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صدرالدّین حضرت بدرالدین چشتی (متوفی ۷۳۸ھ خلدآباد) کے مُرید و خلیفہ تھے، مُرشد نے گلشن آباد ناسک میں سکونت اختیار کرنے کا حُکم دیا تو شاہ صدرالدّین نے عرض کیا کہ ناسک کی ولایت تو سیّد محمد صادق شاہ حسینی کے تفویض ہوئی ہے جو میرے بعد آئیں گے، اس لئے میں اہل ناسک کو ہدایت کرکے دوسری جگہ سکونت پذیر ہوں گا۔ چنانچہ قصبۂ پیپری میں سکونت پذیر ہوئے اور ہدایت وتالیف قلوب کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو مسلمان کیا، ۷۶۸ھ میں رحلت کی اور قصبۂ پیپری میں اگت پوری سے ایک میل کے فاصلہ پر مدفون ہوئے"

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ "شاہ صدرالدّین نام کے کسی اور بزرگ کا تذکرہ سے پتہ نہ چل سکا، اس لئے ممکن ہے کہ یہ مثنوی ان ہی بزرگ کی ہو"[۱]

لیکن مثنوی کی زبان اس کا اسلوب اور اس کے طرز ادا کی روشنی میں اسے ڈاکٹر زور کے بزرگ شاہ صدرالدّین سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ مولوی نصیرالدّین ہاشمی نے بھی ڈاکٹر زور کے بیان کو دُہرایا ہے اور اسی پر اکتفا نہ کرکے شاہ صاحب کی دوسری تصانیف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، لیکن یہ سب مبہم اور غیر تشفّی بخش ہے، ہاشمی صاحب کی مزید تفصیل حسب ذیل ہے۔

"شاہ صدرالدّین اپنے پیش رو اصحاب طریقت کے مطابق صاحب تصنیف تھے

---

[۱] تذکرۂ اُردوٗ مخطوطات صفحہ ۶۷-۶۶۔

چنانچہ ایک کتاب "کسب محویت" آپ کی تصنیف ہمدست ہوئی ہے، یہ تصوّف میں ہے اور ۱۱۷۸ھ میں تصنیف ہوئی ہے اِس کا ایک مخطوطہ کتُب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو میں موجود ہے اس کے علاوہ کئی تصانیف کا پتہ چلا ہے جو تصوف میں ہیں۔[۱۵]"

ہاشمی صاحب نے اپنے اس بیان میں اِس مثنوی کا جو سنہ تصنیف دیا ہے وہ قیاسی ہے، اِس سلسلہ میں خود مثنوی سے کوئی اندرونی شہادت نہیں ملتی۔

مثنوی کا موضوع وحدۃ الوجود، روح، محویت وغیرہ جیسے تصوّف کے مسائل ہیں۔

ابتدا :-

نام لے اللہ محمّد کا اوّل ۔۔۔ کسب کا سب کوں کہوں در ہر محل
گوش جاں سوں اب سنو صاحب یقیں ۔۔۔ کیا کہتا ہے نظم میں شہ صدرالدّیں
اولاً با نفس و دل قلب و مثال ۔۔۔ خواہش دانائی کا توں بوج حال

خاتمہ :-

یہ علم نقطے حروفاں خواہشاں ۔۔۔ سب حروفاں کر توں نقطے میں نہاں
اصل نقطے کا سیاہی سوں پچھاں ۔۔۔ او سیاہی ذات غیب ہووے ہے جاں
گر صدرالدیں رہے توں درغیب ایک پل ۔۔۔ تب جو توں اے فقر کا پاوے محل

ترقیمہ :-

"کاتب الحروف بندۂ کمین عظیم الدّین، قلمی یافت برائے اخلاص محبی، حال ساکن بندر معمورۂ بمبئی، ہر کسے کہ دعوی کُند باطل شود، اتمام یافت بہ روز یک شنبہ تاریخ ۱۴ شہر رمضان المبارک ۱۲۳۲ھ۔"

جیسے کہ اوپر ذکر کیا گیا اِس کا ایک قلمی نُسخہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد میں بھی موجود ہے۔

پنچھی باچھا

مُصنّف وجدی، سنہ تصنیف ۱۱۵۵ھ، صفحات ۱۴۳، شعر فی صفحہ ۱۰، خط نستعلیق، عنوانات سُرخ روشنائی میں، سائز ۴ × ۸

۱۵ دکن میں اُردو چوتھا اڈیشن صفحہ ۳۷۔

وَجدی مغلیہ دَور کا ایک باکمال شاعر ہے، اس کا نام وجیہ الدّین تھا، اس کی تین مثنویاں مشہور ہیں، پنچھی باچھا، تحفۂ عاشقاں اور مخزنِ عشق۔ پنچھی باچھا شیخ فرید الدّین عطار کی مثنوی منطق الطیر کا دکھنی ترجمہ ہے تحفۂ عاشقاں بھی عطار ہی کی ایک مثنوی گُل و ہرمز کا دکھنی ترجمہ ہے لیکن مخزنِ عشق یا بہار جانفزا کسی کا ترجمہ نہیں ہے[1]

پنچھی باچھا کے خاتمہ میں وَجدی نے منطق الطیر کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

شکر کر وَجدی کہ بر وجہ صواب		ختم ہوئی توفیق حق سوں یو کتاب
اصل میں تھا یو کلام فارسی		اہلِ معنی کوں مثال آرسی
خوش تریں تصنیف شیخ نامدار		پیشوائے عارفانِ روزگار
شیخ صاحب دل فرید نامور		خاص جن کا ہے لقب عطار کر
او نکالے ہیں جو یو عطر سخن		عطر پروردہ کئے ہیں نوگگن
ہر بچن یک تحفۂ اسرار ہے		مغز جاں کوں طبلہ عطار ہے
فکر سوں جو کوئی کرے اس میں نظر		مقصدِ دینی سوں ہووے بہرہ ور
نفس اس کا دم بدم تنبیہ پائے		غیر کا وسواس دل سوں اس کے جائے

اور پھر اس کے ترجمہ کے اسباب اس طرح بیان کئے ہیں۔

تھا ولے جوں فارسی میں یو کلام		کم سمجھ سکتے تھے اس کوں خاص و عام
بلکہ بعضے فارسی خواں بھی کہیں		حرف مشکل کوں سمجھ سکتے نہیں
گرچہ میں بھی کچھ نہیں معنی شناس		کان منجے اس کوں سمجھنے کا قیاس
لیکن اس کو دیکھ کر دلچسپ بول		یک بہ یک یوں دل منے آئی کلول
جی موافق فہم اپنے کے ضعیف		اس کتاب خاص کا نظم شریف
صاف کر دکھنی زباں میں لے کو آؤں		تا رہے دُنیا منیں میرا بھی ناؤں
پس مدد منگ شیخ کی ارواح سوں		التجا کر عجز ہور الحاح سوں
میں قلم جاری کیا ہوں ورق پر		جب ہوا پورا نظم یو مختصر
نام اس کا میں پنچھی باچھا رکھا		یادگاری خلق عالم کوں دیا

ابتدا حمد و نعت سے کی ہے اور اصل مضمون شروع ہونے سے پہلے حمد و نعت اور منقبت چہار یار کو سات ابواب میں علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے۔ خاتمہ میں تاریخ

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو دکن میں اُردو۔

تصنیف بھی بیان کی ہے۔ مگر چونکہ یہ مادّہ کی صورت میں ہے اِس لئے ذرا سی تبدیلی پر مختلف نُسخوں سے مختلف سنہ نکل آتے ہیں۔

اِس سلسلہ میں ہاشمی صاحب نے اِس کی تاریخ ۱۱۳۱ھ بتلائی ہے اور زوؔر نے ۱۱۲۶ھ، مگر زیرِ تعارُف نُسخہ میں تاریخی شعر حسبِ ذیل ہے۔

جب کیا تاریخ کا دل میں حساب　　تب ہوی میزاں میں "کیا خاصی کتاب"

صرف "خاصی کتاب" کے ۱۱۲۴ھ۔ اور "کیا خاصی کتاب" کے ۱۱۵۵ھ ہوتے ہیں۔

ابتدا:۔

اے پنچھی پیارے سخن آغاز کر　　حمد سوں حق کے بلند آواز کر
شوق سوں ایسا اُو چایک چہچہا　　جی رہے ترلوک کا عالم لبھا
گلشنِ وحدت ہے تیرا آشیاں　　احدیت کا راز ہے تجھ پر عیاں

خاتمہ:۔

تا کہ بخشے جائے سب میرے گُناہ　　ہووے اُجلا یو مرا نامہ سیاہ
اِس نئے یارب میرا ہوتا ہے کام　　شُکر ہے جی ہوئے پنچھی باچھا تمام
جب کیا تاریخ کا دل میں حساب　　تب ہوی میزاں میں کیا خاصی کتاب

ترقیمہ:۔

"عاصی خاکسار سید اسمٰعیل ولد علی صاحب قبلہ مرحوم ساکن کشن گری درشہر کنہیا نور بہ تاریخ یک شنبہ شہر ذوالحجہ ۱۲۵۵ہجری نبوی صلعم بہ وقت ظہر بہ اتمام رسید۔"

اس کے چار قلمی نسخے ادارۂ ادبیات اُردو میں موجود ہیں[۵۱]۔ ایک کُتُب خانہ جامعہ عُثمانیہ میں ہے[۵۲]۔ علاوہ ازیں یہ متعدد بار چھپ بھی چکی ہے۔ چنانچہ اس کے جو "مطبوعہ نسخے کریمی لائبریری میں موجود ہیں ان میں سے ایک ۱۲۸۴ھ میں مطبع حیدری بمبئی سے اور دوسرا ۱۳۱۲ھ میں کریمی بمبئی سے شائع ہوا ہے۔ ان دونوں مطبوعہ نسخوں میں تاریخی شعر نہیں ہے۔ اور وہ آخر سے کچھ ناقص بھی ہیں ممکن ہے کسی ناقص مخطوطہ کو سامنے رکھ کر یہ تیار کئے گئے ہوں۔ البتہ ادارۂ ادبیات اور جامعہ عثمانیہ کے مخطوطوں میں وہ شعر اس طرح ہے۔

جب کیا تاریخ کا دل میں حساب　　تب ہوا میزان "کیا خاصا کتاب

۱۱۶۲

[۵۱] تذکرۂ اُردو مخطوطات [۵۲] فہرست اُردو مخطوطات

جب کیا تاریخ کا دل میں حساب   تب ہوا میزاں میں "یو خاصا کتاب"
۱۱۳۱
اس طرح ڈاکٹر زور اور ہاشمی صاحب کی تاریخوں کا ماخذ بھی نکل آتا ہے۔

پنچھی باچھا

کتب خانۂ جامع مسجد میں پنچھی باچھا کے دو نسخے ہیں ایک نسخہ مستقل ہے جس کا اوپر تعارف کرایا گیا۔ دوسرا دیوان علیم اللہ کے ساتھ مجلّد ہے۔ یہ نسخہ بہ نسبت پہلے نسخہ کے بہت صحیح اور صاف ہے علاوہ ازیں اس کے خاتمہ میں ۳۲ شعر کا ایک ضمیمہ بھی ہے جس میں انسان کے مختلف قوٰی کو اِن پنچھیوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور آخر میں نبی یا قلب مطلق کو ہُدہُد کے مشابہ قرار دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جس طرح ہُدہُد اِن تمام پنچھیوں کا سردار ہے اِسی طرح نبی یا قلب مطلق بھی انسانی قوٰی کے لئے ہادی و رہنما کا درجہ رکھتا ہے، اِس ضمیمہ کا مصنّف امام الدّین ہے، چنانچہ بسم اللہ سے پہلے یہ جملہ سُرخ روشنائی میں لکھا ہوا ہے:-

"دربیان پنچھیاں سی و دو امام الدّین گوید"

علاوہ ازیں خاتمہ کے ایک شعر میں بھی یہ نام ملتا ہے، اس ضمیمہ کے ابتدائی و اختتامی اشعار حسب ذیل ہیں:-

ابتدا:-

تیس دو پنچھیاں کا کھوں تجھ کوں ذکر   دیکھ اپنے تن منے توں کر فکر
تجھ میں ہے او کون پنچھی بوجھ لے   بھید اِسے مرشد سوں اپنے پوچھ لے
عشق بلبل ہے تیرے من میں بچھاں   بولتی طوطی کلام شیریں زباں

خاتمہ:-

ہے امام الدّین سیں تصنیف یو   طعنہ کش ہونا مناسب نئیں ہے گو
یا الٰہی فائدہ دے خلق کوں   عشق کا توں داد دے مخلوق کوں

کر دُعا میری اجابت اے صنم
رکھو امید تجھ سے کیا ہوں اِسے ختم

امام الدّین وَجدی ہی کا ہم عصر شاعر معلوم ہوتا ہے۔ اِس کی ایک نظم "گنج عرفاں" کا بھی ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اُردو میں موجود ہے جس کا تعارف زور نے تذکرۂ اُردو

مخطوطات میں کرایا ہے، اس تعارف سے اُن کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔[۵]
بہرحال پنچھی باچھا کا یہ دوسرا نسخہ ۶ × ۸ کے ۲۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔
دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مادۂ تاریخ اس میں بھی وہی ہے جو سابق نسخہ میں تھا۔ اس کا ترقیمہ حسب ذیل ہے:۔

"تمت الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب از امداد رسول الثقلین تحریر یافت، بہ روز دوشنبہ تاریخ ۲ شہر ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ، راقم الحروف عظیم الدین، برائے مجی۔ اگر کسے دعوی کند باطل است"

پند نامہ مترجم

مُصنف و سنہ تصنیف نامعلوم۔ صفحات ۵۲، شعر فی صفحہ ۱۱
ابواب سُرخ روشنائی میں۔ خط نستعلیق، سائز ۵ × ۸

اِس مثنوی سے متعلق کچھ تفصیلی معلومات حاصل نہ ہوسکیں، زبان و بیان کے اعتبار سے بعض مقامات میں دکھنی خصوصیات پائی جاتی ہیں لیکن عام طور پر مسخ شدہ ہے ممکن ہے کاتب کی دست اندازی کا یہ نتیجہ ہو، ترجمہ اصل کے ساتھ ہے، پہلے پند نامۂ عطار کا ایک فارسی شعر دیا گیا ہے اور اس کے نیچے اس کا اُسی بحر میں منظوم ترجمہ ہے، اِسی ترتیب کے ساتھ پورے پند نامۂ عطار کی منظوم تشریح کی گئی ہے۔ اِس کے آخری باب کا عنوان "در بیان غفلت گوید" ہے۔ عطار کا پند نامہ بھی اِسی غفلت کے باب پر ختم ہوتا ہے۔ مترجم نے مثنوی کی ابتدا میں اپنی طرف سے کوئی نئی تمہید نہیں بیان کی ہے، البتہ خاتمہ میں تین شعر زیادہ ہیں۔ اِس نسخہ کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے یہ شعر اچھی طرح پڑھے نہ جاسکے۔ شاید مترجم نے اس میں کوئی تاریخ بیان کی ہے۔ وہ شعر حسب ذیل ہیں۔

تھا جمادی الثانی زہرہ جاہ میں — سن ندا تاریخ "غرہ ماہ" میں
سخن بے شک شیخ بو عطار ہے — لیکن رب کو سوز یہ اظہار ہے
نور احمد سے جہاں معمور ہے — نور بھی اس نور سے پُر نور ہے

اِن اشعار میں "غرۂ ماہ" کو مادۂ تاریخ مان لیا جائے تو پھر اس کا سنہ تصنیف ۱۲۶۱ھ ہوگا

[۵] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۂ اردو مخطوطات ص۲۸۶

ضمیمہ

مقالہ نُما

مُرتّبین

عالی جعفری

عصمت جاوید

فضل اللہ فاروقی

ضروری نوٹ:-

مقالہ نُما میں شامل شُدہ مضامین کی نقل حسبِ طلب دو آنے فی صفحہ کی اُجرت پر مہیّا جاسکتی ہے۔ تاہم کسی مضمون کی نقل ایک روپیہ سے کم اُجرت پر فراہم نہیں کی جائے گی۔

فہرست عنوانات

مذہبیات

۱۔ بھگوانداس:

ہماری خودی ہی ہمارے اور اللہ کے بیچ کا پردہ ہے

(دنیا ہند الہ آباد ۵۴، اپریل، ۶، ۲۔۲۱۴)

انسان کے خدا تک پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو پہچانے، پھر اس اصول کو واضح اور روشن کرنے کیلئے قرآن، حدیث، گیتا، وید، انجیل اور صوفیوں وغیرہ کے کلام کے مختلف اقتباسات پیش کئے ہیں۔

۲۔ ٹرٹن۔ اے۔ ایس۔

نذیر حسین مترجم:

مسلمانوں کی تعلیم قرون وسطیٰ میں

(العلم کراچی ۵۴، جنوری، ۴، ۱۰۔۱۰۸)

مشہور مستشرق پروفیسر ٹرٹن اے۔ ایس جو لندن یونی ورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں ان کے مضمون کا ترجمہ و تلخیص جس میں انھوں نے قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے اسکول، استاد کے فرائض، طریقۂ تعلیم وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۔ حبیب اصغر قدوائی:

ملت صابیہ اور بدھ مذہب

(معارف اعظم گڑھ ۵۴، جنوری ۴۲۔۵۲)

رسالہ معارف میں کچھ دنوں سے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یوذاسف اور بدھا ایک ہی شخص اور ملت صابیہ اور بدھ ازم ایک ہی تحریک کے دو نام ہیں مضمون نگار نے فریقین کے دلائل کا تقابل و تجزیہ کیا ہے۔

۴۔ حبیب الرحمٰن الاعظمی:

ہندوستان میں علوم حدیث کی تالیفات

(برہان دہلی ۵۴، فروری، ۸۳۔۹۵)

مندرجہ بالا عنوان پر برہان اگست میں ابوسلمہ شفیع احمد صاحب کا مضمون نکل چکا ہے اسی سلسلہ کی بعض تالیفات جن کا ذکر نہیں کیا گیا تھا اس مضمون میں ان کا ذکر ہے۔ ۴۵ کتابوں کے نام مصنف، اور کتاب کا مختصر حال دیا گیا ہے۔

۵۔ ظفیر الدین:

تاریخی حقائق

(برہان دہلی ۵۴ فروری ۱۱۰۔۱۲۶)

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی کتاب آئینۂ حقیقت نما سے چند مسلمان بادشاہوں خصوصاً محمد بن قاسم کی رواداری، عدل و انصاف، پاس عہد، رعایا پروری کی متعدد مثالیں پیش کرکے بتایا گیا ہے کہ مسلمان بادشاہوں پر تعصب، اور مظالم، اتہام ہے۔

۶۔ عبدالرزاق کانپوری مرحوم:

افغانوں میں اشاعت اسلام کی ابتدا اور اُس کے اسباب

(برہان دہلی ۵۴، مارچ، ۱۷۱)

مولانا عبدالرزاق نے افغانوں کی قومی اور نسلی تاریخ سے متعلق ایک مفید کتاب مرتب کی تھی لیکن وہ ابھی تک شائع نہ ہوسکی۔ عنوان بالا کے ساتھ اس کا ایک باب درج ہے افغانوں میں اسلام خالد بن عبداللہ کے ذریعہ پھیلا ہے۔ اس باب میں خالد بن ولید کا نام لینا صریحی غلطی ہے۔

۷۔ محمد اویس ندوی:

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم اور علوم قرآن

(الفرقان لکھنؤ ۵۴، مارچ ۱۷۔۲۸)

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے مضمون نگار کے سامنے درس قرآن اور مختلف مواقع پر علوم قرآنی سے متعلق جو نکات بیان فرمائے ہیں ان کی طرف مختصر اشارے۔

۸۔ محمد غوث:

جنایات بوجہ غفلت

(معارف اعظم گڑھ ۷۴ء، مارچ ۲۱۸۔۲۲۵)

غفلت میں سرزد ہونے والے گناہوں اور ملازم کے گناہوں کی ذمہ داری کے قانونی پہلوؤں پر مغربی مصنفین اور فقہا کے فیصلوں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

۹۔ محمد منظور نعمانی:

معارف الاحادیث

(الفرقان لکھنؤ ۷۴ء، فروری، ۳۳۔۴۴)

رقاق کے سلسلہ میں مختلف احادیث، ان کا ترجمہ اور تشریح کی گئی ہے۔

۱۰۔ محمد منظور نعمانی۔

معارف الاحادیث

(الفرقان لکھنؤ، ۷۴ء مارچ، ۱۱۔۱۶)

بسلسلۂ ماسبق احادیث رقاق ترجمہ و تشریح،

۱۱۔ محمد منظور نعمانی مترجم:

طالبان سلوک کی ہمت افزائی اور ابتدائی مشورے

(الفرقان لکھنؤ ۷۴ء مارچ، ۲۹۔۳۲)

یہ خط حضرت خواجہ محمد معصومؒ نے ایک ایسے صاحب کو لکھا تھا جنہوں نے اپنے خط میں راہ سلوک کی طلب اور ذوق و شوق کا اظہار کیا تھا۔

۱۲۔ مصطفٰے علی:

(العلم کراچی، ۷۴ء جنوری ۱۰۹۔۱۱۴)

ڈور بنگش کے علماء اور اہل اللہ

ریاست فرخ آباد کے چند علماء اور صلحاء کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

۱۳۔ مناظر احسن گیلانی:

مسلمانوں کا اندلس

(معارف اعظم گڑھ ۷۴ء جنوری ۲۹)

۳۔ اس قسط میں اندلسی مسلمانوں کی عربیت اور مروانی حکمرانوں کے جاہ و جلال کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۴۔ ہاشمی فرید آبادی:

عہد اسلامی میں علمی و تہذیبی ترقی

(العلم کراچی ۷۴ء جنوری، ۹۔۲۴)

ہاشمی صاحب کی کتاب "تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت" سے مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں ہندوستان میں جو علمی و تہذیبی ترقیاں مختلف ادوار میں مختلف مقامات پر ہوئی ہیں انھیں یکجا کیا گیا ہے۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۱۵۔ ابوالحسن علی:

سلطان صلاح الدینؒ ایوبی ایک درویش سیرت سلطان

(الفرقان لکھنؤ، ۷۴ء، فروری، ۱۷)

سلطان صلاح الدینؒ کی پرہیزگاری، ان کا ارتقاء، ان کے محاسن اخلاق، ان کے مردانہ اوصاف، علم و فضل اور تاریخ وفات، سلطان کے خاص سکریٹری کی کتاب سے انتخاب کیا گیا ہے۔

۱۶۔ تاس:

انقلاب عظیم کا علمبردار لینن اعظم

(ہندستانی ادب حیدرآباد دکن ۷۴ء مارچ ۱۱۔۱۳)

لینن کی زندگی اور تعلیم کا سرسری تذکرہ کیا ہے۔

۱۷۔ خصلت حسین صابری:

میر منشیان شاہان اودھ اور منشی ولایت علی عزیزؒ صفی پوری

(العلم کراچی، ۷۴ء جنوری، ۵۵۔۶۷)

منشی ولایت علی عزیز صفی پوری شاہان اودھ کے میر منشیان

کی اولاد میں ہیں۔ منشی صاحب نے سوانح اسلاف نامی ایک کتاب اپنے اور اپنے خاندانی حالات میں لکھی ہے شاہان اودھ کی طرز حکمرانی وغیرہ کا ذکر بھی ہے منشی صاحب کے بزرگوں نے جس طرح میر منشی کے عہدہ کو سنبھالا اور معزز رہے۔ اور دوسرے بہت سے واقعات جو پُر از معلومات اور دلچسپ ہیں بیان کئے گئے ہیں۔ غالب سے اپنی شاگردی اور اس سلسلہ میں غالب کا ایک خط نقل کیا ہے جو ان کے نام غالب نے لکھا۔

۱۸۔ رئیس احمد جعفری:

رئیس الاحرار

(ماہ نو کراچی ۵۴ جنوری : ۱۱-۱۵)

مولانا محمد علی مرحوم کے مختصر حالات اور ان کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

۱۹۔ سالک عبد المجید:

علامۂ سید سلیمان ندویؒ مرحوم

(ماہ نو کراچی ۵۴ جنوری ۲۰-۱۷)

علامۂ سید سلیمان ندویؒ کے حالات زندگی، اور انکے مذہبی، علمی، ادبی، کارنامے مختصر طور سے پیش کئے ہیں۔

۲۰۔ شاہ معین الدین احمد ندوی:

شذرات

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ فروری ۸۴-۸۲)

مولانا سید سلیمان ندویؒ مرحوم کو دار المصنفین سے بے حد محبت تھی۔ چنانچہ ہر حال اور ہر وقت اس کا انھیں خیال رہا اور اسے باقی رکھنے میں ساعی رہے۔

۲۱۔ صباح الدین عبد الرحمٰن:

آہ سید صاحب

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ جنوری ۵-۲۸)

دار المصنفین اعظم گڑھ کے ہر شعبہ بلکہ ذرہ ذرہ پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا نام ثبت ہے۔ اپنی محنت و جانفشانی، اپنے علمی تبحر، اور انتھک سرگرمیوں کے سبب انھوں نے دار المصنفین کی بنیادیں ہی مضبوط نہیں کیں بلکہ اسے ایک زبردست اور مفید علمی و ادبی ادارہ کی شکل میں کچھ اس طرح چھوڑا ہے کہ وہ مستقل طور پر ان کے کام اور نام کو باقی رکھے گا۔ سیرۃ النبی، خطبات، عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ دار المصنفین ہی کی عمارت میں لکھی گئیں۔ کتابوں پر ان کے نوٹ تحقیقی کام کرنے والوں کی مدد کرتے رہے ہیں بہتوں کی رہنمائی کرکے صاحب تصنیف بنادیا۔ چنانچہ اس مضمون میں مقالہ نگار نے مولانا مرحوم کی وفات کی خبر پر اپنے ذاتی تاثرات، دار المصنفین اور اہالیان اعظم گڑھ کی کیفیت بیان کی ہے۔ ساتھ ساتھ ان کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

۲۲۔ عبد اللہ ملک:

ایک مکان ــــــ ایک مرزا

(سویرا لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر ۵۴-۲۱۸)

چین کے مشہور ادیب لوہسون کی داستان پیش کی ہے۔

۲۳۔ عتیق الرحمٰن عثمانی:

سید صاحب کی زندگی کے وہ خاص گوشے جن سے میں متاثر ہوا

(برہان دہلی ۵۴ فروری، ۱۱۹-۱۱۵)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے سانحہ وفات پر ندوہ میں ۲۴ / ۲۷ دسمبر کو ایک جلسہ ہوا جس میں یہ تقریر کی گئی اس میں مقرر نے علامہ سید سلیمان ندوی صاحبؒ سے اپنی پہلی ملاقات آپ کی سادگی، اخلاق، فروتنی و انکسار علمی تحقیق و سنجیدگی علم سے جو تاثر ہوا اُسے بیان کیا گیا ہے۔

۲۴۔ عتیق الرحمٰن عثمانی:

سید صاحب کی زندگی کے وہ خاص گوشے جن سے میں متاثر ہوا

(برہان دہلی ۵۴، مارچ، ۱۷۹-۱۸۲)

مولانا سید سلیمان ندویؒ مرحوم کی تالیف "خطبات مدراس" وحی و نبوت اور الٰہیات کے مسائل کے پیش نظر ایک زبردست اہمیت کی مالک ہے اس کا اسلوب اور

طرزِ استدلال دل نشین و دل پذیر ہے۔ اصلاح و تبلیغ کے لئے بڑے بڑے اہم نکتے ڈھونڈھ نکالے تھے جن سے وہ پرحکمت طریقہ پر کام لیتے تھے۔ ندوہ اور دیوبند کے اختلاف کو مٹانے میں بھی سید صاحب نے زبردست حصّہ لیا ہے۔

۲۵۔ محمّد ایّوب قادری۔ مرتّب:

ساداتِ کاظمیہ
مکتوبات مولانا سید طفیل احمد صاحب مرحوم

(العلم کراچی - ۵۴ جنوری)

مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم کے چند خطوط، حمید حسن کاظمی کے نام ہیں۔ ان خطوط میں ساداتِ کاظمیہ کے شجرہ کے علاوہ اور دوسری تاریخی معلومات پائی جاتی ہیں۔

۲۶۔ محمّد مصلح الدّین احمد:

سر بینیگل نرسنگ راؤ آنجہانی

(آج کل دہلی، ۵۴ فروری -)

سر نرسنگ راؤ سابق جج بین الاقوامی عدالت انصاف کے حالاتِ زندگی اور ان کے مختلف بین الاقوامی کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔

۲۷۔ نسیم احمد فریدی:

تاج العارفین
شیخ تاج الدّین سنبھلی

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ فروری ۳۹ - ۴۸)

شیخ تاج الدّین سنبھلی حضرت خواجہ باقی باللہ کے مشہور خلفا میں سے تھے، ان کے حالات و کوائف کو بیان کیا ہے۔

۲۸۔ نفیس سندیلوی:

مولوی ریاض الدّین احمد ریاض

(آج کل دہلی ۵۴ فروری، ۳۱ - ۲۹)

مولوی ریاض الدّین احمد کے مختصر حالات اور شاعری کا تعارف۔

تاریخ و سیاسیات

۲۹۔ طفیل احمد خاں:

سیاسیاتِ عالم

(سویرا لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر ۱۷ - ۱۸۶)

۱۹۳۹ - ۱۹۴۷ کی جنگ کے پس منظر کے ساتھ اس کے بعد ہونے والے سیاسی کوائف کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ استعمار پرست امن اور حُریّت پسندوں کے مقابلہ میں جمنے سے قاصر ہیں۔

۳۰۔ عالیہ ناہید:

امریکہ کا موجودہ دستور

(آج کل دہلی ۵۴ جنوری ۳۸ - ۴۵)

امریکہ کے موجودہ دستور کے مرتّب ہونے تک جو صورتیں پیش آئیں، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی ہیں۔

۳۱۔ محمّد ایّوب قادری:

ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا؟
روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات
(۲)

(العلم کراچی ۵۴ جنوری ۸۱ - ۱۰۳)

مضمون کی دوسری قسط ہے۔
اس میں رام پور کی تاریخ اور وہاں کی یادگاریں تاریخی مقامات، مدارس، کتب خانہ وغیرہ کی تاریخ تعمیر، اور تعمیر کرانے والوں کے نام اور حالات بیان کئے گئے ہیں۔

تنقید، ادب، لسانیات

۳۲۔ ابوالکلام آزاد:

مکاتیب ابوالکلام آزاد

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء جنوری ۶۶ – ۷۳)

اس دفعہ آٹھ خط ہیں جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ہیں۔ تاریخ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ کچھ ۳۲ء اور کچھ ۳۷ء کے لکھے ہوئے ہیں۔

۳۳۔ احترام الدین احمد شاغل:

جے پور کا ایک گمنام شاعر

(آج کل دہلی ۵۴ء مارچ ۲۷ – ۳۸)

مقالہ نگار کو منشی نعیم الدین صاحب پنشنر انسپکٹر پولیس جے پور کے پاس ایک کلیات کا قلمی نسخہ ملا جس میں صاحب کلام کا نام یا حال درج نہیں ہے۔ البتہ پورا کلیات پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ مرزا اکبر علی خاں نام ہے گل تخلص اور بعض غزلوں میں نگار بھی ہے۔ مقالے میں غزلوں اور قصیدوں سے نمونہ کلام پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کلام مخلوط اور کلام ہندی کا نمونہ بھی دیا ہے اور ان کے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے۔

۳۴۔ اختر علی تلہری:

اقبال ۔ سچدانند سنہا کی نظر میں

(آج کل دہلی ۵۴ء جنوری ۳۰ – ۲۵)

ڈاکٹر سچدانند سنہا نے اقبال پر ایک کتاب بنام اقبال دی پوئٹ اینڈ ہز میسج لکھی تھی۔

اختر علی تلہری نے شاعر اقبال کے پہلو پر ڈاکٹر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے توضیحی مضمون لکھا ہے اور بتایا ہے کہ اس باب میں ڈاکٹر صاحب کی رائے صحیح ہے۔ اقبال ۔ فلسفی و حکیم کو دونوں نہیں مانتے۔ زبان اور بیان کے سلسلے میں اقبال پر اعتراضات بھی وارد کئے ہیں۔

۳۵۔ اختر علی تلہری:

نقش جمیل پر تنقیدی نظر کے بارے میں چند گذارشیں

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء فروری ۱۳۹ – ۱۴۵)

معارف ۵۳ء اکتوبر میں ولی الرحمٰن کاکوی نے جمیل مظہری کے مجموعہ نظم "نقش جمیل" کا جائزہ لیا تھا اور بعض شعروں اور مصرعوں پر اعتراضات کئے تھے۔ اس مضمون میں ان اعتراضات کو غلط و ناروا دکھایا گیا ہے۔

۳۶۔ باقر مہدی:

عقل اور عشق ۔ اقبال کی نظر میں

(آج کل دہلی، ۵۴ء مارچ، ۱۲ – ۲۰)

اقبال نے عقل و عشق کے تصورات عینیت پرست فلسفیوں اور صوفی شاعروں سے لے کر اسلامی فلسفے کے پس منظر میں ابھارے ہیں۔ انھوں نے اپنے خیالات کی ترتیب میں مختلف اور متضاد فلسفیوں کے تصورات سے مدد لی تھی اور خود انھیں الجھنوں میں کئی جگہ الجھ گئے ہیں۔ اقبال کا تصور عشق مابعد الطبعیاتی ہے، اقبال نے چند غلط مفروضوں پر تصور عشق و عقل کی بنیاد رکھی تھی اس لئے نتائج بھی غلط نکلے پھر بھی ان کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۷۔ بسمل عبد الغفور:

از کشکول ڈاکٹر عبد الغفور بسمل

(العلم کراچی، ۵۴ء جنوری، ۳۹ – ۴۱)

سرور جہان آبادی کا ایک لاجواب شعر پیش کیا ہے اور جناب نشتر کی قادر الکلامی کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ مضطر مرحوم کی "رباعیات در توصیف چائے" پیش کی ہیں جو بلند پایہ ہیں۔

۳۸۔ چغتائی عبد الرحمٰن:

فرسودہ باتیں ــ بھائی ویر سنگھ کی شاعری

(سویرا لاہور، ۱۳، ۱۴ نمبر، ۱۶۶-۱۷۱)

ماضی کی چند باتوں کا ذکر کرتے ہوئے پنجابی کے شاعر ویر سنگھ جی کی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔

۳۹۔ حبیب الرحمٰن اعظمی:

مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے؟

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ جنوری ۶۱-۶۵)

مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار عبد اللطیف بن عبد الملک عبّاسی کی تصنیف نہیں جیسا کہ قاضی سیّد نور الدّین حسین (معارف جولائی ۴۹) یا ڈاکٹر باقر علی ترمذی مرحوم (معارف اکتوبر ۵۰) لکھتے ہیں بلکہ عبد اللطیف بن ملک یا ابن فرشتہ ہی ہے۔

۴۰۔ حبیب الرحمٰن اعظمی:

حیات شیخ عبد الحق

(برہان دہلی ۵۴، مارچ، ۱۵۵)

خلیق احمد نظامی نے حیات شیخ عبد الحق لکھ کر اردو لٹریچر میں بہت اہم اضافہ کیا ہے۔ تاہم فرو گذاشتیں ہوئی ہیں جن کا تذکرہ مضمون کی اس قسط میں کیا گیا ہے مثلاً شیخ کے شاگرد و فیض یافتوں کا ذکر نہیں ہے۔ شیخ کی اولاد کے ذکر میں حافظ محمد حسن، شیخ محمد احسان، شیخ مقرب اللہ، مفتی اکرام الدّین حیران وغیرہ کے نام درج نہیں کئے۔ شیخ کے اساتذہ کے اسمائے گرامی بھی تفصیل کے ساتھ نہیں لکھے۔ مضمون نگار نے حوالوں کے ساتھ ان کمیوں کو ایک ایک کر کے گنایا اور انھیں اس مضمون میں پورا کیا ہے۔ (جاری)

۴۱۔ دانش، صفی حیدر:

میر کا تصورِ دردمندی

(ادب لطیف لاہور ۵۲ فروری مارچ ۱۴۳-۱۵۲)

ذکر میر کی روشنی میں میر کے حالات زندگی، تعلیم و تربیت بزرگوں کی صحبت اور سیاسی حالات کا ذکر کرنے کے بعد میر کے اشعار اور چند نفسیاتی اصولوں کے حوالہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میر اذیت پسند لوگوں میں ایک ممتاز فرد تھے اور یہ کہ ان کا تصوّر دردمندی محض جذباتی نہیں بلکہ نیم مفکرانہ ہے۔

۴۲۔ رضا علی وحشت:

حالی کا تغزّل

(اردو کراچی ۵۴ جنوری، ۳۲-۴۵)

حالی کے چند اشعار لے کر ان کی خصوصیات دکھاتے ہوئے حالی کے تغزل پر تبصرہ کیا ہے۔

۴۳۔ ریاض احمد:

قیوم نظر

(ماہ نو کراچی، ۵۴ جنوری، ۵۴-۵۷)

قیوم نظر کی شاعری پر ایک بسیط تبصرہ۔ اس کی شاعری اپنے ہمعصروں میں ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔ اس نے فطرت کے مظاہر اور انسان کی داخلی کشمکش اور خارجی تگ و دو میں قدم قدم پر مماثلتیں دیکھیں۔ اور انھیں کو پیش کر دیا۔ قیوم نظر کی مختلف نظموں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے خیالات کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔

۴۴۔ زور، محی الدّین:

موجودہ اردو ادب کے چند رجحانات اور مسائل

(سب رس، حیدر آباد دکن، خاص نمبر فروری، مارچ ۵۴)

یہ مختصر مضمون اکھل حیدر آباد ہندی پرچار سمیلن میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں اردو زبان کے تین اہم مسائل ادیبوں کے سامنے پیش کئے ہیں اور مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ ادبی تخلیق کرتے وقت ان تین بنیادی مسائل کو سامنے رکھیں تو مستقبل سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، اردو زندہ ہے، زندہ رہے گی وہ تین بنیادی مسائل یہ ہیں۔

(۱) کیا لکھیں اور کس کے لئے لکھیں؟

(۲) کس طرح لکھیں یعنی زبان اور تکنیک کیا ہو۔

(۳) متحدہ محاذ کس طرح بنائیں؟

۴۵۔ سردار جعفری:

ترقی پسند ادب کا سماجی پس منظر

(سویرا لاہور ۱۳، ۱۴، نمبر ۱۲۸ — ۱۴۴)

ادبی اور علمی تحریکیں اور نظریے وقتی تقاضوں کے سبب پیدا ہوتے اور پچھلے تہذیبی سرمائے اور گزشتہ روایات پر اپنی عمارت کھڑی کرتے ہیں۔ ارتقا اور تسلسل کے اسی قانون کے مطابق ترقی پسند ادب اپنے ماضی کے جمہوری سرمائے کا جائز وارث ہے۔ چنانچہ ترقی پسند تحریک سرسید، حالی، شبلی، اقبال وغیرہ کی جمہوری روایات کا تسلسل بھی ہے اور ایک ایسی نئی تحریک بھی جس سے ہمارا ادب کبھی واقف نہیں تھا۔ ان کی غیر جمہوری تحریکوں سے ترقی پسند ادب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۴۶۔ سلامت اللہ:

ناول نگار پریم چند

(سب رس حیدرآباد (دکن)، ۴۵ فروری، مارچ ۵۴، ۳۰ — ۳۴)

پریم چند کی مقبولیت اور شہرت کا راز دیہاتوں اور کسانوں کی زندگی کی صحیح عکاسی اور ترجمانی ہے۔ مضمون نگار نے وضاحت کی ہے کہ پریم چند نے خیالی پلاؤ نہیں پکایا ہے بلکہ وہ خود زندگی میں سے ہو کر گذرے ہیں اور اس زندگی کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔ پریم چند کے ناول "بازارِ حسن" "گوشۂ عافیت" اور "گئودان" کو سامنے رکھ کر ان کی کردار نگاری اور واقعہ نگاری کی مثالیں پیش کی ہیں۔

۴۷۔ سید عبداللہ:

حالی کا اسلوب بیان

(اردو کراچی ۴۵ جنوری، ۳۶ — ۴۸)

سرسید کی سادگی، منطقیت اور بے تکلف اظہار حالی کے یہاں ضرور ہے لیکن دونوں کے بیچ نمایاں فرق ہے۔ حالی سرسید کے مقلد نہیں ہیں بلکہ اپنی ایک خاص طرز رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان غیر شخصی ہے۔ ان کے ہاں جذبات میں روکھاپن ہے۔ جوش بیان کی بڑی کمی ہے۔ جا و بیجا انگریزی الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ تاہم مجموعی لحاظ سے مولانا حالی کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا متدعا نگار کہا جاسکتا ہے۔ حقائق اور افکار کے بیان میں زیادہ کامیاب ہیں۔ واقعہ نگاری اور بیانیہ نگاری کمزور ہے۔ پھر بھی ان کی منفرد خصوصیات کے پیش نظر کوئی ادیب اور انشا پرداز ان کے برابر نہیں ہے۔

۴۸۔ شوکت سبزواری:

غالب کے اُردو کلام کی اشاعت

(ماہ نو کراچی، ۴۵ فروری، ۱۱ — ۱۴)

ماہرین غالب نے ان کے اُردو دیوان کی چار اشاعتوں کا ذکر کیا ہے۔ مضمون نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ پانچواں اڈیشن بھی غالب کی زندگی ہی میں مطبع مفید خلائق آگرہ سے چھپ چکا تھا۔ اس کے ثبوت میں مضمون نگار نے مختلف حوالے دئے ہیں۔

۴۹۔ شوکت سبزواری:

تذکرۂ نشتر عشق

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ فروری ۱۲۹ — ۱۳۸)

تذکرۂ نشتر عشق ایک مخصوص نوعیت کا حامل ہے۔ فارسی گو شعرا کا یہ تذکرہ ریختہ گو شعرا کے حالات بھی فراہم کرتا ہے۔ اور بعضوں کے متعلق نئی اور مفید باتیں بتاتا ہے۔ ۱۲۲۴ھ میں شروع ہوا اور ۱۲۳۳ھ میں اسے دوبارہ لکھا گیا۔ اسی سال یہ مکمل بھی ہوگیا۔ اس کے مؤلف ابو محمد حسین قلی خاں ابن آقا علی خاں ہیں۔ ان کے جد امجد اپنے والد نواب علی خاں کے ہمراہ احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں ترک وطن کر کے (جام — خراساں سے) شاہ جہان آباد آئے تھے۔ حسین قلی خاں ۱۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ہمیشہ سفر میں رہنے کے سبب باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ تاہم مطالعہ کرتے رہے۔ شیخ وجیہ الدین عشقی کے شاگرد تھے۔ چنانچہ اپنا تخلص عاشقی رکھا۔ اکرام الدین حیران اور الٰہی بخش شوق سے بھی تلمذ تھا۔ مختلف مقامات پر سرکاری ملازمت کے سلسلے میں متعین ہوتے رہے۔ اپنے تذکرہ میں شعراء کے حالات کسی قدر تفصیل سے دئے ہیں۔ انتخاب بھی خاصہ ہے۔ عشقیہ اشعار کے انتخاب کا خاص اہتمام

کیا ہے بلکہ ریاض الشعراء والہ داغستانی میں اسی عنصر کی کمی تذکرۂ نشتر عشق کا باعث ہوئی۔ موجودہ تعارفی مضمون ڈھاکہ یونی ورسٹی کے مخطوطہ (آخر ناقص) کو دیکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس کے دو اور نسخے بانکی پور اور رام پور میں پائے جاتے ہیں۔

۵۰۔ شہاب رفعت:

اختر شیرانی مرحوم پر ایک نظر

(ماہ نو کراچی ۵۴ فروری، ۱۴ — ۱۸)

اختر شیرانی کے موضوع شاعری حسن و عشق، اور عرب شعرائے جاہلیت کی شاعری کے تاثرات تصورات و خیالات سے بہت کچھ متاثر تھے خصوصاً اردو شاعری میں براہ راست محبوبہ کا نام لے کر اظہار عشق کی جرأت اختر ہی نے کی۔ اور ایک مدت کے بعد وہ حسن و عشق کی دنیا میں بے نقاب ہو کر سامنے آئے۔ اور یہی اس کی شاعری کا آخر تک موضوع رہا۔

۵۱۔ شیر جنگ:

نشاط مطالعہ — فریدرش وہلم نتشے

(آج کل دہلی ۵۴ جنوری ۳۰)

مکالمے کی صورت میں شروع میں گوتم بدھ اور کنفیوشس کے فلسفے اور پھر ... اور نتشے کے فلسفوں کو تقابلی طور پر دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ آخر میں نتشے کے حالات و تصانیف بیان کئے ہیں۔ (باقی)

۵۲۔ شیر جنگ:

نشاط مطالعہ — فریدرش وہلم نتشے

(مسلسل)

(آج کل دہلی ۵۴، فروری ۹ — ۱۳)

نتشے کے افکار و خیالات کی رفعت و بلندی، اسلوب بیان کی پاکیزگی، اس کا انداز فکر، ان سب باتوں پر اشارے کرتے ہوئے آخر میں اس کی کتاب سے اقتباس پیش کیا گیا ہے۔

۵۳۔ شمیم حمیدی:

تنقید نقش جمیل پر ایک نظر

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ جنوری ۶۸ — ۷۱)

معارف ۵۳ اکتوبر میں "نقش جمیل" (مجموعۂ جمیل مظہری) پر ولی الرحمن کاکوی نے تنقید کی اور غلطیاں بتائیں۔ موجودہ مضمون حوالوں کے ساتھ ان کا ابطال کرتا ہے۔

۵۴۔ صغیر حسن معصومی:

ابن باجۃ الاندلسی

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ مارچ ۱۶۵ — ۱۹۲)

ابن باجۃ الاندلسی کی شاعرانہ خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا بحیثیت فلسفی درجہ متعین کیا گیا ہے اور مادہ اور صورت، نفس، عقل و علم، علم انسانی کی حقیقت اور اس کے مراتب، سیاست مدنیہ، اخلاق اور تصوف ان موضوعات پر ابن باجۃ الاندلسی کے نظریات پیش کئے گئے ہیں اور ان کی تصنیفات سے جابجا اقتباس بھی پیش کئے ہیں۔

۵۵۔ صفدر حسین:

لکھنوی ادب کا پس منظر

(ادب لطیف لاہور، ۵۴ فروری، مارچ ۸۸ — ۹۵)

ریاست دکن و ریاست اودھ کے قیام سے پہلے کے سیاسی حالات مختصراً پیش کرنے کے بعد والیان اودھ کے زمانے میں اردو نظم و نثر جس طرح اثر انداز ہوئے اسے پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اودھ تہذیب کی نشو و نما میں دو مخصوص عناصر عیش پرستی اور مذہب شامل تھے، عیش پرستی کے باعث اشعار میں خارجی اوصاف کا بیان زیادہ اور داخلی کیفیات کا کم ہو گیا۔ اور مذہب نے شاعری میں مخصوص صنف سخن شہدائے کربلا کے مرثیہ کو جنم دیا۔

۵۶۔ ضیا جعفری:

سرحد میں اردو ادب

(ماہ نو کراچی ۵۴، جنوری، ۲۱ — ۲۴)

سرحد میں اردو شاعری کی ابتدائی مختصر تاریخ بیان کرنے

کے بعد انیسویں صدی کے وسط سے اب تک اُردو شاعری اور ادب کی مختصر تاریخ اور شعرا کے نام اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

۵۷۔ ضیاء الدین احمد برنی:

ظفر کی شاعری

(اُردو کراچی ۵۴ جنوری، ۷۸۔۱۱۳)

یہ سراسر غلط ہے کہ ظفر کا سارا کلام ذوق و غالب کا کہا ہوا ہے۔ ظفر خود کہتے تھے۔ ظفر نے اپنے ماحول کا تتبع کرتے ہوئے شاہ نصیر کی پیروی میں جذبات حسن و عشق کو نظم کیا ہے کہیں کہیں تصوف کی چاشنی بھی ہے۔ بعض اشعار میں زمانہ کی شکایتیں ہیں۔ موعظت و نصیحت کا درس بھی دل آویز طریقہ سے دیا ہے۔ اشعار کی زبان بحیثیت مجموعی کافی شستہ ہے۔

۵۸۔ ظ۔ انصاری:

اکبر الہ آبادی اپنی شکست کی آواز

(سب رس، حیدر آباد (دکن) ۴۸ مارچ، ۱۸۔۴۹)

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اور ان کے اقتدار و حکومت قائم ہو جانے پر ملک میں اور خاص طور سے مسلمانوں میں جو مغلوبانہ ذہنیت پیدا ہوئی اور اس کے بعد اس شکست کے اثرات کو جن لوگوں نے مختلف طرح دُور کرنے کی کوشش کی تھی ان میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں اکبر الہ آبادی نے اپنے طنز سے حکومت، معاشرت اور اپنے دَور کے خلاف جن خیالات کا اظہار کیا ہے انھیں کو مضمون میں پیش کیا گیا ہے۔

۵۹۔ عالم خوندمیری:

اقبال اور ان کی شاعری

(سب رس، حیدر آباد (دکن) ۴۸۔ فروری، مارچ ۱۹۴۹ء)

انجمن عوامی مصنفین (حیدر آباد دکن) کی جانب سے اقبال اور ان کی شاعری کے عنوان پر ایک سمپوزیم رکھا گیا، اسی بحث کا یہ پہلا مضمون ہے جس میں مضمون نگار نے اقبال کی تصانیف سے بکثرت اشعار پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ اقبال جدید شاعری اور ادب کے امام تھے اور عہد حاضر کے سب سے بڑے شاعر، انھوں نے اپنے فن اور ادب کو انسانوں کی خدمت اور ان کی ترقی کے لئے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے ترقی پذیر قوتوں کا ساتھ دیا۔ اور زوال پذیر طاقتوں کے خلاف آواز اٹھائی۔

۶۰۔ عبادت بریلوی:

اُردو شاعری میں حُبِّ وطن کی روایت

(سویرا، لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر، ۷۔۱۴۱۔ ۱۶۷)

اُردو شاعری میں شروع ہی سے حُبِّ وطن کی شاندار روایت چلی آتی ہے۔ یہ کہنا کہ ۱۸۵۷ء سے اُردو شاعری میں حُبِّ وطن کا موضوع داخل ہوا ہی سراسر غلط ہے۔ میر سے لے کر حالی، غالب، اقبال، چکبست، جوش، فیض اور دوسرے ترقی پسند شعرا تک حُبِّ وطن کی اس روایت میں عظمت اور بلندی، رفعت اور ہمہ گیری ہے اور یہ عظیم روایت خود اُردو شاعری کی عظمت اور بلندی، رفعت اور ہمہ گیری پر دلالت کرتی ہے۔

۶۱۔ عبدالسلام ندوی:

اُردو غزل

(معارف اعظم گڑھ ۴۸ مارچ ۲۲۶۔ ۲۳۴)

اُردو غزل مولفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں پر تنقید۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب بیان فلسفیانہ ہے۔ جو غزل جیسے موضوع کے لئے مناسب نہیں۔ غزل کا ایک ایسا حصّہ بھی ہے جو جدید تعلیم یافتہ گروہ کے اعتراضات کی زد سے باہر ہے چونکہ یہ کتاب غزل کی حمایت میں لکھی گئی ہے اس لئے مختلف عنوانات قائم کر کے غزل کی ان ہی خوبیوں کو نمایاں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایسا نہیں کیا ہے۔

کتاب میں جو مختلف شعرا کا نمونۂ کلام درج ہے اسے بلند پایہ انتخاب نہیں کہا جا سکتا۔

۶۲۔ عرش ملسیانی:

امجد کے ساتھ چند لمحے

(آج کل دہلی، ۵۴ء فروری، ۲۲۔۲۴)

جنوری ۱۹۳۵ء میں مضمون نگار نے حیدر آباد کا سفر کیا تھا وہاں حضرت امجد حیدر آبادی کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا، امجد صاحب کا تعارف اور ان کی رُباعیات پیش کی ہیں جنھیں امجد صاحب نے خود سُنائی تھیں۔

۶۳۔ عرشی امتیاز علی خاں:

دیوان ابو طالب حکیم

(برہان دہلی، ۵۴ء فروری، ۱۱۱۔۱۱۴)

دیوان ابوطالب حکیم کے ایک قلمی نسخہ کا تعارف اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کا ہے اور محمد کاظم بن محمد امین منشی مصنف عالم گیر نامہ (متوفی ۱۰۹۲ھ) کو حکیم نے یہ نسخہ دیا تھا۔ اور دونوں کی تحریریں نسخہ پر موجود ہیں۔

۶۴۔ عشرت حسین انور:

اقبال — رومی اور ولیم جیمس

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ء، فروری ۱۰۶)

اقبال پر بعض مغربی مفکرین کا اثر ضرور پڑا ہے لیکن ذاتِ باری کے وجود و نوعیت کے سلسلے میں ان کا نقطۂ نظر الگ ہے۔ وہ ذات باری کو حقیقی وجود سمجھتے ہیں اور کسی حد تک فلسفۂ ویدانت کے اثرات کے تحت اور بہت حد تک ولیم جیمس یا رومی یا دونوں کے اثر سے ذاتِ باری سے قریب ترین وصل اور قربت کے طالب ہیں۔ رومی اور ولیم جیمس دونوں وصال حق کے مُتلاشی ہیں لیکن طریقۂ کار دونوں کا جُدا گانہ ہے۔ اس قسط میں دونوں کے نظریات کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

۶۵۔ عشرت حسین انور:

اقبال، رومی اور برگساں

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ء مارچ، ۱۹۳۔۲۰۷)

یہ مقالہ کی دوسری قسط ہے پہلی قسط بعنوان رومی اور ولیم جیمس معارف بابت فروری ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی مقالہ ہذا میں طوالت کے خوف سے اقبال سے موازنہ نہ ہو سکا بلکہ عقل و عشق اور ذات شخص پر رومی اور برگساں کے نظریات پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے رومی ذات شخص کو "جوہر" مانتے ہوئے بھی اسے ہر لحظہ ارتقا پذیر اور متغیر سمجھتے ہیں گو بظاہر اس نظریہ میں برگساں کی تائید نظر آتی ہے لیکن فی الحقیقت ذات شخص کو محض سلسلۂ تغیرات کے مترادف تسلیم نہ کرنے کی بنا پر رومی برگساں کے نتائج فکر سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔

۶۶۔ غلام مصطفٰی:

مولانا حالی کا ذہنی ارتقاء

(اُردو کراچی ۵۴ء جنوری، ۹۱۔۹۰۶)

اس قسط میں ۱۸۹۸ء تا ۱۹۱۴ء تک مولانا حالی کی تصنیفات کا ترتیب وار جائزہ لیا گیا ہے تاکہ ان کے ذہنی ارتقاء کا حال تدریجاً اور ترتیباً معلوم ہو سکے۔ اس سلسلہ میں کوشش کی ہے کہ ان کی تمام اہم تحریروں کا حوالہ آ جائے اس سے تصنیف و مصنف کا صحیح جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے۔ آخر میں مولانا حالی کا تعمیری ادب کے عنوانات سے مولانا کی تعمیری خدمات کا اشارتی تذکرہ کیا ہے۔ خدمات شمار میں ۲۵ ہیں۔

۶۷۔ فاروقی۔ اطہر علی:

لور چندرانی

(آج کل دہلی، ۵۴ء فروری، ۱۲۔۱۴)

لور چندرانی بنگلا زبان کا ایک منظوم رومان جس میں دو شاعروں دولت قاضی اور الاول نے حصہ لیا اور بنگلا ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ بنگلا زبان و ادب کی مختصر تاریخ اور کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۶۸۔ قاضی محمد بشیر الدین پنڈت:

پرتھوی راج راسو

(برہان دہلی ۵۴ء مارچ، ۱۳۳۔۱۴۰)

پرتھوی راج راسو سے متعلق مفصل بیانات ملتے

ہیں۔ ان کا تذکرہ مع ان کے جائزے کے اس مضمون میں ملتا ہے۔ راسو کے واقعات اور سنین غلط ہیں۔ دراصل یہ پرتھوی راج کے دربار کے کسی شاعر کی تصنیف نہیں بلکہ اسی خاندان کے بادشاہ ہرراج یا گوبند راج کے کسی شاعر کی لکھی ہوئی ہے، جس نے پرتھوی راج کی بہادری کے من گھڑت قصے لکھ کر راسو کی پُرفریب عالی شان عمارت تیار کر دی اس کتاب نے اُردو دنیا میں کافی غلط فہمی پیدا کر دی تھی۔

۶۹۔ گوپی چند نارنگ:

اُردو ادب میں اتحاد پسندی کے رُجحانات

(نوائے ادب بمبئی ۵۷ء جنوری، ۲۰ — ۴۰)

اُردو ادب میں رواداری، محبت اور اخوت کا جذبہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود ہندوؤں اور مسلمانوں کا سابقہ۔ خود اُردو زبان ایرانی اور ہندستانی تہذیبوں کا سنگم ہے۔ اتحاد اور یگانگت کی روایت اُردو ادب میں ایک ہزار سال کے ارتقاء کی تاریخ ہے۔ باہمی علیحدگی اور نفرت کی خلیج کو پُر کرنے کی اس نے ہمیشہ کوشش کی۔ اُردو ادب کے ان ہی رُجحانات پر اس مقالہ میں روشنی ڈالی ہے۔ (باقی)

۷۰۔ محمّد اجمل خاں:

چین کے ترانے

(آج کل دہلی ۵۷ء جنوری، ۷ — ۱۱)

شروع سے لے کر اب تک یعنی جدید چین تک کے تمام ترانوں کا ذکر مع اقتباس و ترجمہ کے کیا ہے۔ ان ترانوں سے چین کی زندگی اور جدّ و جہد پر روشنی پڑتی ہے۔

۷۱۔ محمّد اجمل خاں:

روس کے قومی ترانے

(آج کل، دہلی ۵۷ء فروری، ۳ — ۸)

ابتدا میں روسی قوم کی تاریخ پیش کرنے کے بعد، روس میں مختلف دَور میں جو قومی ترانے اختیار کئے گئے ان کے منظوم تراجم اور پھر آخر میں روس کے نئے قومی ترانہ کا منظوم ترجمہ پیش کیا ہے۔

۷۲۔ محمّد اجمل خاں:

انڈونیشیا کا قومی ترانہ

(آج کل دہلی ۵۷ء مارچ، ۵ — ۱۰)

انڈونیشیا کے محل وقوع، مذہب اور زبان وغیرہ پر روشنی ڈالنے کے بعد جاوی زبان میں مہابھارت اور رامائن کے نمونے ملتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی نیتی شاستر سے دو حکایتیں درج کی ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کی قومی تحریکوں کا جائزہ لینے کے بعد انڈونیشیا کا قومی ترانہ مع ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

۷۳۔ محمّد احسن:

اُردو ادب میں رومانوی تحریک

(ادب لطیف لاہور ۵۷ء فروری مارچ ۹ — ۲۱)

مقالہ ہذا اُردو ادب میں رومانوی تحریک مطبوعہ "اُردو" کا دوسرا حصّہ ہے، اس میں رومانیت کی تعریف نظم و نثر میں اس تحریک کے پیروؤں، اس کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لے کر یہ بتایا گیا ہے کہ دَورِ جدید رومانیت کے لئے سازگار نہیں۔

۷۴۔ محمّد حسن عسکری:

محاوروں کا مسئلہ

(ماہ نو کراچی، ۵۷ء جنوری، ۷ — ۱۰)

پُرانے ادیب محاورے کیوں استعمال کرتے تھے؟ محاوروں میں اجتماعی زندگی کی تصویریں سماج کے تصوّرات وغیرہ سموئے ہوئے ہیں ادب میں خوبی اور بلندی اور ساتھ ہی انفرادی و اجتماعی زندگی کی عکاسی ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ ہمارے موجودہ لکھنے والے زندگی کی گہرائیوں میں ڈوب کر نئے نئے محاورے نہ ڈھالیں۔

۷۵۔ محمّد حسن عسکری:

گر ترجمے سے فائدہ اخفائے حال ہے

(ماہ نو کراچی، ۵۷ء فروری، ۷ — ۱۰)

اُردو ادب کے آغاز سے غالب تک گو ترجمے زیادہ نہیں ہوئے لیکن اُردو شعراء دو قسم کی کوششیں کر رہے تھے

اول فارسی کے اسالیب و تصورات اُردو ادب میں سموئے تھے اور دوم اپنی زبان کا ایک مزاج اور روح متعین کرنا چاہتے تھے، پھر سرشار نے ترجمہ کیا اور ایسا کہ اصل کہانی کو دیسی لباس پہنا دیا۔ اس طرح وہ کہیں کہیں ناکامیاب رہے۔ موجودہ دور میں ترجموں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے اور دوسری زبانوں کے ترجمے ہو رہے ہیں لیکن تخلیقی جذبہ نہیں ہے۔ اچھا ترجمہ وہی ہے جس میں کتاب کی اصل روح چاہے برقرار نہ رہے لیکن وہ کچھ نہ کچھ بن ضرور جائے۔ دوسری زبانوں کی باریکیوں اور اظہار خیال کی نزاکتوں کو سمونے کی اُردو ادب میں ابھی گنجائش نہیں۔

۷۶۔ محمد سخاوت مرزا:

سید شاہ فقیر محی الدین مقبولؒ میسوری

(نوائے ادب بمبئی ۵۴ جنوری، ۸-۱۹)

حضرت مقبولؒ میسور کے مشہور بزرگ تھے۔ قصبہ محل ضلع چتور (مدراس)، آبائی وطن ہے۔ شاہ اکمل آپ کے والد ہیں۔ ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور قصبہ محل ہی میں نشو و نما پائی۔ بعض خانگی حالات کے سبب اپنے بھائی شاہ افضل کے ساتھ ۱۳۰۰ھ میں میسور آکر اسے مستقل وطن بنا لیا۔ بلند قامت، گندم گوں، عریض الصدر تھے، سخت متشرع، خلیق، منکسر المزاج، عارف باللہ تھے۔ عقیدۃً سُنی اور حنفی المذہب تھے۔ شاعری میں اپنے بھائی شاہ افضل کے شاگرد تھے۔ آپکے خاندان میں بہت سے شاعر اور مُصنف گذرے ہیں۔ آپ کا کلام حقائق و معا... آئینہ ہے۔ عصری میلانات بھی ملتے ہیں۔ ۱۳۴۶ھ میں وفات پائی (باقی)

۷۷۔ محمد صغیر حسن معصومی:

ابن باجّہ الاندلسی

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ فروری ۸۵)

۱۔ ابن باجّہ اندلس کا زبردست ادیب و فلسفی تھا۔ اس مضمون میں اس یگانۂ روزگار فلسفی کے حالات زندگی اس کے ادبی روابط اور شاگردوں کے تذکرہ کے بعد اس کی تصانیف شمار کرائی ہیں۔ یہ قسط اس کی علمی حیثیت کے تعیّن پر ختم ہوتی ہے۔

۷۸۔ محمد مہدی:

ہندستانی صحافت

(سب رس، حیدرآباد دکن، فروری تا مارچ ۵۴-۷)

ابتدا میں ہندستانی صحافت کی مختصر تاریخ کے بعد موجودہ صحافت پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ انگریزی کے بڑے بڑے اخبارات ایک خاص گروپ کی نمائندگی کرتے ہیں، خبروں اور خبر رساں ایجنسیوں، بیرونی اثرات، اور چند اہم مسائل کی طرف بھی مضمون نگار نے روشنی ڈالی ہے۔ آخر میں آزاد صحافت کی حدود جد اور کوششوں کو سراہا ہے۔

۷۹۔ مختار الدین احمد آرزو:

دیوان سوز کا ایک نادر نسخہ

(اُردو کراچی ۵۴، جنوری ۴-۵، ۱۴)

دیوان سوز کے ایک مختصر سے انتخاب کا تذکرہ کیا ہے، اس کی دو اہم خصوصیتیں ہیں پہلی یہ کہ خود سوز کا انتخاب ہے اور دوسری یہ کہ خود سوز کے ہاتھ کا لکھا ہوا بھی ہے تحقیقی کام کرنے والوں نے سوز پر بہت کم لکھا ہے۔ ضرورت ہے کہ مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر ان کا دیوان باضابطہ مُرتب کرکے شائع کر دیا جائے۔ صفحہ ۲ پر اس انتخاب کے پہلے صفحہ کا عکس دیا ہوا ہے۔

۸۰۔ مرزا بسم اللہ بیگ:

ہم قافیہ اشعار

(نوائے ادب بمبئی، ۵۴ جنوری ۴۱-۶۲)

ردیف و قافیہ کی یکجائی سے اشعار میں جو حُسن اور خوبی پیدا ہوتی ہے اُسے مختلف مثالوں سے اس مقالہ میں اُجاگر کیا گیا ہے۔ (باقی)

۸۱۔ مظفّر علی سیّد:

کلاسیک کیا ہے؟

(ادب لطیف لاہور ۵۴ فروری مارچ ۴۹-۵۴)

کلاسیک کی ماہیت و معنویت پر روشنی ڈالنے کے بعد

لسانی کلاسیک کی افادیت بتائی گئی ہے اور جدید کلاسیک اور ہم عصر کلاسیک کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

۸۲۔ ممتاز حسین:

عوامی ادب

(سویرا، لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر ۱۲۰–۱۲۷)

عوامی ادب وہ ہے جو عوام کی زندگی اور اس کی مختلف کیفیتوں کو عوامی زبان اور عوامی لب و لہجے میں پیش کرے اور عوام کی زندگی کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے نہ کہ تنزل کی ڈھلان پر۔ اردو ادب کا ایک بڑا حصہ اس خدمت کو انجام دیتا رہا ہے۔

۸۳۔ منٹو عابد حسن:

نیا منشور اور اس کے بعد

(سویرا لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر ۱۸۷–۲۰۴)

ترقی پسند تحریک (ادب میں) کی اہمیت اور صحیح رخ محسوس کراتے ہوئے پاکستان کی ۱۹۴۹ء کی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں جو منشور منظور ہوا تھا اس کے بعد پاکستان کے ترقی پسند ادیبوں میں صحیح اور غلط رجحانات پیدا ہوتے رہے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ حالات کے پیش نظر واقعی راہیں لوگوں کو دکھائی جائیں۔

۸۴۔ نجیب اشرف ندوی:

اسمٰعیل امروہی کی ایک اور مثنوی

(اردو، کراچی ۵۴ جنوری ۷–۱۵)

اپریل ۱۹۵۱ء کے اردو میں ڈاکٹر عبدالحق نے اسمٰعیل امروہی کی ایک مثنوی پر مضمون لکھا تھا اور اس مثنوی کو جولائی کے شمارہ میں شائع کر دیا۔ ابھی پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب نے اسمٰعیل کی ایک دوسری مثنوی "قصہ معجزۂ انار" جس میں ۱۷۱ شعر ہیں کا مختصر تعارف پیش کیا اور مع ضروری حواشی کے شائع کیا ہے۔ قصہ شاہ یمن اسمٰعیل کی مثنوی پر مبنی ہے اور یہ مثنوی ۱۱۲۰ء میں لکھی گئی ہے۔

۸۵۔ نصیر احمد زار:

اردو رسم الخط اور تحریر اعداد

(اردو، کراچی ۵۴ جنوری ۱۱۴–۱۲۰)

اردو پر یہ اعتراض کرنا کہ سائنس و ریاضی وغیرہ کا یہ ساتھ نہیں دے سکتی غلط ہے۔ اس طرح اردو ٹائپ رائٹر پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس پر کسی بڑے عدد کا لکھا بہت مشکل ہے۔ مقالہ نگار نے مدلل طریقہ سے اسے بھی غلط دکھایا ہے۔

۸۶۔ نصیر الدین ہاشمی:

کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد دکن) میں اردو قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں

(اردو، کراچی ۵۴ جنوری ۱۶–۳۱)

"مجموعۂ تحقیقات عالیہ" جامعہ عثمانیہ جلد سوم پارٹ ۳۵ء ۱۹۳۶ء میں "پرانی اردو میں قرآن شریف کے ترجمے اور تفسیریں" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ چونکہ اس کتب خانہ میں بعد میں کتابیں اور مخطوطے آتے رہے اس لئے ہاشمی صاحب نے یہ مضمون لکھا ہے جسے مولانا کے مضمون کا ضمیمہ سمجھنا چاہیئے۔ اس میں مولانا کے بعض سہووں کو دور کیا گیا ہے۔

۸۷۔ ولی کاکوی:

وحید الہ آبادی اور ان کے بعض تلامذہ

(نگار لکھنؤ، ۵۴ مارچ)

وحید الدین وحید الہ آبادی کا مقام پیدائش سنہ انتقال حالات زندگی، شعر و شاعری، انتخاب اشعار، اور چند تلامذہ کے نام وہ انتخاب کلام پیش کئے ہیں۔

۸۸۔ ہیریسن۔ ڈی۔ اے:

جنگ آزادی اور اکبر الہ آبادی

(آج کل دہلی، ۵۴ فروری ۳۲–۳۶)

اکبر الہ آبادی انگریزوں کی غلامی، ہندوستان کے افلاس

جہالت، احساس، ذلت، قومی سے کسی بھی محب وطن سے پیچھے نہیں رہے۔ مضمون میں اکبر کے ان خیالات کو ان کے متعدد اشعار پیش کر کے ثابت کیا ہے۔

۸۹۔ ہنس راج رہبر:

ادب اور کردار نگاری

(سب رس۔ حیدرآباد دکن، ۴۸ فروری مارچ ۴۳-۴۲)

ہندوستانی کہانیوں اور ناولوں میں کردار نگاری پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے، حالانکہ حقیقی کردار کے بغیر کہانی میں نہ واقعیت پیدا ہوتی ہے اور نہ تاثر۔ مغربی ممالک کے مختلف افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کی کامیاب کردار نگاری کی مثالیں دے کر مضمون نگار نے ہندوستانی ادیبوں کو مشورہ دیا ہے کہ ایک ادیب جب تک کردار نگاری پر توجہ صرف نہیں کرتا وہ اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

آرٹ

۹۰۔ چغتائی۔ محمد عبداللہ:

تمدنی، ثقافتی، جغرافیائی، مذہبی اسباب جنھوں نے ہندی اسلامی فن تعمیر کے ارتقا میں حصہ لیا

(زبان دہلی، ۴۷ء جنوری، ۳۲ — ۴۳)

مقالہ میں وہ تمدنی، ثقافتی، جغرافیائی اور مذہبی اسباب علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت درج ہیں، جنھوں نے ہندی اسلامی فن تعمیر کے ارتقا میں حصہ لیا۔

۹۱۔ رفیق غزنوی:

پاکستانی موسیقی کا ڈھونگ

(سویرا، لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر ۱۰۹ — ۱۱۹)

ہندوستانی موسیقی سے متعلق مسلمانوں کے شغف اور کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے تاریخ کی روشنی میں دکھایا ہے کہ پاکستانی موسیقی جیسی کوئی علیحدہ صنف موسیقی نہیں ہے۔

۹۲۔ ہنونت سہائے۔ لالہ:

آرٹ اور کلچر — دیسی اور ودیسی

(نیا ہند، الہ آباد ۵۴ء، اپریل ۲۵۰ — ۲۵۶)

۲۶ جنوری (۱۹۵۴ء) کو یوم آزادی مناتے ہوئے ہندستان اور روس کے فنکاروں نے رقص و سرود میں حصہ لیا تھا، روسی آرٹ ان یورپی اور امریکی فلموں کی گندگیوں سے پاک ہے جو ہندوستان میں نمائش کیلئے پیش ہوتی ہیں۔ مضمون نگار نے آگے چل کر ہندوستانی آرٹ کو بلند سے بلند تر کرنے اور ترقی دینے کا مشورہ دیا ہے۔

تعلیمات

۹۳۔ بی۔ وی کیسکر:

ہندستان میں تعلیم کا مستقبل

(ہندستانی ادب حیدرآباد دکن، ۵۴ء مارچ ۵-۶)

۴۔ اس قسط میں بتلایا گیا ہے کہ طریق تعلیم کو ملکی ضروریات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

۹۴۔ ملک۔ ڈی۔ این:

بنیادی تعلیم

(آج کل، دہلی ۵۴ء فروری ۳۷ — ۴۰)

ہندستان میں بنیادی تعلیم کا تصور، اس کی تاریخ، اس کے مقاصد، اور بنیادی تعلیم کے اقتصادی و بنیادی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۹۵۔ نیاز فتحپوری:

عہد مغلیہ میں شاہزادیوں کی تعلیم

شاہان مغلیہ کی تعلیم و تہذیب سے زیب النسا کی تعلیم کا اجمالی خاکہ پیش کرنے کے بعد مضمون نگار نے زیب النسا کی ابتدائی تعلیم سے لے کر اس کی وفات

تک کے شعراء کی قدردانی، شاعری، علم نوازی عاقل خاں کے حالات بعد میں زیب النساء سے عشق کے اتہام کی تردید کی ہے۔

۹۶۔ ہیلن ڈینٹ:
آکسفورڈ یونی ورسٹی
(ہندستانی ادب حیدرآباد (دکن) ۵۷ء مارچ ۴۳)
آکسفورڈ یونی ورسٹی برطانیہ کی سب سے پرانی یونی ورسٹی ہے اس کی خصوصیات مختصراً بیان کی گئی ہیں۔

نفسیات

۹۷۔ معز علی بیگ:
تحلیل نفسی کا تاریخی پس منظر
(برہان دہلی ۵۷ء جنوری، ۱۳-۲۱)
مضمون میں بتایا گیا ہے کہ تحلیل نفسی کا طریقہ دراصل مسمریزم اور ہپناطیقیت (ہپناٹزم) کی ایک بہت ترقی یافتہ شکل ہے اور گو کہ تحلیل نفسی کی دریافت کا سہرا فرائڈ ہی کے سر ہے لیکن فرائڈ کو ایک امتیازی مقام تک پہنچانے میں فرانس کے ڈاکٹروں مثلاً لیبالٹ، شارکو اور برن ہائم وغیرہ کی معاونت شامل ہے مضمون میں مسمریزم اور ہپناٹزم کی تاریخ اور مذکورہ بالا ڈاکٹروں کی خدمات کا مفصل ذکر ہے۔

سائنس

۹۸۔ بھگوت سروپ گوئل:
آفتابی قوت کا استعمال
(آج کل دہلی ۵۷ء، مارچ ۴۴-۴۷)
آفتابی انگیٹھی کی ساخت پر روشنی ڈالنے کے بعد آفتابی قوت کو استعمال کرنے کیلئے امریکہ روس اور فرانس کی ایجادات کا ذکر کیا ہے۔

۹۹۔ ج۔ ا:
نئے چین میں سائنسی تحقیق
(ہندستانی ادب حیدرآباد (دکن) ۵۷ء مارچ ۱۴-۱۷)
کمیونسٹ چین کے سائنسدانوں نے چین کی ترقی میں دوسرے ملکی اشیاء سے مدد لے کر بڑا نمایاں حصہ لیا ہے ان کا جوش عمل ہر شعبہ زندگی کو بہتر بنانے میں کامیاب رہا ہے اور ان کی سرگرمیاں بڑھتی ہی جاری ہیں۔

۱۰۰۔ رضی الدین صدیقی:
علوم طبیعی اور مسلمان
(ماہ نو کراچی، ۵۷ء فروری، ۱۷-۲۰)
چھٹی آل پاکستان سائنس کانفرنس میں پڑھے گئے خطبہ کا ترجمہ جس میں مسلمانوں کے علوم طبیعی میں عہد بعہد کی ترقیوں اور کارناموں کا مختصراً تعارف کرایا ہے مغربی ممالک کے آگے بڑھنے اور ترقی کے اسباب کی وضاحت کی ہے۔

وفیات

۱۰۱۔ نجیب اشرف ندوی:
شذرات — وفات پروفیسر عبدالقیوم
(نوائے ادب بمبئی ۵۷ء، جنوری ۷)
حیدرآباد کے رہنے والے اور وہاں کے علمی حلقوں میں نمایاں تھے اردو کی دنیائے شاعری اور موسیقی کے عالم میں بھی ممتاز تھے سنہ ۵۶ء میں انتقال کیا۔

۱۰۲۔ نجیب اشرف ندوی:
شذرات — وفات حکیم سید شمس اللہ قادری
(نوائے ادب بمبئی ۵۷ء جنوری ۶-۷)
حکیم سید شمس اللہ قادری حیدرآبادی مرحوم ایک معزز و نامور ادیب، مورخ اور محقق تھے۔ تقریباً نصف سے زیادہ عمر سے وہ تاریخی، علمی اور ادبی مضامین لکھ رہے

تھے۔ تاریخ کا مذاق بہت وسیع تھا۔ ادبی حیثیت سے بھی ان کی سب سے بڑی خدمت تاریخ اُردوئے قدیم ہے۔
(۱۹۳۵ء میں انتقال کیا)

۱۰۳۔ نجیب اشرف ندوی:

شذرات ـــ وفات علامہ عبداللہ یوسف علی

(نوائے ادب بمبئی ۵۴ جنوری ۵ـ۶)۔

علامہ عبداللہ یوسف علی بمبئی کے باشندہ تھے۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے کیمبرج سے تکمیل تعلیم کے بعد انڈین سول سروس میں ملازم ہوگئے۔ سرکاری و غیر سرکاری خدمات انجام دیں۔ سیاست کے علاوہ مذہبی، تعلیمی اور سماجی دُنیا میں بھی با اثر ہستی کے مالک تھے۔ مذہب اسلام، اس کی تاریخ، اس کے تمدن اور اس کے مختلف پہلوؤں سے متعلق کام کرتے رہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن شریف کا عجیب و غریب ترجمہ اور اس سے متعلق حاشیہ ہے۔ اسلام کی اتنی ٹھوس خدمت کسی انگریزی داں مسلمان نے نہیں کی۔

۱۰۴۔ نجیب اشرف ندوی:

شذرات ـ علامہ سیّد سلیمان ندویؒ کی وفات پر

(نوائے ادب بمبئی، ۵۴ جنوری ۳ـ۵)

علامہ سیّد سلیمان ندویؒ مرحوم جامع الصفات شخصیت کے حامل تھے ـ وہ بیک وقت محدث، مفسّر فقیہ، متکلم، ادیب، مورّخ، سوانح نگار، نقّاد، انشا پرداز، مدرّس اور خطیب و مقرّر تھے سیاست، تمدن تہذیب، تعلیم اور اصلاح سے متعلق جو راہ اختیار کی وہی صحیح راستہ ہے۔ پاک ضمیری، ایثار پسندی، بُردباری اور صلح جوئی ان کی خصوصیات تھیں۔ دیسنہ (بہار) میں ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں کراچی میں انتقال فرمایا۔

متفرّقات

۱۰۵۔ ابوظفر ندوی سیّد:

سنسکرت کا فارسی ترجمہ

(بُرہان دہلی، ۵۴ فروری ۷۹ـ۸۲)

ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں سنسکرت سے فارسی تراجم کی ابتدا، مصنّفین و مترجمین کے نام، موضوعات اور مختصر اشارات پیش کئے گئے ہیں۔

۱۰۶۔ بھگوان دین:

ارسطو کی مہانتا

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴ اپریل ۲۲۴ـ۲۳۰)

ارسطو کے زمانہ کے فلسفیانہ دور کی وضاحت کرنے کے بعد ارسطو کی تعلیم اور اس کے فلسفہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۱۰۷۔ خالد غزنوی:

محبت کا جنسی پس منظر

(سویرا لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر، ۲۱۹ـ۲۲۳)

محبت اشیاء پسندی کے جذبے کی ایک قسم ہے جس کی تہ میں جنسی لذت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔

۱۰۸۔ محمّد اجمل:

مسلمانوں کے بحری کارنامے

(العلم کراچی ۵۴ جنوری ۵۱ـ۵۴)

اس مضمون میں مختصر طور سے مسلمانوں کے سمندری سفروں، بیڑوں اور قُطب نُما کی ایجاد کا ذکر ہے۔

۱۰۹۔ مناظر احسن گیلانی:

کس لئے؟

(بُرہان دہلی ۵۴ جنوری، ۵ـ۱۲)

نسلی، وطنی اور لسانی اختلافات کا ذکر کرنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اسلام نے نسل زبان و وطن کی قیدوں کو بالکل ختم کر دیا اور بنی آدم کے اختلاف اور افتراق کی ایک ایک راہ کو بند کر کے سیدھا سادھا راستہ پیش کر دیا ہے

۱۱۰۔ نیاز فتح پوری:

خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا؟

(نگار، لکھنؤ ۵۴، مارچ، ۲۰ـ۲۴)

کسی ہندو سوسائٹی نے مندرجہ بالا سوال نیاز صاحب

سے کیا تھا۔ پابند مذہب اور منکر خدا دونوں کے عقائد و افکار کو پیش کرنے کے بعد مضمون نگار نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ دُنیا کی فلاح و بہبود نظریۂ اشتراکیت کے قبول کر لینے میں ہے، ورنہ مذاہب عالم تو انسانیت کو مدارج اعلیٰ پر پہونچانے میں ناکام رہے ہیں۔

۱۱۱۔ یوسیس:

ایک تاریخی عمارت ، دی کیپٹل

(ہندستانی ادب، حیدر آباد (دکن) مارچ ۱۸۔۲۰)

امریکہ میں سرکاری دفاتر کی عمارت "دی کیپٹل" ہے۔ اسی سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

تبصرے

۱۱۲۔ ع، ر:

گریہ و تبسّم

(نوائے ادب بمبئی، ۵۴ جنوری ۶۳)

گریہ و تبسّم صفیہ شمیم ملیح آبادی کی رُباعیات کا مجموعہ ہے۔ ان کی رُباعیات تخئیل اور انداز بیان دونوں کے لحاظ سے اچھی ہیں۔ تاہم عمیق خیالات اور حکیمانہ مطالعۂ حیات کی کمی ہے مشق سے وہ اُردو ادب میں اپنی جگہ بنالیں گی۔ زبان اور انداز بیان میں انیس کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ ان رُباعیات کی خاص بات ان کی رجائیت ہے۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ، قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

پتہ:۔ صفیہ شمیم ملیح آبادی۔ ۳۹ مارگل لائنز۔ راولپنڈی (پاکستان)

۱۱۳۔ ع، ر:

علی گڑھ میگزین، طنز و ظرافت نمبر

(نوائے ادب بمبئی ۵۴، جنوری ۶۳۔۶۴)

علی گڑھ میگزین کا یہ خاص نمبر ہے۔ مولانا ماجد کے خط میں طنز و ظرافت کے مواد کے متعلق بہت سے مفید اشارے ہیں۔ شوکت سبزواری کا مضمون "اُردو شاعری میں طنز" اور ظفر احمد صدیقی کا مضمون "اردو ادب میں پیروڈی" خصوصیت سے قابل مطالعہ ہیں۔ لیکن شوکت سے اکبر کے سلسلے میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ محمد احسن فاروقی کا "سرشار کا مزاح" بھی خاصا ہے۔ فاروقی نے خوجی کے کردار پر کافی طویل بحث کی ہے اور آخر میں اثر لکھنوی سے اُلجھ گئے اور ذاتیات پر اُتر آئے ہیں۔ رشید احمد صدیقی پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کسی قدر مبالغہ ہے۔ اور عقیدت مندی کا اظہار ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور کنہیا لال کپور کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ کرشن چندر کو چھوڑنا نہیں تھا۔ محفوظ علی پر مضمون سرسری ہے۔ قاضی عبدالودود کا مضمون "میر ضاحک" تحقیقی اور اہم ہے۔ جینے کا سلیقہ، (رشید احمد صدیقی) اور اب وقت آگیا ہے (قاضی عبدالغفار) اچھے طنزیہ مضامین ہیں۔

۱۱۴۔ ع، م:

تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت
جلد دوم

(آج کل، دہلی ۵۴ جنوری، ۴۹)

سیّد ہاشمی فرید آبادی کی تالیف ہے۔ تاریخی حیثیت سے اس کتاب کی افادیت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ہندی اردو کا مسئلہ چھڑا ہے تو لہجہ تلخ ہوگیا ہے اور تقسیم ملک کے بعد فسادات وغیرہ کا ذکر آیا ہے تو ایک طرفہ الزام تراشی نے کتاب کی سنجیدگی کو زائل کر دیا ہے۔ کتابت و طباعت و کاغذ، عمدہ۔ تقطیع: $\frac{22 \times 32}{16}$ ضخامت ۶۵۶ صفحے۔ قیمت:۔ آٹھ روپے آٹھ آنے۔

پتہ:۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان، اُردو روڈ کراچی ۱

۱۱۵۔ ع۔ م:

پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو

(آج کل دہلی ۵۴ جنوری ۴۸۔۴۹)

معارف کا تبصرہ دیا جاچکا ہے۔ وہیں قیمت وغیرہ

بھی درج ہے۔ ع۔م تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد انجمن سے متعلق بہت سی باتیں ایسی بیان کی ہیں جو غلط فہمی پھیلانے کا موجب ہیں۔ اُردو کی حمایت میں دوسری زبانوں سے متعلق خواہ مخواہ معاندانہ لہجہ اختیار کیا۔

۱۱۶۔ ع۔م:

علی گڑھ میگزین

(آج کل، دہلی ۴ ۵ جنوری ۴۹ء)

رشید احمد صدیقی اور قاضی عبد الودود وغیرہم کے مضامین پر مشتمل یہ شمارہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے علی گڑھ میگزین کے سابق شماروں کی روایات کو پورا کرتا ہے۔ مرتّب: ظہیر احمد صدیقی، تقطیع: بڑی ضخامت ۲۷۶ صفحے۔ قیمت: تین روپے۔

۱۱۷۔ ع۔م:

کلاسکی ادب

(آج کل، دہلی، ۴ ۵ جنوری ۴۷ء)

خواجہ احمد فاروقی اُردو کے ایک سنجیدہ ادیب کی حیثیت سے بہت اچھی شہرت کے مالک ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین، ادبی تجسس، پختہ شعور اور شگفتہ بیانی کے آئینہ دار ہیں۔ کلاسکی ادب انھیں کے تنقیدی و ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ کتاب جلد اور رنگین جلد پوش کی حامل ہے۔ قیمت: تین روپے ۸/

پتہ:۔ آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی۔

۱۱۸۔ ع،م:

گلگونہ

(آج کل، دہلی، ۴ ۵ جنوری ۴۸ء)

محمد یٰسین تسکین قریشی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ تسکین کی شاعری میں ٹھہراؤ ہے۔ سنبھلے ہوئے مزاج کی غمازی ہے۔ آفرینیوں کی فراوانی ہے۔ انکی غزلیں خوبصورت ہیں۔

قیمت: دو روپیہ آٹھ آنے۔

ناشر: مکتبہ جامعہ، دہلی۔

۱۱۹۔ غلام رسول مہر:

مقدمہ شعر و شاعری

(سویرا، لاہور ۱۳، ۱۴ نمبر، ۳۸۸)

ڈاکٹر وحید قریشی نے مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کو ایڈٹ کیا ہے۔ اس میں مصادر و اشاریہ کے علاوہ کم و بیش ایک سو صفحات کے مقدمات اور اتنے ہی ضمیمے ہیں۔ مقدموں اور ضمیموں میں اصل کتاب اور اس کے بزرگ منزلت مصنّف کے متعلق ایسی بیش بہا معلومات فراہم کر دی گئی ہیں جو کہیں یکجا نہیں مل سکتیں۔ متن کے لئے ۱۸۹۳ء کا نسخہ استعمال کیا ہے۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور۔ قیمت عام اڈیشن چھ روپے۔ خاص اڈیشن سائز بڑا۔ دس روپے۔

۱۲۰۔ م:

آبِ حیات کا تنقیدی مطالعہ

(معارف اعظم گڑھ ۵ ۴ فروری ۱۵۹-۱۶۰)

آزاد کا تذکرۂ آب حیات اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے آج بھی منفرد ہے اور بہت سی چیزوں میں اس کو اوّلیت حاصل ہے اور ادبی حیثیت تو موافق و مخالف سب میں مسلّم ہے لیکن اس کے باوجود صاحب نظر طبقہ کو آب حیات کی تحقیقی حیثیت پر پورا اعتماد نہیں ہے۔ اس نے آزاد کی کمزوریوں، خامیوں اور زیادتیوں کے پیش نظر اعتراضات کئے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے ان میں سے بعض اعتراضات کا شافی و کافی جواب دیا اور بتایا ہے کہ بعض حیثیتوں سے اب بھی کوئی اُردو تذکرہ اس کی ٹکر کا نہیں ہے۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت: ایک روپیہ ۸/

پتہ:۔ کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ۔

۱۲۱۔ محمد صفدر:

طلسم ہوش ربا (مصوّر)

(سویرا، لاہور، ۱۳، ۱۴ نمبر، ۳۸۸)

طلسم ہوش ربا اردو کے کلاسیکی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اور ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے محمد حسن عسکری نے اس کا انتخاب کرکے ایسے ٹکڑے جمع کر دئے ہیں جو پچھلی تہذیبی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں حنیف رامے کی تصویریں اس انتخاب کی خصوصیت ہے۔ قیمت چھ روپے۔ ناشر مکتبہ جدید لاہور

ناشر:۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی (مطبع، اجمل پریس پرنٹرس پبلشنگ سے چھپا) اسپتال ممبئی

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

کا سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

شائع کردہ

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ بمبئی ۱

انجمن اسلام اُردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
کے
اغراض و مقاصد

۱۔ پی۔ایچ۔ڈی کے طلباء کی رہبری کرنا۔

۲۔ ریسرچ کا کام کرنے والے حضرات کی ہر ممکن طریقہ پر اعانت کرنا۔

۳۔ تلاش و تحقیق میں بیرونی ریسرچ اسکالرز کا ہاتھ بٹانا

۴۔ ریسرچ کا کام کرنے والے اداروں اور یونیورسٹیوں سے تعاون کرنا۔

۵۔ ایک جامع کتب خانہ قائم کرنا۔

۶۔ مختلف کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کرنا۔

۷۔ نایاب مخطوطات و مطبوعات حاصل کرنا اور اُنھیں شائع کرنے کا انتظام کرنا۔

۸۔ ادارہ کی طرف سے ایک سہ ماہی رسالہ کا اجراء جو خالص علمی اور ادبی رسالہ ہوگا۔

اس میں اُردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

اس رسالہ میں گجرات و دکن سے متعلق اُردو کے ابتدائی کارنامے جو اب تک شائع نہیں ہوئے اُنھیں شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اُردو سے متعلق ریسرچ کا کام اس کے ذریعہ برسرِ عام لایا جائے گا۔

رسالہ کا حجم کم از کم ۹۶ صفحات ہوگا۔

رسالہ ہر سال جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوگا۔

نمائندہ خصوصی

توسیلِ زر کا پتہ

رائیڈرس امپوریم لمیٹیڈ

POST BOX NO. 1411, BOMBAY 1.

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی

ــــــــ کا

سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب

ماہ اکتوبر ۱۹۵۴ء

جلد ۵ ... ... شمارہ ۴

چندہ سالانہ تین روپے
ششماہی دو روپے } علاوہ محصول ڈاک

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

فہرست مضامین

شذرات

حسرت موہانی مرحوم کی سیاسی خدمتوں اور قربانیوں سے قطع نظر، ان کی بعض ادبی خدمات اتنی گراں مایہ اور اتنی اہم ہیں کہ اردو زبان کا کوئی مورخ انھیں نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان کا رسالہ اردوے معلّی، ان کی شرح دیوان غالب، ان کے تنقیدی مقالے، متروکات اور فن شعر پر ان کے رسائل قدیم اساتذۂ کلام کا انتخاب وغیرہ ان کے وہ ادبی کارنامے جن کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان کی شاعری سے اردو غزل گوئی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ "غزل کو لکھنؤ کے تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچہ سے سادگی، آسان گوئی اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر کر لانا شاعری میں حسرت کا تجدیدی کارنامہ ہے" لیکن یہ ملک و قوم کے لئے کتنی شرمناک بات تھی کہ [illegible]

COPY FOR EXCHANGE

We hope that you reciprocate!

Thanks

N. B.—Please send two copies of your each publication separately addressed to.

1. The Director
   Urdu Research Institute
   92, Dadabhoy Navroji Road
   Bombay 1

2. The Secretary
   The Writers' Emporium Ltd,
   Post Box No. 1411
   Bombay 1.

[illegible] نائب صدر جمہوریہ رادھا کرشن پہلے نائب صدر منتخب ہوئے ہیں۔ یہ اکادمی بیک وقت ہندوستان کی ۱۴ اہم زبانوں کو فروغ دینے اور ان کے مصنفوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی کوشش کرے گی۔ اس طرح جو ادب پیدا ہوگا وہ مولانا موصوف کے الفاظ میں "انسانی ورثہ میں اضافہ کا باعث ہوگا" اس اکادمی کا معیار ویسا ہی بلند ہوگا جیسے فرانس کی نیشنل اکادمی ہے۔ اکادمی تخلیقی ادب کو فروغ دینے کے لئے ہر سال ہر زبان کے بہترین مصنف کو ۵۔۵ ہزار کا انعام دے گی۔ کوئی مصنف دوبارہ انعام حاصل نہ کر سکے گا۔ نیز اکادمی دوسرے ممالک کو ثقافتی وفد بھی بھیجے گی۔ اور دوسرے ممالک کے ارباب غور و فکر کو بھی دعوت دیتی رہے گی یقین ہے کہ یہ اکادمی ہندوستانی تصنیفات کا معیار بلند کرنے میں معاون ثابت ہوگی اور اس کی وجہ سے ہندوستان کی ثقافتی سرگرمیوں کو زیادہ فروغ حاصل ہوگا۔

تقسیم ہند کے بعد سے ہندوستان کے بہت سے علمی و ادبی اداروں کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے، ان ہی میں ایک ادارہ دارالمصنفین اعظم گڑھ بھی ہے۔ یہ ادارہ اپنی زندگی کے لئے بڑی حد تک اپنی مطبوعات کی بکری ہی پر بھروسہ رکھتا تھا، لیکن تقسیم ملک کے بعد نہ صرف یہ مصیبت نازل ہوئی کہ پاکستان کی علم دوست حکومت نے اپنے علاقہ میں کتابوں کی درآمد پر سخت پابندی لگا کر دارالمصنفین کو اس کے اس خون زندگی سے بڑی حد تک محروم

ہی نہیں کردیا جو اسے اس علاقہ سے ملتا تھا بلکہ وہاں کے بعض بددیانت ناشروں نے اس کی کتابوں کو چھاپ کر اس کی سسکتی زندگی کے ختم کرنے کا بھی سامان بہم پہنچا دیا تھا اور اگر بروقت حکومت کی توجہ اس طرف مبذول نہ کرائی جاتی اور اس حکومت کے علم دوست و علم نواز وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو، وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد اور وزیر خوراک جناب رفیع احمد قدوائی عملی حیثیت سے اس کے بدن میں حیات زا قوت پیدا کرنے کا سامان نہ کرتے تو اس چہل سالہ علماء کے ادارہ کا بچنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس سنبھالے نے زندگی کی امید دوبارہ پیدا کردی ہے اور ان بزرگوں کی اس عملی دلچسپی نے دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کردیا ہے چنانچہ حال ہی میں جناب تقدس مآب حضرت ملا طاہر سیف الدین بالقابہ نے دوسرے علمی اداروں کی طرح اسکی طرف بھی امداد کا ہاتھ بڑھایا ہے اور مرکزی حکومت کے وزراء نے محترم کی طرح نہ صرف خود "لائف ممبر" ہو گئے، بلکہ ان کی وجہ سے ان کے حلقۂ اثر کے دوسرے پندرہ بزرگواروں نے بھی اس قسم کی رکنیت قبول کرلی ہے۔ ہم کو امید ہے کہ دنیا اور دین کی یہ علمی امداد یں دارالمصنفین کو ایک مرتبہ پھر اپنی روائتی علمی خدمات کے قابل بنا دے گی۔

اگست کے آخری ہفتہ میں بمبئی یونی ورسٹی کی دعوت پر مختلف یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور ماہرین تعلیم کی ایک مجلس منعقد ہوئی تھی۔ شرکت کرنے والوں میں جناب ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ہمارے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی تشریف لائے، اور ارکان ادارہ اور اعزازی رفقاء سے تبادلہ خیالات کرتے اور مفید مشورے دیتے رہے۔ ان ہی دنوں میں اردو کے مشہور ادیب و ڈرامہ نگار جناب سید امتیاز علی تاج بھی بمبئی میں تشریف رکھتے تھے وہ بھی متعدد بار انسٹی ٹیوٹ میں آئے۔

جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا سب سے بڑا علمی و مذہبی شہ کار ترجمان القرآن اردو میں کلاسک کی حیثیت حاصل کرچکا ہے۔ اب تک اس کے صرف بیس پارے شائع ہوئے تھے لیکن اب مولانا نے اسے مکمل کرلیا ہے اور وہ چار جلدوں میں شائع ہو رہا ہے۔ طباعت و اشاعت کی اجازت بمبئی کی مشہور نفاست پسند کمپنی شرف الدین الکتبی و اولادہ کو ملی ہے۔ اس کا مطبعۂ قیمہ اپنی نفیس و پاکیزہ طباعت کے لئے مشہور ہے۔ اس لئے ہمیں امید ہے کہ ترجمان القرآن جس طرح معنوی لحاظ سے اہم ہے، صوری لحاظ سے بھی دیدہ زیب ہوگا۔

علمی حلقوں میں یہ خبر انتہائی رنج کے ساتھ سنی گئی کہ ۳۰ جولائی کو علم و ادب کا ایک اور آفتاب غروب ہوگیا۔ شمس العلما عبدالرحمان مرحوم، سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونی ورسٹی قدیم طرز کے تعلیم یافتہ تھے تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ لاہور گئے جہاں انھیں ایک معمولی سی ملازمت مل گئی۔ لاہور کے دوران قیام میں انھوں نے ابن خلدون کے مقدمہ کا ترجمہ کیا۔ یہی ترجمہ ان کی آئندہ کامیابی و ترقی کا باعث بنا۔ سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں عربی و فارسی کے لکچرر کی جگہ خالی ہوئی تو ڈپٹی نذیر احمد نے اسی ترجمہ کو دیکھ کر مرحوم کے تقرر کی سفارش کی تھی۔ مرحوم مذکورہ بالا کالج میں تیس سال کے قریب شعبۂ عربی و فارسی کے پروفیسر اور صدر رہے۔ ان کی تصنیف مرآۃ الشعر ان کے فضل و کمال، دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کا ایک نہایت عمدہ ثبوت ہے۔ ادھر چند سالوں سے مرحوم گوشہ نشین ہوگئے تھے اور علمی و ادبی مجلسوں میں شرکت کرنا ترک کردیا تھا۔ مرحوم نے کراچی میں وفات پائی۔

طالع یار خاں دِہلوی

(سیّد جمیل الدین)

مرزا غالب، ۱۸۶۰ء کے ایک خط میں نواب انورالدّولہ شفق[1] کو لکھتے ہیں:

"طالع یار خاں کے دونوں بیٹے ٹونک سے رخصت لے کر آئے تھے، غدر کے سبب جا نہ سکے، یہیں رہے۔ بعد فتح دہلی دونوں بے گناہوں کو پھانسی ملی۔ طالع یار خاں ٹونک میں ہیں، زندہ ہیں؛ پر یقین ہے کہ مردے سے بدتر ہوں گے[2]"۔

غالب نے "مہر نیم روز" کا ایک نسخہ، جزئی حلِ لغات، تصحیحِ اغلاط اور تزیین و آرایش کے بعد، نواب وزیرالدّولہ والیٔ ٹونک کی خدمت میں بھیجا تو ان ہی طالع یار خاں کے توسط سے بھیجا۔ اس نسخے کے سرورق سے پہلے، سادہ ورق پر، یہ عبارت درج ہے:

"این کتاب تاریخ مہر نیم روز بتاریخ بست و ہفتم جمادی الثانی ۱۲۷۱ہجری معرفت طالع یار خاں صاحب فرستادہ اسداللہ خاں غالب در کتب خانہ حضور بطور نذر داخل شد[3]"۔

طالع یار خاں کی شخصیت، ان کے مرتبے کی اہمیت وزیرالدولہ سے ان کے تعلقات کی نوعیت اور دوسرے قرائن غمازی کرتے ہیں کہ غالب نے وزیرالدولہ کی مدح میں جو قصیدے لکھے وہ بھی طالع یار خاں ہی کی وساطت سے بھیجے۔

---

[1] شفق انورالدولہ، سعید الملک، نواب محمد سعدالدّین خاں بہادر صولت جنگ (عرف منجھلے صاحب) رئیس کالپی۔ آپ کے والد بزرگوار افضل الدّولہ احمد بخش خاں سیماب تخلص، نواب عمادالملک غازی الدین خاں خلف نظام الملک آصف جاہ کی اولاد میں سے تھے۔ کندورہ کالپی کے رہنے والے تھے۔ پہلے سیّد امجد علی قلق اور بعد میں غالب سے مشورہ کیا ۱۸۸۲ء ۹۸-۱۲ھ میں انتقال کیا۔ "تلامذہ غالب" از مالک رام ایم۔اے رسالہ ادب اردو بابت جولائی ۱۹۵۱ء ص۱۲۱۔ [2] خطوط غالب مرتبہ مہیش پرشاد الہ آباد ۱۹۴۱ء ص۱۴۲

[3] اس نسخے پر "مہر نیم روز کا ایک خاص نسخہ" کے عنوان سے "نوائے ادب" بمبئی بابت جولائی و اکتوبر ۱۹۵۱ء اور جنوری ۱۹۵۲ء میں ایک مضمون شائع ہو چکا ہے۔

* تقویم کی رو سے ۱۸۸۲ء ۱۰ صفر ۱۲۹۹ھ سے شروع ہو کر ۱۹ محرم ۱۳۰۰ھ کو ختم ہوتا ہے اس لیے ۱۸۸۲ء اور ۱۲۹۸ھ باہم مطابق نہیں۔

غالب سے گہرے یا سطحی تعلق رکھنے والوں میں سے متعدد اشخاص کے احوال لکھے گئے لیکن طالع یار خاں کا حال ابھی تک شرمندۂ تحریر نہیں ہوا ہے راقم نے ان سے متعلق کچھ معلومات خان بہادر مرزا حامد علی خاں دہلوی سابق دربار سکریٹری نواب صاحب ٹونک سے اور کچھ دوسرے ذرائع سے حاصل کی ہیں۔ ذیل میں وہ، مآخذ کی تصریح کے ساتھ، درج کی جاتی ہیں۔ مرزا حامد علی خاں طالع یار خاں کے حقیقی نواسے مرزا محمد علی خاں دہلوی کے بیٹے ہیں اور جو حالات انھوں نے لکھ کر بھیجے ہیں ان کے بارے میں یہ توضیح کی ہے کہ "یہ حالات والد کی قلمی یادداشت سے لیے گئے ہیں۔"

پس منظر

طالع یار خاں کو فنون سپاہ گری میں کمال اور وزیر الدولہ کو ان فنون میں ان سے تلمذ حاصل تھا لیکن اس اجمال کی تفصیل سے پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ جس دور اور جس ماحول سے یہ تعلق رکھتے ہیں اس دور اور اس ماحول میں فنون سپاہ گری کو کیا درجہ حاصل تھا؟

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی جھلک دکھاتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

> "شرفا میں تو شاید ڈھونڈے سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو اور بانک۔ بنوٹ۔ اور لکڑی نہ جانتا ہو۔ بچپن ہی سے ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے، مقابلے ہوتے ہیں، واہ واہ سے بچوں اور نوجوانوں کا دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپاہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔"[۵۱]

خواجہ الطاف حسین حالی سرسید احمد خاں (ولادت: ۱۲۳۲ھ ۱۸۱۷ء) کے بچپن کے ذکر میں لکھتے ہیں:

> "اس زمانے میں شرفائے دہلی تیراکی اور تیر اندازی کو ایک جوہر شرافت جانتے تھے۔ میر متقی (سرسید کے والد متوفی ۱۲۵۴ھ ۱۸۳۸ء) کو ان دونوں فنون میں کمال حاصل تھا۔ اکثر مرشد زادے اور شریف زادے ان دونوں فنون میں ان کے شاگرد تھے۔ خود سرسید نے بھی تیراکی اور تیر اندازی ان سے سیکھی تھی۔ سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں جو قطع نظر تیر اندازی کے تیر اور کمانیں بنانے میں نہایت مشاق تھے میر متقی ہی کے شاگرد تھے۔"

---

۵۱ ۱۲۶۱ھ ہجری میں دہلی کا ایک مشاعرہ رسالہ اردو بابت جنوری ۱۹۲۹ء ص۴۰۔

۵۲ حیات جاوید حصہ اول شائع کردہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء ص۱۴۵

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"تیراندازی کی صحبتیں بھی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین خاں کے مکان پر ہوتی تھیں۔ وہ (سرسید) کہتے تھے کہ "مجھے اپنے ماموں اور والد کے شوق کا وہ زمانہ جب کہ نہایت دھوم دھام سے تیراندازی ہوتی تھی، یاد نہیں۔ مگر جب دوبارہ تیراندازی کا چرچا ہوا وہ بخوبی یاد ہے ..... ظہر کی نماز کے بعد تیر اندازی شروع ہوتی تھی۔ نواب فتح اللہ بیگ خاں، نواب سید عظمت اللہ خاں، نواب ابراہیم علی خاں اور چند شاہزادے اور رئیس اور اور شوقین اس جلسہ میں شریک ہوتے تھے۔ نواب شمس الدین خاں رئیس فیروزپور جھرکہ جب دلّی میں ہوتے تھے تو وہ بھی آتے تھے۔ میں نے بھی اسی زمانے میں تیر اندازی سیکھی اور مجھ کو خاصی مشق ہو گئی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک دفعہ میرا نشانہ جو تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جا کر بیٹھا تو والد بہت خوش ہوئے اور کہا "مچھلی کے جائے کو کون تیرنا سکھائے" یہ جلسہ برسوں تک رہا پھر موقوف ہو گیا۔"

حیات جاوید حصہ اول ص ۴۴

نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال (ولادت ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء) کو قرآن کریم، فارسی، انگریزی، حساب کی تعلیم اور خوش نویسی کی مشق کے ساتھ ساتھ شہ سواری اور بانک[1] بھی سکھائی جاتی تھی۔ آپ خود بیان کرتی ہیں کہ شہ سواری کی روزانہ اور بانک کی ایک دن بیچ مشق ہوتی تھی اور جہاں قرآن اور فارسی کی تعلیم کے لئے مولوی جمال الدین خاں اور مولوی حسین شاہ بخاری، انگریزی اور حساب کے لیے منشی حسین خاں اور پنڈت گنپت رائے مقرر تھے وہاں حق داد خاں اُستاد، شہ سواری اور سید امیر علی پھکیت، بانک سکھانے کے لئے متعین تھے[2]۔

---

[1] اُستادان کامل نے چھوٹے ہتھیاروں سے بچنے کے واسطے جیسے کہ خنجر اور چھری وغیرہ ہیں ایک فن ایجاد کیا ہے اس کو بانک کہتے ہیں..... اس فن والا بغیر بندوق کے کسی ہتھیار سے زخمی نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ تیر و کمان کو بھی ... رد کرتا ہے اور شمشیر و خنجر اور سنان و سنگ فلاخن وغیرہ کو بآسانی بچا کر محفوظ رہ سکتا ہے بانک باز اگرچہ مرد منحنی ہو اور حریف، اس فن سے بے خبر، ہر چند کہ قوت بازو میں رستم ثانی ہو مگر جس وقت بانک والے کے پیچ میں آجاتا ہے تو بعینہ یہ حال ہوتا ہے جیسے چوہا بلی کے پنجے میں اسیر ہو گیا ہو۔"
عقل و شعور مولفہ سید نظام الدین مطبع نولکشور لکھنؤ ص ۳۵۴

[2] تزک سلطانی مولفہ نواب سلطان جہاں بیگم مطبع سلطانی ۱۳۲۸ھ ص ۳۵-۳۶۔

مہدی علی سہسوانی کہتے ہیں:

"ان کی نانی نواب سکندر بیگم (ولادت ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء وفات ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے ان کو پرورش لیا۔۔۔ بسم اللہ بڑی دھوم سے کی اور قرآن مجید اور فارسی انگریزی کا پڑھانا شروع کیا اور سواری اسپ و فن سپاہ گری سکھایا۔ پندرہ برس کی عمر تک بے پردہ رکھا۔"[۵۱]

نظامی بدایونی لکھتے ہیں:

"سلطان جہاں بیگم... پیدایش ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۹ء[۵۲] عربی۔ فارسی۔ اردو انگریزی کی تعلیم پائی ہے۔ فن سپہ گری و شہسواری بھی جانتی ہیں۔"[۵۳]

پچھلی صدی میں فنون سپاہ گری حاصل کرنے کا بہت شوق اور چرچا تھا۔ اگر تلاش و جستجو کا میدان مرزا غالب کے شاگردوں کے حلقے تک محدود کر دیا جائے تو ان میں بھی کئی ایسے باکمال نکلیں گے جو ان فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ مثلاً:

"سید شاہ باقر علی باقر، بیر نگر (ضلع گیا، بہار) کے سادات میں تھے ... علم و فضل کے علاوہ سپہ گری اور متعلقہ فنون میں اپنے عہد کے ایک ممتاز فرد تھے تصوف و سلوک سے بھی بہرہ وافی حاصل تھا۔ غالب کی تصانیف دیکھ کر اور خواجہ فخر الدین حسین سخن سے ان کے کمالات سن کر..... شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے ۱۹۰۸ء میں وفات پائی..."[۵۴]

"ظفر۔ ظل سبحانی ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ تاجدار دہلی .....۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ (۱۷۷۵ء) کو..... پیدا ہوئے ..... ستمبر ۱۸۳۷ء..... میں تخت دہلی پر جلوہ آرا ہوئے...... ۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو.. .. جاں بحق ہوئے..... رنگون میں آخری آرام گاہ ہے..... مردانہ فنون میں تیر اندازی، تیغ زنی، نشانہ بازی، بانک، بنوٹ، لکڑی، شہسواری میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ شہسواری

---

۵۱ تاریخ الکہ بھوپال مولفہ مہدی علی سہسوانی ۱۳۱۴ھ ص ۱۱

۵۲ بجائے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء، ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۸ء ہونا چاہیے اس لئے کہ سلطان جہاں بیگم خود لکھتی ہیں:
"میں ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۹ جولائی ۱۸۵۸ء کو پیدا ہوئی" تزک سلطانی ص ۳

۵۳ قاموس المشاہیر مرتبہ نظامی بدایونی نظامی پریس بدایوں ۱۹۲۴ء جلد اول ص ۲۹۷

۵۴ غالب از غلام رسول مہر دوسری اشاعت لاہور حاشیہ ص ۴۴۸

سے متعلق مشہور ہے کہ ان کے زمانے میں ہندوستان بھر میں صرف ڈھائی سوار تھے۔ سالم ایک یہ اور ایک ان کے چھوٹے بھائی مرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار ..۔"

تلامذہ غالب از مالک رام ایم اے۔ اردو ادب جنوری تا مارچ ۵۲ ۱۹ء ص۱۰۸-۱۱۱

"عرشی۔ سید احمد حسن قنوجی .. ۱۹ رمضان ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) کو پیدا ہوئے۔ سید صدیق حسن جو آگے چل کر" نواب والا جاہ، امیر الملک سید صدیق حسن خاں بہادر" کہلائے ان سے دو برس چھوٹے تھے۔ عرشی نے ابتدائی تعلیم قنوج میں حاصل کی۔ پھر کان پور، فرخ آباد، بریلی، علی گڈھ اور دہلی میں اساتذۂ وقت کی خدمت میں رہ کے تکمیل کی۔... کمالات معنوی کے علاوہ فنون سپہ گری میں بھی طاق تھے۔ شہسواری، شمشیر زنی اور نشانہ بازی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ گھوڑوں کی شناخت اور ہتھیاروں کے حسن و قبح پر بھی بڑی گہری نظر تھی۔ ان کا معقول ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انھوں نے قنوج کے باشندوں کے جان و مال کی حفاظت میں بہت قابل تعریف کام کیا ...... ۹ رجمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۰ء) کو واصل حق ہوئے ...... اُردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں میں غالب سے تلمذ تھا.... [۵۱]"

وزیر الدولہ اور فنون سپاہ گری

نواب امیر خاں[۵۲] فنون سپاہ گری میں طاق اور ان کے صاحبزادے الولد سرّ لابیہ کے مصداق تھے۔ مولف افتخار التواریخ کہتے ہیں:

"۱۲۴۷ہجری (۱۸۳۲ء) میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنگ اجمیر میں رونق افروز ہوئے۔ نواب (امیر خان) صاحب بہادر حسب الطلب ان سے ملنے کو گئے۔ پیشوائی اور ملاقات حسب معمول ہوئی۔ نواب صاحب نے اپنی فوج کی قواعد لاٹ صاحب کو دکھلائی اور کچھ خود بھی مع صاحبزادوں کے گھوڑوں

---

۵۱ تلامذہ غالب از مالک رام اردو ادب جنوری تا مارچ ۱۹۵۲ء ص۱۰۸-۱۱۱

۵۲ نواب وزیر الدولہ کے والد، بانی ریاست ٹونک۔ ان کے سپاہیانہ کارناموں کی داستان تاریخ ہند کا ایک مستقل باب ہے۔

پر سوار ہو کر اور برچھا ہاتھ میں لے کے قراولی کی جس کو دیکھ کر راٹ صاحب بہت خوش ہوئے۔[۵۱]

خود وزیرالدولہ کو فنون سپاہ گری سے خصوصی شغف تھا۔ ان کے عہد میں ٹونک نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ سپاہیانہ فنون کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بھی خاص شہرت کا مالک تھا۔ مولف آثار مالوہ کا بیان ہے:

"دہلی اور لکھنؤ کے اہل علم و کمال قدر دانی کی کشش سے ٹونک میں اس قدر جمع تھے کہ دارالاسلام ٹونک اس وقت ہندوستان کا شیراز نظر آرہا تھا۔ شجاعت، بسالت اور استقلال نسلی جواہر تھے ۔ سپہ گری کے تمام فنون کے اکتساب نے ان جوہروں کو اور زیادہ چمکا دیا یہاں تک کہ اساتذہ فن خود ان سے کسب کمالات کرتے رہے۔[۵۲]"

مولف تذکرہ کاملان رامپور مولوی سید حسن شاہ صاحب محدث (۱۲۶۶ھ/۱۸۴۹ء - ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"بوجہ ملاقات سابقہ ٹونک کو نواب وزیرالدولہ بہادر کے پاس گئے شاہ صاحب کو اوائل عمر سے بانک۔ پٹا اور دیگر سپاہیانہ ورزشوں کا بھی شوق تھا اس لیے نہایت لطف کی صحبت رہی۔[۵۳]"

وزیرالدولہ کی تصویر دیکھیے تو یہ شان نظر آتی ہے: گھوڑے پر سوار ہیں۔ جسم پر زرہ ہے، پشت پر ترکش و سپر، پہلو میں تیغ، کاندھے پر گرز و کمان اور سر پر آہنی کلاہ ہے۔ یہ گویا ان کے اس شغف کی بھی تصویر مرئی ہے جو انھیں فنون سپاہ گری سے تھا۔

وزیرالدولہ کے استاد

حاجی شمس الدین احمد خاں دیوان ریاست ٹونک کی تالیف:

"واقعات ہفت سالہ امیر و بست سالہ وزیر[۵۴]" میں نواب وزیرالدولہ کے اساتذہ کے نام مندرجہ ذیل عنوان کے تحت بترتیب ذیل ملتے ہیں:

---

[۵۱] افتخارالتواریخ مولفہ دیبی پرشاد مطبع رضوی دہلی ۱۹۰۹ء صفحہ ۴۸

[۵۲] آثار مالوہ مولفہ سید احمد مرتضیٰ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۳

[۵۳] تذکرہ کاملان رامپور مولفہ حافظ احمد علی خاں شوق ہمدرد پریس دہلی ۱۹۲۹ء صفحہ ۱۱

[۵۴] نسخہ سعیدیہ پبلک لائبریری ٹونک راجستھان ۸۳ فہرست جدید تاریخ قلمی۔

"استادان علم و فن سپاہ گری
استاد سید رسول صاحب[۵۱]
استاد طالع یار خاں
امام الدین خاں
محمد امان خاں رسالہ دار[۵۲]
مولانا سید حیدر علی[۵۳]

۵۱ استاد سید رسول صاحب سے متعلق، صاحبزادہ چھٹو میاں ابن صاحبزادہ عبدالکبیر خاں ٹونکی سے جو کچھ راقم نے سنا اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ فن سپاہ گری میں ایسے باکمال تھے کہ گویا بے مثال تھے۔ وزیر الدولہ انہیں ہزار جتن کر کے، گوالیار سے لائے اور اس آسایش و آرام اور عزت و احترام کے ساتھ رکھا کہ یہیں کے ہو رہے۔ بازار علی گنج (ٹونک) میں، شارع عام پر، شفاخانہ مستورات اور شفاخانہ حیوانات کے درمیان ان کی قبر ہے۔ اس کے اطراف میں سیمنٹ کا کٹہرا لگا دیا گیا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک باؤلی ہے جو "سید رسول صاحب کی باوڑی" کہلاتی ہے۔

۵۲ محمد امان خاں رسالہ دار کے پوتے غفران خاں نے راقم کو اپنے دادا کے حالات قریب قریب ان الفاظ میں بتائے:

محمد امان خاں کے باپ کا نام دوران خاں تھا۔ دوران خاں سپاہی پیشہ اور بہادر ہونے کے علاوہ جہاں دیدہ اور قابل اعتبار تھے، مہاراجا اندور کی رانیوں کی ڈیوڑھی پر متعین تھے۔ کسی لڑائی میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ امان خاں بچپن ہی میں یتیم ہو گئے اور اپنی ماں کے ساتھ، نواب امیر الدولہ کے عہد میں، ٹونک آ گئے۔ جوان ہو کر شہ سواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی، پٹا، بانک، بنوٹ میں، ایسی مہارت حاصل کی کہ بلند پایہ استادوں میں شمار ہونے لگے۔ نواب وزیر الدولہ والی ٹونک کے استاد ہونے کا امتیاز حاصل ہوا۔ گرد و نواح کی اور چند ریاستوں کے رئیس بھی ان کے شاگرد ہوئے۔ ٹونک کی فوج میں رسالہ دار تھے۔ کئی لڑائیوں میں شریک اور فتح یاب ہوئے۔ تفصیل تاریخ ٹونک سے معلوم ہو سکتی ہے۔ نرودگاہ "پائیگاہ" کہلاتی ہے۔ والیٔ جے پور بڑی قدر کرتے تھے۔ یہی کشش جے پور لے گئی۔ پچیس تیس سال جے پور میں رسالدار کے عہدے پر مامور رہے۔ کم و بیش اسی سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ٹونک میں مدفون ہوئے۔ دو بیٹے تھے: عبدالقادر خاں اور عرفان خاں، دونوں نے فنون سپاہ گری حاصل کیے۔ یہ بھی اپنے عہد کے استاد مانے جاتے تھے۔ عرفان خاں غفران خاں کے والد تھے۔

۵۳ مولف سیرت سید احمد شہید "تیرھویں صدی کے باکمال اور مشاہیر رجال" کا تعارف کراتے ہوئے سید حیدر علی صاحب کے بارے میں کہتے ہیں: "فنون عقلیہ کے امام معنی مولانا حیدر علی رامپوری... فاضل یگانہ ...... جن کو علوم عقلیہ میں درجۂ اجتہاد حاصل تھا" سیرت سید احمد شہید از سید ابو الحسن علی ندوی تیسری اشاعت

(باقی اگلے صفحے پر)

حکیم سید انور علی[۵۱]
حکیم امام الدین خاں

(حاشیہ بقیہ صـ۱۱) "مولانا حیدر علی علامہ عصر تھے۔ دہلی میں ولادت ہوئی بعمر سنی میں رام پور چلے گئے۔ نحو و عربیت میں سید غلام جیلانی اور مولانا عبد الرحمٰن قہستانی اور شیخ رستم علی رامپوری کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں طالبین سے ایک عرصہ تک پڑھتے رہے پھر دہلی جاکر شاہ رفیع الدین و شاہ عبد العزیزؒ سے استفادہ کیا اور حکیم شریف صاحب سے طب پڑھی۔ حضرت سید (احمد شہید) صاحبؒ سے طریقت کی تعلیم حاصل کی۔ ذکاوت، سرعتِ ادراک، جامعیت معقول و منقول، کتاب و سنت اختلاف ائمہ سے واقفیت، تبحر علمی میں سرآمد روزگار اور علوم حکمیہ میں بحرِ ذخار تھے۔ رامپور میں شادی کی اور عرصہ تک وہیں رہے اس لیے رامپوری مشہور ہو گئے۔ پھر کلکتہ کا سفر کیا، پھر ٹونک تشریف لے گئے۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم نے پوری جوہر شناسی اور قدردانی فرمائی اور ریاست کا مدار المہام مقرر کر دیا۔ آپنے وہیں سکونت اختیار فرمائی۔ درس و افادہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ پرانی ٹونک میں آپ کی مسجد، جس میں آپ درس دیتے تھے، موجود ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ، ٹونک میں، موجود ہیں۔ شاگردوں میں مشاہیر وقت ہیں۔"

سیرت سید احمد شہید از سید ابوالحسن علی ندوی نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۹ء صـ۱۲۳

"مولوی سید حیدر علی اخیر عہد جناب سید احمد علی خاں بہادر (والی رامپور متوفی ۱۲۵۶ھ ۱۸۴۰ء) میں ٹونک گئے اور وہاں نہایت عزت پائی۔ نواب وزیر الدولہ ان کے شاگرد تھے۔ رات دن درس علوم و طبابت سے کام تھا علوم میں بے مثل تھے۔۔ مولوی فضل حق سے امکان نظیر میں مباحثہ بھی رہا۔ نواب صدیق حسن خاں مولف ابجد العلوم کہتے ہیں کہ اس مباحثہ میں دونوں کی تحریریں بہ نظر انصاف دیکھی جائیں تو حق پر مولوی حیدر علی پائے جاتے ہیں۔۔ ۱۲۳۰ھ میں کلکتہ کو گیے اور کچھ دنوں وہاں مقیم رہے۔ طلبہ کا ہجوم رہتا تھا اور رات دن درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔۔ ٹونک میں انتقال فرمایا۔" تذکرہ کاملان رامپور صـ۱۱۸، ۱۱۹

"بتاریخ شانزدہم ماہ مسطور (ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۶ء) روز دوشنبہ بعد زوال حضرت مولانا سید حیدر علی صاحب نے انتقال فرمایا۔ تاریخ وفات ؎ جنتِ فردوس گردد مسکن و ماوائے او"

حدیقہ راجستان ٹونک مولفہ سید اصغر علی آبرو ۱۹۰۱ء صـ۴۳

۵۱ حکیم سید انور علی: "حدیقہ راجستان ٹونک" کے مؤلف سید اصغر علی آبرو کے والد ماجد تھے۔ آبرو اپنی تالیف میں ان کا حال لکھتے ہیں:

"۱۲۲۲ھ ہجری (۱۸۰۷ء) میں نواب وزیر الدولہ بہادر عالم ارواح سے عالم اجسام میں ظہور پذیر ہوئے۔ بعد مرور مدت چہار سال و چہار ماہ ..... والد ماجدِ مولف نے نواب وزیر الدولہ بہادر کو بسم اللہ پڑھائی۔ زاں بعد..... والدِ ماجدِ خاکسار سے جمیع علوم دینی و دنیوی وقتاً فوقتاً حاصل کیے..... (باقی اگلے صفحے پر)

صاحبزادہ محمد عبدالمجید خاں[51]

اساتذۂ علم و فن کی اس فہرست میں دوسرا ہی نام "استاد طالع یار خاں" کا ہے اور اس سے وزیرالدولہ کے دربار میں ان کی اور ان کے مرتبے کی اہمیت کا پتا چلتا ہے۔

نسب نامہ

نسب نامہ یہ ہے: "طالع یار خاں ابن نواب محمد یوسف خاں ابن نواب محمد یعقوب خاں ابن نواب حفیظ اللہ خاں[52] ابن نواب سعداللہ خاں از اولاد شیخ حمید الدین ناگوری[53] و شیخ عطاء اللہ بخاری[54]۔

والد، مولد، مسکن

مرزا طالع یار خاں، نواب مرزا یوسف خاں کے فرزند تھے، دہلی میں پیدا ہوئے۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۱۲) ۱۲۵۰ھ ہجری (۱۸۳۴ء) میں جب ..... مسند ریاست کو زینت بخشی ....، والد ماجد مولف کو بخطاب عمدۃ العلما، زبدۃ الفضلاء معزز و مفخر فرمایا اور اپنا معالج خاص مقرر کرکے بہت کچھ اعزاز بخشا حتٰی کہ بجز والد ماجد کے محلات زنانہ حضوری میں، بنا بر علاج، اندر جانے کا کسی حکیم کو حکم نہ تھا ..... بڑے بڑے سخت موقعوں پر ایسے ایسے علاج کیے کہ مورد تحسین و آفرین ہوئے ..... ۱۲۷۳ھ ہجری (۱۸۵۷ء) میں ..... اس جہان فانی سے بملک جاودانی رحلت فرمائی۔" حدیقہ راجستان ٹونک صفحہ ۴۷-۴۸

[51] صاحبزادہ عبدالمجید خاں عالم تھے۔ وزیرالدولہ کے استاد بھی تھے اور داماد بھی۔ حدیقہ راجستان ٹونک میں جہاں "تفصیل اسمائے داماد ہائے حضرت نواب وزیرالدولہ بہادر" دی گئی ہے وہاں ان کا نام "جناب صاحبزادہ مولوی عبدالمجید خاں صاحب عرف نوشہ میاں پنجابی" موجود ہے۔ وزیرالدولہ کی صاحبزادی فاطمہ بیگم سے نکاح ہوا تھا بازار میر گنج (ٹونک) میں "نوشہ میاں کا پل" ان ہی کی طرف منسوب ہے۔

[52] "نونی، نواب حفیظ اللہ خاں کی جاگیر تھی۔ وہاں، دہلی کے قریب گڑھی میں ان کا مقبرہ ہے" خط۔

[53] سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید (پہلا باب صفحہ ۲۶ مطبع نولکشور ۱۸۹۵ء) میں "مزار قاضی حمیدالدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ" کے عنوان سے لکھا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے پائنتی قاضی حمیدالدین ناگوری کا مزار ہے اور آگے وہ عبارت درج کی ہے جو لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ واقعات دارالحکومت دہلی (حصہ سوم صفحہ ۲۷۱-۲۷۲) میں اسی عنوان کے تحت، یہ عبارت بھی ہے: "نام آپ کا محمد اور باپ کا نام عطا تھا۔ آپ بخارا کے رہنے والے تھے۔ آپ بڑے عالم اور مشائخِ وقت (میں سے) تھے۔ آپ کو شیخ شہاب الدین سہروردی اور میر شمس الدین سمرقندی سے فیض خلافت حاصل تھا۔ ایک سال دو مہینے مدینہ منورہ میں رہے پھر حضرت خواجہ (قطب الدین بختیار کاکی) صاحب کی خدمت میں حاضر رہے بعد وفات خواجہ صاحب ..... آپ نے انتقال فرمایا۔"

[54] خط، یعنی مرزا حامد علی خاں کے وہ دو خط جن میں موصوف نے طالع یار خاں سے متعلق اپنی معلومات لکھ کر بھیجیں۔

نواب مرزا یوسف خاں، آخری بادشاہِ دہلی، بہادر شاہ ظفر، کے معتمد خاص تھے۔ بہادر شاہ ان کو، خواصی میں، ساتھ رکھتے تھے اور پیار سے "کلّو" کہتے تھے۔ ان کی ایک حویلی دہلی میں "کلّو خواص کی حویلی" کے نام سے ان کی یادگار باقی ہے۔ آج کل اس میں ایک بڑا محلّہ آباد ہے۔[۵۱]"

"واقعات دارالحکومت دہلی" میں کلّو خواص کی حویلی کا ذکر موجود ہے[۵۲]

۱۸۲۳ء سے ۱۸۶۲ء تک ٹونک میں رہے

"وزیرالدولہ اپنے استاد مرزا طالع یار خاں کو، جنھیں ہزاروں اشعار یاد تھے جو نہایت بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے اور فنون سپاہ گری میں کمال رکھنے کے علاوہ علوم مجلسی میں کامل تھے، بہت عزیز رکھتے تھے۔ تعظیم کی عزت دی تھی۔ باغات۔ کارخانہ جات: یعنی اصطبل، فیل خانہ وغیرہ ان سے متعلق تھے۔ موضع وزیر پورہ جاگیر میں تھا۔ چنانچہ ۱۸۲۳ء سے ۱۸۶۲ء تک ٹونک میں رہے[۵۳]"

کس مکان میں رہے؟

"امیر بیگم والدہ وزیرالدولہ کے لئے "نوشہ میاں کے پل" اور "منیر خاں کی مسجد" کے وسط میں ایک حویلی زیر تعمیر تھی کہ ۱۸۴۳ء میں موصوفہ حج کو گئیں اور ایسی گئیں کہ پھر واپس نہیں آئیں۔ آبرو کہتے ہیں:

> "۱۲۶۰ ہجری میں جناب عالیہ قدسیہ والدۂ حقیقی حضرت نواب وزیرالدولہ بہادر بیت اللہ شریف تشریف لے گئیں وہاں پہونچ کر انتقال فرمایا اور ان کو قریب مزار حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ کے مدفون کیا۔[۵۴]"

---

[۵۱] خط، یعنی مرزا حامد علی خاں کے دو خط جن میں موصوف نے طالع یار خاں سے متعلق اپنی معلومات لکھ کر بھیجیں۔

[۵۲] اس کتاب میں کلّو خواص کی حویلی کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

"کلّو خواص کی حویلی ـــ جیسی قبر سے کوئی ڈھائی سو قدم کے فاصلے سے دائیں ہاتھ کی طرف تراہے جاتے ہوئے امیر خاں کے بازار میں یہ حویلی ہے پہلے بہت بڑی حویلی تھی اب ٹوٹ ٹاٹ گئی کچھ دیواریں رہ گئی ہیں جن سے اندازہ اس حویلی کی شان و شوکت کا کیا جا سکتا ہے۔ اب اس جگہ متفرق مکانات بن گیے ہیں۔"

واقعات دارالحکومت دہلی مولفہ بشیرالدین احمد دہلوی

حصہ دوم شمسی مشین پریس آگرہ ۱۹۱۹ء ص۱۶۷

[۵۳] خط

[۵۴] حدیقہ راجستان ٹونک ص۳۵-۳۶

ایک بیان یہ ہے:

"تشریف بری جناب عالیہ والدۃ حضور پرنور مع داماد و خواہر خود شاں بسفر حج ۱۲۵۹ھ ۱۸۴۳ء انتقال خواہر جناب عالیہ در بمبئی قبل حج و مادر در مکہ و خود بدریائے شور بعد حج ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء"[۵۱]

بہر حال وہ "قریب مزار حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ علیہ مدفون" ہوئی ہوں یا سمندر کی آغوش، ان کے لیے، آغوش لحد بنی ہو، وہ واپس نہیں آئیں صاحبزادہ عبدالکبیر خاں[۵۲] کے بیٹے صاحبزادہ محمد شاہ خاں عرف چھٹو میاں (متولد ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء) نے راقم کو بتایا کہ جب یہ حویلی تیار ہوئی تو وزیرالدولہ نے طالع یار خاں کو دیدی اور یہ ان کا مسکن بنی زمانہ مابعد میں یہ ان کے پوتے افضل یار خاں کو ملی۔ ان ایام میں چھٹو میاں، بقول خود، دس گیارہ سال کے تھے اور، اپنے والدین کے ساتھ اس میں مقیم تھے۔ افضل یار خاں کے بعد ان کی اولاد نے اسے صاحبزادہ مسعود علی خاں (ابن نواب ابراہیم علی خاں) کے ہاتھ فروخت کردی۔ اب یہ "صاحبزادہ مسعود علی خاں کی حویلی" کے نام سے مشہور ہے۔

کمال فن کا مظاہرہ

"طالع یار خاں کو بنوٹ[۵۳] میں کمال حاصل تھا۔ ایک روز وزیرالدولہ نے ان سے کہا: "ہم آپ کا کمال دیکھنا چاہتے ہیں"۔ طالع یار خاں نے جواب دیا: "عام مجمع میں نہیں دکھا سکتا۔ حضور ہوں اور حضور کے چند عزیز موجود ہوں تب دکھا سکتا ہوں"

---

[۵۱] "منتخب حالات عہد وزیرالدولہ امیرالملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ" (قلمی)

[۵۲] صاحبزادہ عبدالکبیر خاں وزیرالدولہ کے نواسے تھے۔

[۵۳] "فنون سپہگری میں .... بنوٹ نہایت شریف و معزز اور سب فنون میں بمنزلہ بادشاہ ذی جاہ کے قدر و منزلت رکھتا ہے ...... اس فن گرامی کے ذریعہ سے انسان رومال سے تلوار چھین لیتا ہے بلکہ رومال کو ہتھیار جانتا ہے اور خالی ہاتھ شمشیر چھین لیتا ہے اور اہل بنوٹ نے ہزار آدمیوں میں سے جان سلامت بچا لینے کے واسطے ایک نئی دھج نکالی ہے اس کو اپنی اصطلاح میں فرہنگ کہتے ہیں"

(عقل و شعور ص ۴۳۸)

چنانچہ میرے والد سے صاحبزادہ احمد یار خاں صاحب[۵۱] مرحوم فرماتے تھے کہ وہ نواب صاحب کے ہمراہ موجود تھے۔ ایک بڑا طاقت ور حبشی جوان، جو دو تلواریں ہر وقت کمر سے باندھے رہتا تھا، نواب صاحب کا جمعدار تھا۔ مرزا صاحب نے کہا: "میں صرف رومال ہاتھ میں لیتا ہوں، حضور اس سے فرمائیں کہ جس قدر اس میں طاقت ہے ننگی تلوار سے مجھ پر وار کرے۔" جمعدار نے عرض کی: "حضور! میرے ہاتھ سے، کیوں دہلی کے ایک شہزادے کا خون کراتے ہیں۔ میں اگر بھینسے پر وار کروں تو میری تلوار اس کو کاٹ کر زمین میں گھس جائے۔"

طالع یار خاں نے کہا: "فن کا کمال دیکھنا ہو تو اس کو نہایت جوش دلائیں، جس قدر زور دار ہاتھ مارے گا اسی پر لوٹ جائے گا۔" چنانچہ اس کو بہت جوش دلایا گیا۔ اس نے بھرپور ہاتھ، تلوار کا لگایا۔ آنِ واحد میں، رومال سے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے وہ حبشی مرزا صاحب کے قدموں میں گرا پڑا تھا۔ تلوار بہت دور جاکر گری تھی، دونوں پہنچے ہاتھ کے اُتر گئے تھے۔ نواب صاحب نے اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں[۵۲]۔"

۵۱۔ "صاحبزادہ احمد یار خاں ابن بخشی محمد زماں خاں ۱۲۳۸ھ ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ نواب وزیر الدولہ سے فنون سپاہ گری اور علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کی۔ نواب ممدوح نے ان کو پرگنہ نیما ہیڑہ کا ناظم مقرر کیا۔ ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء میں عُہدہ اہلکاری اعلیٰ پر ممتاز فرمایا۔ ان کی شادی اپنی ہمشیرہ فیض بیگم صاحبہ سے کی۔ ۱۲۸۱ھ ۱۸۶۴ء میں نواب محمد علی خاں مسند نشین ہوئے۔ انھوں نے عہدۂ اہلکاری اعلیٰ پر بدستور قائم رکھا اور خطاب: "اشرف الامرا، عمدۃ الملک بہادر فتح جنگ" سے معزز و ممتاز فرمایا۔ ۱۲۸۴ھ میں نواب محمد علی خاں کی معزولی اور نواب ابراہیم علی خاں کی مسند نشینی پر انتظامی پنچایت قائم ہوئی تو اس کے رُکن ہوئے۔ ۱۳۰۴ھ ۱۸۶۷ء میں کونسل قائم ہوئی تو اس کے ممبر مقرر ہوئے اور صیغۂ فوج ان کے سپرد ہوا۔ ۱۳۱۶ھ ۱۸۹۸ء میں عہدۂ جرنیلی اور کونسل کی ممبری سے مستعفی ہوئے۔ ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء میں انتقال کیا۔ موتی باغ میں، بجوار احاطۂ وزیر الدّولہ، مدفون ہوئے۔ بسلسلۂ خیر خواہی بزمانہ غدر ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء حاصل کی ہوئی زمین کے علاوہ موضع بھاپچی اور زمان پورہ جاگیر میں تھا۔"

اشرف التواریخ مولفہ صاحبزادہ عبدالرحمٰن خاں ص ۲۲-۲۶

۵۲۔ خط۔

فرزند

"طالع یار خاں کے دو فرزند تھے: اصغر یار خاں اور صفدر یار خاں۔ یہ دونوں ٹونک میں ملازم تھے۔ رخصت لے کر دہلی آئے تھے کہ غدر ہوگیا۔ یہاں شہزادگانِ دہلی کے ہمراہ انگریزی فوج کے بہت سے افسروں کو تہ تیغ کیا اور بعدِ فتحِ دہلی دونوں نے پھانسی پائی، عمریں تیس پینتیس برس کی تھیں۔"

صفدر یار خاں

"صفدر یار خاں فنونِ سپاہ گری میں ماہر و مشاق تھے۔ صاحبزادہ احمد یار خاں بیان کرتے تھے کہ جاورہ کے ایک صاحبزادے، بہت شہ زور جو کہ سپر کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیتے تھے، آئے۔ اور نواب وزیر الدولہ سے عرض کی:

"آپ کے استاد مرزا طالع یار خاں صاحب سے چھری کی کسرت کرنا چاہتا ہوں"

نواب صاحب نے فرمایا: "ہم ان کے شاگرد ہیں، آپ ہم سے مقابلہ کریں۔"

انھوں نے عرض کی: گدّی کا ادب مانع ہے۔"

فرمایا: "ان کے صاحبزادے صفدر یار خاں سے، جو کہ ہمارے خلیفہ ہیں، زور آزمائی کرو۔"

چنانچہ مقابلہ ہوا جب وہ چھری کا وار کرتے تھے تو صفدر یار خاں اس زور سے گدی مار کر چھری کو روکتے تھے کہ چھری اُن کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑتی تھی۔ وہ صاحب بہت شرمندہ ہوئے۔[۲]

صاحبزادیاں

"دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک کا نام نواسی بیگم اور دوسری کا نام بادشاہ بیگم تھا۔"[۳]

پوتے

"مرزا صفدر یار خاں کے دو فرزند ہوئے: ایک مرزا سکندر یار خاں دوسرے مرزا افضل یار خاں۔ مرزا سکندر یار خاں نے نکاح نہیں کیا ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ تارک الدنیا بزرگ اور ولی کامل تھے۔"[۴]

پڑپوتے اور پڑپوتیاں

"افضل یار خاں کے دو فرزند اور تین لڑکیاں ہیں: ایک فرزند مرزا احمد یار خاں صاحب

---

۱ خط ۲ ایضاً ۳ ایضاً ۴ ایضاً

دفتر ہائی کمشنر پاکستان دہلی میں ملازم ہیں دوسرے مرزا سلطان یار خاں صاحب بی۔اے ایل ایل۔بی۔ دہلی کے مشہور وکیل ہیں اور اسمبلی کے ممبر ہیں۔ افضل یار خاں ٹونک میں معزز عہدوں پر فائز ہوئے چنانچہ برسوں پرگنہ نیماہیڑہ کے ناظم رہے۔ ۱۹۲۰ء میں انتقال ہوا۔ دہلی میں مدفون ہوئے۔[۵۱]

نواسے

نواسی بیگم کے تین بیٹوں کے نام حسب ذیل ہیں:

مرزا اکبر علی خاں، مرزا نواب علی خاں اور مرزا محمد علی خاں یہ تینوں بھائی بھی ٹونک میں، اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے۔

مرزا اکبر علی خاں

"۱۳۰۴ھ ۱۸۸۶ء میں... ناظم کل سایرات مقرر ہوئے۔"[۵۲]

"۱۳۰۵ھ ۱۸۸۸ء میں... بعہدہ نظامت پرگنہ سرونج۔سے مامور ہوئے۔"[۵۳]

"۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء میں...... بجلدوی حسن خدمات ..... خلعت فاخرہ ہفت پارچہ" (پایا)[۵۴]

"۱۳۱۰ھ ۱۸۹۳ء میں...... دربار نے استعفیٰ منظور فرمایا۔"[۵۵]

اکبر علی خاں کی ایک تالیف "تاریخ قیصری" نصرت المطابع دہلی سے ۱۸۷۷ء میں چھپ کر نکلی جس میں ہندوستان کی ریاستوں اور والیان ریاست کے احوال درج ہیں۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "ہیچمداں... اکبر علی خاں متوطن دہلی... ۱۸۶۹ء سے بگوشہ دامن دولت لچھمی سنگھ جی بہادر فرماں روائے بانسواڑہ سایہ گزیں ہو کر بعہدہ جلیلہ میر منشی گری خاص و وکالت ہائے ایجنٹی میواڑ و ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ و نائب مدار المہام ریاست ممتاز رہا۔"

اور صفحہ ۲۱۸ پر، جہاں ریاست ٹونک کا ذکر ہے، لکھتے ہیں:

"میرے بزرگوں میں سے محمد طالع یار خاں اور محمد تہور علی خاں اس سرکار میں چالیس برس تک عہدہ ہائے جلیلہ سرفراز رہے۔

یادگار دہلی میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے: "مرزا صاحب موصوف دہلی کے ایک مشہور و نامی گرامی خاندان کے یادگار ہیں۔ نہایت لائق، فائق، خلیق، متواضع، شریف الطبع آدمی ہیں راجپوتانہ کی کئی ریاستوں میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے ہیں"، یادگار دہلی مولفہ سید احمد صفحہ ۱۶۷

۵۱ خط ۵۲ حدیقہ راجستان ٹونک صفحہ ۱۴۱ ۵۳ ایضاً صفحہ ۱۴۲-۱۴۳ ۵۴ ایضاً صفحہ ۱۸۶ ۵۵ ایضاً صفحہ ۲۰۲۔

مرزا نواب علی خاں

"۱۳۰۴ھ　۱۸۸۷ء　میں...... بعہدہ سکریٹری دربار (ٹونک)...... مامور فرمایے گئے۔"[۵۱]

"۱۳۰۵ھ　۱۸۸۸ء　میں.. بعہدہ سکریٹری دفتر دارالانشا حضوری مقرر ہوے۔"[۵۲]

"۱۳۱۰ھ　۱۸۹۲ء　میں...... وکالت اجنٹی، باڑوتی و ٹونک پر مامور فرمایے گئے۔"[۵۳]

"۱۳۱۲ھ　۱۸۹۵ء　میں...... بعہدہ اسسٹنٹی اول محکمہ حساب و جانچ بماتحتی حضرت وزیر اعظم امیر مفخم مقرر کیے گئے۔"[۵۴]

۱۳۱۱ھ میں ایک کتاب: "واقعہ غدر ۱۸۵۷ء المسمیٰ بہ آثار محشر" تالیف مرزا محمد نواب علی خاں دہلوی مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب پر آسد لکھنوی کا قطعہ تاریخ بھی ہے۔ گمانِ غالب ہے کہ یہ انہی کی تالیف ہے۔ آسد لکھنوی نے ان کے بیٹوں کی شادی کی تاریخ بھی لکھی ہے جو دیوان آسد کے ص۱۷۷ پر چھپی ہے۔

مرزا محمد علی خاں

"آپ کی ولادت ۴ ستمبر ۱۸۵۴ء مطابق ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۷۱ھ کو آپ کے وطن مالوف دہلی میں واقع ہوئی .... آپ اپنے والد (مرزا علی خاں) کی رحلت کے بعد اپنے نانا محمد طالع یار خاں کے پاس ٹونک میں چلے آئے... ۱۸۷۴ء میں اپنے چچا مرزا محمد تہور علی خاں وکیل ریاست ٹونک حاضر باشِ رزیڈنسی اندور میواڑ کے قائم مقام اور ۱۸۷۷ء میں مستقل وکیل دربار مقرر ہوے۔ شروع ۱۸۸۵ء میں آپ کو عاقلانہ خدمات کے لحاظ سے نواب صاحب ٹونک نے سدر ایجنسی باڑوتی و عہدۂ سفارت پر سرفراز کیا جسے آپ نے نہایت بیدار مغزی سے انجام دیا۔ ۱۸۸۷ء میں قیام کونسل کے وقت آپ ممبر کونسل اور صیغہ جات سررشتہ تعلیم

---

[۵۱] حدیقہ راجستان ٹونک ص۱۳۶　[۵۲] ایضاً ص۱۴۲-۱۴۳　[۵۳] ایضاً ص۲۵۸
[۵۴] ایضاً ص۳۱۵

جنگلات و سرحدات و میونسپلٹی و دارالطبع کے منتظم و نگراں مقرر ہوئے۔ قحط سالی ۱۸۹۶ء ۔ ۱۸۹۷ء میں کارِ متعلقہ ریاست کے علاوہ سنٹرل افسر قحط بھی معین ہوئے۔ آپ کی خدمات لائقہ کی جلدو میں گورنمنٹ انڈیا نے ۱۸۹۸ء میں آپ کو بطور ذاتی اعزاز کے "خاں صاحب" کا خطاب مرحمت فرمایا اور جنوری ۱۸۹۱ء میں آپ کے زمانۂ ملازمت کی حسن کارکردگی کے صلہ میں نواب صاحب ٹونک نے "اعتماد جنگ بہادر" کا لقب اور پندرہ سو بیگہ آراضی بطور جاگیر معافی دوامی عطا فرمائی اور جوڈیشل ممبری کونسل کے معزز عہدہ پر سرفراز کیا۔[۱]"

مرزا محمد علی خاں کی ایک کتاب "تحفہ محمود" مطبع محمدی ٹونک سے ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی۔

یہ بیس بائیس صفحات پر پھیلی ہوئی خالق باری کے قبیل کی کتاب ہے اور اس میں انگریزی اور اردو مترادفات منظوم کیے گئے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا دہلی میں مدفون ہوئے۔

وفات اور مدفن

نواب وزیرالدولہ کے بعد، طالع یار خاں، بھوپال تشریف لے گئے۔[۲] ۱۸۶۴ء میں انتقال ہوا اور بھوپال میں مدفون ہوئے۔[۳]"

.:. .:. .:.

---

[۱] صحیفہ زرّیں ذکر مشاہیر راجپوتانہ و وسط ہند ص۸۵ مقالہ نگار جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم رضا لائبریری رامپور کا شکر گزار ہے کہ موصوف نے جناب مولوی فضل اللہ صاحب ... لائبریرین اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے کہنے پر مرزا محمد علی خاں کا حال صحیفہ زرّیں سے نقل کرا کے بھیج دیا۔ اور فاروقی صاحب کا بھی شکر گزار ہے کہ انھوں نے مقالہ نگار کے کہنے پر عرشی صاحب کو لکھا۔

[۲] جون ۱۸۶۴ء میں وزیرالدولہ نے وفات پائی۔ اگر طالع یار خاں ۱۸۶۲ء میں ٹونک سے گئے تو وزیرالدولہ کی زندگی میں گئے، اگر وفات کے بعد گئے تو یہ زمانہ ۱۴ر جون ۱۸۶۴ء کے بعد کا ہونا چاہیے۔

مرزا غالب (۱۷۹۶ء - ۱۸۶۹ء)

اور

امیر مینائی (۱۸۲۸ء - ۱۹۰۰ء)

از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی
(صدر شعبۂ اسلامی تاریخ، سندھ یونیورسٹی حیدرآباد)

مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی اور منشی امیر احمد امیر مینائی لکھنوی اُردو کے نامور شاعر گزرے ہیں، اور دونوں کا شمار اُردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ غالب نہ صرف فارسی اور اردو کے ایک مسلم الثبوت اور بلند رتبہ شاعر تھے، بلکہ زباں دانی اور لغت کی تحقیق میں بھی منفرد اور یگانۂ روزگار تھے۔ لغوی اور لسانی تحقیق میں ان کے کارنامے تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں۔ امیر مینائی فن شعر اور لغت کے علاوہ عربی و فارسی کے عالم اور رسمی علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ اردو شاعری میں وہ استاد فن مانے گئے ہیں، اس کے علاوہ فارسی میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور لغوی و لسانی مباحث میں ان کو جو دسترس تھی وہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے۔ خصوصاً امیر اللغات ان کی لغوی تحقیقات کا بہترین نمونہ ہے۔ اگرچہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ ان دونوں بزرگوں میں جو دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، ان سے بہت کم لوگ واقف ہیں، مرزا صاحب کے بعض خطوط سے ان تعلقات کا پتہ چلتا ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب امیر کی وجاہت اور فن شعر گوئی میں ان کی قابلیت کے معترف تھے۔ اسی طرح امیر غالب کو سخن دانی، فارسی شعر و ادب اور لغت میں استاد مانتے تھے۔

غالباً ان دونوں کے تعلقات کا آغاز ۱۸۵۸ء سے ہوتا ہے جبکہ ان کا تعلق دربار رامپور سے تھا اور قیام رامپور کے زمانے میں ان دونوں کی ملاقات ہوتی رہتی تھی کسی تذکرہ نویس نے اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ خود امیر نے اپنے تذکرہ "انتخاب یادگار" میں اس پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔ امیر ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور گئے۔ اس سے پہلے ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خان ناظم مرزا غالب کے شاگرد ہو چکے تھے اور

خط کتابت کے ذریعہ مرزا صاحب ان کے کلام پر اصلاح دیتے تھے۔ خود مرزا صاحب ۱۸۶۰ء میں پہلی بار رامپور تشریف لے گئے۔ اس سے پہلے امیر سے ان کی ملاقات نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے آشنا ہو چکے تھے۔ مرزا کے تمام مکاتیب میں کوئی مکتوب امیر کے نام نہیں پایا جاتا۔ البتہ مرزا نے اپنے ایک خط میں، جو انھوں نے ۱۲ رجون ۱۸۵۹ء کو اپنے ایک شاگرد منشی شیو نرائن کے نام لکھا تھا، امیر کا ذکر کیا ہے، اور اس میں ان کو اپنا دوست بتایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"..... اب کے تمھارے معیار الشعرا میں میں نے یہ عبارت دیکھی تھی کہ امیر شاعر اپنی غزلیں بھیجتے ہیں، ہم کو جب تک اون کا نام و نشان معلوم نہ ہوگا ہم اون کے اشعار نہ چھاپیں گے۔ سو میں تم کو لکھتا ہوں کہ یہ میرے دوست ہیں اور امیر احمد اون کا نام ہے اور امیر تخلص کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے ذی عزت باشندوں میں ہیں اور وہاں کے بادشاہوں کے روشناس اور مصاحب رہے ہیں اور اب وہ رامپور میں نواب صاحب کے پاس ہیں۔ اون کی غزلیں تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ میرا نام لکھ کر ان غزلوں کو چھاپ دو یعنی غزلیں غالب نے ہمارے پاس بھیجیں اور اوس کے لکھنے سے اون کا نام اور اون کا حال معلوم ہوا۔ نام اور حال جو میں اوپر میں لکھ آیا اسس کو اب کے معیار الشعرا میں چھاپ کر دو ورقہ یا چہار ورقہ رامپور اون کے پاس بھیج دو اور سرنامہ پر یہ لکھو کہ در رامپور بر در دولت حضور رسیدہ بخدمت مولوی امیر احمد امیر تخلص برسد۔ مجکو اس کی اطلاع دو اور اس امر کی بھی اطّلاع دو کہ رامپور کو تمھارا اخبار جاتا ہے یا نہیں۔"

(مرسلۂ یکشنبہ ۱۲ رجون ۱۸۵۹ء)[1]

اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے رامپور جانے سے قبل ہی امیر سے ان کی خط کتابت نواب صاحب کے کلام کی اصلاح کے سلسلے میں رہی ہوگی۔ اور اسی ضمن میں امیر نے رسالۂ معیار الشعراء میں اپنے کلام کی اشاعت کے بارے میں مرزا صاحب کو لکھا ہوگا اور غزلیں بھیجی ہوں گی جس کی بنا پر غالبؔ نے اپنے شاگرد کو یہ ہدایت کی ہے۔

---

[1] اردوے معلّیٰ صفحہ ۳۷۳ طبع ۱۸۹۹ء دہلی۔

لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ ان دونوں کے مکاتیب میں جو چھپ کر شائع ہو چکے ہیں ایک دوسرے کے نام کوئی مراسلت نہیں پائی جاتی۔ "دوست" کا لقب غالباً یہاں رسمی طور پر استعمال ہوا ہے کیوں کہ ایک ہی دربار سے دونوں متوسل تھے اور اسی بناء پر ان دونوں میں گونہ تعلق قائم ہو گیا تھا۔ ورنہ غالب امیر سے عمر میں دو چند تھے۔ ۱۸۶۰ء میں امیر کی عمر صرف ۳۱ برس کی تھی جب کہ غالب ۶۳ برس کی پختہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اس لئے امیر کو انھوں نے رسماً اور اخلاقاً اپنا دوست بتایا ہے۔ اس خط میں غالب نے امیر کی ذاتی وجاہت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور نہ کوئی تعریفی کلمہ استعمال کیا ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ مرزا نے ان کی غزلوں کو اس قابل سمجھا کہ ان کے چھاپنے کی سفارش کی اور اپنے توسط سے اپنے نام کے ساتھ ان کی اشاعت گوارا فرمائی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب نے امیر کا کلام پسند کیا اور اپنے ایک ہم عصر نوجوان شاعر کی ہمت افزائی کی۔

اس واقعہ کے کوئی تین برس بعد امیر کا ایک قطعہ غالب کی حمایت میں شائع ہوا۔ ۱۸۶۲ء میں جب غالب نے برہان قاطع کے رد میں قاطع برہان لکھی اور اس کی تردید میں غالب کے مخالفین نے بھی کئی رسالے اور نظمیں تصنیف کر کے چھپوائیں، تو غالب کے شاگردوں اور طرفداروں نے ان کا ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور یہ بحث اس وقت کے اخباروں میں ایک مدت تک چلتی رہی۔ چنانچہ آغا احمد علی کے بعض شاگردوں کے رد میں غالب کے دو شاگردوں قدا اور سخن نے ایک رسالہ "ہنگامۂ دل آشوب" کے نام سے لکھا جو ۱۸۶۷ء / ۱۲۸۴ھ میں آرہ سے منشی سنت پرشاد کے مطبع میں چھپ کر شائع ہوا[۵۱]۔ اس رسالہ میں انھوں نے میر آغا علی صاحب شمس لکھنوی کے ایک مضمون کا ذکر کیا ہے جو غالب کے رد میں اودھ اخبار میں چھپا تھا۔ اس مضمون کا جواب امیر نے لکھا جو اسی اخبار میں شائع ہوا۔ اور ایک قطعہ اردو میں غالب کی حمایت میں لکھا تھا جو اس رسالے میں موجود ہے۔ چنانچہ امیر کا یہ قطعہ رسالۂ مذکور سے نقل کیا جاتا ہے[۵۲]:

---

۵۱ یہ رسالہ نایاب تھا اس لئے منشی عطا حسین صاحب نے اس کو ایک مختصر دیباچے کے ساتھ رسالۂ اردو (انجمن ترقی اردو) بابت ۱۹۳۷ء میں شائع کرا دیا۔ اس طرح یہ رسالہ محفوظ ہو گیا ہے۔

۵۲ رسالۂ اردو جنوری ۱۹۳۷ء صفحہ ۸۱–۸۰۔

قطعۂ من نتائج طبع دبیر بے نظیر منشی محمد امیر صاحب متخلص بہ امیر
رئیس لکھنؤ سلمہ اللہ تعالیٰ و ارتقاہ علی مدارج الاعلیٰ کہ از اودھ اخبار نقل نمودہ شد

بلا تعلّی مضموں لکھے ہیں چند اشعار یہاں مبالغۂ شاعری نہیں درکار
عجب وقائع حیرت فزائے عالم ہے سنیں پسند کریں مالک اودھ اخبار[1]
ہوا ہے مستعد جنگ نظم بنگالی ہوئی ہے غالب و مغلوب میں عجب پیکار
جواب ان کا لکھا پارسی قیامت کی کہاں یہ سنگ رخام و کہاں در شہوار
یہ کھانے والے ہیں دن رات سنگی مچھلی کے عفونت ان کی زباں سے نہیں گئی زنہار
خرابی ان سے ہوئی اُردوے معلیٰ کی چلم کو کہتے ہیں یہ کو لکی خدا کی مار
سیاہ قلب کا مضموں سپر ہے سلہٹ کی پناہ دے نہ اسے تیغ حیدر کرار
سپاہی زادہ کا اس نے جواب خوب لکھا کہ میرا دادا تھا نادر کی فوج کا سالار
کسی کے جد کو بنائے جو کوئی اپنا جد کبھی دروغ کو ہوتا نہیں فروغ ای یار
وہ اپنے جد کا بتائیں خطاب سرداری میاں گنجفہ تھے کون نادری اسوار
بغیر نام و نشاں کس طرح یقیں آوے خلاف محض یہ جدّ جدید کا اظہار
یہ ان کے اب جد فاسد کی گبڑی ہے ابجد بنائیں وہ کوئی نام اس مقام پہ زردار
اسی طرح سے کلام ان کا سب ہے مصنوعی دروغ نظم سے کیوں کر نہ ہو جہاں بیزار
رقم کیا ہے جو ہر جا کی جا یہ اب جاجا یہ جاجا کون مرض کی دوا ہے اے بیمار
صحیح فارسی میں ہم نے مانا ہے جاجا فصاحت اس کی تکلم میں ہے بہت دشوار
زباں بریدہ بکنجے نشستہ ام صم و بکم خموش رہنا ہے اون کے لیے بہ از گفتار
خدا گواہ کہ اب عافیت اسی میں ہے اونھیں یہ چاہیئے اس بات کے ہوں شکر گزار
سُنو بیان اسد اللہ خان غالب کا زمانہ اون کے حسب اور نسب سے واقف کار
خطاب یافتہ ہیں وہ رئیس دہلی کے زمیں سے تا بفلک حسن خانداں اظہار
وہ اپنے عصر کے خاقانی و نظیری ہیں نظیر اون کا جہاں میں کہیں نہیں زنہار
سخن کی داد لے زندہ ہو جو فردوسی کلام اون کا وہ نام خدا ہے باغ و بہار
وہ نظم حضرت غالب جہاں ہیں غالب ہے انھیں کے قول پر آفاق کا ہے دار و مدار
اساتذہ ہیں یہاں ناسخ جہاں منسوخ انھیں سے طالب اصلاح شاعران دیار

[1] منشی نول کشور

زمانہ ہم کو بھی کہتا ہے منصف الدّولہ — فہیم شہر ہیں البتہ شاعری دشوار
لکھا ہے ہم نے بھی اک مختصر جہاں آشوب — لکھے ہیں اس میں قلمبند ہفت صد اشعار
جو سرگذشت کہیں کی نئی سنی لکھی — لکھا امیر نے یہ واقعہ بھی آخر کار

اس قطعہ کے عنوان میں امیر احمد کی بجائے "محمد امیر" لکھا ہے جو غالباً دبیر بے نظیر کے قافیہ کی رعایت سے درج ہوا ہے، کیونکہ امیر تخلص کا کوئی دوسرا شاعر لکھنؤ میں مشہور نہیں ہوا۔ آخری شعر سے ایک خاص بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ امیر نے "جہاں آشوب" کے نام سے ایک نظم بھی لکھی تھی جو سات سو اشعار پر مشتمل تھی۔ لیکن امیر کی مطبوعہ تصانیف میں کہیں اس کا نام نہیں ملتا، نہ ان کے کسی سوانح نگار نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس نظم کی اشاعت ہی نہ ہوئی ہو اور وہ ان کے مسودات میں رہ گئی ہو۔

جلالی احمد آبادی

(گذشتہ سے پیوستہ)

(پروفیسر سید اکبر علی صاحب ترمذی گورنمنٹ کالج اجمیر)

منصب وزارت ———

دیگر درباروں کی طرح دربار شاہیہ میں بھی منصب وزارت تھا اور اس عُہدے پر شیخ احمد بن برھان المعروف بہ میاں مخدوم فائز تھے۔ آپ ۸۶۸ھ سے ۸۸۰ھ تک اس فرض کو انجام دیتے رہے۔

میاں مخدوم کا مختصر ترجمہ ہم اس مضمون کی پہلی قسط میں پیش کر آئے ہیں ان کے مختصر حالات مرآت احمدی اور صد حکایت میں ملتے ہیں۔ مرآت احمدی کے مُصنّف نے آپ کا سنِ ولادت نہیں بیان کیا ہاں یہ ضرور لکھا ہے کہ "اخیر الاولیاء" (۸۹۰ھ) سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے[۵۱]۔ سید جعفر بدر عالم اپنی صد حکایت میں لکھتے ہیں کہ وفات کے وقت میاں مخدوم کی عُمر چھیالیس[۴۶] سال کی تھی[۵۲]۔ ان بیانات کے پیشِ نظر ۸۴۷ھ آپ کا سالِ ولادت متعین کرنا غلط نہ ہوگا۔

آپ نے مولانا صدر جہاں[۵۳] سے علومِ ظاہری کی تحصیل کی۔ ابھی آپ کی عُمر بارہ سال ہی کی تھی کہ آپ ۸۵۶ھ میں حضرت شاہیہ کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے بارہ سال کی مسلسل خدمت کے بعد ۸۶۸ھ میں دربار شاہیہ کے منصب وزارت پر فائز ہوئے اور بارہ سال یعنی ۸۸۰ھ تک اس فرض کو خوبی سے انجام دیتے رہے۔ حضرت شاہیہ کی وفات (۸۸۰ھ) سے تا دمِ مرگ (۸۹۰ھ) یعنی دس سال تک حضرت شاہیہ کی خلافت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

میاں مخدوم کے آباء و اجداد اہلِ قلم میں سے تھے اور "نویسندگی" ان کا آبائی پیشہ تھا، چنانچہ صد حکایت کا مصنّف لکھتا ہے "سن بہ بیست و چہار رسید بمرتبہ خلافت وزارت شاہی رسیدند و چوں آبای ایشان از اہل قلم بودند روزی بخاطر گذرانیدند کہ اینجا کہ ارادت آوردیم باز خدمت نویسندگی ...... اگر ازیں خدمت معذور دارند وقت بحضور بگذرد حضرت شاہیہ دام جلالہ فرمودند اینہا بخاطر مگذران انت وزیری فی الدنیا والآخرة"[۵۴]

---

[۵۱] خاتمہ مرآت احمدی (کلکتہ) ص ۱۳ [۵۲] صد حکایت (قلمی) حکایت نمبر ۹، مرآت احمدی کا مُصنّف وفات کے وقت آپ کی عُمر چوسٹھ سال کی بتاتا ہے لیکن صد حکایت کا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے [۵۳] خاتمہ مرآت احمدی (بمبئی) ص ۳۰ مولانا صدر جہاں کے مختصر ترجمہ کے لئے دیکھئے خاتمہ، مرآت احمدی (بمبئی) ص ۶۴ تا ۶۶۔

[۵۴] صد حکایت۔ حکایت نمبر ۹، جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۲۷۔

اخراجات

دربار شاہیہ کا خرچ سلطان وقت کے دربار کے اخراجات سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ سید محمد جمعات شاہیہ میں لکھتے ہیں "والحال خرچ بادشاہانہ دارند"[51] آپ کے دربار میں جو بھی حاضر ہوتا انعامات شاہانہ پاتا۔ سید محمد جمعات شاہیہ میں لکھتے ہیں "حاضرانِ مجلس را بانعامات شاہانہ دامن گران ساختہ درخلوت شدند"[52]

بوڑھے اور اپاہج لوگوں کے لئے آپ کے دربار سے روزینہ مقرر تھا۔[53] آپ کے دربار میں حاضر ہونے والے صوفیوں اور علماء کو آپ کی سرکار سے دینار و درہم ملتے[54] آپ کے اخراجات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مخدوم جہانیاں کے عرس کے لئے بارہ ہزار فیروز شاہی سرکار خاصہ سے مطبخ کے لئے مقرر تھی[55]

مرآت سکندری اور مرآت احمدی کے بیانات سے بھی سید محمد کی رائے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مرآت سکندری کا مصنف لکھتا ہے "حضرت شاہیہ از خزانہ خود یک لک و بیست و چہار ہزار تنکہ نقرہ بفقرا انفاق فرمودند"[56] مرآت احمدی کا مصنف لکھتا ہے "مولانا شیخ احمد المشتہر بمیاں مخدوم کہ مرید خاص باخلاص حضرت شاہیہ بود سرانجام ضروریات آنحضرت بدیشان تعلق داشت گویند کہ ہشتاد و چہار تنکہ زر سرخ بہر یک بوزن ہفتہ تولچہ خرچ روزمرہ سرکار شاہی بود۔"[57] مولانا محمد عماد الدین طارمی کے والد زربفت کی ایک خرگاہ لے کر وارد ہند ہوئے لیکن جب بادشاہ وقت نے خریدنے سے انکار کر دیا تو وہ احمد آباد تشریف لائے اور حضرت شاہیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے نو لاکھ روپیہ میں یہ خرگاہ خرید لی[58]

مجلس سماع

حضرت شاہیہ کو سماع کا شوق تھا چنانچہ رسول آباد کے جماعت خانہ میں اکثر و بیشتر محفل سماع منعقد ہوتی[59] مرآت سکندری کا مصنف لکھتا ہے "میاں منجلہ یعنی شاہ عالم .... استماع سرود می نمایند"[60] آپ کے آستانہ پر ملک کے مشہور و معروف قوال حاضر

---

[51] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۱۹۔ [52] ایضاً جمعہ ۳ اور ۱۴۔ [53] ایضاً جمعہ ۲۔ [54] ایضاً جمعہ ۲۶۔ [55] ایضاً جمعہ ۳۴۔ [56] مرآت سکندری ص ۹۰ [57] خاتمہ مرآت احمدی (بمبئی) ص ۳۱۔ [58] خاتمہ مرآت احمدی ص ۱۱۰۔ [59] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۱۶۔ [60] مرآت سکندری ص ۱۱۱۔

ہوتے[۱۵]۔ ان قوالوں میں ملک شمس الدین کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے[۱۶]۔

قراء ــــــــ

قوالوں کی طرح بعض قاری بھی آپ کے دربار سے وابستہ تھے۔ دربار شاہیہ میں "قاری خاص" کا ایک جداگانہ عہدہ تھا چنانچہ جمعات کا مولف لکھتا ہے "بعد از آن قاری خاص بعضی احادیث می گذرانند و در مجمع علماء عبارت را بی بجا یا صحیح می خواند حضرت شاہیہ تحسین کردند و فرمودند مولانا عبارت را بغایت خوب می خوانند[۱۷]۔ دربار شاہیہ سے وابستہ قراء کی فہرست میں مولانا علی بن سلیمان[۱۸] اور مولانا سلیمان بن علی[۱۹] کے نام ممتاز نظر آتے ہیں۔

جامعہ رسول آباد ــــــــ

اسلامی عہدِ حکومت میں رسول آباد کو علمی اور تعلیمی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حضرت شاہیہ کے زمانہ میں یہ ایک تعلیمی مرکز تھا جہاں تشنگان علم تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس حاصل کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو اس جامعہ میں مختلف مسائل پر بحث ومباحثہ ہوتا یہاں پر یہ لکھ دینا نہایت ہی ضروری ہے کہ اس درس گاہ میں مذہبی علوم پر زیادہ زور دیا جاتا اور عقلی علوم سے اجتناب کی تلقین کی جاتی چنانچہ جمعات کا مولف لکھتا ہے "بعد ازاں بہ طلبہ علم فرمان شد عزیزان در علوم دینیہ غور کنید کہ گفتہ اند ۔

علم و فقہ است و تفسیر و حدیث ہر کہ داند غیر ازیں گردد خبیث[۲۰]

اس درس گاہ سے طلباء کی ایک بڑی جماعت فیض یاب ہوتی تھی۔ جمعات شاہیہ کی زیر بحث جلد میں جن طلباء کا ذکر ملتا ہے ان میں (۱) خواجہ کریم الدین (۲) بلال ساکن منجھوری اور (۳) مولانا یوسف بن احمد نمایاں نظر آتے ہیں۔ مولانا یوسف سید عثمان شمع برہانی کے پوتے تھے اور ان کا سلسلہ سید عثمان سے اس طرح جا ملتا ہے یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان مولانا یوسف اپنے زمانہ کے بلند پایہ علماء میں شمار کئے جاتے تھے آپ نے ۸۸۹ھ میں ابن خاکان کا منظر الانسان کے نام سے فارسی میں ترجمہ کیا اور سلطان محمود بیگڑہ کے نام سے معنون فرمایا[۲۱]۔

علماء ــــــــ

علماء کی ایک بڑی جماعت آستانہ شاہیہ سے وابستہ تھی، جن علماء کا ذکر جمعات

---

۱۵ جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۳۲۔ ۱۶ ایضاً جمعہ ۳۰ ۱۷ ایضاً جمعہ ۲ ۱۸ ایضاً جمعہ ۱۸ ۱۹ ایضاً جمعہ ۲۵
۲۰ جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۲۳ ۲۱ ظفر الدولہ جلد اول ص ۳۳ ۔

کی زیر بحث جلد میں ملتا ہے ان میں یہ نام نمایاں نظر آتے ہیں (۱) مولانا یوسف بن احمد (۲) مولانا شیخ احمد بن برهان المعروف بہ میاں مخدوم (۳) شیخ فرید الدین محمد بن دولت شاہ جامع کنوز محمدی (۴) مولانا سلیمان بن علی (۵) مولانا علی بن سلیمان (۶) شیخ جلال محمود خاں (۷) مولانا عبداللہ بن اسماعیل (۸) مولانا صدر الدین (۹) مولانا عماد الدین (۱۰) قاضی نجم الدین بنبانی۔

مولانا یوسف بن احمد، میاں مخدوم اور فرید بن دولت شاہ کے حالات ہم سطور بالا میں پیش کر آئے ہیں مولانا سلیمان بن علی، مولانا علی بن سلیمان اور شیخ جلال محمود خاں کے حالات ہنوز پردہ اخفا میں ہیں مولانا عبداللہ بن اسماعیل اپنے وقت کے مشاہیر علماء میں شمار کئے جاتے تھے آپ بھروچ کے منصب قضاوت پر فائز تھے لیکن حضرت شاہ عالم کی ارادت آپ کو آستانہ شاہیہ پر کھینچ لائی چنانچہ آپ منصب قضاوت چھوڑ کر خدمت شاہیہ میں حاضر ہوئے۔ کچھ عرصہ کے بعد حضرت شاہیہ کے ایماء سے آپ نے منصب قضاوت دوبارہ قبول فرمایا۔[۱]

مولانا صدر الدین کے بارے میں جمعات کے مؤلف لکھتے ہیں "مولانا صدر الدین مورخ والی عہد لازال کا سمہ محمودا"[۲] جمعات کے اس جملہ سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مولانا صدر الدین محمود بیگڑہ کے عہد کے مورخ ہوں گے۔ جمعات کا یہ جملہ محمود بیگڑہ کے عہد کی تاریخی تحقیقات کے بعض تاریک گوشوں کو روشن کرنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے اس موضوع پر تفصیلی بحث میں اپنے ایک دوسرے مقالہ میں پیش کروں گا۔ یہاں تک مولانا عماد الدین کا تعلق ہے ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ شیخ القضات نجم الدین کے صاحبزادے تھے۔[۳]

باوجود کوشش کے ہم قاضی نجم الدین کے حالات فراہم نہ کرسکے۔ جمعات کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ نجم الدین محمود بیگڑہ کے زمانہ میں احمد آباد کے منصب قضاوت پر فائز تھے، مرآت سکندری کے بیانات سے بھی جمعات کی تصدیق ہوتی ہے[۴] قاضی صاحب حج بیت اللہ سے مشرف ہوچکے تھے[۵] اور ابتدا میں شیخ احمد کھٹو گنج بخش سے شرف ارادت حاصل تھا اور ان کی صحبت سے استفادہ بھی کیا تھا[۶] مرآت سکندری کے مصنف نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ قاضی صاحب شرع

[۱] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۸ [۲] ایضاً جمعہ ۷ [۳] ایضاً جمعہ نمبر ۳۳۔ [۴] مرآت سکندری ص ۱۰۳ اور ص ۱۱۱ [۵] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۳۲ [۶] ایضاً جمعہ ۳۲ و جمعہ ۱۶۔

کے بڑے پابند تھے یہاں تک کہ بادشاہ کو بھی خاطر میں نہ لاتے[1]۔ لیکن اس واقعہ کے بعد قاضی صاحب نے شریعت کو چھوڑ کر طریقت کا راستہ اختیار کیا اور حضرت شاہیہ کے ارادت مندوں کے حلقہ میں منسلک ہوگئے[2]۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ مقبول بارگاہ ہوگئے اور بعد میں شرف خلافت بھی حاصل کیا۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ قاضی صاحب نے کب وفات پائی۔ خزینۃ الاصفیاء کا مصنف قاضی صاحب کا سن وفات ۹۱۱ھ بتلاتا ہے[3]۔"

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا کہ جمعات کا مولف قاضی نجم الدین کو بنبانی بتاتا ہے۔ بنبانیوں کی اصل کے متعلق جمعات کا مؤلف لکھتا ہے "و این خانہ زاد (سیّد محمّد) گوید بنبان ولایتست مابین خراسان و ملتان و ایں جماعت کہ در ملک گجرات[4] بہ بنبانیان مشہور اند از آنجا آمدہ اند و ایشان از آل حضرتِ عبد اللہ بن عباس اند[5]۔" اس عبارت میں بنبانیوں کو حضرت عبد اللہ بن عبّاس کی آل سے بتایا گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بنبانی حضرات خود کو عبّاسی بھی کہتے ہیں۔

اکثر و بیشتر بنبانی حضرات شاہ عالم کے جدّ امجد حضرت مخدوم جہانیاں جہاںگشت کے مرید تھے جمعہ کے روز آستانہ شاہیہ پر حاضر ہونے والے ارادت مندوں میں بنبانیوں کا بھی ایک گروہ ہوتا چنانچہ جمعات شاہیہ میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہے "دیگی از قبلہ بنبانیاں ارزانی داشتند و فرمان شد کہ بنبانیان اکثر مرید سلسلہ حضرت سیّد الاقطاب مخدوم جہانیاں علیہ الرضوان اند و اوایل و اواخر ایشان مقبول اند[6]"

اس جلیل القدر علمی خانوادے نے بہت سے محدثین، علماء اور صلحاء پیدا کئے اور افتا و قضا کے مناصب پشتوں تک اس خاندان میں رہے۔ اس خانوادہ کے باکمال وزراء نے نہ صرف انتظام ملکی میں نام پیدا کیا بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی علماء کی قدر دانی اور صوفیاء سے عقیدت مندی اور سب سے بڑھ کر اپنے ذاتی کمالات کے درخشاں نقوش تاریخ کے صفحات پر چھوڑے ہیں۔ چنانچہ جمعات شاہیہ کا مؤلف لکھتا ہے "و بسیاری از علماء و صلحاء و ارباب تصنیف و اصحاب حدیث درمیان خانوادہ ایشان بودہ و بتوجہ شاہی خواہد بود کہ بزبان مبارک فرمودہ اند کہ اوایل و اواخر ایشان

[1] مرآت سکندری ص ۱۱۱ [2] ایضاً ص ۱۱۱ [3] خزینۃ الاصفیاء ص ۸۷ [4-5] جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۱۷ [6] ایضاً جمعہ ۱۷۔

اس خانوادہ کے علماء اور اتقیاء کی فہرست میں شیخ صدر الدین، شیخ منہاج الدین شیخ فیض اللہ، مولانا عبد الملک، مولانا عبد اللطیف، مولانا خلیل محمد وغیرہ کے نام نمایاں نظر آتے ہیں شیخ فیض اللہ بن زین العابدین بنبانی نے اپنی مجمع النوادر میں اس خانوادہ کے حالات کسی قدر تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ پروفیسر محمد اقبال نے اس کتاب پر ایک ناقدانہ مقالہ سپرد قلم کیا تھا جو لاہور کے مشہور اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہو چکا ہے۔[۵۲] ڈاکٹر باقر علی ترمذی مرحوم کا ایک مقالہ مولانا عبد الملک بنبانی (محدث) پر مجلہ معارف میں چھپ چکا ہے۔[۵۳] سید محمد کے زمانہ میں اس خانوادہ کے ایک صوفی بزرگ ملک حسین بقید حیات تھے چنانچہ سید محمد لکھتے ہیں "امروز لقادہ ایشان صاحب ا مجذبہ وسلوک مرشدی ملک حسین الزینبی النقطی الشاہی است۔[۵۴]"

ہمیں سخت افسوس ہے کہ اس باکمال خانوادہ کے حالات آج تک پردۂ تاریکی میں ہیں ممکن ہے محققین کی مساعی اس خاندان کی علمی، ادبی اور ملکی خدمات منصۂ ظہور پر لے آئیں۔

شعراء

دربار شاہیہ میں حاضر ہونے والے عقیدتمندوں میں صوفیہ، قراء، طلباء اور علماء کے علاوہ شعراء بھی پائے جاتے تھے۔ یہاں پر یہ لکھ دینا نہایت ہی ضروری ہے کہ حضرت شاہیہ کو شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ آپ اپنی مدح میں قصیدے سننا پسند نہ کرتے ایک مرتبہ ایک شاعر نے قصیدہ پڑھا تو آپ نے فرمایا "خیر الکلام بخوانید یعنی تفسیر و حدیث[۵۵]" آنحضرتؐ کی مدح میں اگر کوئی قصیدہ ہوتا تو سماعت فرماتے اور مداح کو شاہانہ انعام عطا کرتے۔ ایک مرتبہ مولانا صدر الدین نے ایک نعتیہ قصیدہ پڑھا تو آپ نے اپنا جامہ اُتار کر قصیدہ گو کو پہنا دیا۔[۵۶] بعض مرتبہ لوگ آپ کی تعریف میں اشعار رباعیات اور قصائد کہہ کر لاتے آپ کو یہ چیزیں پسند نہ تھیں تاہم حفظ خاطر کے لئے سماعت فرماتے چنانچہ جمعات کا مؤلف لکھتا ہے "درین اثنا شاعرے قصیدہ مدح

---

۵۱ جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۱۷۔ ۵۲ اورینٹل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۳۹ء۔
۵۳ معارف بابت اکتوبر ۱۹۵۱ء ۵۴ جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۱۷۔ ۵۵ جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۱۴۔ ۵۶ ایضاً جمعہ ۶۔

گذرانند بظاہر برای حفظ خاطر او استماع می نمودند و بباطن ہمس می فرمودند ہرآنچہ می فرمودند و مذکور شد پیش فقیر صادق مدح و ذم ورد وقبول خلق یکسانست[له]

دربار شاہیہ سے وابستہ شعراء کی فہرست میں ہمیں یہ نام نمایاں نظر آتے ہیں (۱) حسینی (۲) مولانا صدر الدین (۳) خوا المند والی (۴) حسین (۵) اللہ دیا المعروف بہ شرف جہاں۔

سید جعفر بدر عالم نے اپنی صد حکایت میں اللہ دیا کا ایک فارسی قصیدہ نقل کیا ہے جو انھوں نے حضرت شاہیہ کی مدح میں کہا تھا۔ اس قصیدے کے چند اشعار ہم یہاں پیش کرتے ہیں ؎

جانم فدات باد کہ از جاں نکوتری — تنہا ترا رسد زہمہ خلق برتری
شاہ و گدا بحضرت عالی برابرند — کز قہر و لطف بخشد فقر و تونگری
ای دل صورچہ بینی معنی بہ بیں بیا — بگذر زاسم تا بہ مسماش پی بری
شاہ محمد ابو ختم ولایت است — ہم چو بذات جد تو ختم پیمبری
آن خسرو شجاع کہ آمد چو جد خویش — بی مثل و بے نظیر بملک دلاوری[سه]

دربار شاہیہ سے وابستہ شعراء کی فہرست میں فارسی کے علاوہ ہندی کے شاعروں کے نام بھی نظر آتے ہیں اس سلسلہ میں مبارک بن کالو اور سلطان قطب الدین کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مبارک بن کالو گجرات کے امراء زادوں میں سے تھا اور ہندی میں شعر کہتا تھا چنانچہ جمعات کا مؤلف لکھتا ہے " بعد از افادہ ایں فواید می خواستند درخلوت شوند کہ مبارک بن کالو ازامراء زادہای وقت بعرض رسانید کہ شعر ہندی کہ در زبان گجراتی آنرا جکری گویند گفتہ ام می خواہم بخدمت بگذارم توقف نمودہ آں را استماع فرمودند[سه]"

گذشتہ قسط میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ سلطان قطب الدین کو اپنی سلطنت کے ابتدائی ایام میں حضرت شاہیہ سے بے حد عقیدت تھی لیکن بعد میں چند اسباب کی بناء پر آپس میں رنجش ہو گئی تھی۔ جمعات میں ہمیں سلطان قطب الدین کے ہندی اشعار ملتے ہیں جو اسنے حضرت شاہیہ کی مدح میں کہے تھے۔ چنانچہ جمعات کا مؤلف لکھتا ہے " سلطان قطب الدین

له جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۲۳۔ سه صد حکایت حکایت نمبر ۸۱۔ سه جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۳۰۔

طاب اللہ ثراہ اشعار ہندی در مدح آنحضرت دارد[۱]، ہم ذیل میں سلطان کا ایک ہندی شعر نقل کرتے ہیں ؎

منجھن شاہِ جہانیاں جس دیتا سجان   شاہوں کیرا شاہ تون دونہ جل تیری آن

اس شعر سے سلطان کی عقیدتمندی کے علاوہ نویں صدی ہجری کے منتصف قرن اخیر کی ہندی شاعری کے رجحانات کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱؎ جمعات شاہیہ جلد پنجم جمعہ ۲۴

نوائے ادب کے پرانے پرچے

خصوصاً جلد اوّل کے مطلوب ہیں

جن حضرات کے پاس ہوں براہ کرم

ہمیں مطلع کریں

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲، دادا بھائی نوروزجی روڈ بمبئی ۲

رونق بنارسی

(از جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نامی - ایم اے - بی ٹی - پی ایچ ڈی)

محمود میاں رونق بنارسی خورشید جی مہروان جی بالیوالا کی "پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی" میں ملازم تھے۔ خورشید جی بالیوالا کے بھانجے دوراب جی دھنجی شاہ کھراس جو کمپنی مذکور میں منیجر تھے بقید حیات ہیں وہ رونق کے متعلق فرماتے ہیں۔

"ان کا نام شیخ محمود احمد۔ تخلص رونق اور ان کے آبا و اجداد کا وطن بنارس تھا۔ انھوں نے اکسٹھ سال کی عمر میں ۲۵ اپریل ۱۸۸۶ء مطابق ۱۹ رجب المرجب ۱۳۰۳ھ کو بمبئی میں انتقال کیا۔ اس طرح وہ کم و بیش ۱۸۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ رونق کی عمر اٹھارہ سال کی تھی کہ ان کے والدین کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا اور وہ اپنی نانی کے ہمراہ دکن سے جہاں اُن کے آباء و اجداد نے عارضی بود و باش اختیار کر لی تھی شمالی ہند کی طرف روانہ ہوئے۔ چندے ناگپور میں قیام کیا۔ اس کے بعد بمبئی آ گئے۔ اور قدیم گورنمنٹ ہاؤس واقع پریل کی ایک کاٹن مل میں ملازم ہو گئے۔ کچھ ذاتی شوق اور کچھ نئے ماحول نے نوجوان محمود کو مجبور کیا کہ وہ محلّہ کی ایک مکتب میں قرآن شریف۔ اردو اور فارسی پڑھیں۔ محمود کی علمی ترقی کے ساتھ ان کی ملازمت بھی مستقل ہو گئی اور وہ آہستہ آہستہ جابر بن گئے لیکن شعر و شاعری کے چسکے اور پلے ہاؤس کے چکروں نے ان کی دنیا ہی بدل دی اور ان کا رجحان تھیٹر کی طرف ہو گیا۔"

کھراس سے بھی چند باتیں معلوم ہوئیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) کمپنی کے رجسٹروں میں ان کا نام شیخ محمود احمد درج ہے۔ ان کا نام شیخ محمود اور ان کے والد کا نام شیخ احمد تھا۔ دکن میں عام قاعدہ ہے کہ کسی شخص کے نام کے ساتھ اس کے باپ کا نام بھی لکھا جاتا ہے۔ اس لیے ان کا نام، رجسٹروں میں، شیخ محمود احمد لکھا گیا۔

(۲) "میاں" کا لفظ اضافی ہے۔ پارسی عموماً مسلمانوں کو "میاں" کہتے ہیں خاص کر معمر افراد کو۔ رونق کی عمر۔ ان کا لباس۔ ان کی چوگوشیہ ٹوپی۔ درمیانہ قد۔ گٹھا ہوا بدن۔ گول ڈاڑھی۔ تعجب نہیں کہ وہ اسی لئے "محمود میاں" کہلائے ہوں لیکن کم و بیش تین گھنٹے کی مسلسل گفتگو میں داراب شاہ کھراس نے رونق بنارسی کو ایک بار بھی "محمود میاں" نہیں کہا بلکہ "ماموو" ہی کہتے رہے۔

(۳) ان کے ایک ڈرامہ سیف سلیمانی عرف معصوم معصومہ کے سرِ ورق پر یہ عبارت درج ہے "محمود خاں صاحب رونق۔ احمد آباد۔ ضلع دکن۔ ۱۸۸۸ء" اس سے بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیے کہ وہ احمد آباد کے رہنے والے تھے یہ غلط فہمی کہ اس کے مندرجۂ بالا بیان سے دُور ہو گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ وہ دکن میں پیدا ہوئے۔ ممکن ہے کہ دکن میں بھی کوئی احمد آباد ہو۔ ان کے احمد آبادی (گجراتی) نہ ہونے کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کی تصانیف میں بکثرت دکنی الفاظ ملتے ہیں۔

چونکہ ابھی تک اردو تھیٹر کی تاریخ مرتب نہیں ہوئی ہے اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اور بیان کرنے سے پہلے ہندستانی تھیٹر کا پس منظر بیان کر دیا جائے۔

انگریزی تھیٹر

۲۳ جون ۱۶۶۱ء کو چارلس دوم شاہ برطانیہ اور الفانسو ششم شاہ پرتگال کے درمیان "میرج ٹریٹی" انجام پذیر ہوئی جس کی دفعہ گیارہ کے رو سے شاہ چارلس دوم کی شادی شاہزادی کیتھرائن برگنزا آف پرتگال سے قرار پائی۔ شاہ پرتگال نے کیتھرائن کے جہیز میں بمبئی کا علاقہ دیدیا اور اس طرح بمبئی شاہ برطانیہ کی ملک بنا۔[۱]

بمبئی کی قدیم تاریخیں یہ بتلانے سے معذور ہیں کہ انگریزوں نے مشرق میں کس جگہ پہلے اپنا تھیٹر قائم کیا۔ جیمس ڈوگلس کی تاریخ "بمبئی اینڈ ویسٹرن انڈیا" کے صفحہ ۱۷۱ کی ایک تصویر کی عبارت "بمبئی گرین چرچ اینڈ تھیٹر اباؤٹ ۱۷۵۰ء"[۲] سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں بمبئی میں ایک تھیٹر موجود تھا جو ۱۸۳۵ء تک قائم رہا۔

اس تھیٹر کے مسمار ہو جانے کے بعد جب ایک دوسرے تھیٹر کی تعمیر کا سوال پیدا ہوا تو ہنری فاکٹ نے "بمبئی تھیٹر" کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ تھیٹر ۱۸۶۷ء میں چندہ

---

۱ Proceedings of the Geographical Society Report on the Landed Tenure of Bombay by J. Warden Esq _ communicated by Major J. W. Jervis.

۲ James Douglas. Bombay & Western India. Vol. I.

سے تعمیر ہوا تھا[۵۱]۔ چنانچہ چندہ جمع ہوا اور "بمبئی تھیٹر" قدیم کی بجائے "بمبئی تھیٹر" جدید ۱۸۴۵ء میں تعمیر ہوا۔ یہ تھیٹر چونکہ گرانٹ روڈ پر واقع تھا اس لئے گرانٹ روڈ تھیٹر کے نام سے مشہور ہوا۔ اس تھیٹر کے اور بھی نام تھے مثلاً رائل تھیٹر۔ وکٹوریہ تھیٹر۔ ہاؤنٹے والا تھیٹر۔ جگناتھ تھیٹر وغیرہ۔ اس میں انگریزی تماشے ہوتے تھے۔

اُردو تھیٹر

گرانٹ روڈ تھیٹر میں جو ابھی تک انگریزی ڈراموں کے لئے وقف تھا پہلی مرتبہ ایک ہندستانی کمپنی بنام "ہندو ڈرامیٹک کور" نے ایک مراٹھی ڈرامہ جو رامائن سے ماخوذ تھا ۹ مارچ ۱۸۵۳ء کو اسٹیج کیا، یہ تماشہ چونکہ پہلی بار ایک ملکی زبان میں اہل ملک کے لئے اسٹیج ہوا تھا اس لئے بہت مقبول ہوا۔ کمپنی مذکور نے نو مرہٹی ڈرامے اس تھیٹر میں اسٹیج کئے۔ اس کے بعد دسواں تماشہ ۲۶ نومبر اور گیارھواں ۳ دسمبر ۱۸۵۳ء کو ہندستانی زبان میں دکھلایا[۵۲]۔ دونوں بار "گوپی چند اور جلندھر" دکھلایا گیا۔ ہندو ڈرامیٹک کور کی یہ عوام تک پہنچنے کی پہلی کوشش تھی جو کافی مقبول ہوئی اس تماشہ کا خلاصہ شنبہ ۳ دسمبر ۱۸۵۳ء ٹیلی گراف اینڈ کوریر میں شائع ہوا۔ اس کور نے ۱۸۵۴ء میں صرف ایک ہی تماشہ ہندستانی میں دکھلایا۔ یہ وہی راجہ گوپی چند اور جلندھر تھا جو ۶ جون کو پیش کیا گیا۔

مرہٹوں کے میدان اسٹیج میں آنے کے بعد یہ کیونکر ممکن تھا کہ پارسی خاموش رہتے! ان کا پہلا اعلان شنبہ یکم اکتوبر ۱۸۵۳ء کو بمبئی گزٹ میں شائع ہوا جس میں انھوں نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ عنقریب تماشے دکھلانے والے ہیں۔ چنانچہ تین گجراتی تماشے یکے بعد دیگرے دکھلانے کے بعد پارسی ڈرامیٹک کور نے مندرجۂ ذیل چار تماشے ہندوستانی میں دکھلائے۔

۱۔ پیدائش سیاوکس حصہ اوّل — ۶ مئی ۱۸۵۴ء
۲۔ " " حصہ دوم — ۲۰ مئی ۱۸۵۴ء
۳۔ حاجی میاں ۔ فضل اور کلال خانہ — ۳ جون ۱۸۵۴ء
۴۔ پٹھان سرفراز اور گل۔ علاءالدین اور باتو ترلیقا — ۱۷ ستمبر ۱۸۵۴ء

---

۵۱ Bombay Gazette
Tuesday. January 4, 1842.

۵۲ Telegraph and Courier,
Thursday, November 24, 1853

ہندستانی زبان میں ڈرامے دکھلانے کا سلسلہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا رہا۔ پارسی آگے بڑھتے گئے۔ مرہٹے پیچھے ہٹتے گئے۔ کچھ عرصہ بعد پارسی کمپنیاں پیشہ ور ناٹک منڈلیاں بن گئیں اور صرف ہندستانی (اُردوٗ) میں تماشے دکھلانے لگیں۔

ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا ہے کہ یہ ابتدائی اُردوٗ ڈرامے کن لوگوں نے لکھے۔ ڈاکٹر پٹیل کا بیان ہے کہ "۱۸۶۱ء میں انتیس پارسی کمپنیاں مقابلہ میں زندہ تھیں" ان میں سے بیشتر کمپنیاں اُردو ڈرامے دکھلاتی تھیں۔

۱۸۷۱ء میں دادا بھائی پٹیل کی پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی نے "خورشید" نامی ڈرامہ ایدلجی کھوری سے گجراتی میں لکھوا کر اور سیٹھ بہرام جی مہروان جی آرام سے اس کا ترجمہ اردو میں کرا کر بمبئی تھیٹر گرانٹ روڈ میں اسٹیج کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دادا بھائی پٹیل اور کنور جی ناظر مالک الفنسٹن ڈرامیٹک منڈلی کی مشترکہ کوششوں سے "نورجہاں" اسٹیج ہوا۔ ایدل جی کھوری نے یہ ڈرامہ بھی گجراتی میں لکھا تھا اور خاں صاحب نسروان جی مہروان جی آرام نے جو پارسی وکٹوریہ کے اداکار تھے اُردوٗ میں ترجمہ کیا تھا۔

آرام اُردوٗ کے قدیم ترین ڈراما نویس تھے۔ انھوں نے مندرجۂ ذیل منظوم اور نثور ڈرامے اردوٗ میں لکھے ہیں:۔

نثر میں (۱) باغ وبہار (۲) عالم گیر (سمبسلین) (۳) گوپی چند (۴) حاتم طائی (۵) گل باصنوبر چہ کرد (۶) جوان بخت (مرچنٹ آف وینس) (۷) گل بکاؤلی۔

نظم میں (۱) بے نظیر بدر منیر (۲) جہانگیر شاہ گوہر (۳) چھل بٹاؤ موہنا رانی۔ (۴) شکنتلا (۵) پدماوت اور (۶) لیلیٰ مجنوں۔

اُردوٗ ڈراما نویسوں میں آرام کے بعد اختر کا نام نظر آتا ہے لیکن اس سے زیادہ ان کے متعلق اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ چھل بٹاؤ موہنا رانی (مصنفۂ آرام) میں ایک جگہ ان کا تخلص آتا ہے۔

اختر وہ ہیں، دیکھ یہاں آرام سے بیٹھے
کہیں گے کہ گھر سے ہوں گے وہ بوستان میں تارے

ڈاکٹر پٹیل مصنف "تاریخ پارسی ناٹک" کا خیال ہے کہ اردوٗ کے ابتدائی

۱۸۶۱ء تاریخ پارسی ناٹک (بزبان گجراتی)، مصنفۂ ڈاکٹر دھنجی بھائی نسروان جی پٹیل۔

ڈرامے سوفی صدی پارسیوں نے لکھے یا لکھوائے۔ وہ ۱۸۸۰ء کے قبل کے جملہ اردو ڈراموں کو پارسیوں کی تصنیف سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی تصنیف میں صرف ایک جگہ ایک غیر پارسی کا ذکر کرتے ہیں اور وہ ہے "منشی رونق" جس کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس نے پارسیوں کے لکھے ہوئے ڈراموں پر اپنا نام چھپواکر قدیم مصنفین کا نام و نشان مٹادیا۔

آردیشر دادا بھائی ٹھونٹھی نے جن کے والد دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی پارسیوں کی ایک بہت ہی پرانی کمپنی "دی پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی" کے سینیر پارٹنر تھے، اور جو اپنے وقت کے سب سے بڑے اداکار سمجھے جاتے تھے اور جن کے مقابلے میں خورشید جی بالیوالا اور جمشید جی میڈن ایک طفل مکتب کی حیثیت رکھتے تھے ۱۹۴۳ء میں فرماتے تھے کہ "منسی رونق نے ہماری اور دوسری کمپنیوں کے ڈرامے از سر نو لکھ کر اپنے نام سے چھپوائے تھے۔"

مجھے منشی رونق کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں خورشید جی بالیوالا کی ڈائریز دیکھنے اور ان کی عبارت پڑھوا کر سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں تک میں گجراتی عبارت سے مطلب اخذ کرسکا ہوں خورشید بالیوالا کا نظریہ بھی ان کے متعلق وہی تھا جو اوّل دو پارسی حضرات کا۔

منشی رونق کمپنی میں ملازم تھے اور ڈائرکٹر کمپنی ــــ دادا بھائی رتن جی ٹھونٹھی کے حکم سے ڈراموں میں ردّ و بدل کرتے تھے۔ اغلب ہے کہ اسی دوران میں یا دادا بھائی ٹھونٹھی کی کمپنی سے علیحدگی کے بعد انھوں نے کاپی رائٹ سے بچنے کے لئے پارسی وکٹوریہ اور دوسری کمپنیوں کے ڈرامے اپنے نام سے چھپوا دیئے ہوں ان کی تصنیف اور تالیف کی طباعت کا کل زمانہ صرف پانچ سال ہے یعنی ۱۸۷۹ء سے ۱۸۸۳ء تک۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوسکا ہے پارسی وکٹوریہ نے سوائے ایک ڈرامہ "خورشید" کے اور کوئی ڈرامہ اپنی طرف سے شائع نہیں کیا۔ یہ ڈراما بھی گجراتی رسم الخط میں ہے۔ کمپنی نے البتہ گجراتی کے کئی ڈرامے شائع کئے۔

تصانیف

مندرجۂ ذیل ڈرامے رونق بنارسی کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ رونق نے صرف پارسی وکٹوریہ ناٹک منڈلی میں ملازمت کی۔ اسی منڈلی میں وہ ایک اداکار کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور اسی کے اسٹیج پر وہ خودکشی کے

مرتکب ہوئے اور جان عزیز سے ہاتھ دھویا اس کمپنی کے پانچ مالک تھے (۱) دادا بھائی رتن جی ٹھوٹھی (۲) دھنجی بھائی خورشید جی گمڑیالی (۳) خورشید جی مہروان جی بالیوالا (۴) دوسا بھائی فریدون جی مغل اور فرام جی اپو اور اسی لئے یہ کمپنی "گروہے وکٹوریہ" کے نام سے مشہور تھی اور "جاگیرداروں کی کمپنی" بھی کہلاتی تھی۔ رونق بنارسی نے طالب بنارسی کی طرح اپنی پوری زندگی پارسی وکٹوریہ کی خدمت میں گذاردی اور کبھی کسی دوسری کمپنی کے لئے کوئی ڈراما نہیں لکھا البتہ بعض کمپنیوں نے ان کی زندگی ہی میں ان کے ڈرامے اپنے نام نام سے چھپوائے تھے اور یہ ڈرامے وہ اسٹیج بھی کرتی تھیں۔ اس زمانہ میں نہ لوگوں کو کاپی رائٹ کا خیال تھا اور نہ وہ "اس چوری اور سینہ زوری" پر عدالت کے دروازے کھٹکھٹاتے تھے جو تماشہ مقبول ہوتا تھا وہ عام طور پر کھیلا جانے لگتا تھا۔ کنور جی ناظر جو الفنسٹن ڈرامیٹک کلب کے مالک تھے اس کو اپنی بہترین کامیابی سمجھتے تھے کہ ان کے ڈرامے اسٹیج کرنا دوسروں کے لئے باعث فخر ہیں۔

رونق بنارسی کے ڈرامے

				تاریخ
۱	بے نظیر بدر منیر			۱۸۷۹ء
۲	لیلیٰ مجنوں			۱۸۷۹ء
۳	انجام الفت	عرف	ہمایوں ناصر	۱۸۸۰ء
۴	پورن بھگت			۱۸۸۰ء
۵	سیف سلیمان	عرف	معصوم معصومہ	۱۸۸۰ء
۶	ستم ہامان	عرف	فریب عزرائیل	۱۸۸۰ء
۷	عاشق کا خون	عرف	ہیر رانجھا	۱۸۸۰ء
۸	حاتم بن طے	عرف	افسر سخاوت	—
۹	طلسم زہرہ	عرف	رنج کا بدلہ گنج	۱۸۸۲ء
۱۰	فسانہ عجائب	عرف	جانِ عالم انجمن آرا	۱۸۸۲ء
۱۱	انصاف محمود شاہ غزنوی	عرف	اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے	—
۱۲	انصاف محمود شاہ	عرف	ظلم عمران	۱۸۸۲ء
۱۳	عاشق کا خون اور دامن پہ دھبہ			—
۱۴	عجائب پرستان	عرف	بہارستان عشق	۱۸۸۳ء

۱۵	ظلم اظلم	عرف	جیسا بونا ویسا پانا	۱۸۸۳ء
۱۶	خواب گاہ عشق	عرف	بیداد وحشت	۱۸۸۳ء
۱۷	خواب محبت	عرف	نادان کی دوستی جی کا جنجال	۱۸۸۳ء
۱۸	غرور رعد شاہ	عرف	چندا چور وخورشید نور	—
۱۹	سنگین بکاؤلی			—
۲۰	نقش سلیمانی	عرف	شدادی بہشت	— ۱۸۸۶ء
۲۱	فریب فتنہ	عرف	چاہت زر	—
۲۲	کالکا بھوگ	عرف	گھڑی کی گھڑیال	(کومک)
۲۳	نورالدین اور حسن افروز			(کومک)
۲۴	چمبیلی گلاب			(کومک)
۲۵	میاں پستو اور بیوی کھٹمل			(کومک)

بے نظیر بدر منیر

یہ منظوم ڈراما تین ڈراپ سین پر مشتمل ہے اور پہلی بار اگست ۱۸۷۹ء کو بمبئی میں اسٹیج ہوا[۵۹]۔ میری لائبریری میں اس منظوم ڈرامہ کا جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۰ء درج ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا بیجا نہ ہوگا کہ خان صاحب نسروان جی مہروان جی آرام نے ۱۸۷۲ء میں یہ ڈراما پارسی وکٹوریہ کے لئے لکھا تھا جو اسٹیج پر مقبول ہوا تھا۔ غالباً کمپنی نے اس ڈرامہ کو رونق سے ازسرنو لکھوایا یا اس میں تبدیلیاں کرائیں۔ آرام کا اوریجنل ڈراما اب تک مفقود ہے اور دادا بھائی پٹیل آر دیشر مٹھوٹھی۔ خورشید جی بالیوالا اور جمشید جی میڈن کی پرائیوٹ لائبریریوں میں بھی تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہ ہو سکا ممکن ہے کہ اس کا کوئی نسخہ میڈن کی لائبریری واقع کلکتہ میں موجود ہو۔

پلاٹ:۔ شاہزادہ بے نظیر اپنے باغ کی سیر میں مصروف ہوتا ہے کہ ماہرخ پری اسے اپنے چھپر کھٹ پر اڑا لے جاتی ہے۔ بادشاہ اور ملکہ اپنے اکلوتے بیٹے کی یاد میں رو رو کر پاگل ہوجاتے، اور خود اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔

ماہرخ پری شاہزادہ بے نظیر سے اظہار محبت کرتی اور اس کو سیر و تفریح کے لئے اپنا چھپر کھٹ دیتی ہے۔ بے نظیر ماہرخ کی محبت کو ٹھکرا کر تفریح کے لئے نکلتا اور

---

۵۹ فہرست برٹش میوزیم لائبریری۔

بدرمنیر کو مصروف گلگشت چمن دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا اور چھپر کھٹ کو نیچے اتار کر اس سے ملاقات کرتا ہے۔

ماہ رخ پری فریب دیو سے یہ حال سن کر پیچ و تاب کھاتی اور بے نظیر کو قید کرتی ہے دوسری طرف بدرمنیر شاہ زادہ کا انتظار کرتی اور بدقسمتی پر آنسو بہاتی ہے۔ وزیر زادی نجم النساء اپنی سہیلی کا یہ حال دیکھ کر شاہزادہ کی تلاش میں نکلتی اور شاہ اخیار سے مل کر بے نظیر کے لئے رہائی کی طالب ہوتی ہے۔ شاہ اس کی درخواست منظور کرتا ہے۔ نجم النساء کی درخواست پر وہ شاہزادہ کے والدین کو بھی طلب کرتا اور ان کی موجودگی میں عاشق و معشوق کے ہاتھ ملادیتا ہے۔

اس منظوم ڈرامہ میں دو جگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔ اس میں فارسی کی بھی دو غزلیں شامل ہیں۔ ایک غزل جس میں چار شعر ہیں بدرمنیر پڑھتی ہے جبکہ وہ پہلی بار شاہزادہ سے ملتی ہے۔ بے نظیر بھی اس کے جواب میں ایک فارسی غزل پڑھتا ہے جس میں چھ شعر ہیں۔ ان کے علاوہ مثنوی میرحسن کے آٹھ منتخبات بھی شامل ہیں۔ ظفر کی بھی ایک غزل ہے۔ ایک غزل کسی نامعلوم شاعر کی ہے۔

اندرونی سرورق پر تحریر ہے "یہ ناٹک ۱۸۶۷ء کے پچیسویں ایکٹ کے مطابق رجسٹر کیا گیا اور اس کے تمام حقوق وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے مالکوں مسرز خورشید جی بالیوالا جنجی بھائی خورشید جی گھڑیالی اور دوسا بھائی فریدوں جی مغل کے نام محفوظ ہیں۔ لہٰذا مذکورہ مالکوں کی اجازت کے بغیر کوئی بھی ناٹک کے کسی حصے کو چھاپنے یا اسٹیج کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

اسی ڈرامہ کو بعد میں حافظ محمد عبداللہ نے ازسرنو لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا اور اس کا نام "بے نظیر بدرمنیر عرف تماشائے دلپذیر" رکھا۔ تیغ محمد تیغ نے اصل نام کو بجنسہ قائم رکھا اور پورے ڈرامہ کو اپنے الفاظ میں لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔

(۲) لیلیٰ مجنوں

اس منظوم ڈرامہ پر ۱۸۷۹ء درج ہے[۵] اور اس میں لیلیٰ مجنوں کا مشہور قصہ تحریر ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈراما بھی آرام کے منظوم ڈرامہ لیلیٰ مجنوں سے ماخوذ ہے کیونکہ کئی سال قبل یہ ڈراما اسٹیج ہو چکا تھا۔

اس کے بعد حافظ محمد عبداللہ نے اس ڈرامہ کو "عشق لیلیٰ مجنوں عرف سوانح قیس مفتوں" کے نام سے ازسرنو لکھا۔ دل لکھنوی نے ۱۹۲۶ء، اور نشتر لکھنوی نے ۱۹۳۱ء میں اسٹیج کیلئے

---

۵ فہرست برٹش میوزیم لائبریری۔

لکھے جو مقبول ہوئے ریاض دہلوی اور صادق سردھنوی نے مطالعہ کے لئے قلمبند کئے۔

(۳) انجام الفت عرف ہمایوں ناصر

یہ منظوم ڈراما چار ڈراپ سین پر مشتمل ہے اور اس پر تاریخ ۱۸۸۱ء درج ہے۔[له]
یہ گجراتی رسم الخط میں ہے میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۸ء تحریر ہے اور دوسری بار شائع ہوا ہے۔

پلاٹ :- جہاندار شاہ والی حلب کا ولی عہد ہمایوں اور وزیر زادہ ناصر آپس میں ایک جان دو قالب ہیں۔ ہمایوں ناصر کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وزیر زادہ ناصر شاہزادی مہر نگار کا خواستگار ہے۔ شاہزادہ کی شادی بڑے تزک و احتشام سے ہوتی ہے لیکن وزیر زادی شاہی محل میں جانے کے بجائے ڈاکوؤں کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہو جاتی ہے جسے ڈاکو کوتوال تاتار کے ہاتھ دس ہزار میں فروخت کر دیتے ہیں۔

ہمایوں اور ناصر مہر افروز کی تلاش میں نکلتے اور بدقسمتی سے ان ہی ڈاکوؤں کے چنگل میں پھنس کر اسی کوتوال کے ہاتھ نو ہزار میں بک جاتے ہیں۔ کوتوال شاہزادہ کو اپنا مصاحب اور وزیر زادہ کو جیل خانہ کا داروغہ مقرر کر دیتا ہے۔

ہمایوں، ناصر اور مہر افروز آپس میں مشورہ کرتے اور راہ فرار اختیار کرتے ہیں۔ ناصر کی بھی شادی ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہمایوں اور ناصر شکار کھیلنے کے لئے جاتے ہیں۔ ہمایوں ایک خوبصورت دوشیزہ پر عاشق ہو جاتا اور اس کے لب لعلین کا بوسہ لینا چاہتا ہے کہ عورت برق رفتاری سے خنجر نکالتی اور مار کر مر جاتی ہے۔ ہمایوں کو پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کی بہن اور ناصر کی بیوی مہر انگیز تھی۔ ہمایوں بعد شرمندہ ہوتا اور خودکشی کر لیتا ہے۔ ناصر کو جب اس کا پتہ چلتا ہے تو وہ بھی ایک خنجر آبدار سے اپنی حیات مستعار ختم کر لیتا ہے۔

اس منظوم ڈرامہ کو غلام حسین ظریف اور فقیر محمد تیغ نے از سر نو لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔

(۴) پورن بھگت

یہ منظوم ڈراما دو ایکٹ اور تیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس پر تاریخ ۱۸۸۰ء درج ہے۔ اس میں پورن بھگت کا مشہور قصہ بیان کیا گیا ہے۔[تله]

اگرچہ "پورن" کا پلاٹ مقبول عام ہے پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ محمد عبداللہ

له و تله فہرست برٹش میوزیم لائبریری۔

غلام حسین ظریف اور مولوی بخش الٰہی نامی نے رونق کے منظوم ڈرامے سے اس کو از سر نو لکھ کر اپنے نام سے چھپوایا۔ جگناتھ شرما نے جو "پورن بھگت" لکھا ہے وہ نثر میں ہے اور علمی حیثیت سے ایک اچھی چیز ہے۔

(۵) سیف السلیمان عرف معصوم معصومہ

یہ منظوم ڈراما تین ایکٹ پر مشتمل ہے اور پہلی بار ۱۶ر اکتوبر ۱۸۸۰ء کو اسٹیج ہوا۔ اس پر ۱۸۸۰ء درج ہے۔ برٹش میوزیم لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر بھی ۱۸۸۰ء درج ہے۔

پلاٹ:۔ زبیدہ اپنے بدخصلت اور کام چور شوہر صادق سے افلاس کی شکایت کرتی ہے۔ شیطان صادق کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھاکر کثیر دولت کے عوض اس کی روح خرید لیتا ہے۔ زبیدہ گھر بار چھوڑکر اور اپنی اولاد سے منہ موڑ کر گھر سے باہر نکلتی اور تاریکی میں غائب ہو جاتی ہے۔

خوش قسمتی سے اُسی وقت خوش سیر (والیٔ تاراتگر) اپنے فرزند غلمان رو کے ہمراہ اُدھر ٹہلتا ہوا آنکلتا اور معصوم کی آواز سن کر اور اس کو بے یار و مددگار سمجھ کر اپنے ہمراہ لے جاتا ہے۔

صادق اور اس کا غلام پاگل خان شیطان کی بخشی ہوئی دولت سے خوب عیش کرتے ہیں۔ شیطان پاگل خان کو حکم دیتا ہے کہ وہ معصوم کا باپ بن کر خوش سیر کے یہاں جائے اور معصومہ کو اپنے ہمراہ لے آئے چنانچہ پاگل خان خوش سیر کے پاس جاتا اور معصومہ کو اپنے ہمراہ لے آتا ہے۔

خوش سیر کا بیٹا غلمان رو اپنی چچازاد بہن اور معشوقہ حور وش کے ہمراہ معصومہ کی تلاش میں نکلتا۔ راستہ میں ایک انگوٹھی پاتا اور (رہبرنیکی) آسمان پری کو اس کے دریافت کرنے پر دیدیتا ہے جس سے آسمان پری خوش ہوکر اس کو سیف سلیمانی انعام دیتی ہے۔

شیطان (جو انسانی صورت میں خناس کے نام سے مشہور ہے) صادق اور پاگل خان کو حکم دیتا ہے کہ وہ معصومہ کی گردن مروڑ کر اس کی زبان باہر کھینچ لیں۔ صادق اس کی زبان باہر کھینچتا اور پاگل خان کو خنجر چلانے کا حکم دیتا ہے کہ زبیدہ مردانہ لباس میں داخل ہوکر اپنی بیٹی کو بچالیتی ہے لیکن خود صادق کی بربریت کا نشانہ بن جاتی ہے۔

پاگل خاں معصومہ کو اپنی پیٹھ پر لادکر شیطانی قلعہ میں لے جاتا اور صادق اس کے پیٹ پر پیر رکھ کر اس کی زبان کاٹنا چاہتا ہے کہ غلمان رو سیف سلیمانی کا علم اُڑاتا ہوا

داخل ہوتا ہے۔ دونوں کو واصل جہنم کرتا اور اس کے طلسمی قلعہ کو درہم برہم کر دیتا ہے۔
خناس یہ دیکھ کر چراغ پا ہوتا اور اس کو اٹھا کر ایک گہری خندق میں پھینک دیتا ہے جہاں وہ گرتے ہی ریچھ بن جاتا ہے۔ حور وش مردانہ لباس میں آتی اور ریچھ کو دیکھ کر خوف کھاتی ہے کہ آسمان پری داخل ہوکر ریچھ کو پھر انسانی شکل میں لاتی ہے۔ سب ایک دوسرے کو زندگی اور مسرت کی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

حافظ محمد عبداللہ اور غلام حسین ظریف نے اس ڈرامہ کو اپنے الفاظ میں لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔ حکیم محمد یوسف مالک و مدیر نیرنگ خیال کے پاس اس منظوم ڈرامہ کا جو نسخہ ہے اس پر یہ عبارت درج ہے "سیف سلیمانی عرف مرحوم معصوم۔ مُصنّفہ میاں محمود خاں صاحب رونق احمد آباد ضلع دکن۔ مطبوعہ ۱۸۸۶ء"[۱] اس عبارت سے پروفیسر سید حسن صاحب نے یہ مطلب لیا ہے کہ رونق احمد آباد ضلع دکن کے رہنے والے تھے۔[۲]

ستم ہامان عرف فریب عزرائیل

یہ دو ایکٹ کا ایک مختصر منظوم ڈراما، اور اس پر ۱۸۸۰ء درج ہے[۳]۔ میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

پلاٹ:- ہامان یادِ الٰہی میں اپنی زندگی کے بہترین ایام صرف کرتا ہے۔ اس کی بیوی نادینہ اور بچے مظفر اور مہرنگار عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کرتے اور ہر وقت غربت و افلاس کا رونا روتے ہیں۔ ہامان اس چیخ پکار سے گھبرا کر جنگل چلا جاتا اور یاد الٰہی میں اپنا وقت صرف کرنا چاہتا ہے کہ شیطان اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا کرتا اور آخر میں کامیاب ہوکر اس کی سالہا سال کی محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔

شیطان اس کو بے حساب دولت دیتا اور اس کے عوض اس کی روح اس سے خرید لیتا ہے ہامان اپنی بیوی اور بچوں کو بھی اپنے راستہ پر ڈالنا چاہتا ہے لیکن وہ غربت اور افلاس کی زندگی ہی کو دولت و ثروت اور جاہ و حشم پر ترجیح دیتے ہیں۔

شیطان آہستہ آہستہ ہامان کو طرح طرح کی برائیوں میں پھنساتا ہے یہاں تک کہ ایام عروج پورے ہوتے ہیں اور شیطان فتح و نصرت کے ڈنکے بجاتا ہوا آتا اور اس کی روح کو لے کر بحر شعاع میں غائب ہو جاتا ہے۔

۱۔ نیرنگ خیال لاہور۔ جولائی ۱۹۳۲ء ص ۱۴۲　۲۔ محمود میاں رونق از پروفیسر سید حسن نوائے ادب بمبئی جولائی ۱۹۵۲ء　۳۔ فہرست برٹش میوزیم لائبریری۔

یہ دونوں ڈرامے (سیف السلیمان اور فریب عزرائیل) گوئٹے کے فاؤسٹ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حافظ محمد عبداللہ۔ غلام حسین ظریف۔ مولوی بخش الٰہی نامی اور کریم الدین کریم بریلوی نے اس ڈرامہ کو اپنے نام سے لکھ کر شائع کر دیا۔ کریم بریلوی نے اپنے ڈرامہ کا نام "گلستان خانہ ان ہامان" رکھا۔ یہ ڈراما ۱۸۸۵ء میں قلمبند ہوا اور دو سال تک مسلسل چلتا رہا۔

(۷) عاشق صادق عرف ہیر رانجھا

یہ چھتیس صفحات پر پھیلا ہوا منظوم ڈراما دو ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اس پر تاریخ ۱۸۸۸ء درج ہے[۱]، میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۶ء تحریر ہے اور سرورق پر لکھا ہوا ہے "تصنیف کیا مرحوم منشی محمود میاں متخلص بہ رونق" نے اور "دوبارہ چھاپ کے اظہار کیا واسطے خاص و عام کے"۔ اس میں ہیر رانجھا کا مشہور قصہ درج ہے اور رونق نے اس میں کافی کتر بیونت کی ہے۔

پلاٹ:- ہیر دختر چوچک (گوجر) رانجھا کو خواب میں دیکھتی اور اس پر عاشق ہو جاتی ہے۔ رانجھا بھی اس کو خواب میں دیکھتا اور دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے اور اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔ بڑی تلاش کے بعد وہ چرواہے کے لباس میں ہیر سے ملتا اور ہیر اسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیتی ہے۔

ہیر کے منگیتر شیدا کو اس کا پتہ چل جاتا ہے اور ایک دن جبکہ عاشق و معشوق دنیا جہان سے بے نیاز محو اختلاط تھے وہ چوچک (ہیر کے باپ) کو ان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ چوچک اسی وقت ہیر کو گھر سے باہر نکال دیتا اور ہیر کی شادی شیدا سے کر دیتا ہے ہیر اس صدمہ کی تاب نہ لاکر بیمار پڑ جاتی ہے۔ رانجھا اسے دیکھنے کے لئے آتا اور اپنے ہمراہ لیکر فرار ہو جاتا ہے۔ شیدا سایہ کی طرح ان کا پیچھا کرتا ہے اور ایک سرائے میں وہ رانجھا کو زہر پلا دیتا ہے۔ ہیر اپنے شوہر کو ایک بڈھے ملازم کے لباس میں پہچان لیتی اور ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر کے اپنے بھی خنجر بھونک لیتی ہے۔

اس منظوم ڈرامہ میں رانجھا فارسی کی دو غزلیں گاتا ہے۔ ایک غزل میں پانچ شعر ہیں اور دوسری میں چھ۔ ڈرامہ میں تین جگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔

---

[۱] فہرست برٹش میوزیم لائبریری۔

حافظ محمد عبداللہ اور عبدالعزیز نے اس پلاٹ کو اپنے رنگ میں رنگ کر اپنے نام سے شائع کیا۔

(۸) حاتم بن طے عرف افسر سخاوت

یہ منظوم ڈراما دو ایکٹ پر مشتمل ہے۔ میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ رونق نے اس ڈرامہ میں حاتم طائی کی دریا دلی پیش کی ہے۔ ڈرامہ میں چھ جگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔ اس ڈرامہ کی ایک کاپی پروفیسر سید حسن (پٹنہ) کی لائبریری میں بخط گجراتی موجود ہے۔ اس پر بھی کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

حاتم طائی کا موضوع بہت ہی فرسودہ ہے۔ سیکڑوں قصّے کہانیوں کے علاوہ آرام اور منظر بریلوی نے "حاتم طائی" کے نام سے اور عبداللہ فتحپوری نے "سخاوت حاتم طائی" کے نام سے ڈرامے لکھے ہیں۔

(۹) طلسم زہرہ عرف رنج کا بدلہ گنج

یہ منظوم ڈراما تین ڈراپ پر مشتمل ہے۔ میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۳ء درج۔ یہ ڈراما یکم اگست کو پیش ہوا۔

پلاٹ :۔ شاہزادہ بدخشاں مہر طلعت نام عورتوں کے نام سے نفرت کرتا ہے وہ ایک رات سلطان قیموس شاہ کی دختر زہرہ پری کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اسی وقت ایک بزرگ نمودار ہوکر اس سے کہتے ہیں کہ اگر صاحب عزو شان اور صاحب اولاد بننا ہے تو اٹھ اور اس پری سے شادی کر۔ راہ میں جو دشواریاں پیش آئیں اس آئینہ کی امداد سے ان کا مقابلہ کر۔ شاہزادہ بیدار ہوکر آئینہ کو اپنے قریب دیکھتا اور خواب کو ایک حکم سمجھ کر زہرہ پری کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے۔

دوسری طرف ایک پری شاہزادہ مہر طلعت کی ایک تصویر زہرہ پری کو دکھاتی ہے۔ جسے وہ دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو جاتی ہے۔ مہر طلعت مصائب جھیلتا زہرہ کے طلسماتی حلقہ تک پہنچ جاتا ہے۔ قیموس شاہ زہرہ کی شادی شاہزادہ مہر طلعت سے کر دیتا ہے۔

اس ڈرامہ میں ایک جگہ بھی "رونق" تخلص نہیں آیا ہے۔ اس میں نثر کا ایک جملہ استعمال ہوا ہے۔ "دیوی ٹھہرے۔ آپ کے واسطے میں بہت سا مزے دار پکوان حاضر کرتی ہوں۔" ڈراپ سین دوم۔ پردہ ششم۔ اس ڈرامہ کی ایک کاپی بخط گجراتی پروفیسر سید حسن (پٹنہ) کی لائبریری میں موجود ہے لیکن اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

(۱۰) فسانہ عجائب عرف جان عالم انجمن آرا

میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۲ء درج ہے۔ یہ منظوم ڈراما ۹ مارچ ۱۸۸۲ء کو پہلی بار اسٹیج ہوا۔

پلاٹ:- شاہزادہ جان عالم اپنے خواجہ سرا سے شاہزادی انجمن آرا کے حسن لاثانی کا حال سن کر نادیدہ عاشق ہو جاتا اور اس کی تلاش میں نکلتا ہے۔ راستہ میں ایک ساحرہ اس کے حسن و جمال کی پرستار بن جاتی ہے۔ شاہزادہ راہ فرار نہ پاکر اس کی دلجوئی کرتا ہے۔ ساحرہ اس کو اپنے باپ شہپال کی "سلیمانی تختی" بطور تحفۂ محبت پیش کرتی اور اس کی خصوصیات سے آگاہ کرتی ہے۔ شاہزادہ اُسی تختی کی امداد سے شہ پال کے طلسم کو توڑتا، شاہزادی انجمن آرا کو قید سے چھڑاتا اور اس کے والد "صاحبقران والئی ملک زرنگار" تک اس کو پہنچاتا ہے جو دونوں کی شادی کر دیتا ہے۔

اس میں "رونق" تخلص پانچ جگہ آیا ہے۔ شاہزادہ ساحرہ کے جال میں پھنس کر جو فارسی غزل گاتا ہے وہ پانچ اشعار پر مشتمل ہے۔ "جان عالم" ساحرہ سے "سلیمانی تختی" لینے کے بعد جب اس کے ایک ٹھوکر مارتا ہے تو وہ بھی فارسی بولنے لگتی ہے ؎

کس نہ آموخت علم تیر از من   کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

میری لائبریری میں فسانہ عجائب کا ایک اور بھی نسخہ ہے جس پر تاریخ ۱۸۹۶ء ہے اس میں نظم و نثر کا تناسب مساوی ہے کتاب پر نہ مصنف کا نام ہے اور نہ کسی پبلشر کا۔

عبداللہ فتحپوری نے اس منظوم ڈرامہ کو اسی نام سے اپنے الفاظ میں لکھا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے "فسانہ عجائب" کے نام سے ۱۸۸۸ء میں محمد نبی گوہر مراد آبادی نے "جان عالم و انجمن آرا" کے نام سے لکھا۔ پہلے دو ڈرامے اسٹیج کے لئے لکھے گئے اور آخر الذکر مطالعہ کیلئے۔

ان کے علاوہ طالب بنارسی نے بھی اس ڈرامہ کو "فسانہ عجائب اوپرا" کے نام سے اپنے دوران قیام کلکتہ میں "الفنسٹن ڈرامیٹک کلب بمبئی" کے لئے ۱۸۸۷ء میں قلمبند کیا۔ اس کے بعد دوبارہ "اس کے پلاٹ میں چند در چند تبدیلیاں کر کے اور زیادہ دلکش اور لطیف پیرایہ میں ترتیب دے کر وکٹوریہ ناٹک منڈلی کے لئے پیش کیا۔"

(۱۱) انصاف محمود شاہ غزنوی عرف اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

یہ منظوم ڈراما دو ایکٹ پر مشتمل ہے۔ اس پر ۱۸۸۲ء درج ہے۔ میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

یہ جان عالم و انجمن آرا کا منظوم حصہ ہے۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ تدنق نے ایک ہی پلاٹ دو ڈراموں کے لئے کیوں منتخب کیا۔ عرفیت سے صرف اس قدر مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ جان عالم۔ انجمن آرا اور مہر نگار کو ان کی نیکیوں کا انعام ملتا ہے اور ماہ طلعت میمونہ خصال اور شہپال کو ان کی برائیوں کی سزا ملتی ہے۔

عبداللہ فتح پوری نے اس کو اپنے الفاظ میں منظوم کیا اور "محمود شاہ" نام رکھا۔

انصاف محمود شاہ عرف ظلم عمران روسیہ (۱۲)

یہ منظوم ڈراما دو ایکٹ اور بیس سین پر مشتمل ہے۔ اس منظوم ڈرامہ کا سولھواں حصہ نثر میں ہے۔ برٹش میوزیم اور انڈیا ہاؤس کی لائبریریوں میں جو نسخے ہیں ان پر ۱۸۸۲ء درج ہے۔ میری لائبریری میں جو نسخہ ہے اس پر ۱۸۸۳ء تحریر ہے۔ سرورق پر "ظریف" کا نام درج ہے لیکن متن میں پانچ جگہ "رونق" تخلص آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل ڈرامہ رونق کا ہے لیکن ظریف نے صرف استادی کے دو چار ہاتھ دکھلائے ہیں اور ان کا یہ ایک شعر ہی بس

ناٹک ہم اے ظریف تراشے نئے نئے   قصے قدیم ہیں یہ تماشے نئے نئے

میرے پاس اس ڈرامہ کی ایک اور نقل بھی ہے۔ اس میں چار جگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے اور اس کے سرورق پر تحریر ہے ؎

کھیل محمود شاہ غزنوی کا   چھاپا اس کو بدل ظریف زار
رشک نوشیروان عادل ہے   جس کا خواہاں ہر ایک عاقل ہے

اس کے علاوہ تحریر ہے "المشتہر حسینی میاں متخلص بہ ظریف" اور تاریخ ار ذیقعدہ ۱۳۰۵ھ درج ہے یہ منظوم ڈراما اگرچہ "مہتا جمنا داس بھگوان داس" نے شائع کیا ہے لیکن پبلشر کی حیثیت سے اس کا نام کہیں درج نہیں ہے۔ سرورق پر صرف "در بمبئی سٹی پریس طبع شد" تحریر ہے صفحہ آخر پر ان کتب فروشوں کے نام تحریر ہیں جہاں سے یہ کتاب دستیاب ہو سکتی ہے ان ہی میں ایک نام مہتا جمنا داس بھگوان داس کا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ قانونی چارہ جوئیوں سے بچنے کیلئے کیا گیا۔

پلاٹ:۔ امیرالامراء اپنی وفات سے قبل اپنے معتمد اور نیک سیرت غلام عمران کو بلاکر اور اپنی کل جائداد اس کے سپرد کر کے وصیت کرتے ہیں کہ وہ وجیہ القمر (فرزند امیر) کے بالغ ہونے کے بعد اس کے سپرد کر دے۔

نیک سیرت غلام بے شمار دولت اور جواہر کثیر دیکھ کر اپنے ہوش و حواس

کھو بیٹھتا ہے۔ خوشامد پرست اس کے ایمان کو متزلزل کر دیتے ہیں وہ اپنے مرحوم آقا کی دولت اپنی عیش پرستی پر صرف کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وجہہ القمر کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے اس کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ عمران کی بیوی خیرن اور بیٹا غفران ہر ممکن طریقے سے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ سمجھنے کے بجائے ان کا دشمن جانی بن جاتا اور ایک دن حالت نشہ میں وہ غفران کو بتہ تیغ کر دیتا ہے۔ خیرن بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ سلطان محمود شاہ غزنوی اور ایاز خود اس معاملہ کی تحقیق کرتے ہیں۔ عمران پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ وجہہ القمر کی شادی وزیر حسن کی لڑکی شمس النساء سے ہو جاتی ہے۔

عبد اللہ فتحپوری نے اس منظوم ڈرامے کو "ظلم عمران مردود عرف عدل سلطان محمود" کے نام سے از سر نو لکھ کر اپنے نام سے شائع کیا۔

(۱۳) **عاشق کا خون دامن پہ دھبہ عرف دولت کا پیار۔ چاہت سے عار**

یہ منظوم ڈراما جو تین ڈراپ پر مشتمل ہے رونق کا آخری ڈراما سمجھا جاتا ہے۔ اس کی ایک کاپی میری لائبریری میں ہے اور دوسری بخط گجراتی پروفیسر سید حسن کے کتب خانہ میں دونوں پر تاریخ مفقود ہے۔ یہ غلط ہے کہ یہ رونق کا آخری ڈراما تھا۔ یہ بھی غلط ہے کہ یہ نامکمل ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس ڈرامہ میں رونق نے اسٹیج پر کام کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے اپنی گردن پر چھرا چلا لیا۔ یہ المیہ ڈراما رونق کی زندگی کا ہو بہو مرقع ہے۔

بائی منی بائی (خورشید جی بالیوالا کے بھانجے دوراب جی دھنجی شاہ کھرا کی بیوی) کا بیان ہے کہ رونق کی بیوی بہت ہی آوارہ اور بد چلن تھی اور بارہا تنبیہ کے باوجود اپنی شرمناک حرکتوں سے باز نہیں آتی تھی۔ رونق اس کو مارتے پیٹتے اور ہر طرح سے اس کو تنبیہ کرتے لیکن وہ ذرہ برابر پروا نہ کرتی۔ رونق نے، اتوار کی سہ پہر کو جبکہ عاشق کا خون۔ دامن پہ دھبہ اسٹیج ہو رہا تھا اپنے ہاتھ سے اپنی گردن استرے سے کاٹ لی۔ تماش بینوں نے پہلے اسے ایکٹنگ سمجھا لیکن جب ونگس سے اداکار دوڑ پڑے اور ہر طرف سے شور و غل بلند ہوا تو تماشائی گھبرائے اور بھاگنے لگے۔ فوراً ڈراپ ڈال دیا گیا۔ دوراب جی کو اطلاع بھیجی گئی۔ وہ پریشان حال آئے۔ کمپنی کی جانب سے کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔ اداکاروں کے علاوہ سیکڑوں تماشائیوں نے شرکت کی اور بڑے قبرستان میں ان کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

پلاٹ :۔ ایک دولت پرست حسینہ "مست ناز" ایک نوجوان مصور سے عشق کرتی اور کچھ عرصہ اس کی زندگی کے ساتھ کھیلنے کے بعد ایک ایسے شخص سے رشتہ الفت جوڑتی

ہے جو بہت دولت مند ہوتا ہے اور اس سے شادی کا وعدہ بھی کرلیتی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ دن تفریح کرنے کے بعد اس کی آنکھ ایک امیرکبیر سے لڑ جاتی ہے جو اس سے شادی کرلیتا ہے۔

اب مست ناز کو اپنی سابقہ زندگی میں سیکڑوں داغ نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ مصور سے اپنے خطوط طلب کرتی ہے اور اس کے انکار کی صورت میں اس کو قتل کرانا چاہتی ہے لیکن وہ بچ جاتا ہے۔ مست ناز خودکشی کرلیتی ہے۔

طالب بنارسی نے بہت ہی معمولی رد و بدل کے بعد اسے اپنے نام سے شائع کیا۔ اس کے سرورق پر تحریر ہے "مرحوم منشی محمود میاں متخلص بہ رونق کے لکھے ہوئے ناٹک سے نئی طرز پر منشی و نایک پرشاد طالب نے تصنیف کیا" سرورق پر یہ شعر درج ہے

جفا کی تیغ سے عاشق کا خون کرتے ہیں جو سیمتن ہیں فقط سیم و زر پہ مرتے ہیں

اور آخر میں "طالب" تحریر ہے۔ ممکن ہے کہ کاتب نے غلطی سے "طالب" لکھ دیا ہو کیونکہ "عاشق" رونق کا دوسرا تخلص تھا۔ اس پورے ڈرامہ میں نوجگہ "رونق" تخلص آیا ہے۔ طالب ایک بار بھی نہیں آیا۔ ظاہر ہے کہ طالب نے اس ڈرامہ میں سنگین بکاولی سے بھی کم رد و بدل کیا۔

(باقی)

افکار۔ سالنامہ ۵۴ء ۱۹

ادارہ۔ صہبا لکھنوی، طفیل احمد خاں

کتابت، طباعت، کاغذ بہتر ضخامت ۳۱۰ صفحات

ٹائیٹل: رنگیں و خوبصورت، قیمت: دو روپے آٹھ آنے۔

ناشر: مکتبہ افکار، ادبستان، عیدگاہ، بندر روڈ کراچی۔

پاکستان پہنچ کر بھی افکار نے اپنا مطمح نظر اور اسلوب و انداز نظر باقی ہی نہیں رکھا بلکہ اس میں اور حسن پیدا کیا ہے۔ ۳۴ و ۳۵ شماروں پر مشتمل اس کا یہ سالنامہ ۱۹۵۴ء خود اس بات کا شاہد ہے۔ اس میں اچھے تنقیدی مقالے بھی ہیں، اور دلکش طویل و مختصر نظمیں بھی، زندگی سے بھرپور غزلیں بھی ہیں اور بھڑکتے ہوئے قطعات رباعیات اور گیت بھی۔ اس کی افادیت کو بڑھانے کیلئے دلیس دیس کی کہانیوں اور نظموں کے ساتھ ساتھ اردو کے شاعروں اور ادیبوں کی تصویریں بھی شامل کردی گئی ہیں۔ مقالوں، افسانوں، طنزوں، نظموں، غزلوں اور ڈراموں وغیرہ میں اردو کے منجھے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش نئے لکھنے والے اور نئی لکھنے والیاں بھی ہیں جو شاندار مستقبل رکھتی ہیں۔ مجموعی طور پر سالنامہ بہت کامیاب ہے۔ موجودہ زمانہ میں اتنا ضخیم خوبصورت سالنامہ محض ڈھائی روپے میں نکال لینا افکار والوں ہی کے دل گردہ کا کام ہے۔ وہ ہر طرح ہماری مبارک باد کے مستحق ہیں۔

(ع۔ج)

حیاتِ اجمل

(از عبد الرزاق قریشی)

حکیم اجمل خاں مرحوم کی شخصیت بڑی حد تک جامع کمالات تھی۔ وہ ایک حاذق طبیب دور اندیش رہبر اور شریف النفس انسان تھے۔ کانگریس، مسلم لیگ، ندوۃ العلماء، جامعۂ ملیہ، طبیہ کالج وغیرہ کی جو خدمات انھوں نے انجام دیں انھیں ہماری قومی تاریخ کا مورّخ کبھی فراموش نہیں کر سکتا، یہ بات قابلِ افسوس ہی نہیں بلکہ شرمناک تھی کہ اتنے بڑے محسن ملک و قوم اور اتنے بلند مرتبہ انسان کی کوئی عمدہ سوانح عمری ہماری زبان میں نہ تھی۔ خوشی کی بات ہو کہ ہماری زبان کے مشہور انشا پرداز جناب قاضی عبد الغفار صاحب نے اس کمی کو پورا کیا۔ حیاتِ اجمل کی ترتیب و تالیف کے لئے قاضی صاحب سے زیادہ مناسب کوئی شخص ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ حکیم صاحب مرحوم کے انیس جلوت و خلوت رہ چکے ہیں۔ انھوں نے حکیم صاحب کے کارناموں کو صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھ مختلف تحریکوں میں حصّہ بھی لیا ہے اگرچہ ان کا دامن سیاسیات کے اس خارزار سے، جس سے دامن و گریبان چاک ہو جاتے ہیں، ہمیشہ محفوظ رہا۔

حیاتِ اجمل کا مسودہ تقریباً بیس سال پہلے تیار ہو گیا تھا۔ بقول مصنف "اس کتاب کی اشاعت کا سوال عرصہ تک ایسے اصحاب کے اختیار میں رہا جو یا تو اس کی اشاعت پسند ہی نہ کرتے تھے یا حکیم اجمل خاں مرحوم کی عظمت سے بے پروا ہو چکے تھے"[۱] قاضی صاحب کا یہ بیان قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اگر آثارِ جمال الدین افغانی کی اشاعت کا انتظام ہو سکتا تھا، آثارِ ابو الکلام آزاد کے لئے پبلشر مل سکتا تھا۔ لیلا کے خطوط چھپ سکتے تھے مجنوں کی ڈائری طبع ہو سکتی تھی تو حیاتِ اجمل کی طباعت و اشاعت کا انتظام کیوں نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا اربابِ جامعہ بھی اس کتاب کی اشاعت پسند نہ کرتے تھے۔ کہیں اس پردۂ تعویق میں کوئی معشوقِ زنگاری، نہ کام کرتا رہا ہو۔

حیاتِ اجمل کہنے کو تو حکیم اجمل خاں مرحوم کی سوانح عمری ہو، لیکن حقیقت یہ ہو کہ اس میں جدید ہندوستان کی کمی سی سی تاریخ آگئی ہو، طبیہ کالج، سرسید کی تحریک، کانگریس

[۱] حیاتِ اجمل صفحہ ب۔

مسلم لیگ کانگریس کا اتحاد، شورش بنگالہ، جنگ طرابلس و بلقان، جنگ یورپ، اسلامی ممالک کی بیداری، کوماگاٹو مارو کا حادثہ، رولٹ ایکٹ، تحریک خلافت، ترک موالات ندوۃ العلما، جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، غرض انیسویں صدی کے اواخر سے حکیم صاحب مرحوم کی وفات تک جتنے اہم واقعات ہوئے یا تحریکیں وجود میں آئیں ان سب کا مختصر یا تفصیلی ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ اسی طرح تقریباً تمام اہم لیڈروں کا جنھوں نے اس دور کی مختلف تحریکوں میں حصہ لیا سرسری یا تفصیلی ذکر آگیا ہے۔ علی برادران کا ذکر بھی کئی موقعوں پر آیا ہے، لیکن ان کی خدمات کو جس طرح اجاگر کرنا چاہئیے تھا نہیں کیا گیا۔

ہندوستان کی سیاسی دنیا کا یہ ایک نہایت عبرت انگیز سانحہ ہے کہ علی برادران کی خدمات کو بھلا دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ علی برادران ہی کے جوش و خلوص، ایثار و قربانی اور ہمت و جرأت کا نتیجہ تھا کہ کانگریس میں ایک نئی روح پیدا ہوئی۔

قاضی صاحب نے صرف یہی نہیں کہ علی برادران کی خدمات کو اجاگر نہیں کیا بلکہ کہیں کہیں ان پر طنز بھی کیا ہے۔ تحریک خلافت کے سلسلہ میں اکثر ان کی کوششوں کو غلط اقدام سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن جب حکیم صاحب بیچ میں آتے ہیں تو وہی خلافت کمیٹی قوم کے لئے مفید ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ حکیم صاحب نے "اہلِ ملک سے اپیل کی کہ وہ پھر خلافت کمیٹی کو کام کرنے کے قابل بنادیں۔ یہ پیام درحقیقت خلافت کی گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کی ایک آخری کوشش تھی۔[لہ]"

مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ گیر مسلسل اور اہم خدمات کو بھی نہ جانے کس مصلحت کی بناء پر یہاں نظر انداز کردیا گیا ہے۔ اگر" اقبال اپنے مینائے شعر میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو بھر کر خدا کی بارگاہ میں" گیا تو مولانا نے بھی بلقان کے شہیدوں کی حمایت میں اپنا خون جگر الہلال کے صفحات پر پھیلایا اور انسان کی بزم عیش میں ایک زلزلہ، ایک طوفان، اور ایک حشر برپا کردیا۔

حسرت موہانی کی خدمات کا بھی اعتراف نہیں کیا گیا۔ حسرت تو علی برادران سے بھی زیادہ مظلوم ہیں۔

مختلف تحریکوں کی تدریجی رفتار کا مصنف نے بہت خوش اسلوبی سے ذکر کیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انھوں نے ان تحریکوں میں سے اکثر میں خود بھی حصہ لیا ہے، اگرچہ جیسا کہ

لہ حیات اجمل ص۳۷۳

پہلے کہا گیا، ان کا حصہ زیادہ تر تحریری یا احتیاطی رہا ہے۔ بعض اوقات بیجا تفصیل وطوالت سے کام لیا گیا ہے، مثلاً شورش بنگالا کی ذیلی سرخی کے تحت تقسیم بنگالا سے الگ ہوکر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ شورش بنگالا کا ڈانڈا ہندوستان کی جنگ آزادی سے ملانا قاضی صاحب کی اپج ہے۔

مختلف تحریکوں کی تدریجی رفتار و ترقی کے ذکر کی وجہ سے مرحوم حکیم صاحب کی زندگی کے تدریجی انقلابات کا اچھی طرح اندازا ہوجاتا ہے۔ اور یہ پتا چلتا ہے کہ کس طرح "اجمل خاں آشیانۂ وفاداری سے قربان گاہ آزادی پر" پہنچے۔ حکیم صاحب ہمارے سامنے ایک انسان کی حیثیت سے آتے ہیں۔ کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں معلوم ہوتے۔

حیات اجمل مندرجۂ ذیل ابواب میں منقسم ہے:

تاریخی پس منظر، نمود صبح، دور اول، دور ثانی، دور ثالث، نصف النہار، دور آخر سفر کی آخری منزل، آخری شام، حکیم صاحب ایک انسان کی حیثیت سے۔

تاریخی پس منظر کے عنوان سے جو کچھ لکھا گیا ہے اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ محض عامیانہ باتیں لکھی ہیں۔

> "حساب تو لگائیے کہ اس دن سے آج تک جمنا کے دھارے پر کتنا پانی بہہ چکا ہوگا۔ اس بہتے ہوئے پانی میں اگر دو آنکھیں ہوتیں تو انھوں نے اندر پرست کی بہاڑیوں پر انسانی آبادی کے کیا کیا تماشے دیکھے ہوتے۔ کلجگ کا سارا دور ان آنکھوں کے سامنے گذرا ہوتا۔"[1]

ان جملوں میں افسانوی رنگ ہے۔ یہ تاریخی انداز بیاں نہیں ہوسکتا۔

تاریخی پس منظر کے بعد مصنف نے حکیم صاحب مرحوم کے خاندانی حالات بڑی عمدگی سے لکھے ہیں۔ لیکن یہاں ایک بات کی شدت سے کمی محسوس ہوتی ہے۔ حکیم صاحب کی پیدائش کے وقت ہندوستان کے معاشرتی و تمدنی حالات کا ذکر ضروری تھا۔

حکیم صاحب مرحوم عام طور پر ایک طبیب کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ لیکن انھوں نے ہندوستان کی سیاست میں جو جدوجہد کی اس سے موجودہ نسل بہت کم واقف ہے۔ حیات اجمل اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ مصنف نے نہایت خوش اسلوبی اور تفصیل سے ان کی سیاسی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ حیات اجمل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ مرحوم حکیم صاحب ہندوستانی سیاست کے اہم ترین ارکان میں سے ہیں۔ کانگریس کی صدارت ہندوستان کی سیاسی دنیا کا سب

---

[1] حیات اجمل ص۳

سے بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ حکیم صاحب کو یہ اعزاز بھی ملا۔ ان کے زمانہ میں ہندوستانی سیاست کی اہم ترین تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان ہی کے زمانہ میں یورپ میں پہلی جنگ عظیم چھڑی۔ ان ہی کی زندگی میں زمانہ نے طرابلس اور بلقان کی خون آشامیوں کے نظارے دیکھے۔ حکیم صاحب ان تمام واقعات حادثات اور سانحات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے مختلف تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ انھوں نے سی۔آر داس کے ساتھ مل کر سوراج پارٹی بنائی۔ ان کی سیاسی وسعت نظر اور دور بینی کے گاندھی بھی قائل تھے غرض "حکیم صاحب کا تخیل انتہاپسند اور عمل معتدل تھا۔"

حکیم صاحب کی سیاسی زندگی کا سب سے روشن پہلو ہندو مسلم اتحاد کے لئے ان کی ان تھک کوشش ہے۔ وہ آخر دم تک ہندو مسلم اتحاد کے حامی رہے۔ بقول قاضی صاحب "ہندو مسلم اتحاد ان کی سیاسی زندگی کی ساری تفسیر تھی۔ یہی حاشیہ تھا اور یہی متن تھا۔"[۱] ہندو مسلم فسادات کا ان پر بہت اثر پڑا۔ اس کے باوجود ان کے جوش وخلوص میں کمی نہ آئی۔ "ان کے دل کے ساز سے جس کے بہت سے تار ٹوٹ چکے تھے وہی ایک آواز ہر دفعہ نکلتی تھی اور وہی ایک تخئیل تھا جو مجروح ہو کر بھی زندہ تھا۔" حکیم صاحب کی وطن دوستی کا اندازا اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بقول مصنف حیات اجمل "حکیم صاحب آنکھوں میں پانی آجانے کی وجہ سے بڑی حد تک بصارت سے محروم ہو چکے تھے، ان کا کام باوجود اس معذوری کے برابر جاری رہتا تھا ... اس حالت میں جب چار قدم چلنا بھی ان کے لئے دشوار تھا وہ کانگریس کے اجلاس خاص میں ہر وقت شریک رہے۔"[۲]

برسوں کی جدوجہد اور بڑی بڑی قربانیوں کے بعد ہندوستان اب آزاد ہو چکا ہے۔ اگرچہ آزادی کے بعد دنیا نے جو کچھ دیکھا وہ انتہائی شرمناک ہے۔ نئی پود شاید مشکل سے یہ یقین کرے کہ کبھی مسلمان بھی کانگریس میں شریک تھے، حالانکہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ مسلمان تھے جنھوں نے سیاسی تحریک میں جان ڈالی۔ حیات اجمل میں اس مٹتے ہوئے نقش کو نہایت وضاحت سے ابھارا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری کی یادداشت سے مندرجۂ ذیل عبارت نقل کی گئی ہے:

> ستمبر ۱۹۲۰ء میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں جو خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا اس اجلاس میں مہاتما گاندھی نے گورنمنٹ کے خلاف نان کوآپریشن کی تحریک پیش کی مہاتما گاندھی کے ہم خیال ہندو لیڈروں میں صرف موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو تھے البتہ مسلمانوں میں سوائے محمد علی جناح کے سب مہاتما جی کے موافق تھے .. نان

۱؎ حیات اجمل ص۲۳۰ ۲؎ ایضاً ص۲۳

کو آپریشن کا رزولیوشن باوجود بنگال کے لیڈروں کی بے انتہا کوشش کے۔ ... مسلمانوں کی کثرت آرا سے ... منظور ہوگیا ... کانگریس کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اپنی کثرت تعداد کی وجہ سے کانگریس کو ایک دلیرانہ اور جارحانہ پروگرام منظور کرنے پر مجبور کیا۔"[۵۱]

اس کے بعد قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ

"یہ ایک تاریخی حقیقت ہے ... کہ ان ہی کی (مسلمانوں کی) قوت نے حکومت اور کانگریس کے مقابلہ کا میدان تیار کیا اور اس تحریک کا آغاز کیا جو بعد میں آزادی کی کامیاب تحریک ثابت ہوئی۔ گو کہ بعد کے حالات اور مسلم لیگ کی فرقہ پرست قیادت نے مسلمانوں کے دامن پر تقسیم ہند اور دو قومی نظریہ کا دھبہ لگادیا۔"[۵۲]

حکیم صاحب مرحوم ایک حاذق طبیب تھے۔ ہزاروں انسانوں نے ان کے ہاتھ سے شفا پائی۔ انھوں نے یونانی طب کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ طبیہ کالج قائم کیا، طبی کانفرنسیں کیں، حکومت کا مقابلہ کیا۔ ان تمام باتوں کی تفصیل حیات اجمل میں پائی جاتی ہے۔ لیکن ان کے طبی معرکوں کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا صرف دو موقعوں پر ضمنی طور پر ذکر آگیا ہے۔

حکیم صاحب شاعر تھے۔ شیدا تخلص تھا۔ ان کا فارسی کا دیوان برلن سے چھپ کر شائع ہوچکا ہے۔ اس کا مقدمہ بھی قاضی صاحب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ پھر بھی انھوں نے حکیم صاحب کی شعر و شاعری کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

حکیم صاحب کے علمی و ادبی ذوق کے متعلق مصنف نے صرف ایک ہلکا سا اشارہ کیا ہے، حالانکہ انھیں اس کا اعتراف ہے کہ "حکیم صاحب جہاں جاتے تھے اپنا ذوق علمی اور جذبۂ اسلامی ساتھ لے جاتے تھے۔"[۵۳] جس شخص کا یہ حال ہو کہ بقول قاضی صاحب "صحت کا سوال نظر انداز ہوجاتا اور پیرس کے کتب خانوں کی سیر حکیم صاحب کے لئے دنیا کے تمام مشاغل سے زیادہ ضروری ہوتی۔ پیرس کی نیشنل لائبریری میں صبح کو جاتے تھے اور شام کو نکلتے تھے۔ قلمی کتابوں کے صیغہ میں گویا انھوں نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ گھنٹوں مشرقی کتابوں کا تذکرہ رہتا تھا اور خصوصاً طب کی قلمی کتابوں پر تنقید اور تبصرہ کے دریا بہہ جاتے تھے۔"[۵۴] اس کے ذوق علمی کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھنے کی ضرورت تھی۔

آخری شام، کے عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں جذبات و احساسات کی اچھی مصوری کی گئی ہے۔ مصنف نے مرحوم حکیم صاحب سے اپنے ذاتی تعلقات کو نہایت اختصار مگر خوبی

---

۵۱ حیات اجمل ص۲۲۳ ۵۲ ایضاً ص۲۳۱ ۵۳ حیات اجمل ص۳۳۵ ۵۴ ایضاً ص۳۴۵

کے ساتھ بتایا ہے اور ان سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔

حکیم صاحب مرحوم کے اخلاق و عادات کا ذکر تفصیل اور خوبی سے کیا گیا ہے۔ البتہ دو ایک جگہ مبالغہ کا رنگ آگیا ہے۔ "رمضان میں ان کے دسترخوان پر سیکڑوں بھوکے روزانہ کھانا کھاتے تھے۔[۵۱]" غربا اور ضرورت مندوں کا خیال ان کو ہمیشہ رہتا تھا۔ ابتدائی زندگی میں جب سیاسی مشاغل سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا وہ سیکڑوں ضرورتمندوں کی حاجت روائی کیا کرتے تھے۔[۵۲]"

اسی حقیقت کا اظہار مفتی کفایت اللہ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"کتنی ہی بیواؤں اور یتیموں کے ماہانہ وظائف اور کتنے ہی غریبوں اور حاجت مندوں کی یکمشت عطیات سے دستگیری ہمیشہ جاری رہتی تھی اور اس میں ماہانہ بڑی گراں قدر رقم خرچ ہو جاتی تھی۔۔ ۔ ۔ بیش قیمت دواؤں کی تقسیم اور غربا کے ساتھ ان کی ہمدردی معروف و مشہور ہے۔[۵۳]"

قاضی صاحب اس تہذیب کی پیداوار ہیں جو خطاے بزرگان گرفتن خطاست کی تعلیم دیتی ہے۔ چنانچہ حیات اجمل میں کہیں پھوڑوں کو ٹھیس نہیں لگنے پائی ہے" اب نہ اجمل خاں اس دنیا میں موجود ہیں اور نہ شفاء الملک لہذا اس قضیہ کی تفصیلات کا ان اوراق میں ذکر کرنا محض فضول ہے۔[۵۴]" لیکن جدید اصول سوانح نگاری کے خلاف ہے۔

ضرب کلیم میں ایک نظم ہے جس کا عنوان ہے "مسولینی کا خطاب" اپنے مشرقی و مغربی حریفوں سے" یہ نظم جنگ ابی سینیا (۱۹۳۵ء) کے زمانہ میں کہی گئی ہے۔ قاضی صاحب کا یہ بیان کہ یہ نظم اقبال نے جنگ طرابلس (۱۹۱۱ء) سے متاثر ہو کر لکھی ہے، صحیح نہیں۔

قاضی صاحب ہماری زبان کے بہت اچھے ادیب و انشاء پرداز ہیں۔ وہ اگرچہ سجاد حیدر یلدرم سے متاثر ہیں لیکن ان کا اپنا مخصوص طرز تحریر ہے۔ ہاں ان میں یلدرم کی سی لطافت نہیں۔ حیات اجمل میں قاضی صاحب کی انشاء پردازی کے نہایت عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔

"کاغذ پر جو تصویریں کھینچی جاتی ہیں وہ عموماً ظاہری اعمال کی تصویریں ہوتی ہیں۔ روح کا عکس ان میں نظر نہیں آتا۔ آنکھ نے اجمل خاں کو دیکھا، دل نے پہچانا مگر قلم ان کی روحانیت کا نقشہ کھینچنے سے معذور رہا۔[۵۵]"

"ان کی یاد کے نقوش اور ان کی انسانیت کے آثار آج بھی ان کے بیمار مندوں کے لئے نظر افروز ہیں۔ زندگی کے نگارخانہ میں جب تک انسانیت کا وجود باقی ہو

---

۵۱ حیات اجمل ص۱۱۴ ۵۲ ایضاً ص۱۱۵ ۵۳ ایضاً ص۵۳ ۵۴ ایضاً ص۷۶-۷۷

ہمارے دل انسانی فضائل سے آباد ہیں ان کی تصویر دھندلی نہیں ہو سکتی۔"[۵۱]

"درحقیقت ان کی طبیعت کی شوخی پر متانت اور ضبط کے اتنے پردے پڑے ہوئے تھے کہ دنیا اس کو نہ دیکھ سکی۔ لیکن خاص خاص احباب کی صحبت میں جب کبھی ان پردوں کا کوئی گوشہ اٹھ جاتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ہر گوشۂ بساط

داماں باغبان و کفِ گل فروش ہے"[۵۲]

"ایشیائی ممالک میں ہر طرف جمود اور اضمحلال کے آثار نمایاں تھے۔ بکھرے ہوئے قومی شیرازے بعد میں سامراج کی تیز ہوا کے جھونکوں میں اور بھی زیادہ منتشر ہوتے جا رہے تھے ایرانی اور عرب تہذیب کے آثار تقریباً مٹ چکے تھے۔ دنیا کے علوم و فنون کی ترقیوں سے ایشیا کی اقوام (سوائے جاپان کے) بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔"[۵۳]

لیکن بعض جملے کتاب کے کھٹکتے ہیں۔

"یہ جانتے ہوئے کہ اس بغاوت میں اصلی ہاتھ برطانیہ کا ہے اعتدال اور سیاسی احتیاط کے بہت سے چشمے خشک ہونے لگے"[۵۴]

"ان سازشوں کا پہلا شکار شریف مکہ تھا وہ پہلی مچھلی تھی جو ممالک عرب میں برطانوی تدبر کے کانٹے میں الجھی۔"[۵۵]

"دولت عثمانیہ کا پیالہ لبریز ہو رہا تھا۔"[۵۶]

"ہندوستان کے مسلمانوں کا رگ و ریشہ ترکوں کی ہمدردی سے لبریز تھا۔"[۵۷]

یہ جملے ادبی حیثیت سے کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں، سوانح نگاری کی زبان نہیں ہو سکتے یہ جملے بھی محل نظر ہیں:

"خدا خدا کر کے تشریف لے گئے۔ دس روز کے بعد تشریف لائے۔"[۵۸]

"جس ماحول میں ان کے تیسرے بیٹے نے سورج کی روشنی میں آنکھیں کھولیں۔"[۵۹]

"مادۂ آتشگیر کے متعلق سخت قواعد بنا کر بنگال کی بم بازی کا انسداد کرنا چاہا گیا۔"[۶۰]

"جنرل ڈائر نے اپنے گورنر کے ذمہ دار کی تفسیر جلیانوالہ باغ میں پیش فرمائی۔"[۶۱]

"کلکتہ کانگریس کے بعد اکتوبر، نومبر اور دسمبر میں مولانا محمد علی انگلستان سے واپس آئے"[۶۲]

"اس حیثیت سے ان کا خطبہ ان خطبات میں سے ایک بہترین خطبہ تھا۔"[۶۳]

---

۵۱ حیات اجمل ص ۲۹۶، ۵۲ ایضاً ص ۲۰۶، ۵۳ ایضاً ص ۲۱۱، ۵۴ ایضاً ص ۱۵۶، ۵۵ ایضاً ص ۱۶۲، ۵۶ ایضاً ص ۱۶۷

۵۷ حیات اجمل ص ۲۹۵، ۵۸ ایضاً ص ۱۱۱، ۵۹ ایضاً ص ۱۳۱، ۶۰ ایضاً ص ۲۲۷، ۶۱ ایضاً ص ۲۳۳، ۶۲ ایضاً ص ۱۲۳

۶۳ ایضاً ص ۲۳۶،

"ترکی کے سیاسی انقلاب نے جنگ کی بساط کو لوٹ دیا۔"[۵۱]

اس جملہ میں کس قدر طوالت ہے:

"واقعات نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ سوائے خاص خاص علماء کے جو شخصی طور پر سیاسی مسائل کے لئے کام کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے یا رکھتے ہیں، عام طور پر ہر جبہ و عمامہ کا سیاست کے میدان میں آجانا گو وقتی طور پر خلافت کی تحریک کے لئے مفید ثابت ہوا لیکن بعد کو اور گذشتہ چند سال میں جب انگریزوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ہندوؤں اور کانگریس کے خلاف استعمال کیا، سیاست اور مذہب کی یہ آمیزش ملک کی سیاسی تعمیر کے لئے بہت ہی مضر ثابت ہوئی۔"[۵۲]

اس جملہ میں تضاد پایا جاتا ہے:

"یہ محض حکیم صاحب کی آواز کا اثر تھا کہ دہلی میں...... قصابوں اور مسلمانوں نے قربانی کے متعلق حکیم صاحب کی ہدایت پر عمل کیا...... خود دہلی کے مسلمانوں نے بھی اپنے غصہ سے مغلوب ہو کر حکیم صاحب کے مشورہ پر پوری طرح عمل نہ کیا۔"[۵۳]

ایک موقع پر یہ عامیانہ شعر نقل کیا گیا ہے:

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی مریض عشق پر رحمت خدا کی

بعض الفاظ کی املا بھی پرانے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ مثلاً ڈہاکہ (ڈھاکا) کہال (کھال)، ادہر (ادھر) بہلانا (بھلانا) بندہ (بندہ یا بندا) وغیرہ۔ جس انجمن کے قاضی صاحب سکریٹری ہیں اسی کے بنائے ہوئے اصولوں کی خلاف ورزی کوئی اچھی بات نہیں۔ پرانا کو کئی جگہ پورانا لکھا گیا۔ یہ قطعی غلط ہے۔ دفعتاً، قدرتاً وغیرہ بھی غلط ہے۔ جب لفظ کا آخری حرف تائے تانیث ہو تو وہ الف میں تبدیل نہیں ہوتا۔

کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ دو صفحے کی 'تصحیح کتابت' کے باوجود بیسیوں فاحش قسم کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔

بیسویں صدی کی کتاب اور اس میں فہرست مضامین نہ ہو، حیرت کی بات ہے۔ واقعات کے بیان کے سلسلہ میں حوالے شاذ و نادر ہیں۔ کتابوں اور رسالوں یا اخباروں کا حوالہ ضرور ہونا چاہئے تھا۔

کتاب کے آخری حصے میں مرصنف مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم، ریورنڈ سی اف اینڈ روز اکھانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے مضامین کے اقتباسات دئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے بیان کے آخری حصہ میں کہتے ہیں کہ

"وہ اجمل خاں جو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اتنا بڑا تھا کہ زمانہ اب مشکل سے اس کی مثال پیدا کرے گا۔ لیکن اجمل خاں زندہ ہے وہ اس سے بھی کہیں بڑا ہے اور آج لوگ اس کی بڑائی کا اندازہ بھی مشکل سے کر سکتے ہیں۔"

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے؟

---

۵۱ حیات اجمل ص۱۲۳، ۵۲ ایضاً ص۱۸۶، ۵۳ ایضاً ص۲۸۹۔

تبصرے

(تبصرے کے لئے کتابوں کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے)

سراپائے رسول

مصنف:- اعجاز الحق قدوسی۔ تقطیع چھوٹی، صفحات ۱۱۱
کاغذ معمولی، طباعت و کتابت بہتر، قیمت ۱۴ر
ناشر:- مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد (دکن)

سیرت پاک پر سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ نبی پاک کی زندگی کے مختلف پہلو نئے نئے انداز سے پیش کئے جا رہے ہیں، اس کتاب میں مصنف نے نبی کریم صلعم کی زندگی کی روزمرہ کی باتیں مثلاً اخلاق، معمولات و عادات کھانے پینے کے عادات معاشرت، اوقات و عبادات، نہائت سہل اور آسان انداز سے بیان کئے ہیں۔ بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی مفید ہے۔ بچوں کو اگر ابتدا ہی میں یہ کتاب پڑھا دی جائے تو یقیناً ان کے اخلاق و کردار کو سنوارنے میں بہت مفید ثابت ہوگی اور رسول پاک کی پیروی کرکے وہ ایک بہتر مسلمان اور اچھے شہری بن سکتے ہیں۔

سچ کا پجاری

مصنف:- پرکاش پنڈت، صفحات ۶۲، قیمت درج نہیں
ناشر:- چاند پبلیکیشنز محمد علی روڈ، ناگپور۔

کتاب بچوں کے لئے آسان زبان میں لکھی گئی ہے، اس میں مہاتما گاندھی کے بچپن سے لے کر ان کے دردناک قتل تک کے وہ چند اہم واقعات بیان کئے گئے ہیں جنھیں سچ اور صحیح سمجھ کر گاندھی جی ان پر ثابت قدم رہے اور آخر میں انھیں کی جیت ہوئی۔ یہ کتاب بچوں اور بڑوں دونوں کے لئے مفید ہے، ایک جگہ اخبار کی جمع "اخباریں" ہے جو غلط ہے۔ دوسری جگہ تاریخی غلطی ہے، گاندھی جی گولیوں کا نشانہ اس وقت بنے جبکہ وہ تقریر کرنے جا رہے تھے نہ کہ "تقریر کر رہے تھے" امید کہ آئندہ اڈیشن میں تصحیح کر دی جائے گی۔

مہاتما گاندھی

مصنف:- محمد حفیظ الدین۔ سائز ۵ × ۷۔ صفحات ۶۳، قیمت بارہ آنہ
ناشر:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی۔

کتاب ظاہری اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ بچوں کے لئے آسان اور دلنشین انداز میں گاندھی جی کی زندگی کے حالات مصنف نے بیان کئے ہیں۔ جا بجا گاندھی جی کی زندگی کی مختلف تصویریں بھی دی ہیں۔ کتاب کی افادیت کو دیکھتے ہوئے قیمت زیادہ نہیں۔

حسرت موہانی مرتبہ عبدالشکور، تقطیع ۵×۷، صفحات ۲۰۰، کاغذ معمولی، کتابت صاف ستھری، قیمت: دو روپے۔

ناشر۔ انوار بکڈپو، لکھنؤ

اس کتاب کا یہ تیسرا اڈیشن ہے جسے انوار بکڈپو نے شائع کیا ہے۔ اردو میں اہم اور ضروری کتابوں کی بہت کمی ہوگئی ہے جو شائقین کو بڑی جستجو اور تلاش کے بعد بھی کم ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ فاضل مرتب نے اس اڈیشن میں دو مختصر ابواب کا اضافہ بھی کیا ہے۔ ایک میں حسرت کی شخصیت پر جامع طور سے بحث کی ہے اور دوسرے باب میں یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں کہ حسرت نے کن کن حضرات سے استفادہ کیا تھا۔

طور رخشاں مرتب۔ طرفہ قریشی۔ تقطیع ۵ × ۷½، صفحات ۱۷۶، کاغذ معمولی کتابت گوارا، قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ رحیمیہ مومن پورہ۔ ناگپور سٹی۔

زیر نظر مجموعہ "کل ہند ادارۂ ادبیہ سیمابیہ، ناگپور کے مشاعروں کا انتخاب ہے۔ اس مجموعہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف وہی شعرا ہیں جو سی پی و برار کے رہنے والے ہیں یا جنھوں نے یہاں آکر مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ مجموعہ میں تین نظمیں بھی ہیں۔ طرحی غزلیں اور رباعیات و قطعات بھی ہیں جن میں بلندی خیال بھی ہے اور پستی بھی۔ فاضل مرتب لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے مدھیہ پردیش اور برار کے شعرا کا کلام اور اکثر کی تصویریں دونوں جمع کردی ہیں۔ کتابت کی غلطیاں کافی ہیں۔

نغمۂ الوہیت مترجمہ حسن الدین احمد صاحب، تقطیع ۵×۷، صفحات ۱۴۲۔ کاغذ معمولی۔ کتابت بہتر، قیمت تین روپے۔

پتہ عزیز باغ سلطان پورہ، حیدرآباد (دکن)

بھگوت گیتا کا آسان اور عام فہم ترجمہ ہے۔ اس سے پہلے بھی گیتا کے مختلف تراجم ہوچکے ہیں۔ خاص طور سے مرزا جعفر علی خاں اثر کا نغمۂ جاوید کے نام سے منظوم ترجمہ اہمیت رکھتا ہے حسن الدین احمد صاحب کا یہ ترجمہ کامیاب ہے۔ شروع میں پنڈت سندر لال کا ایک مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ملک کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے مذہب سے واقفیت ضروری ہے۔ مترجم نے پوری کوشش اور محنت سے ترجمہ شگفتہ کیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اس مقدس کتاب سے سنسکرت نہ جاننے والے بھی مستفید ہوسکیں۔ قیمت اگر قدرے کم ہوتی تو اچھا تھا۔

("ف")

ضمیمہ (ب)

کتب خانہ جامع مسجد بمبئی میں

اُردو مخطوطات

از

حامد اللہ صاحب ندوی

ابتدا:

حمد بے حد مر خدائے پاک را　　آں کہ ایماں داد مشت خاک را
حمد بے حد اُس خدائے پاک کو　　جس دیا ایماں مٹھی بھر خاک کو
آنکہ در آدم دمید او روح را　　داد از طوفاں نجات او نوح را
او کہ آدم بیچ پھونکا روح کو　　او کہ طوفاں سے بچایا نوح کو
آنکہ فرماں کرد قہرش بادرا　　تا سزائے داد قوم عاد را
او کہ فرمایا قہر سے باد کو　　تا سزا دے گی او قوم عاد کو

خاتمہ:-

ہر کہ آرد ایں وصیت پا بجائے　　در دو عالم راحتش بخشد خدائے
جو کہ لاوے اس وصیت کو بجا　　دو جہاں کی راحت دے اس کو خدا
ہمدمی را درد عائت دست گیر　　تا ترا ہم دست گیرد دست گیر
کر دعا سے دوست دائم دستگیر　　تا ترا بھی ہاتھ پکڑے دست گیر

جہاں تک مثنوی کے آخری اشعار کا تعلق ہے۔ وہی تین شعر آخری ہیں جو سن تصنیف کی شہادت میں اوپر نقل کئے گئے۔ لیکن متن کے اعتبار سے خاتمہ انھیں فارسی اشعار کے ترجمہ پہ ہوتا ہے۔

پندنامۂ فریدالدّین عطّار میں "ہمدمی را درد عایت دستگیر" یہ شعر نہیں ہے علاوہ ازیں ہر کہ آرد الخ، کے بعد بھی چار دعائیہ شعر ہیں جن کا اس مثنوی میں پتہ نہیں۔

"پندنامہ" کے نام کا ایک مخطوطہ ادارۂ ادبیات میں موجود ہے[1]، لیکن وہ کسی اور مصنّف کا لکھا ہوا ہے، پندنامۂ عطّار سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ علاوہ ازیں اس کی بحر بھی الگ ہے۔

من سمجھاوَن

مُصنّف تُراب، سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۲۶،
خط نستعلیق۔ سائز ۸×۶

تراب کے حالات تفصیلی طور پر معلوم نہ ہو سکے، غالباً کوئی قلندر مشرب درویش تھا، اس رسالہ کی ابتدا میں صرف یہ جُملہ سُرخ روشنائی میں لکھا ہوا ہے :- "ایں رسالہ

---

[1] تذکرۂ اُردو مخطوطات ص۱۵۶

تصنیف از برہمن حسینی است مسمّٰی بہ من سمجھاؤن" اس سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ تراب کا نام براہمن حسینی ہے، اس سلسلہ میں خود نظم سے بھی کوئی شہادت نہیں ملتی البتہ ابتدائی تین شعروں سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظم رام داس کی کسی نظم کا ترجمہ ہے، چنانچہ کہتا ہے:۔

اے اِس کے من کی پوتھی کا جواب ہے — کہ جس کا رام داس جگ میں خطاب ہے
مراٹھی بات میں پوتھی او بولیا — میں اس کا رمز سب دکھنی میں کھولیا
بھی اس کا نام من سمجھاؤن راکھا — ولیکن سربسر ہندی ہے بھاکا

ہسٹری آف مراٹھی لٹریچر میں رام داس کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ وہ ۱۶۰۸ء میں ضلع ستارا کے ایک چھوٹے سے قصبہ جلگاؤں میں پیدا ہوا تھا اس کا اصل نام تو نارائن تھا، مگر چونکہ اس کو رام سے بہت عقیدت تھی اور بعد میں اس نے اسی نام سے ایک الگ فرقہ کی بنیاد بھی ڈالی تھی اس لئے رام داس کے نام سے مشہور ہوگیا۔ اس کی ابتدائی زندگی بڑی دلچسپ ہے، بارہ سال کی عمر میں عین شادی کے وقت وہ گھر سے بھاگا اور پنچوٹی (ناسک) پہنچ کر ہندو مذہب کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور پھر ہندوستان بھر کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے اور مختلف فرقوں کی رسومات وغیرہ کو دیکھنے کے بعد وہ ۳۶ سال کی عمر میں اپنے وطن لوٹا اور ستارا ہی کے ایک گاؤں چامفال میں رام کے نام پر ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈالی۔

چونکہ اسی زمانہ میں شیواجی بھی عظیم تر مہاراشٹر کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اس لئے جب اس کو معلوم ہوا کہ رام داس بھی اسی منصوبہ کو روحانی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے تو وہ ستارا کی فتح کے بعد اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اس کی مریدی اختیار کرلی۔

رام داس نے اپنی تعلیمات کو پھیلانے کے لئے چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھیں ان میں دسبودھ दासबोध راماین रामायण اور مناچے شلوک मनाचे श्लोक کافی مشہور ہیں۔[۱۵]

مناچے شلوک کے مختلف چھوٹے بڑے ایڈیشن بازاروں میں ملتے ہیں۔ من سمجھاون کے مضامین کو اس کے مضامین سے ملانے پر معلوم ہوتا ہے کہ من سمجھاون، مناچے شلوک ہی کا آزاد ترجمہ ہے

۱۵ رام داس کے تفصیلی حالات کیلئے دیکھو دی ستارٹ ہسٹری آف مراٹھی لٹریچر از ایم، کے، ناڈکرنی، رام داس کا انتقال ۱۶۸۱ء میں ہوا

کتاب جملہ بارہ ترجیع بند نظموں پر مشتمل ہی، اور ہر ایک ترجیع بند میں تقریباً بارہ بند ہیں۔ اس طرح اِس پوری مسلسل نظم کو جس کو ترجیع بند مسدس بھی کہا جا سکتا ہی تقریباً ڈیڑھ سو بند پائے جاتے ہیں۔ موضوع، دُنیا کی ناپائداری، دیر و حرم کی تفریق اور نفس کی خواہشات اور اسی طرح کے بعض دوسرے مسائل ہیں۔ آخری دس بارہ بندوں میں شاعر نے اپنے تنجور جانے اور ستوبا مہاراج سے ملنے کا ذکر کیا ہے۔ مناپچے شلوک میں اس کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا ممکن ہی تراب نے اپنا ہی واقعہ منظوم کر کے آخر میں بڑھا دیا ہو۔ طرزِ بیان نہائت اثر انگیز ہے، ہر ترجیع بند نظم کا ایک ایک بند ملاحظہ ہو:-

(۱)

ارے من تو مایہ میں جیپ عمر کھومت   بزاں ہات دے سر کوں پچتا کے روت
بدی کا تخم باغ نیکی میں بومت   بسر دھیاں گرو کا سکھی نیند سو مت

جو کوئی عاشقِ پاک بدنام ہے گا
وہی ساقیِ بزم گلفام ہے گا

(۲)

اے فانی سار کچھ وفادار نئیں رے   یہاں کوئی دائم رہن ہار نئیں رے
بُرے وقت کا کوئی دلدار نئیں رے   چمن باغ کثرت کا در کار نئیں رے

مسافر ہو نکلے ہیں دو دن سفر کوں
اٹھو جی اٹھو اب چلو جاویں گھر کوں

(۳)

ہمیں ہو کے مہمان آئے ہیں سب   ہوا حرص غصّے میں کیا ہم کوں مطلب
قلم آزمانے کوں بھیجا اہے رب   اسی واسطے سب کوں کہتا ہوں اب تب

شو الفت خویش و دختر پسر کوں
اٹھو جی اٹھو اب چلو جاویں گھر کوں

(۴)

کتے لے کے تسبیح منکے پھراتے   بڑے پاک زاہد نمازی کلاتے
دلے من کے منکے کا نئیں بھید پاتے   سدا میں پنے سوں اپس سدھ گنواتے

ارے من شتابی بتیں آسرن میں
ہے سارا سکت سب گرو کے چرن میں

(۵)

ارے من توں پن دودھ کھاتا نہیں ہے ایکیلا اندھارے میں جاتا نہیں ہے
زمیں کا تجے سیج بھاتا نہیں ہے بہ جز چکسا وکسا توں کھاتا نہیں ہے
ارے من یہ دھن مال پر تا اکڑنا
ہے آخر تجے کل کوں ماٹی میں گڑنا

(۶)

ہمیں آسماں سور چندر ستارے ہمارے نظارے بدل ہم سنوارے
الست ہو کے قالو بلے ہم پکارے جہاں ہم اُٹھے وہاں نہیں تھا دو جارے
ہمیں ہم کوں ہم دیکھنے جگ میں آئے
ہمیں ہم کوں ہم دیکھ ہم کوں گنوائے

(۷)

ہزاراں سوں پیوند کی گوڈری کر رکھا نام اس کا گدا دل کا بستر
سمجھتا ہے اس کو کہ از کسوت زر نہ کس ٹھگ کا وسواس نہ کس چور کا ڈر
ارے من اسے کیا ہے دُنیا کا جھانسا
لیا ہاتھ میں بھیک کا جن نے کانسا

(۸)

تراب میں تراب ہو کے میں توں پسارو مرا حال سُن کر سگل آہ مارو
اپس دل کوں مرشد کے قدماں پو دارو نکورے نکو من میں جھگڑے بچارو
جہاں یک پنا وہاں تو ہم تم نہیں ہے
دوئی کا تو ہرگز تکلم نہیں ہے

ابتدا:۔

سَدا رام کے نام سوں کام ہے گا ہمیں دھیان اس کا صبح شام ہے گا
....

وہی گل وہی مل وہی جام ہے گا
وہی ساقی بزم گلفام ہے گا

الکھ نام اللہ نرنجن ہری ہے نرنکار نرگن ویہ میسری ہے
صفت اس کی ہر شئے میں دائم بھری ہو اوگنگا او جمنا لو گوداوری ہے

وہی ذوالجلال اور اکرام ہے گا
وہی ساقی بزم گلفام ہے گا

خاتمہ :-

تراب اس شہر سیتے جلدی نکل توں بہت دن رہیا یاں اپنا اٹھ کے چل توں
اول سدھ گنوا پھر نکوہات مل توں ہوا اِس زمانہ منیں بیربل توں

ستو با مہاراج گنونت عاقل
مرے بید کا بھید پانی کرے دل

کیا ختم اب "من کی پوتی" کوں ساری تراب عاشقی پا کے عاجز بھکاری
حسینی براہمن اسے نام داری کہا ہے اسے رنگیں سخن یادگاری

ستو با مہاراج گنونت عاقل
مرے بید کا بھید پانی کرے دل

یہ مخطوطہ دیوان علیم، رموز السالکین اور پنچھی باچا کے ساتھ مجلّد ہے۔

ریاض العارفین

مصنف اسحاق، سنہ تصنیف ۱۲۰۶ھ، صفحات ۳۹۳، شعر فی صفحہ ۱۵،
خط نستعلیق، عنوانات سرخ روشنائی ہیں، سائز ۵ × ۷۔

• اسحاق کے حالات تفصیلی طور پر کہیں تذکروں میں نہیں ملتے، البتہ خود مثنوی سے اس کے متعلق جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہو کہ وہ بیجاپور کا رہنے والا ہو، گردش ایام نے اس کو مدورے میں لا ڈالا ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف سے پیشتر ہی اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہو، اُس کے چار بھائی ہیں اور چاروں کے چاروں بہترین شاعر ہیں۔ اس کا یعقوب نامی ایک دوست بھی ہے جو دکھنی نظم کا اُستاد ہو، انھیں سب لوگوں کی فرمائش پر اُس نے یہ مثنوی لکھی ہو، چنانچہ اس مضمون کے بعض شعر حسب ذیل ہیں :-

گرچہ میں ہوں آج مدرسے میں مقیم لیک بیجاپور ہے وطن قدیم
باپ میرا مغفرت معمور ہے سور منے جگ میں سب مشہور ہے
چار بھائیاں ہیں میرے شیریں مقال فہم میں کامل فراست میں کمال
بھی مرا ہے دوست دار، اک دلپسند نام ہے یعقوب اس کا ارجمند
مجھ کوں اس سوں ہے نہایت اتحاد نظم دکھنی میں ہے او ہی اوستاد
ہیں انوں کے سب اشارت کے سبب نظم سنجی بولیا ہوں بیش اب

اِس مثنوی کی ترتیب سات مہینہ سات دن میں مکمل ہوئی ہے۔ اور اس سے اس کا مقصد نہ سیم و زر کی طلب ہے، نہ نام و نمود کی خواہش:۔

نئیں طلب مجھ کوں کسی سوں سیم و زر نئیں کیا ہوں کس کی فرمائش اپر
تا مجھے کس سوں آہے رؤ و ریا محض یو بولیا ہوں از بہر خدا
سات مہینے سات دن لگ کھینچ رنج ہات میں لایا ہوں یو پاکیزہ گنج

علاوہ ازیں اِس تصنیف کے وقت مُصنّف کی عُمر بائیس سال ہے، اور اُس نے اس کو سنہ ہجری ایک ہزار دو سو چھ میں ختم کیا ہے:۔

جب کیا میں نظم یو شیریں مقال عُمر تب میری اتھی بادیس سال
اور سنہ ہجرت شہ ذوالافتخار تھی ہزار یک، دو صد و شش در شمار

اس طرح اس کا سنِ پیدائش ۱۱۸۴ھ ہوتا ہے۔

مثنوی؛ قوت حلال، بندگی رب، خوف خدا، عمل، توکّل، عاجزی و تحمّل، رضا بہ قضا، عشق و محبّت اولیائے کرام، اور اسی طرح بعض دوسرے مضامین سے متعلق ہے جو دس ابواب میں الگ الگ بیان کئے گئے ہیں۔

ابتدا حمد و نعت اور منقبت خلفاء سے کی ہے، اور وجہ تالیف میں بتایا ہے کہ مجھے ہر گھڑی اور ہر آن یہی فکر تھی کہ اپنے دل میں خوف خدا پیدا کرنے کے لئے کوئی تدبیر کرنا چاہیئے، خدا نے توفیق دی اور دل میں خیال آیا کہ بزرگانِ سلف کے حالات کو جو زیادہ تر فارسی میں ہیں دکھنی میں منتقل کر دیا جائے۔ لہٰذا قطرہ قطرہ جمع کرکے میں نے یہ دریا پُر از گُہر کیا ہے:۔

تھی مری خاطر پسند میں فکر یو ہر گھڑی ہر آن ہر دم ذکر یو
جی کیموں کوئی کام ایسا حق پذیر ترس حق تا مجھ منے ہو جائے گیر

پس دیا توفیق مجھ کوں ذوالجلال — یک بہ یک مجھ دل منے آیا خیال
تا حکایات بزرگانِ سلف — اور مصفا تعلیمات با شرف
فارسی جو نثر سے تھا یو بیاں — نظم سوں دکھنی کے کیتا ہوں عیاں
قطرہ قطرہ جمع کر ہر یک کا حال — پر گہر کرتا ہوں دریا کی مثال

خاتمہ میں رسولؐ و صحابۂ کرام پر درود و سلام بھیجا ہے۔

ابتدا:-

ابتدا کرتا ہوں بسم اللہ سوں — صاحب اجلال و عزّ و جاہ سوں
حمد حق ہے افسر فرقِ سخن — زینتِ ہر نامۂ نو و کہن
پر شرف انوار احمد ذوالجلال — ہے سخن کے چرخ کا روشن ہلال

خاتمہ:-

دے خموشی اب زباں کوں بات سوں — رکھ قلم داں میں قلم کوں ہاتھ سوں
بھیج اپنی بندگی کوں کر نمود — مصطفےٰ کی روح اشرف پر درود
اور مکرم آل اور اصحاب پر — پڑھ تحیت اور سخن کوں ختم کر

ترقیمہ:-

"تمام شد..... ایں کتاب ریاض العارفین از کاتب الحروف تحریر و خاکسار، طالب دیدار رب الغفّار، عاجز بندہ محمّد قاسم بن محمّد عبّاس لال چھتری، حالا ساکن در بندر زنجیرۂ ممبئی در محلۂ ٹمکر بہ وقت عصر میان روز دوشنبہ بست و سوم ماہ رجب المرحب ۱۲۵۶ھ ہجری نبوی صلعم، اگر کسے دعوی کند باطل است۔

اِس کے متعدّد قلمی نسخے، جامعہ عثمانیہ، ادارۂ ادبیات اُردو اور کتب خانہ آصفیہ وغیرہ میں موجود ہیں، اور یہ متعدّد بار چھپ بھی چکی ہے، چنانچہ اس کا ایک مطبوعہ نسخہ جو کریمی لائبریری میں موجود ہے، وہ حافظ محمّد اکبر کی تصحیح و ترمیم کے ساتھ ۱۳۰۱ھ میں مطبع فتح الکریم بمبئی سے شائع ہوا ہے۔

علاوہ ازیں اِس مثنوی پر ڈاکٹر زور ایک تعارفی مضمون اور جناب سخاوت مرزا ایک تحقیقی مضمون "نوائے ادب" میں لکھ چکے ہیں۔[۵]

---

۵ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "نوائے ادب" بابت جنوری ۱۹۵۱ء و بابت جولائی و اکتوبر ۱۹۵۱ء۔

زین المجالس

مُصنّف یوسف مرگھے، سن تصنیف ۱۲۱۸ھ، صفحات ۲۷۰، شعر فی صفحہ ۱۱، خط نسخ، عُنوانات سُرخ روشنائی میں، سائز ۶×۹۔

یوسف صاحب کوکنی برادری کے ایک فرد ہیں، ان کا خاندانی لقب مرگھے ہے، یہ اپنے وقت کے فاضل اور با اثر لوگوں میں سے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے جناب فیض مآب سررابرٹ گرانٹ نائٹ جی، سی، ایچ نے انھیں قاضی شہر بمبئی کا منصب دے رکھا تھا، آج تک یہ منصب انھیں کی اولاد میں چلا آرہا ہے، چنانچہ آج بھی جناب قاضی محمد حسن مرگھے و جناب قاضی محمود مرگھے، دو بھائی جو بہ اعتبار رشتہ یوسف صاحب مرگھے کے پڑ پوتے ہوتے ہیں، یہ خدمت انجام دے رہے ہیں، اس سلسلہ میں سند کی جو نقل انھوں نے عطا فرمائی، اس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"سند"

"میں مسمّی رابرٹ گرانٹ نائٹ جی، سی، ایچ، صدر امور مملکت ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر و گورنر جزیرۂ بمبئی کی حیثیت سے۔ محمد یوسف صاحب بن محمد حسین مرگھے کو تمام مسلمانان بمبئی کے لئے قاضی و متولی مقرر کرتا ہوں، چنانچہ اِس حکمنامہ کے مطابق تمام مسلمانوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے مذہبی امور میں اُن کی اِقتدا کریں"

"اِس حکمنامہ کی رو سے محمد یوسف صاحب بن محمد حسین مرگھے کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ جُملہ فرائض بابت نکاح و دیگر رسومات و امور متعلق بہ مذہب کی خود سے نظامت فرمائیں۔"

"یہ (سند) بمبئی میں میرے دستخطوں اور مُہر سے ۳ ربیع الاوّل مطابق ۱۴ جون ۱۸۳۵ء کو جاری کی گئی ہے۔"

یہ حکم جناب فیض مآب سررابرٹ گرانٹ نائٹ جی، سی، ایچ۔ صدر امور مملکت ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر و گورنر جزیرۂ بمبئی و علاقہ جات ماتحت۔

دستخط، ڈبلیو، ایچ، واتھن

معتمد اعلیٰ حکومت برائے امور عدالت

خود مثنوی سے بھی مصنف کے حالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے، چنانچہ خاتمہ میں انھوں نے بتایا ہے کہ ابتدا ہی سے میرے بڑے بھائی شیخ محمد عطاء الدین مرگھے نے میری پرورش کی اور انھیں کے سائۂ عاطفت میں رہ کر میں نے اس کتاب کو مکمل کیا ہے، میرے قریبی دوستوں میں میاں صاحب مہری متخلص بہ قاسم اور بابو صاحب متخلص بہ فقیہ قابل ذکر ہیں، یہ لوگ بلند پایہ شاعر ہیں اور زین المجالس کی تدوین میں میری علمی مدد بھی کی ہے، وغیرہ۔ اشعار ملاحظہ ہوں،

صلاح پانے سے ان عالی مکاں کے — جو ہیں اُستاد شعرائے زماں کے
سخن داں پر خرد والا قدر او — سخندانی میں ہیں اب معتبر او
میاں صاحب تخلص ان کا قاسم — لقب مہری ہیں دانا مرد عالم
دگر ہیں قدوۃ الشعرا و ممتاز — سخندان و خردمند و سرافراز
کہ بابو صاحب ان کا نام نامی — فقیہ ان کا تخلص ہے گرامی
کئے ہیں مجھ پہ جو احساں انھوں نے — کتاباں بھی دئے ہیں گے جنھوں نے
جزائے خیر دیوے اُن کو سُبحاں — مدد سب پر رہیں سلطان جیلاں
خصوصاً بھائی صاحب میرے ذی قدر — شرافت کی بلندی پر ہیں جوں بدر
عطاء الدین ہیں شیخ محمد — لقب مرگھے، ہیں نیکی سے موید
کئے ہیں مجھ سے جو خوبی نہایت — لکھا جاوے نہ اس سے یک کتابت
نہ یوں اب کوئی کرے اپنے پسر سے — شفیق ایسے نہ کئیں دیکھا نظر سے
مری بیچارگی پر رحم لاکر — کئے ہیں پرورش تب تو سراسر
لکھا یہ نظم میں نے با فراغت — نہ تھی کس چیز کی دل پر ملالت
غرض ظلِ اعانت میں انھوں کے — لکھا اِن مجلسوں کو چین ہو کے
خدا یہ سایۂ رافت مرے سر — رکھے پائندہ قائم تا بہ آخر

اِس شفیق بھائی اور صاحب علم دوستوں کے علاوہ بھی انھوں نے اپنے ایک یار جانی معین الدین مقری کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے کہ انھیں کی تحریک پر ابتدا ابتدا میں میرے دل میں اس مثنوی کے لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور بعد میں بعض اور دوستوں کی خواہش سے یہ چیز تکمیل کو پہنچی۔

مرا اِس عصر میں اک یار جانی — گُلِ باغِ و دادِ مخلصانی

انیس خاص یارِ نیک تدبیر
خلاصہ دوستان و اہل توقیر
سخندانی کے ہے دریا کا گوہر
بلندی پر خودی کے جو ہے اختر
معین الدین مقری اس کا ہے نام
رکھے حق شاد و خرم اس کو مدام
کہا مجھ کو لے قرطاس و قلم ہات
رقم کر شاہ جیلاں کے کرامات
کہ تا اس بارگہ سے پاوے یاری
ترے سے یہ رہے اک یادگاری
سو اک مجلس لکھا تھا تب خوشی سات
اگیارہ سو اگیارہ تھے او ابیات
اِسے دیکھے ہیں میرے مشفقوں نے
محباں مہرباں و مونسوں نے
نوازش کر کہے ہیں بعد مجھ کو
اتی سن بات جو کہتے ہیں تجھ کو
بیاں کر یازدہ مجلس اسی دھات
کرے تا زینت مجلس طلوعات
کہا میں نے اگر چاہے خداوند
مرے بھی دل کا ہے ارمان ہر چند

انھیں مہربانوں اور بزرگوں میں ایک ان کے اُستاد بھی ہیں جن کی طرف صنعت توشیح کے ذریعہ اشارہ کیا ہے۔ اِس صنعت میں جب نظم یا نثر کے مصرعوں یا جُملوں کے سرحروف کو ملایا جاتا ہے تو اس سے کوئی نام حاصل ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں اپنے اُستاد کے نام کو ظاہر کرنے کے لئے یہی صنعت استعمال کی ہے۔

حصول شعر میرے ہات آیا
ضیا اس شمع دل نے میرے پایا
رضا اور لطف سے استاد کے ہو
ترشد باعث ارشاد کے ہے
مرے استاد حضرت مولوی ہیں
وحید العصر شیخ دہلوی ہیں
لسان الحق بیانِ علم دیں میں
ولی ہیں اولیائے کاملیں میں
یقیں ہیں اختر برج رشادت
مقرر گوہر درج سعادت
یہاں علامۂ دوراں ہیں ذی شاں
رئیس فاضلانِ اہلِ عرفاں
عجب ذات مبارک ہے مخیر
بھی ہیں در رشتۂ آل پیمبر
دگر ہیں شیخ اور درویش و عالم
امامت کے ہیں کشور بیچ حاکم
لباس ورع میں بادیں پناہی
لئے ہیں کشور رفعت کی شاہی
ہمیشہ ہے دنوں کا فیض جاری
دل و جاں اُن سے پاتے ہیں قراری
ہوا فیضوں سے ان کے بہرہ ور جب
لکھا ان مجلسوں کو نظم کر تب
وہیں سے یہ شرف پایا ہوں میں اور
یقیں ہے جو انھیں دیکھیں گے کر غور

مجھے فرمادیں خوش ہو خوب نادر دعا حق سیں کریں پھر اس کی خاطر
خلیل ان کو رکھے ہم سب پہ سبحان لکھوں کیا اور بھی ہے دل کا ارماں
ہر اک مصرع کا اول حرف چُن کر کرے مجمع تو ہووے نام ظاہر

آخری شعر کو تقریر کے مطابق ہر مصرع کا سرحرف چن کر ملایا جائے تو اس سے "حضرت مولوی میر عبد اللہ دہلوی مدظلہ العالی" حاصل ہوتا ہے، یہی ان کا استاذ کا نام ہے۔

اس سے زیادہ اور کوئی روشنی ان کے حالات پر نہیں پڑتی، مثنوی کے ایک مطبوعہ نسخہ میں اُن کی تاریخ وفات بھی درج ہے جو حسب ذیل ہے:۔

چو رفت قاضی یوسف بہ سوئے مصر عدم زر حلتش بہ دل جملہ مومناں غم بود
وفائے زار رقم کرد سال آں زہکا شب ادینہ و عاشورۂ محرم بود

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف زین المجالس کی ۱۲۴۳ تالیف کے بعد بھی تقریباً اڑسٹھ سال زندہ رہے، پتہ نہیں مثنوی کس عمر میں لکھی اور اس مثنوی کے بعد کچھ اور لکھنے کا موقع ملا بھی یا نہیں۔

بہر حال مثنوی کا موضوع شاہ جیلان کے حالات و کرامات ہیں جنھیں گیارہ ابواب میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، مضامین کی ترتیب میں مناقب غوثیہ تحفۂ راغبین، قلائد الجواہر، اور سفینۃ الاولیا سے مدد لی گئی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

کتابوں کے حوالہ سے ہے تحریر مُصنّف اس کے ہیں سب اہل توقیر
انوں سے یک مناقب غوثیہ ہے بھی تحفۂ راغبین کر دوسرا ہے
دگر سوم قلائد الجواھر سفینہ اولیا چوتھا ہے آخر
یہ چاروں سے مناقب منتخب کر دیا ترتیب ہر یک قسم اوپر
کیا ہوں یازدہ مجلس مرتب رکھا زین المجالس نام کر اب

ابتدا میں حمد و نعت کے تقریباً تیس شعر ہیں جس کے آخر میں اپنا نام یوسف بہ طور تخلص استعمال کیا ہے اور پھر استاذ وغیرہ کی تعریف کرنے کے بعد اصل مضمون شروع کیا ہے، خاتمہ میں سنہ تصنیف پر روشنی ڈالی ہے اور درود و سلام پر ختم کیا ہے۔
سنہ تصنیف سے متعلق اشعار یہ ہیں۔

کیا ہوں اس کے تئیں جب میں نے اتمام ربیع الآخر میں تھا ماہ فرجام

تھے بارہ سو پہ پندرہ سال ہجرت کہ پایا حق سے یہ تائید و نصرت

علاوہ ازیں "روضہ مناقب" سے بھی تاریخ نکالی ہے:-

اسے اتمام کر دیکھا ہوں پڑھ کر بہلنے کو لگا دل اس کے اندر
کیا تب فکر تاریخ مناسب کہا ہاتف نے "دہ روضۂ مناقب"
۱۲۱۵

ابتدا:-

جمیع الحمد بالتخصیص للٰلہ لہ محضاً جمیع العز و الجاہ
کہ اس نے باعث اظہار اکوان کیا ہے اشرف المخلوق انساں
اسی میں سے کیا پیغمبراں کو رسالت کے فلک کے اختراں کو

خاتمہ:-

قبولیت پہ رکھ کر یہ مناجات پڑھوں آخر بھی پیغمبر پہ صلوات
قلم رکھ مصطفےٰ پر کرکے تسلیم کیا اب ختم اس نامے کا ترقیم
پڑھو صلوات یارو ہوکے خوش حال کہ ہوگے دو جہاں میں اہل اقبال

ترقیمہ:-

"تمام شد این مجلس ہائے حضرت غوث الاعظم قدس اللہ سرہٗ العزیز بتاریخ نہم ماہ ذی قعدہ ۱۲۳۴ ہجریہ ...... کاتب الحروف مُلّا شیخ احمد بن شیخ محمد ابراہیم کھتے"۔

یہ مثنوی متعدد بار چھپ چکی ہے، چنانچہ اس کے جس مطبوعہ نسخہ کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ ۱۳۰۱ھ ہجری میں دوسری بار مطبع فتح الکریم بمبئی سے شائع ہوا ہے۔ اس کے خاتمہ میں محمد منظور کی مختصر سی تقریظ اور مُصنّف کی وفات اور مثنوی کے پہلے و دوسرے ایڈیشن کی تاریخیں بھی درج ہیں۔

مطبوعہ نسخہ کی زبان میں بہت کچھ کاٹ چھانٹ کی گئی ہے، یہاں تک کہ شعر کے شعر، مصرعہ کے مصرعہ بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں حمد و نعت کے بعد پیر کی تعریف میں بھی ایک مستقل باب ہے، جس میں مُصنّف نے اپنے پیر کا نام بھی صنعت توشیح ہی کے ذریعہ ظاہر کیا ہے، اشعار حسب ذیل ہیں:-

حمایت کو مجھے ہیں بس مرے پیر ضروریات میں ان سے مجھے دھیر
رضامندی کا ان کی میں ہوں خواہاں تشفّی ان کی میرے دل کا ارماں
دل و دیں استوار ان سے ہوا ہے لیاقت کا سبب اُن سے ملا ہے

دیانت داری و تقوٰی شعاری　　انھیں سے اب رہی عالم میں جاری
رئیس الاولیاء ہیں شیخ کامل　　شریف الناس، فرخندہ شمائل
امین گنج اسرار الٰہی　　ہمایوں تاجدار ملک شاہی
قوام الخلق قطب الوقت نامی　　امیر معرفت کشانِ سامی
دیارِ حق شناسائی کے سرور　　رہ توحید حقانی کے رہبر
یم فیض و عطا کے درِّ مکنوں　　قیاس خلق سے شان ان کی افزوں
دل و دلدار مقبولوں کے ذی شان　　سر آمد عارفوں کے فخر دوراں
ادب آموز حق کے طالبوں کے　　لطائف بخش سارے راغبوں کے
لبھاتے حق سے دل لوگوں کے فائق　　ہوے کامل ولایت ان سے شائق
سپہر مکرمت کے ماہ انور　　رفیع المنزلت ملکوت منظر
ہمیشہ ان پہ ہو رحمت خدا کی　　ملے ہم کو مدد ان کے عطا کی
سر مصرع سے یک یک حرف لے جو　　ملاوے تو ملے نام ان کا نیکو

اس سے حضرت والد ارشاد قادری قدس اللہ سرہم حاصل ہوتا ہے۔

بہار خلیل

مُصنّف نجم الدّین، سنہ تصنیف ۱۲۳۷ھ، صفحات ۱۸۱، شعر فی صفحہ ۱۳،
خط نستعلیق سائز ۶" × ۸"

نجم الدّین کے حالات تفصیلی طور پر معلوم نہ ہو سکے، تمہید سے جن حالات پر روشنی پڑتی ہو وہ صرف اس قدر کہ جس زمانہ میں انھوں نے یہ مثنوی مرتب کی ان کے والدین زندہ تھے، اُن کا ایک بڑا بھائی بھی موجود تھا، جس کا نام غلام حسین بتلایا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:-

جو ہیں قبلۂ دو جہاں والدین　　مرے کعبۂ جاوداں والدین
تو رکھ ان کو خوش دل بہ عمر دراز　　دو عالم میں دونوں کو کر سرفراز
جو ہیں بھائی صاحب مرے مہرباں　　دو جگ میں تو رکھ اس کو باعزّ و شاں
کہ ہے نام اس کا غلام حسین　　معاون ہیں جس کے امام حسین

غلام حسین مصنّف کے ایک مہربان بھائی ہی نہ تھے بلکہ مربّی اور اُستاد بھی

تھے، بہار خلیل کی تدوین میں بھی انھوں نے کافی مدد کی ہے اور اس کی خاطر بہت کچھ رنج و غم برداشت کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

کیا نظم دکھنی کو جب اختتام — دکھایا برادر کو اپنے تمام
جو میرا شفیق اور استاد ہے — جسے علم و فضلِ خداداد ہے
ہے روشن اسی سے چراغ سخن — معطر ہے جیوں گل دماغ سخن
دیا اس کو اصلاح ترتیب سے — مزین کیا ایک ترکیب سے
ہوئی اس کی تائید سے یہ کتاب — بنایا او ذرے کے تئیں آفتاب
اٹھایا بہت اس کی خاطر او رنج — سخن کے گہر سے کیا جمع گنج
کرے عاقبت خیر اس کی خدا — رکھے اس کو خوش دو جہاں میں سدا

اس طرح مثنوی میں اپنے بھائی کا ذکر کئی جگہ کیا ہے، مثنوی کی زبان جس طرح خود مصنف نے اوپر اشارہ کیا ہے دکھنی ہے،

مثنوی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے حالات سے متعلق ہے، چنانچہ تمہید میں وجہ تالیف پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا ہے کہ معین الدین منشی الہی کی کتاب معارج النبوۃ نظر سے گذری، اس میں انبیاء کے حالات نقل کئے گئے ہیں، اس کا ہر ایک واقعہ نورٌ علی نور ہے، خاص کر ابراہیم خلیل اللہ کا واقعہ اپنے اندر ایک خاص تاثیر رکھتا تھا، جی میں آیا کہ اس کو فارسی سے دکھنی میں منتقل کردوں، لہذا میں نے ترجمہ کردیا۔

معارج نبوہ جو ہے دل پذیر — سیر اور تواریخ میں بے نظیر
کہ جس میں رسولاں کا مذکور ہے — ہر یک قصہ نورٌ علی نور ہے
مصنف ہوا اس کا او عالی جناب — کہ جس کا تھا منشی الہی خطاب
معین الدین نام اس کا معروف ہے — کتاب اس کی مقبول و موصوف ہے
کیا ہے بیاں فارسی میں تمام — سراپا ہے اعجاز اس کا کلام
روایت سے اس کی اتھا بس کہ شوق — مرے دل میں پڑھنے سے ہوتا ہے ذوق
خصوصاً خلیل خدا کا بیاں — ہوا دل نشیں اور مرغوب جاں
کہا تب مرے دل نے اس طور سے — سن اے نجم الدین بات کو غور سے
جو ہے فارسی شعر میں یہ تمام — سو معلوم کرتا نہیں ہر کدام
بس اب نظم دکھنی میں اس کو اگر — کرے ترجمہ سہل اور خوب تر

پڑھیں گے عقیدت سے سب مو وزن جہاں میں رہے یادگار سخن

مثنوی حمد و نعت اور مناجات سے شروع ہوتی ہے، خاتمہ میں اپنی کتاب کی مقبولیت کے لئے دُعا کی ہے اور سنِ تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے۔

مرتب ہوئی جب بہار خلیل بجا لا کے میں شکر رب جلیل
کیا سال ہجری کو تعداد جب تھی سن بارا سو اور سینتیس تب

علاوہ ازیں شعر سے بھی تاریخ نکالی ہے۔

ہوا غیب سے یوں ندا اے جلیل "ہو ہر دل عزیز یہ بہار خلیل"

اس شعر میں دوسرے مصرعہ سے ۱۲۳۷ نکلتے ہیں۔

ابتدا:-

الٰہی تجھے حمد شایان ہے دو جگ پر ترا فضل و احسان ہے
دیا جسم آدم میں تو روح کو بچایا ہے طوفان میں نوح کو
کرم کرکے ادریس پر اے کریم کیا ہے تو جنت میں اس کو مقیم

خاتمہ:-

پھر اک عرض ہے میری کر مستجاب کہ جس نے دیا انتظام کتاب
وہ ہے بھائی صاحب غلام حسین بخشنا اسے بھی بہ نام حسین
محمد پر اور ان کے سب آل پر اور اصحاب پر جو ہیں والا قدر
تو ہر دم کہا نت درود و سلام ہوا نام پر ان کے ختم کلام

ترقیمہ:-

"این کتاب کاتب و مالک شیخ مصطفےٰ بن شیخ آدم ساکن بندرِ مالوانہ تعلقہ سیندی درگ، تحت الوقت العصر بروز شنبہ، تحریر فی التاریخ بست و یکم محرم الحرام ہجری نبوی ۱۲۶۳ھ ، گرکسے دعوی کند باطل است"

یہ کتاب متعدد مرتبہ بمبئی میں طبع ہو چکی ہے اور بازاروں میں ملتی ہے۔

حُسن و دل

مُصنف و سنہ تصنیف نامعلوم، صفحات ۳۵، شعر فی صفحہ ۱۳، خط نستعلیق، سائز ۶" × ۹"

یہ ایک منظوم تمثیل ہے جس میں، حُسن و دل، عقل، عشق، ہمت،

نظر اور اسی طرح بعض دوسرے متعلقات کو افراد قرار دے کر نہایت دلچسپ انداز میں حسن وعشق کی کرشمہ سنجیاں بیان کی ہیں۔

اِس کا ماخذ ایک فارسی مثنوی "حسن و دل" ہے، جس کا ایک نسخہ یونی ورسٹی لائبریری میں بھی موجود ہے، ڈاکٹر عبدالحق نے سب رس کے مقدمہ میں اِس موضوع سے متعلق جن تصانیف کا ذکر کیا ہے، اُن میں اِس دکھنی مثنوی کا بھی حوالہ موجود ہے۔ اس میں انھوں نے وہ خلاصہ بھی دیدیا ہے جو اِن تصانیف کا مشترک موضوع ہے۔

فارسی مثنوی نہایت تفصیلی ہے، اس میں حمد و نعت ۔اور دیگر مضامین کو کئی صفحوں میں بیان کرنے کے بعد اصل واقعہ کو شروع کیا گیا ہے، لیکن یہ دکھنی مثنوی بہت مختصر ہے، اس میں حمد و نعت کے صرف تین شعر ہیں اور پھر اس طرح واقعہ شروع کر دیا ہے:۔

ایک قصا نادر سنو کہتا ہوں ایتا — بولتا ہوں میں بڑی سی شان کا
یوں سُنا ہوں شہر مغرب کی نقل — بادشاہ اِس شہر میانہ تھا عقل

خاتمہ میں عاشقوں کی کامیابی کے لئے دُعا کی ہے اور خود بھی رحم و کرم کا طالب ہوا ہے، چنانچہ کہتا ہے :۔

یا الٰہی اِس وضع سب کو ملا — غنچۂ اُمید یوں دل کا کھِلا
ہے سکت او تجھ میں قادر ذوالجلال — یوں بھی کرتا ہے عرض بخشو اماّل
جو بھی چہتا ہے حُسن کا مبتلا — یا الٰہی بیگ اس کو بھی ملا
جو رہیں مل مل ہمیشہ صبح و شام — آرزو رکھتا ہوں یو دل میں مدام

خاتمہ کے بعض اشعار سے شُبہ ہوتا ہے کہ مصنّف کا نام خاتم ہوگا۔

ابتدا:۔

حمد بے حد اس خدائے پاک کوں — کہ شرف بخشا مٹھی بھر خاک کو
نور سوں اپنے نبی پیدا کیا — شرف سب خلقت منے ان کو دیا
اور محمد پاک ہے تیرا رسول — دین کو جس کے کیا سب نے قبول

خاتمہ:۔

یا الٰہی خاتم اوپر کر کرم — راکھنا مردوں کے میداں میں شرم
شوق سے رکھتا سبی خاتم خبر — جو سُنا تھا یو قصہ اِن سر بسر
اس وضع دیکھتے ہی بولا ہے تمام — فضل سے حق کے کہا ہے والسّلام

ضمیمۂ

مقالہ نما

مرتبین

عالی جعفری

عصمت جاوید

فضل اللہ فاروقی

ضروری نوٹ :-

مقالہ نما میں شامل شدہ مضامین کی نقل حسب طلب دو آنے فی صفحہ کی اجرت پر مہیا کی جا سکتی ہے۔ تاہم کسی مضمون کی نقل ایک روپیہ سے کم اجرت پر فراہم نہیں کی جائے گی۔

فہرست عنوانات

مذہبیات

۔ انور۔ انوارالحسن:

انوار تجلیات

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ مئی۔

قرب بالنوافل اور قرب بالفرائض۔ زمان عمر برحق کا ہونا
ما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ کی حقیقت،
نا کی اصلیت اقبال کے ماخذ، اقبال اور تقدیر کا ماخذ کیا
تھا، آخر میں کہا ہے اقبال نے تقدیر کے مسئلہ میں اپنا جو نظریہ
ش کیا ہے وہ ان کا نہیں ہے بلکہ خواجہ معصوم نے تقدیر کی
قسمیں پہلے بیان کر دی ہیں انھیں سے استفادہ کیا ہے۔

۔ بھگوان داس۔ ڈاکٹر۔

انسانی زندگی میں دعا یعنی پرارتھنا کی جگہ

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴، مئی ۲۹۵ ـ ۳۰۶)

ویدوں کی سندھیا، عیسائیوں کی دعا، مسلمانوں کی نماز،
میکہ تمام مذاہب کی دعائیں حقیقت میں ایک ہیں۔ حتّیٰ
ایک سائنس داں کی دھن بھی ایک قسم کی دعا ہے۔ مقابلے
مختلف مذاہب کی دعائیں پیش کرنے کے بعد ان کی باہمی مماثلت
روشنی ڈالی گئی ہے اور دکھاوے کی عبادت کی مذمت کی گئی ہے۔

۔ بھگوان داس۔ ڈاکٹر:

دھرم کا جسم اور اس کی روح

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴ جون، ۳۵۸ ـ ۳۷۲)

دنیا کے تمام بڑے مذاہب کی مقدس کتابوں سے
رہ و توبہ کے بارے میں حوالے اور صوفیوں کے اقوال و
ار ہندو دھرم سے مختلف اشلوک اور اقوال پیش کرنے کے بعد آخر
ا ہے کہ دھرم یا مذہب کے اوپری ردیوں سے ہٹ کر دھرم یا مذہب کے اصلی
ر کی طرف یعنی اپنے اندر کی طرف رخ کرنا ہی سچے دھرم اور دین کی
ے بڑھنا ہے، یہی مذہب کے جسم سے مذہب کی روح
ف جانا ہے یہی انسانی ایکتا کو سمجھا اور اپنے اور سب کے
کے ایشور اللہ کو پہچانتا ہے۔

۴۔ جعفر شاہ۔ محمد:

فرمانِ رسول

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴، اپریل ۱۳ ـ ۱۴)

لعنت ملامت کے سلسلہ میں رسول پاک کی چند حدیثیں
اور ان کا ترجمہ۔

۵۔ جعفر شاہ، محمد:

فرمانِ رسول

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ مئی۔ ۱۱ ـ ۱۳)

مضمون میں ہمسایوں کی گواہی کی اہمیت احادیث رسول
سے پیش کر کے اچھے ہمسایوں کی مثال دی ہے اور تلقین کی ہے کہ
خوش گوار زندگی آپس میں مل جل کر رہنے ہی سے نصیب
ہو سکتی ہے۔

۶۔ خلیفہ عبدالحکیم:

اسلامی ثقافت کی روح

(ماہ نو، کراچی، ۵۴، اپریل ۷ ـ ۱۴)

مسلمانوں کی پستی و انحطاط کے اسباب پر مختلف طبقوں
نے جو روشنی ڈالی ہے کہ اسلام کی تباہی کا سبب یہ ہے کہ مسلمان
حقیقت میں مسلمان ہی نہ رہے۔ کسی نے کہا کہ دنیا مومن کا قید خانہ
ہے اصل چیز آخرت ہے ایسے وقت میں اقبال جیسا مفکر پیدا
ہوا اور بتایا کہ اسلام کی ماہیت اور اس کی اصلی روح کیا ہے پھر
اسلامی ثقافت کی روح کی تشریح و توضیح کی ہے۔

۷۔ خورشید احمد فارق۔ ڈاکٹر:

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(برہان دہلی، ۵۴، مئی)

مقدسی کی کتاب "احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم" کا
تعارف، یہ کتاب لیڈن میں چھپی، اس میں نہ صرف سلطنتوں اور
جغرافیہ کے بارے میں تفصیلی معلومات ہیں بلکہ مختلف اسلامی
ریاستوں اور ملکوں کی سماجی مذہبی، اقتصادی حالت کا تقابلی

جا ئزہ دیا گیا ہے۔ اس میں چوتھی صدی ہجری کے رسوم روایات، فرقوں، تجارت، محصول، اخلاق، اور زبانوں کا ایک منظم گو کسی حد تک ناکافی خاکہ پیش کیا ہے۔

۸۔ فضل قدیر ندوی:

تفسیر القرآن
دین و دنیا کی ہم آہنگی

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴، اپریل ۱۱ — ۱۲)

چند آیتیں اور سائنس کی ہم معنی چند حدیثیں ان کے تراجم اور ان کی تفسیر و تشریح پیش کی گئی ہے۔

۹۔ عبد الرشید، خواجہ:

ارتقاء انسانی کا ایک نیا زاویۂ نگاہ

(معارف اعظم گڈھ، ۵۴، اپریل ۲۴۵ — ۲۶۰)

انسان کی تخلیق اور اس کے ارتقاء پر ایک نئے نقطۂ نظر سے جو مذہب تاریخ اور سائنس سے ملا جلا ہے، روشنی ڈالی ہے، محی الدین ابن عربی کے قول کہ آدم سے ابتدائے آفرینش نہیں ہوئی بلکہ آدم سے پہلے بھی دنیا میں لوگ موجود تھے اور اللہ تعالیٰ نے دو لاکھ آدم پیدا کئے۔ ان دو نظریوں کو سامنے رکھ کر، تخلیق انسانی، تخلیق اولی، و ثانیہ، بشر، آدم، کے موضوع پر قرآن اور سائنس کی روشنی میں بحث کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ شیخ اکبر کا نظریہ غلط تھا۔

۱۰۔ عبد السلام قدوائی:

ہندوستان کا نیا دور اور مسلمان

(الفرقان لکھنؤ، ۵۴ مئی جون، ۳۶ — ۴۵)

مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ حکومت و اقتدار کو عزت کے بجائے ایک ذمہ داری اور بار گراں خیال کرتے تھے، پھر آگے چل کر مسلمانوں میں حرص اقتدار و حکومت، اختلاط، اور کمزوری حقیقت سے منہ موڑ کر دینا طلبی اور خاص طور سے ہندی مسلمان حکمرانو میں شروع ہی سے یہ جذبہ رہا اس نئے دور میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ اسلام کی صحیح تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کریں، خود اخلاق و کردار کا نمونہ بن کر دوسروں کے سامنے صحیح اسلام پیش کریں۔

تب دوسری قوموں کو اپنا ہمدرد اور خیر خواہ بنا لیں گے اور ہندوستان میں ایک صحیح اور پر اخلاص ہمدردانہ فضا پیدا کر دیں گے۔

۱۱۔ غوث محمد، ڈاکٹر:

جنایات بوجہ غفلت
(مسلسل)

(معارف، اعظم گڈھ ۵۴، اپریل ۲۶۱ — ۲۷۵)

عنوان کی دسویں فصل اور چھٹا باب ہے جس میں آقا کی ذمہ داری " اس مضرت کی بابت جو ملازمین کو پہنچے اور اجیر مشترک کی ذمہ داری" کے اسلامی اصول و قوانین کی تشریح کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں انگلستان کے قانون کو بھی مد نظر رکھا گیا ہے۔

۱۲۔ غوث محمد، ڈاکٹر:

جنایات بوجہ غفلت
ساتواں باب اجیر مشترک کی ذمہ داری

(معارف، اعظم گڈھ ۵۴ مئی ۳۶۴ — ۳۸۲)

اجیر مشترک سے متعلق فقہا کی رائیں۔ مثالیں۔ اور مثالوں سے نتائج مستنبط کر کے وضاحت کی گئی ہے۔ آخر میں انگلستانی قانون کی مستثنیٰ صورتوں کا اسلامی فقہ سے مقابلہ کیا ہے۔

۱۳۔ غوث محمد ڈاکٹر:

جنایات بوجہ غفلت

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ جون ۴۳۷ — ۴۵۱)

مندرجۂ ذیل عنوانات پر انگلستان کے قوانین اور اسلامی قوانین، فقہی کتابوں سے مثالوں کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔

(۱) نالش بعد موت

(۲) امور متعلق بہ ثبوت (الف) بار ثبوت (ب) پیش آمدہ حالات سے ان کی نوعیت کا تعین۔

(ج) کوئی شخص اس مضرت کی شکایت نہیں کر سکتا جس پر وہ رضامند ہوا ہو۔

(باقی)

۱۴۔ فضل قدیر ندوی:

تفسیر

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ء جون ۹۔۱۱ اور ۱۸)

رمضان اور قرآن کی وجہ تسمیہ اور روزے کے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

۱۵۔ کمار پا۔ جے۔ سی۔ ڈاکٹر:

شانتی کا یقینی راستہ

(نیا ہند، الہ آباد ۵۴ء جون ۷ ۲۷۷۔۲۷۹)

دنیا میں ایٹم اور ہائیڈروجن بموں کی ایجاد سے امن وشانتی کے بہت سے طریقوں پر سوچ بچار کیا جارہا ہے لیکن کوئی یقینی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر جنگ روکنی ہے اور امن قائم رکھنا ہے تو موجودہ نظام زندگی کو بدلنا ہوگا۔ اور سروودے کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ سروودے کی تشریح اور تعریف۔

۱۶۔ لاہوتی:

تصوف کا پہلا دور

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴ء، اپریل ۲۱۔۲۳)

مسلمانوں میں دور اکبری میں جو عقائد میں تزلزل پیدا ہوگیا تھا اسے حضرت مجدد الف ثانی نے بہت حد تک دور کیا آخر دور میں شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان والوں نے بدعات کی طرف سے متنبہ کیا اور خالص اسلام پیش کیا۔ آخر میں شاہ ولی اللہ کی ہمعات سے "تصوف کا پہلا دور" عہد رسالت کا مختصر خلاصہ دیا ہے۔

۱۷۔ "م":

بزرگان دین

(فیض الاسلام۔ راولپنڈی ۵۴ء مئی، ۱۴۔۱۵)

حضرت سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے حالات زندگی اور ان کے اقوال پیش کئے ہیں۔

۱۸۔ محفوظ الکریم معصومی:

یوذ اسف

(برہان دہلی، ۵۴ء مئی، ۳۵ — ۴۵)

معارف کے پچھلے نمبروں میں قرآن کے صابئین اور بودھ مت سے متعلق کئی مضامین نکلے تھے۔ مولانا گیلانی مسعودی اور بیرونی کے دلائل کو مانتے ہوئے قرآن کے صابئین دراصل بودھ مت کے معتقدین تھے، سلسلہ کا دوسرا حلقہ رنگون کے ایک ندوی فاضل کا ہے۔ اصل مسئلہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے بودھ مت کے بعض خاص الفاظ کی بابت مختصر طور پر مفید باتیں پیش کی گئی ہیں۔ مضمون نگار نے تین لفظ۔ بد۔ یوذ اسف، اور سمینہ سے متعلق بحث کی ہے اور لغت وتاریخ سے دلائل پیش کئے ہیں۔

۱۹۔ منظور نعمانی:

اسوقت کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ اور ہمارا سب سے اہم فرض انسانوں کو انسان بنانے کی جدوجہد

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ء، مئی جون۔ ۴۴ — ۷۲)

فروری ۵۴ء میں بستی میں تبلیغی جماعت کا دورہ ہوا تھا ایک جلسۂ عام میں نعمانی صاحب کی تقریر کہ انسانیت کو اپنا مرتبہ پہچاننا ضروری ہے تاکہ انسان روحانیت کی طرف توجہ کرے، مادیت سے کبھی انسان فلاح ونجات نہیں پا سکتا۔ یورپ وامریکہ اور دوسرے ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

۲۰۔ منظور نعمانی:

قرآنی دعوت

(۹)

(الفرقان لکھنؤ۔ ۵۴ء، مئی جون۔ ۹ — ۱۸)

قرآن میں خدا کی ہستی اس کی صفات وتوحید کے بعد آخرت کا درجہ ہے۔ مضمون میں آخرت سے متعلق متعدد آیات اور ان کا ترجمہ وتفسیر پیش کرکے آخرت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۲۱۔ منظور نعمانی:

معارف الحدیث

(مسلسل)

(الفرقان لکھنؤ، ۵۴ء مئی جون؛ ۱۹ — ۲۴)

احادیث رقاق، مختلف کتب احادیث سے یکجا کرکے متن، ترجمہ اور تشریح بہت شگفتہ انداز میں پیش کی گئی ہیں۔

۲۲۔ ولی الدین میر۔ ڈاکٹر:

مذاہبی زندگی کے چند حقائق

(الفرقان لکھنؤ۔ ۵۴، مئی جون، ۲۷-۳۵)

امریکی فلسفی جارج سنٹیانا روحانیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے: " روحانیت سے مراد نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے۔" "روحانیت ہے"۔ تیسرے کی محبت ہر مخلوق میں جبلی طور پر پائی جاتی ہے اور خیر مطلق کو افلاطون نے دوسرے لفظوں میں (۴۰۵) حق کہا ہے اور دوسرے تمام مذاہب نے اسی حقیقت کو اپنے اپنے الفاظ میں خدا، یزدان، اللہ، ایشور، گاڈ، اسی ایک حقیقت کے نام ہیں۔ آگے چل کر اس نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنے کے لئے جو زندگی میں انقلاب ہوتا ہے وہ یہ ہیں۔ تزکیہ نفس اور تحمیدہ سیر، اپنے نفس کو رذائل سے پاک کرکے دنیاوی اسباب ظاہری سے اپنے کو نجات دے تب ماسوا سے چھوٹ کر ذات حق سے توسل حاصل ہوگا۔

تذکرہ و سیرت نگاری

۲۳۔ ابراہیم محمد۔ قاضی:

ملا عبدالقادر بدایونی اور ان کی تاریخ منتخب التواریخ

(معارف اعظم گڈھ۔ ۵۴، اپریل، ۲۹۱-۳۰۵)

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اپنے اور اپنے معاصرین کے جو حالات و واقعات بیان کئے ہیں، کتاب سے متعدد حوالوں کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے۔

۲۴۔ ابراہیم محمد، قاضی:

ملا عبدالقادر بدایونی اور ان کی تاریخ منتخب التواریخ

(۲)

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ مئی، ۳۴۰-۳۵۷)

ملا عبدالقادر بدایونی اپنے حالات منتخب التواریخ کی مختلف جلدوں میں لکھے ہیں۔ ان سب کو یکجا مرتب کرکے پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بدایونی نے دربار اکبری کے بہت سے امرا وشعراء اور ان کے علاوہ دوسرے صلحاء وصوفیا اور شعراء کے مختصر حالات اور اشعار پیش کئے ہیں۔

۲۵۔ اختر رانپوری:

قاضی نذرالاسلام

(ساقی، کراچی ۵۴ جون ۱۲-۱۳)

قاضی نذرالاسلام ضلع بردوان کے ایک گاؤں میں ۱۸۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ عربیت میں تربیت پائی۔ پہلی جنگ عظیم میں ملازمت کی اور واپسی کے بعد بنگالی ادب شاعر نذرالاسلام سے روشناس ہوا۔ انھوں نے بنگالی ادب میں اسلامی روایت فارسی وعربی کے الفاظ، جدید بحریں، غزل، جوش، قوت سبھی کچھ ٹیگور کے علی الرغم دیا۔ ان کے ہاں بڑا خلوص پایا جاتا ہے۔

۲۶۔ ادارہ:

بہادران اسلام

(فیض الاسلام۔ راولپنڈی ۵۴، اپریل، ۱۷-۲۰)

حضرت طلحہ اور حضرت ابوذر غفاری کے مختصر حالات زندگی۔

۲۷۔ ادارہ:

بہادران اسلام

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ مئی، ۱۷-۲۰)

حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت ابوذر غفاری کے حالات زندگی اور ان کے کارنامے۔

۲۸۔ ادارہ:

حضرت ابوذر غفاری

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ جون، ۱۹-۲۱)

آخری قسط۔ حضرت ابوذر غفاری کی تجہیز وتکفین کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۲۹۔ اطہر حسین جعفری:

فٹز جرلڈ مترجم رباعیات عمر خیام

(آج کل دہلی، ۵۴ جون، ۱۵)

رباعیات عمر خیام جس خراب و خستہ مکان میں ترجمہ کی گئی اس کا جاء وقوع، اور فٹز جرلڈ کے دلچسپ حالات زندگی۔

۳۰۔ تصدق حسین:

اچھوتیاں

(نگار لکھنؤ ۵۴ جون، ۱۱ — ۱۵)

اچھوتیاں شاہ نصیر الدین حیدر کے داماجی ایک کاتبہ ہیں ابتداء میں یہ کوچہ اچھوتیاں میں مقیم تھیں۔ بعد میں درگاہ بارہ امام میں منتقل ہوگئیں۔ شاہ نصیر الدین کے بعد جب محمد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو انھوں نے ان "حرم دوازدہ امام علیہ السلام" کو آزاد کر دیا۔ مصنف نے دربار اودھ کے حوالے سے سہ پارہ نامی ایک اچھوتی کی آوارگی کے واقعات مختصراً پیش کئے ہیں۔

۳۱۔ جعفر شاہ، محمد:

حضرت ابو بکرؓ

(فیض الاسلام، راولپنڈی۔ ۵۴ مئی ۲۱)

حضرت ابو بکر خلیفۂ اول کو بحیثیت رفیق سوت پیش کیا گیا ہے کہ آپ ابتداء اسلام سے لے کر آخر تک رسول اکرم کے کیسے فدائی رہے۔

۳۲۔ جلیل قدوائی:

شاد عظیم آبادی

(ماہ نو کراچی، ۵۴، ۱۶ — ۲۲)

شاد عظیم آبادی کے مختصر حالات زندگی پیش کرنے کے بعد یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ سوز و گداز کے باوجود شاد کا کلام میر کے کلام سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ میر ذاتی خلش کے دائرہ میں محدود ہیں اور شاد کا میدان وسیع تر ہے۔ ان کا کلام درد و حافظ کے رنگ میں ہے۔ زور بیان انیس کی یاد دلاتا ہے اور عاشقانہ کلام میں آتش کا رنگ جھلکتا ہے۔ شیفتہ نگاری و مصوری ان کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔

۳۳۔ حبیب الرحمن الاعظمی:

حیات شیخ عبدالحق محدث

(برہان دہلی، ۵۴ اپریل، ۲۱۳ — ۲۳۱)

شیخ عبدالحق محدث سے متعلق دوسری قسط جس میں ان سے متعلق مزید معلومات پیش کی گئی ہیں۔

۳۴۔ خالدی محمد:

خالد بن سنان العبسی

(۲)

(برہان دہلی، ۵۴ مئی، ۵ — ۲۱)

خالد بن سنان کے نبی نہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ نوسین کے بادیہ نشینوں میں تھا، تفاسیر اور سب احادیث اس بات پر متفق ہیں کہ خالد بن سنان نبی نہیں تھا۔ اس دعوے کے ثبوت میں قرآن اور مفسرین کے مختلف حوالے پیش کئے ہیں۔ آخر میں ان کتابوں کے نام دیئے ہیں جن سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تعداد ۵۰ ہے۔

۳۵۔ خلیل الرحمن،

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

(ماہ نو، کراچی ۵۴ جون، ۱۵ — ۱۸)

ریڈیو پاکستان لاہور کی ایک تقریر، شیفتہ کے حالات اردو زبان میں سب سے پہلے ان کا تنقیدی تذکرہ، ان کے اردو و فارسی کے چند اشعار شیفتہ کی تصانیف۔

۳۶۔ رادھا رمن۔

میری کشمیر یاترا

(ہندستانی ادب حیدرآباد (دکن)، ۵۴ مئی ۲ — ۱۴)

کشمیر کے سفر وہاں کے حالات، وہاں کے مناظر وغیرہ کی کیفیت بیان کی ہے۔

۳۷۔ صباح الدین عبدالرحمن

سلاطین مملوک کے عہد کا ایک گمنام مگر بڑا افریقی شاعر شمس دبیر

(معارف اعظم گڑھ، ۵۴ مئی ۳۳۵ — ۳۳۹)

مولانا شمس الدین دبیر کی حیثیت سے شخصیت، ان کے

بارے میں مورخین کے اختلافات اور ان کی تصحیح کرتے ہوئے ان کے حالات زندگی اور ان کا ایک ہی قصیدہ جو پایا جاتا ہے پیش کیا ہے۔

۳۸۔ طٰہٰ حسین۔ ڈاکٹر:
عبدالحمید۔ مترجم۔

عثمانؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں

(برہان دہلی، ۵۴، جون، ۱۷ — ۲۸)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے الفتنہ الکبریٰ کے عنوان سے تین کتابیں لکھی ہیں عثمانؓ۔ علیؓ۔ معاویہؓ۔ یہ پہلی کتاب کے چند ابتدائی اوراق ہیں۔ اس میں بطور تمہید بادشاہت آمریت اور جمہوریت کے تجربات اسلامی نظام حکومت وخلافت پر روشنی ڈالی ہے۔

۳۹۔ ظ۔ انصاری:

جارج برنارڈ شا

(آج کل دہلی ۵۴ مئی، ۲۶ — ۳۰)

شا کی ابتدائی زندگی اور پھر اس کے حالات، اس کی انفرادیت پسندی، قوت تنقید، طنز اور انسان دوستی اور اس کے خاص انداز فکر پر روشنی ڈالی ہے۔

۴۰۔ عرشی:

حکیم الشعراء طغرائی

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ جون ۳۵ — ۳۹)

صاحب مضمون نے اپنی ذاتی معلومات کی بنیاد پر حکیم طغرائی کی شاعرانہ استعداد وسعت مطالعہ، اصلاح شعر کی صلاحیت، عالی ظرفی، اور تنقید کی صلاحیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے تلامذہ اور خاندان کے دیگر افراد کا بھی ذکر کیا ہے۔

۴۱۔ گیلانی۔ مناظر احسن:

ایک سیاسی قوال کا عروج وزوال

(الفرقان ۵۴، اپریل، ۳۳ — ۴۸)

ہشام بن عبدالملک کے زمانے میں خالد بصرہ، کوفہ، عراق اور خراسان کا حاکم بنا تھا مضمون میں اس کی داد ودہش تول اور رفاہ عام کے کام سے متعلق باتیں بتائی گئی ہیں۔

۴۲۔ لاہوتی:

سرمد کے متعلق جدید تحقیق

(فیض الاسلام، راولپنڈی، ۵۴، مئی)

اسلامک کلچر حیدر آباد کے جوبلی نمبر میں ڈبلیو۔ جی فشل کے مضمون کا خلاصہ کہ سرمد حقیقت میں یہودی تھے اور آخر تک اپنے مذہب کی تبلیغ میں کوشاں رہے جس کی وجہ سے انھیں قتل کیا گیا۔

۴۳۔ "م"

بزرگان دین

(فیض الاسلام راولپنڈی ۵۴، اپریل ۱۵ — ۱۶)

حضرت مخدوم جہانیاں کی کتاب سراج الہدایہ سے آپ کے ملفوظات فقہ کے سلسلہ میں جن چند باتوں کو گنایا ہے ان میں سے بعض توبہ، زہد، عبادت، صبر عرفان وغیرہ کی تشریح کی ہے۔

۴۴۔ ابراہیم محمد، قاضی:

تاریخ بدایونی پر ایک اجمالی نگاہ

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ جون، ۴۲۰ — ۴۳۴)

تیسری قسط۔ عبدالقادر بدایونی کی تالیف تاریخ بدایونی میں مختلف علماء، فضلا، شعراء اور ان کے سرپرستوں کا جو حال درج ہے انھیں مع اقتباس پیش کیا ہے۔

۴۵۔ محمد خالدی:

خالد بن سنان العبسی

(برہان دہلی، ۵۴، اپریل، ۱۹۷ — ۲۱۲)

عام طور پر یہ مشہور ہے حضرت عیسٰی اور حضرت محمدؐ کے درمیانی زمانے میں دنیا کسی خطہ میں کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوا لیکن بعض عربی روایتوں میں خاص جزیرۃ العرب میں ایک شخص خالد بن سنان العبسی کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ نبی تھے مقالہ میں ان سے متعلق منتشر مختصر معلومات کو یکجا کرکے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخی تحقیق کے لحاظ سے خالد بن سنان اور اس کی نبوت کی کیا حیثیت ہے (باقی آئندہ)

۴۶۔ محمد عاقل:

آزادی کی قربان گاہ پر

(نگار لکھنؤ، ۵۴ جون، ۳۰ — ۳۲)

انقلاب فرانس میں میڈم رولینڈ نے عملی حصّہ لے کر اپنی جاں قربان کر دی، مضمون میں اس خاتون کے مختصر حالاتِ زندگی اور قربانی کا حال بیان کیا گیا ہے۔

۴۷۔ نسیم احمد افریدی:

خواجہ ابرار خواجہ حسام الدّین

(الفرقان لکھنؤ، ۵۴ مئی جون، ۷۳ — ۸۴)

خواجہ ابرار حضرت خواجہ باقی باللہ کے خاص دوستوں اور دوسرے بڑے اہل تصوف میں سے ہیں، پیدائش ۹۷۷ھ خواجہ صاحب کو اکبر نے زمرۂ امرا میں داخل کیا تھا لیکن انھیں دنیا و اہل دنیا سے لگاؤ نہ تھا۔ آخر اکبر نے انھیں منصب سے رخصت دیدی اور آپ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں مرتبہ کمال کو پہونچے۔ حضرت مجددؒ الف ثانی نے خواجہ ابرار کو ۱۳ خطوط لکھے ہیں جو حضرت مجددؒ کے مکتوبات میں موجود ہیں۔

۴۸۔ ہارون خاں شروانی:

ز۔ خ۔ ش اور ان کی شاعری

(سب رس، حیدرآباد (دکن)، ۵۴، اپریل ۳۰ — ۲۴)

نواب سر مزمل اللہ خاں کی چھوٹی صاحبزادی زاہدہ خاتون شروانیہ جو ز۔ خ۔ ش کے نام سے دنیائے شاعری میں مشہور ہیں۔ ان کے حالات زندگی، ان کی شاعری اور کلام سے انتخاب۔

۴۹۔ یوسیس:

تھامس ایڈیسن

(ہندستانی ادب حیدرآباد (دکن) ۵۴ مئی)

ایڈیسن کے حالات زندگی اور اس کی بعض ایجادات کا مختصر بیان۔

تاریخ و سیاسیات

۵۰۔ برق:

بابر کا دورِ حکومت (مسلسل)

(فیض الاسلام راولپنڈی، ۵۴، اپریل)

تاریخی کتابوں کے حوالوں سے بابر کا انصاف، علم و تحقیق، موسیقی و مصوری سے دلچسپی اور اس کی سیاسی پالیسی پر مختصراً بتایا۔

۵۱۔ ظفیر الدین محمدؔ:

تاریخی حقائق

(برہان دہلی، ۵۴ مئی، ۴۶ — ۵۳)

خلفائے راشدین، خلفاد بنو امیہ و عباسیہ، و زراء و امراء اسلام کے تقویٰ عدل و انصاف۔ خوف خدا، داد و دہش وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات پیش کئے گئے ہیں۔

۵۲۔ مقدسی۔ ڈاکٹر:

خورشید احمد فارق۔ مترجم۔

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں (۲)

(برہان، دہلی، ۵۴، جون)

اس قسط میں عراق اور اقدر کے جغرافیائی، تمدنی، تہذیبی تاریخی اور مذہبی حالات بیان کئے گئے ہیں۔

تنقید، ادب، لسانیات

۵۳۔ آل احمد سرورؔ:

رومانی نثر نگار

(ادب لطیف لاہور ۵۴، اپریل ۵ — ۸)

رومانیت کی تعریف و توضیح کے بعد سرسید، ابو الکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، ل احمد، مہدی الافادی اور سجاد انصاری کی رومانوی خصوصیات پیش کی گئی ہیں۔

۵۴۔ اثر محمد علی:

آرزو، صفی اور جلیل کے خطوط

(آج کل دہلی، ۵۴، اپریل ۲۳)

آرزو، صفی، اور جلیل کے پانچ خط محمد علی اثر کے نام درج ہیں آرزو اور جلیل سے اصلاح کے سلسلے میں خط و کتابت تھی۔

۵۵۔ اثر۔ محمد علی:

ایک عجیب توارد

(آج کل دہلی ۵۴، مئی، ۱۸ — ۳۰)

ایک غزل کا یہ شعر

"صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی"

گستاخ رام پوری کے دیوان مرتبہ مولانا حسرت مطبوعہ ۱۹۱۹ء میں بھی پایا جاتا ہے اور ریاض کے دیوان مطبوعہ ۱۹۳۰ء میں بھی دونوں کی غزلیں ثبوت میں لکھ کر آخر میں لکھا گیا ہے کہ مندرجہ بالا شعر اور اسی غزل کے دوسرے اشعار جو ریاض کے دیوان میں ہیں گستاخ کے ہیں، ریاض کے کسی شاگرد یا دوست نے ان کا دیوان شائع کرتے ہوئے گستاخ کے پسندیدہ اشعار دیوان ریاض میں شامل کر دئے۔

۵۶۔ احسن عبدالشکور:

تحریک پاکستان کا پیشرو۔ سرسید

(ماہ نو، کراچی ۵۷، مارچ ۲۵، ۲۷ — ۶)

سرسید زبردست ماہر تعلیم اور اردو کے زبردست ادیب تھے اور اردو نثر پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ وہ سیاسی رہنما تھے ہندو مسلم اتحاد کے حامی اور رواداری کے علم بردار لیکن ان کی نگاہ دور بیں نے آنے والے واقعات کا صحیح اندازہ لگایا۔ اور انھوں نے اپنی افسردہ اور مایوس قوم میں ایک ایسا زبردست ملی جذبہ پیدا کیا جو بالآخر پاکستان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

۵۷۔ احسن لکھنوی:

زہر عشق کی شان نزول اور اصل واقعہ

(روح ادب ۴ سال ۲ نمبر، ۴۶ — ۴۷)

زہر عشق کا قصہ خود نواب مرزا شوق کی زندگی کا نہیں ملکہ ان کے سالے اور ایک رہن رکھی ہوئی "بیوی" ستارہ کا ہے۔ بہار عشق، فریب عشق اور زہر عشق مرزا کی مثنویاں ہیں۔

۵۸۔ ادارہ:

ہندی دوہے

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ جون ۱۲، ۴۳ — ۴۵)

چند ہندی دوہے ان کی تشریح کے ساتھ دئے گئے ہیں

۵۹۔ ادارہ۔ اقبال:

مکاتیب سر اقبال

(معارف اعظم گڑھ ۵۴، اپریل ۳۰۶ — ۳۱۴)

علامہ سر محمد اقبال کے ۹ خطوط سید سلیمان ندوی کے نام جن میں مختلف علمی و ادبی مسائل پر سوالات و اشارات ہیں۔

۶۰۔ ادارہ:

مکاتیب اقبال

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ جون ۴۶۱ — ۴۷۲)

مولانا سلیمان ندوی کے نام اقبال کے خطوط مورخہ ۳ر دسمبر ۱۹۱۸ء، ۲۳ر مارچ ۱۹۱۹ء، ۳ر اپریل ۱۹۱۹ء، ۲۴ر اگست ۱۹۱۹ء، ۱۷ر ستمبر ۱۹۱۹ء، ۲۷ر ستمبر ۱۹۱۹ء، ۱ر اکتوبر ۱۹۱۹ء، ۱۰ر نومبر ۱۹۱۹ء، ۱۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء، ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۰ء، ۵ر اکتوبر ۱۹۲۱ء، ۲۸ر نومبر ۱۹۲۱ء اور ۳۰ر اپریل ۱۹۲۲ء (باقی)

۶۱۔ ادارہ:

خطوط کے عکس

(آج کل دہلی ۵۴، اپریل، ۲۹ — ۴۰)

داغ، فانی، حکیم محمد علی ناول نگار، جلال لکھنوی، علی حیدر طباطبائی، سہا مجددی، امیر اللہ تسلیم، راجہ گردھاری پرشاد، لالہ لاجپت رائے، آرزو لکھنوی، مولانا حالی کے خط و لفافہ، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی، اقبال، جلیل مانکپوری، عبدالحلیم شرر، علامہ فضل حق آزاد، منشی دیا نرائن نگم، مولانا حامد حسن قادری، اور اختر شیرانی مرحوم کے خطوط کے عکس دیئے گئے ہیں۔

یہ خطوط تاریخی اہمیت بھی رکھتے ہیں اور معلومات افزا بھی ہیں۔

۶۳۔ ادارہ:

کہتی ہے تجھکو ... الخ ـــــ مرزا شوق

(روح ادب ۲ سال ۷ نمبر، ۴۴ ـ ۴۵)

اس عنوان کے تحت مرزا شوق کی مثنویوں پر ایک عمومی اور "زہر عشق" پر خصوصی رایوں کے پیش نظر امیر احمد علوی، مولانا حالی، مولانا عبدالماجد دریابادی، جوش ملیح آبادی، نیاز فتحپوری، آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری اور خواجہ احمد فاروقی کے ہاں سے اقتباسات درج کئے ہیں۔

۶۴۔ آرزو۔ مختار الدین:

برٹش میوزیم میں کتب مشرقیہ کی نمائش

(معارف اعظم گڈھ ۵۴، اپریل، ۲۷۶ ـ ۲۹۰)

برٹش میوزیم لندن میں بعض مشرقی ممالک کے مخطوطات و مطبوعات کی نمائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ انھیں مخطوطات و مطبوعات میں سے بعض کا تعارف اور ان کی تاریخ۔

۶۴۔ آزاد۔ ابوالکلام:

اکاڈیمی آف لیٹرز کا قیام

(آج کل دہلی، ۵۴ مئی، ۳ ـ ۹)

وزیر تعلیم مولانا آزاد نے ۱۲ مارچ ۱۹۵۴ء کو نیشنل اکاڈمی آف لیٹرز کے پہلے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے اکاڈیمی کی اہمیت، مقصد وغیرہ بیان کیا ہے۔

۶۵۔ السیندرو بوزانی:

رومی میں الہیت اور وحدت الوجود

(ماہ نو کراچی ۵۴، مارچ ۱۸، ۴۴ ـ ۴۲)

مولانا رومی کی الہیت اور وحدت الوجود پر تاثرات کے ساتھ سیر حاصل بحث کی ہے۔

۶۶۔ اقبال۔ سر محمد:

مکاتیب سر محمد اقبال بنام مولانا سید سلیمان ندوی

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ مئی، ۳۶۹ ـ ۳۸۴)

۲۲ اکتوبر ۱۹۱۸ء ... ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے خط سید سلیمان ندوی کے خط کے جواب میں، مختلف الفاظ کے معنی، محل استعمال اور اصلاحیں کئے گئے ہیں۔

۶۷۔ انتظار حسین، ناصر کاظمی:

غالب اور ہم

(ماہ نو کراچی ۵۳ ـ ۵۹)

غالب پر مکالمے کی صورت میں ایک ہلکی پھلکی گفتگو۔

۶۸۔ ایک پروفیسر (؟)

قصوں کی کہانی

(نگار لکھنؤ، ۵۴ جون ۵ ـ ۱۰)

مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فارسی عربی لاطینی اور دیگر یورپین زبانوں کے اکثر قصوں کے مآخذ بالواسطہ یا بلا واسطہ ہندوستانی قصے ہیں۔

۶۹۔ ایلیا اہرن برگ:

لیکھک اور اس کی کلا

(نیا ہند الہ آباد ۵۴ مئی ۳۲۵ ـ ۳۳۵)

مصنف اور اس کے فن کے باہمی رشتہ کو ظاہر کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں دنیا کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے باقی آئندہ (مترجم مجیب رضوی)

۷۰۔ ایلیا اہرن برگ:
مجیب رضوی، مترجم۔

لیکھک اور اس کی کلا
(مسلسل)

(نیا ہند، الہ آباد ۵۴ جون، ۳۲۳ ـ ۳۸۲)

مصنف اگر اپنے بدلتے ہوئے حالات اور بدلتے ہوئے دل کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی تصانیف مرتب کرے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

آگے چل کر لکھا ہے کہ مصنف کسی کے حکم سے متاثر ہو کر نہیں پیش کر سکتا بلکہ وہ تو وہی نتیجہ لکھے گا جو اس کے دل ... درا ... ہے۔

۷۱۔ بٹ اصغر:

مونتاج کی فنی حیثیت

(نگار کراچی ۵۴، شمارہ ۴۴، ۴۵، ۵۵ـ۵۹)

تصادمات کی ایک خاص مقدار اور رفتار سے ڈرامائی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اسی کیفیت کو مونتاج کہا جائے گا خواہ وہ ادب میں ہو، موسیقی میں ہو، مصوری میں ہو یا فلم میں۔

۷۲۔ بخاری فارغ:

غزل کا ارتقا

(افکار کراچی ۵۴، شمارہ ۴۴ـ۲۵، ۱۴۴ـ۱۵۴)

غزل قصیدہ کی تشبیب سے پیدا ہوئی۔ تاہم یہ بھی اسی کے مقابل محبوب کا قصیدہ تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ قصیدہ کی تشبیب کے دوسرے اجزا اس کے اندر داخل ہو گئے۔ رودکی سے لے کر سعدی سے قبل تک فارسی غزل نے کوئی ترقی نہیں کی۔ سعدی نے اسے مستقل حیثیت ہی نہیں دی بلکہ اسے اپنایا سجایا، آراستہ کیا اور پھر اسے مقبول عام بنا دیا۔ سعدی کے بعد خسرو نے جلا بخشی، حافظ نے سرمستی دی۔ نظیری و بیدل نے فلسفہ و تخیل کی بلندی دی اور عرفی سے لے کر غنی کشمیری وغیرہ نے عروج پر پہنچا دیا۔ پشتو میں بھی غزل ملتی ہے۔ بعض لحاظ سے تو یہ فارسی غزل سے بھی پرانی ہو جاتی ہے۔ اس میں بھی بہت سے مدوجزر آئے۔ موجودہ فارسی غزل بے جان ہے مگر پشتو غزل میں زندگی ہے۔ اردو غزل نے بھی زینہ بہ زینہ ترقی کے مدارج طے کئے ہیں۔ میر، سودا، اور مصحفی کی خدمات قابل قدر ہیں۔ غالب و مومن نے فلسفہ و رفعت تخیل دی۔ حالی، فراق، اقبال، فیض وغیرہ نے اسے بہت بلند کر دیا۔

۷۳۔ بشارت اللہ بیگ۔ مرزا

رعایت لفظی

(نگار، لکھنؤ، ۵۴ جون، ۳۰ ـ ۴۴)

صنع کی تعریف کے بعد چند ایسے لطیفے بیان کئے گئے ہیں جن میں یہ صنعت استعمال کی گئی ہے۔

۷۴۔ جمیل جالبی:

ایک بے مثل مثنوی

(ساقی کراچی ۵۴ جون، ۳۳ـ۳۵)

مولانا جامی کی مثنوی سلامان و ابسال پر ادبی تبصر[ہ] درج ہے۔

۷۵۔ جبیب الرحمٰن غزنوی:

راجستھان کے لوک گیت

(آج کل دہلی ۵۴ جون، ۵ـ ۱۱)

ابتدا میں عوامی ادب کی تعریف، عوام کی زندگی او[ر] روزمرہ کے مسائل کی تشریح کرنے کے بعد راجستھان [کے] مختلف گیت پیش کئے ہیں جن میں شادی، بیاہ کی رسمیں، [شادی] سے پہلے منگیتر سے چوری چھپے کی ملاقات، خط، شادی اور رخصتی [کا] بیان ہے۔

۷۶۔ حسین نعیم:

ترقی پسند شاعری کے چند مسائل

(شاہراہ دہلی، ۵۴ مئی، ۱۱ـ ۲۰)

داخلیت، سماجیت، نظم و غزل کے اسلوب واند[از] بیان، ڈکشن، اور عام زبان وغیرہ سے بحث کی ہے۔

۷۷۔ حمید ناز:

سریلے بول

(ساقی کراچی، ۵۴ جون ۴۹ـ۵۱)

سریلے بول محمد عظمت اللہ خاں کے گیتوں اور نظموں کا مجمو[عہ] عظمت اللہ ۱۸۸۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ گھر پر فارسی و ع[ربی] کی تعلیم کے بعد پہلے ریذیڈنسی اسکول اور پھر گورنمنٹ ہائی اسکو[ل میں] تعلیم پائی، ان کے ابتدائی مضامین میں بھی ذہنی بلندی، ندرت ساتھ شوخی، بے خوف لہجہ اور بقول اختر شیرانی استدلال کی [قوت] ہے۔ ان کی نظموں اور گیتوں میں شعریت کم سہی لیکن بڑی نغمگی ملتی [ہے]۔ عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر[نے کے لئے] شعر کیلئے نئے نئے موضوع ڈھونڈے اور عربی و فارسی بحروں کے خلا[ف] صدا بلند کی اور ہندی بحریں اردو میں استعمال کئے۔

۷۸۔ خالدہ یوسف:

اورنگ آبادی شعرا اور ادیب

(سب رس، حیدرآباد (دکن)، ۵۴ء، اپریل ۲۵-۳۷)

اورنگ آباد کے ۲۶۴ شعراء کے ناموں کی فہرست پیش کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں دلچسپی رکھنے والے حضرات سے درخواست کی گئی ہے کہ اگر اور کوئی نام کسی کو معلوم ہو تو براہ کرم ادارۂ ادبیات اردو کے توسط سے مطلع فرمائیں۔

۷۹۔ خورشید احمد فارق۔ ڈاکٹر:

عیون الاخبار

(برہان دہلی، ۵۴ء، اپریل، ۲۳۲-۲۴۲)

عربی کی ایک اہم عالیشان تالیف عیون الاخبار کا تعارف کرایا گیا ہے۔

۸۰۔ دیوانہ مصطفیٰ آبادی:

مکتوبات اختر

(سب رس حیدرآباد (دکن)، ۵۴ء، اپریل ۵-۱۲)

مضمون نگار نے اپنے اور اختر شیرانی کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے مختصر حالات زندگی بیان کرنے کے بعد پھر وہ خطوط پیش کئے ہیں جو اختر شیرانی نے مضمون نگار کو ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان مختلف اوقات میں لکھے، خطوط کی تعداد دس ہے۔ خطوط زیادہ تر کاروباری ہیں۔

۸۱۔ راحت اللہ خاں، ڈاکٹر:

کتب خانہ آصفیہ کی اردو قلمی کتابیں اور ان کی اہمیت

(سب رس، حیدرآباد (دکن)، ۵۴ء، اپریل ۲۵-۳۴)

ابتدا میں کتب خانہ کی تاریخ قیام اور پھر سال بہ سال ترقی کرتے ہوئے موجودہ نئی عمارت میں کتب خانہ کی منتقلی، اردو فارسی، عربی، سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں کی قلمی کتابیں اور ان کی اہمیت،

پھر آخر میں چند قدیم اور نایاب قلمی مثنویوں اور دواوین کا مختصر تعارف۔

۸۲۔ رئیس احمد جعفری:

کتاب الاغانی

(ماہ نو کراچی، ۵۴ء جون۔ ۲۳-۲۶)

عربی زبان و ادب، کثرت الفاظ، غیر زبانوں کے الفاظ کے قبول کی صلاحیت بیان کرنے کے بعد ابوالفرج اصفہانی کے حالات زندگی اور اس کی کتاب اغانی کا تعارف، گو بظاہر یہ داستانوں اور روایتوں کا مجموعہ ہے لیکن حقیقت میں اموی اور عباسی عہد حکومت کی منہ بولتی تصویر ہے، ابو محمد المہلبی کا قول ہے کہ کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کی مجھے جستجو ہو اور وہ اس میں مل نہ گئی ہو، جو واقعات و حالات علماء نے اپنی ان گنت کتابوں میں تحریر کئے ہیں وہ سب اس میں حسن تالیف اور لطف بیان کے ساتھ موجود ہیں۔

۸۳۔ زار، نصیر احمد:

اردو میں اعراب کا مسئلہ

(اردو کراچی، ۵۴ء، اپریل، ۱۰۱-۱۳۰)

دنیا میں لکھی جانے والی ہر زبان میں اعراب کا مسئلہ مشترک ہے۔ بہت سی زبانوں میں حروف علت کے ماسوا اور کوئی نظام اعراب نہیں۔ اہل لغات کچھ ایسی مخصوص علامات پیش کرتے ہیں جس سے تلفظ کی صحت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ یہی علامات ایسی زبانوں میں اعراب ہی کا کام انجام دیتی ہیں انگریزی کے حروف علت، جو اعراب کا کام دیتے ہیں ہندی سنسکرت کی علامات اعراب پر بحث و تشریح کرنے کے بعد اردو کے اعراب اور اصول و قواعد کی تشریح کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ اردو کا نظام اعراب ایسا جامع و مکمل ہے کہ دنیا کی کسی بھی زبان کا کوئی لفظ بشرطیکہ اس کی اصوات کے حروف اردو میں موجود ہوں اس کی مدد سے اپنے اصلی تلفظ کے مطابق ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

۸۴۔ سجن لال، قاسم علی:

راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند

(نوائے ادب بمبئی ۵۴ء، اپریل، ۲۰-۳۴)

۱۸۶۸ء میں راجہ شیو پرشاد نے ایک مضمون لکھا تھا جس

کا عنوان "کچھ بیان اپنی زبان کا" ہے، جس میں اُردو ہندی زبانوں کے سلسلہ میں اظہار خیال کیا ہے۔ ابتدا میں سنسکرت زبان پر بحث ہے پرانی پراکرت، نئی پراکرت یعنی ہندی اور سنسکرت الفاظ مثال میں پیش کئے ہیں پھر عہد بعہد زبان میں جو تغیر و تبدل ہوا ہے اسے مع مثالوں کے پیش کیا ہے۔

۸۵۔ سخاوت مرزا:

حضرت شاہ مقبل میسوری اور ان کا کلام

(مسلسل)

(نوائے ادب بمبئی ۵۴ء اپریل۔ ۵ — ۱۹)

حضرت شاہ مقبل کے حالات، ان کے کلام پر تبصرہ اور دوسرے شعراء کے اشعار سے موازنہ و مقابلہ۔

۸۶۔ سخاوت مرزا

قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض

بہ سلسلۂ گزشتہ، اردو اکتوبر ۵۳ء

(اردو، کراچی ، ۵۴ ، اپریل ۳—۴۹)

عادل شاہی دور ۸۹۶ تا ۱۰۹۷ اور قطب شاہی دور ۹۱۶ — ۱۰۹۸ کے شعراء کے حالات، اور ان کی شاعری کے نمونے پیش کئے ہیں۔

۸۷۔ سروری۔ عبد القادر:

ہندستانی زبان کے لفظ انگریزی میں

(آج کل، دہلی ۵۴ء، مئی ، ۸ — ۱۳)

انگریزی میں اُردو لفظوں کی درآمد کی تاریخ بیان کرنے کے بعد ان الفاظ کی بہ ترتیب موضوع ذیل فہرست دی ہے۔ افراد و القاب لباس وغیرہ۔ حیوانات و نباتات، کھانے پینے کی چیزیں، گھریلو چیزیں اور سواریاں اعداد و سکے اور ناپ۔ ثقافت و دفتر۔ اشخاص و عہدے۔ ملک کے انتظامی حصے و متفرقات۔

۸۸۔ سلیم جعفر:

ریختی

(ساقی کراچی، ۵۴ء جون، ۲۵ — ۳)

ہندی کی تقلید میں ریختہ کے پیدا ہونے سے پہلے جو اردو شاعری وجود میں آئی تھی وہ خود ریختی تھی یعنی ریختی ریختہ سے پیدا ہوا ہے وہ دور ریختی کا پہلا دور تھا۔ دوسرا دور رنگین کے ساتھ شروع ہوا۔ پہلے شرم و حیا تھی۔ اور اب شوخی و شرارت۔ تاہم اسے بدنام صنف سخن سمجھنا غلطی ہے ریختی میں سب سے بڑا کارنامہ اور کمال جان صاحب نے پیدا کیا ریختی عورتوں کی زبان، ان کے جذبات اور خیالات کی عکاس ہے۔ اس کی مدد سے اودھ کی تمدنی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔

۸۹۔ سکریٹری:

کل حیدر آباد اردو کانفرنس

۳۰ر اپریل تا ۲ر مئی ۵۴ء

(سب رس، حیدر آباد (دکن) ۵۴ء اپریل)

۳۰ر اپریل کو ادارۂ ادبیات اردو اور دوسری انجمنوں کی طرف سے بلائی ہوئی اردو کانفرنس کی رپورٹ اور کارگزاری۔

۹۰۔ سمپورنانند:

ہندستان کی قومی زبان

(معارف اعظم گڈھ ۵۴ء مئی ۳۸۳ — ۳۸۸)

اخبار مدینہ بجنور کے اپریل ۳۹ء کے جوبلی نمبر میں سمپورنانند جی نے ہندوستان کی قومی زبان کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں انھوں نے اردو اور ہندستانی کو ایک مستقل زبان کا درجہ دیا ہے اور کہا ہے کہ ہندوستانی زبان سے وہ زبان مراد ہے جسے شمال میں دہلی سے پٹنہ تک اور وسط ہند میں جبل پور اور جبل پور کے اطراف کے پڑھے لکھے لوگ بولتے ہیں زبان کے الفاظ اور دونوں زبانوں کے مسئلہ کو سامنے رکھ کر حل کرنے کی کوشش کی ہے۔

۹۱۔ سید اعظم حسین:

آرزو کے خطوط

آج کل دہلی ۵۴ء ۱۰ اپریل ، ۱۴—۲۵

مضمون نگار کو ۱۹۲۴ء یا ۱۹۲۵ء میں "فغان آرزو"

پڑھنے کا موقع ملا اور جب انھوں نے ۱۹۲۹ء میں "ادب" لکھنؤ سے جاری کیا تو آرزو اس میں لکھنے بھی لگے۔ "ادب" نے آرزو کی "خالص اردو" کی نشرو اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ مضمون نگار اور آرزو میں ربط ضبط بڑھا۔ یہ آرزو کے شاگرد ہوئے۔ تعلقات کی بنا پر آرزو نے انھیں بہت سے خط لکھے ہیں۔ جستہ جستہ ان کے اقتباس درج ہیں۔ اِن سے آرزو کی انسانی خصوصیات اور زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

۹۲- بادشاہ حسین۔ سید:

اسٹیج اور فلم

(فنکار ۵۴ شمارہ ۳۴، ۳۵، ۷۲-۷۷)

ڈراما ادبی بھی ہوتا ہے اور تمثیلی بھی تمثیلی انداز میں ایک زمانے تک صرف اسٹیج ہی شامل تھا بعد میں فلم نے رنگا رنگی پیدا کر دی۔ اور اس نے انگلینڈ، فرانس، روس، امریکہ وغیرہ میں تو نہیں البتہ ہندوستان اور دوسرے دو ایک ملکوں میں اسٹیج کو تباہ کر دیا۔ اسٹیج اور فلم میں اصل اور نقل کا فرق ہے۔ فلم کا کینوس وسیع سہی مگر اسٹیج کی دنیا میں حقیقت جھلکتی رہتی ہے۔ فلم کے اداکاروں کا پاس زیادہ ہوتا ہے فن کا کم۔ اردو میں ڈراموں کی کمی کا باعث اسٹیج کی کمی ہے۔ ڈراما اور فلم دونوں بیک وقت ہمارے لئے ضروری ہیں۔

۹۳- عابد علی۔ سید:

افکار و مسائل

(ادب لطیف لاہور، ۵۴ اپریل ۲۴-۲۸)

مقالہ نگار کی صدارتی تقریر جو حلقہ ارباب ذوق کے چودھویں اجلاس میں پڑھی گئی۔ اس میں اردو شاعری کے ارتقا کا مختصر جائزہ لینے کے بعد "حلقہ ارباب ذوق" کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۹۴- محمد یوسف۔ سید:

اردو یا عربی

(ہمایوں لاہور ۵۴ جون ۳۴۳-۳۵۱)

ہز ہائی نس آغا خان نے موتمر اسلامی کے اجلاس ۱۹۵۱ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنایا جائے۔ مقالہ میں اس تجویز کے خلاف دلائل پیش کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اُردو ہی پاکستان کی سرکاری زبان بن سکتی ہے اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو اسلامی زبان ہے۔

۹۵- سیدہ جعفر:

سحر البیان، اور مثنوی بوستان خیال

(آج کل، دہلی ۔ ۵۴ جون ، ۳۱-۳۴)

میر حسن کی مثنوی سحر البیان، اور سراج اورنگ آبادی کی مثنوی بوستان خیال کا دونوں سے مختلف مقامات کے اشعار پیش کر کے مقابلہ کیا ہے۔ سراج اورنگ آبادی نے مثنوی اس وقت لکھی جبکہ اردو کا دامن اچھی لفظوں سے تہی تھا، پھر بھی کامیاب ہے۔

۹۶- شادانی عندلیب:

ڈھاکہ کی ادبی محفلیں

(ساقی کراچی ، ۵۴ ، جون ، ۹-۱۰)

۱۹۲۸ء سے لے کر اب تک شعر و شاعری خصوصاً شاعروں کی جو کیفیت حاصل ڈھاکہ میں رہی ہے اس کا مختصر سا جائزہ لیا ہے

۹۷- شکیل الرحمٰن:

نصرتی کی ایک رزمیہ مثنوی

(شاعر، دہلی ۵۴ مئی ۔ ۲۱-۲۶)

"علی نامہ" نصرتی کی ایک رزمیہ مثنوی ہے جو دیپک تو نہیں مگر اس کی بہت ساری خصوصیتیں اس میں موجود ہیں تاہم رزمیہ شاعری کی صفتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں یوں تو اس میں بہت سی خامیاں ہیں مثلاً معرکہ آرائی برابر کی نہیں جانبداری کا احساس نمایاں ہے بعض تاریخی غلطیاں، ناگوار خاطر الفاظ اور بیان، شاعرانہ مبالغہ، جذبات کا ناقابل برداشت ساؤ، عوام کا ذکر ہو یا وغیرہ مگر ان کے باوجود حسن کی تصویر کشی، شجاعت اور ظرافت، زبان کی خوبصورتی

اور اچھوتی تشبیہیں اس رزمیہ کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

۹۸۔ شوکت سبزواری:

اردو زبان کا ایک اہم صوتی رجحان

(اردو، کراچی، ۵۴، اپریل، ۵۰ — ۶۵)

اردو زبان کے صوتی رجحان اور اس سے اردو کے ماخذ اور اصل کا پتہ لگایا ہے کہ اردو کی اصل کیا ہے۔ سنسکرت، پراکرت پنجابی، برج، پالی وغیرہ زبانوں کے ہم صوتی الفاظ اور ان پر تدریجی عمل کی مثالیں پیش کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ اردو سے پہلے دہلی و میرٹھ کے نواح میں ایک بول چال کی زبان تھی۔ اردو نے اس بول چال کی زبان سے ارتقا پایا اور غالباً یہی زبان ہے جسے عام ہندو اہل نظر کھڑی بولی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۹۹۔ شوکت سبزواری:

اردو نثر کے اسالیب بیان

(ماہ نو کراچی، ۵۴ جون، ۱۹ — ۲۲)

ابتدا میں نظم و نثر پر ایک عالمانہ فنی بحث اور وضاحت کے بعد دونوں اصناف کے فرق کو واضح کیا ہے۔ معمولی الفاظ احساس کا اظہار کرتے ہیں اور علامات سے احساس کی اس ارتقائی منزل کی طرف ہماری رہنمائی ہوتی ہے جہاں احساس پختہ خیال کی صورت اختیار کرتا ہے احساس جب پختہ خیال کی صورت اختیار کرتا ہے تو نثر وجود میں آتی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے ادب میں نثر کی قدر زیادہ کی پیداوار ہے نثر ادب کی وسیع ترین صنف ہے جس کا ہر موضوع سے قریب قریب یکساں تعلق ہے۔ اردو نثر کے گوناگوں امکانات کا ابھی اچھی طرح جائزہ نہیں لیا گیا ضرورت ہے کہ جدید تنقید کی روشنی میں اس سے بحث کی جائے سماج کے بدلتے ہوئے حالات کا اثر اردو نثر پر نظم سے زیادہ پڑ رہا ہے۔

۱۰۰۔ صدیقی ابواللیث:

نظیر اکبر آبادی

(اورینٹل کالج میگزین ۵۳ مئی و اگست، ۱۲۶ — ۱۵۰)

(مسلسل) نظیر کے بارے میں شروع سے یہ غلط فہمی پھیلا دی گئی ہے کہ وہ عامیانہ بلکہ سوقیانہ مذاق رکھتا تھا اور اس کا کلام اوباشوں کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے نظیر کے اخلاقی اور انسانی پہلو پر ناقدین نے سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں شاید ہی کوئی دوسرا شخص انسانیت کا اتنا بڑا علمبردار ہو جتنا نظیر تھا۔ اس کی اخلاقی، انسانی، صوفیانہ شاعری کے اعلیٰ نمونے اس کے کلیات میں موجود ہیں۔ ان کا غائر مطالعہ اس کا ہمیں احساس ہی نہیں دلائے گا بلکہ اس کی عظمت کا قائل بھی بنا دے گا۔

۱۰۱۔ صفدر امام کاکوی:

اردو کا لسانی پس منظر

(تدریجی ارتقاء اور موجودہ نزاعی مسئلہ)

(ساقی کراچی ۵۴ جون، ۶۵ — ۲۷)

آریوں سے پہلے ہندوستان میں دراوڑی زبان اور کلچر کا بول بالا تھا۔ تجارتی اغراض کے سبب بدیسی لوگ آتے اور نئے نئے الفاظ بھی دے جاتے۔ آریا جب آئے تو ایران سے ہوتے آئے۔ چنانچہ اپنی زبان میں ایرانی زبان اور کلچر کی خصوصیات لے آئے۔ ان کا ریلے پر ریلا آتا رہا اور یہ عنصر بڑھتا رہا۔ ضرورت اور وقت نے آریوں اور دراوڑیوں کو بہت قریب کر دیا اور ایک مشترکہ تہذیب اور زبان (عام) کی بنیاد پڑی۔ نتیجہ مختلف پراکرتیں تھیں۔ انھیں سے اردو کا تعلق ہے۔ ایران اور عرب سے آنے والے اپنی اپنی زبان کے الفاظ اپنے مال کے ساتھ دے جاتے اور یہاں سے الفاظ لیجاتے۔ تجارت، تبلیغ اور حکومت کے ذریعہ یہ لین دین جاری رہا۔ اردو زبان کسی ایک علاقہ یا شہر کی نہیں۔ پورا ہندوستان اس کا جنم بھوم ہے۔ انگریزوں کی شرارت پسندی کے سبب ایک زبان اور قوم کا نظریہ تباہ ہوا اور پھر اس کے اسلوب، الفاظ اور رسم الخط پر غلط قسم کی بحثیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔

۱۰۲۔ عابد رضا بیدار:

عبد الحلیم شرر کے خطوط

(آج کل دہلی، ۵۴، اپریل ۴۶ — ۵۵)

شرر کی زندگی کے مختصر حالات لکھنے کے بعد نواب بدھن

اور ایک شیخ صاحب کے نام لندن سے لکھے ہوئے شرر کے خطوط دئے ہیں۔ شرر نے ان میں لندنی قیام کے زمانے میں وہاں کی سوسائٹی کو جیسا محسوس کیا، لکھدیا۔ وہاں کی "رنگینی" سے شرر بہت متاثر ہیں۔

۱۰۳۔ عابد علی سید:

اقبال کے کلام میں ساقی کی علامتی اہمیت

(ماہ نو، کراچی۔ ۵۴ جون، ۱۱ — ۱۴)

تمام فنون لطیفہ میں مخصوص اصطلاحات و علامات ہیں اسی طرح شاعری میں بھی ہیں۔ اقبال نے ساقی سے پہلے ابتدا میں عام روایتی ساقی مراد لیا لیکن جیسے جیسے ان کے کلام میں رفعت اور پیغام میں گہرائی پیدا ہوتی گئی ویسے ویسے انھوں نے ساقی کو اپنی ایک خاص علامت متعین کی درمیاں میں اقبال مصلح قوم شاعر کو "ساقی" کہتا ہے۔ اور اس کے بعد آخر میں "ساقی" فیضان الٰہی کی علامت قرار پاتا ہے۔

۱۰۴۔ عبادت بریلوی:

تنقید میں توازن

(ماہ نو، کراچی، ۵۴ مارچ ۱۲ — ۱۷، ۳۲)

شعر و ادب کی طرح تنقید بھی ایک فن ہے۔ اور فن کی حیثیت سے نہ صرف حسن کی حامل ہے بلکہ تخلیق حسن کی معاون بھی ہے۔ چنانچہ تخلیق فن کے لئے جس توازن کی ضرورت ہوتی ہے اس کی اہمیت کا صحیح احساس اور اندازہ تنقید ہی میں ہوتا ہے۔ توازن کے بغیر تنقید اور تنقید کے بغیر توازن ناممکن سی بات ہے۔ توازن سے تنقید بھی پیدا ہوتی ہے اور حسن بھی لیکن یہ توازن از خود نہیں بلکہ زندگی کے حقائق کے احساس اور حالات کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ اور تنقید زندگی کے احساس اور حالات کے شعور کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔

۱۰۵۔ عبادت بریلوی:

اقبال کا تنقیدی نقطہ نظر

(ماہ نو، کراچی، ۵۴، اپریل ۲۱ — ۲۷)

گوئٹے نے کہا ہے کہ ایک اچھے شاعر کے لئے نقاد ہونا بھی ضروری ہے، اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اس لئے ان کے پاس ایک واضح تنقیدی نقطہ نظر ہے۔ آگے چل کر اقبال کے موضوعات پر ان کے مختلف اشعار سے پیش کرنے کے بعد کہا ہے کہ حالی نقاد ہیں کیونکہ انھوں نے تنقیدیں لکھی ہیں، ان پر تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ اقبال نے تنقیدیں نہیں لکھیں انھوں نے صرف اپنے اشعار میں اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے۔

۱۰۶۔ عبادت بریلوی:

دست صبا اور فیض کی شاعری کا نیا دور

(افکار ۵۴ شمارہ ۳۳، ۳۵، ۲۲۳-۲۲۲، ۲۶۹)

دست صبا فیض کے کلام کا نیا مجموعہ ہے۔ اس میں جو نظمیں اور غزلیں شامل ہیں وہ نقش فریادی کی نظموں کے مقابلے میں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے زیادہ اہم ہیں۔ ان سے فیض کی شاعری کے ایک نئے موڑ اور ان کی فکر کی ایک نئی منزل کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں ایک نیا انداز اور نیا آہنگ ہے۔ ان میں احساس کی شدت، جذبہ کا خلوص اور عمل کی خواہش ہے جس سے ان میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ زندگی اور اس کی کشمکش کی تصویریں دست صبا کی نظموں اور غزلوں میں صاف نظر آتی ہیں۔

۱۰۷۔ عبادت:

جدید اردو غزل

(اورنٹیل کالج میگزین ۵۳، اگست ۵۳-۱۲۵)

غزل میں زندگی اور اس کے تغیرات اپنے سارے تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ وہ وقت اور زمانے کے ساتھ بدلتی ہے۔ نئے روپ، نئے رجحانات اپناتی، جدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اردو غزل نے یہی کچھ کیا ہے مومن و غالب نے جدید غزل کی طرح ڈالی، ظفر نے مخصوص انداز میں شرکت کی، حالی نے اپنی شعری قوت اور اصلاح کے سبب جدید رنگ کو اور نکھارا اور بہت سے نئے امکانات پیدا کر دئے۔

اکبر، داغ، چکبست، اقبال، ریاض، فانی، اصغر

حسرت، اثر، فراق وغیرہ نے زندگی، اس کے تقاضوں اور مختلف رنگا رنگ پہلوؤں کو غزل میں اپنے اپنے انداز میں سمو دیا۔ (مسلسل)

۱۰۸۔ عبداللہ۔ سید:

اقبال کی زبان

(ماہ نو، کراچی، ۵۷، اپریل ۱۵ — ۲۰)

اقبال کی فارسی زبان پر کبھی کبھی اعتراض کیا جاتا رہا ہے کہ ان کی فارسی ترکیبیں، بندشیں اور لہجہ کمزور اور روزمرہ کے مطابق نہیں۔ اقبال کی زبان پر اعتراض کرنے والوں کو اہل زبان کے اشعار کی سند سے مثالیں پیش کر کے واضح کیا ہے کہ خود اہل زبان کے ہاں بھی بعض صرفی و نحوی کمزوریاں رہی ہیں۔ ورنہ اقبال کی زبان اور ترکیبیں کسی طرح اہل زبان سے کمتر نہیں۔

۱۰۹۔ عسکری۔ محمد حسن:

پیروی مغربی کا انجام

(ماہ نو، کراچی ۵۴، اپریل، ۳۱ — ۳۳)

حالی کا ایک شعر جس میں انھوں نے کہا ہے "حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں" اس پر گذشتہ دور میں جو بحثیں ہوئیں کہ مغربی سے مراد کیا ہے۔ یورپ یا فارسی کا مغربی نام کا ایک شاعر اردو ادب میں مختلف نقطہ نظر کے خیالات رکھنے والوں کے افکار سے مثالیں دے کر بیان کیا ہے کہ اردو ادیبوں کا احساس مغرب کا احساس نہ بن سکا۔ بلکہ ادب میں جمود سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو ادیبوں نے فارسی کے گمنام شاعر مغربی ہی کی پیروی کی ہے۔

۱۱۰۔ عسکری۔ محمد حسن:

ادب یا علاج الغربا؟

(ماہ نو کراچی ۵۴ مئی، ۸ — ۱۱)

مقالہ نگار نے اس سوال کا جواب کہ فن پارے کی تخلیق فن کار کی شخصیت پر خوشگوار اثر ڈالتی ہے یا ناگوار، ایلیٹ، ورڈزورتھ اور کیٹس کے اقوال و آراء کی روشنی میں دینے کی کوشش کی ہے اور آخر میں یہ بتایا ہے کہ حقیقی فنکار کے لئے فن کی تخلیق علاج نہیں بلکہ عذاب جان ہوتی ہے۔

۱۱۱۔ عسکری۔ محمد حسن:

فنی تخلیق اور درد

(ماہ نو، کراچی، ۵۴ جون، ۷ — ۱۰)

مضمون نگار نے ایک سوال اٹھایا کہ تخلیقی کام کے ذریعہ لکھنے والے کو ذاتی طور سے کتنی تسکین مل سکتی ہے؟ سوال قائم کر کے ادب و نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے مغربی مفکرین کے اقوال کی روشنی میں جواب دیا ہے کہ ادب وہ ہے جس میں تخلیق کو جبلتوں کے ارتقاء کا ذریعہ سمجھا جائے دوسرا نظریہ ہے جس میں ادب کو خواب کے مترادف سمجھا جاتا ہے پھر اس نظریہ کی وضاحت کی اور آخر میں کہا ہے کہ فن کار کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے سکون مل رہا ہے یا تکلیف پہنچ رہی ہے وہ ادب کی تخلیق نہیں کرتا ادب اس کے اندر سے رستا ہے۔

۱۱۲۔ عشرت حسن انور۔ ڈاکٹر:

اقبال۔ رومی اور شنکر

(معارف اعظم گڑھ ۵۴ جولائی ۵ — ۱۹)

مقالہ میں مقام ذات سے متعلق رومی کے نظریہ اور شنکر اچاریہ کے فلسفہ ادویت واد میں مماثلت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ رومی اور شنکر دونوں حصول کو اسباب و علل پر مشتمل قرار دیتے ہیں۔ دونوں ذات کو عاری عن الصفات مانتے ہوئے بھی جامع ہمہ صفات تصور کرتے ہیں۔ دونوں کا خیال ہے کہ مقام ذات کا پتہ دینے کے لئے اشارات و کنایات وغیرہ قطعی ناقص و نازیبا ہیں۔ فرق یہ ہے کہ شنکر گیان کو مانتے ہیں اور رومی قلبی رجحانات کی تائید کرتے ہیں۔

۱۱۳۔ عطاء الرب صدیقی:

اردو نثر اور علی گڑھ تحریک

(ساقی کراچی، ۵۴، اپریل، ۲۲ — ۲۴)

ابتدا میں اردو کی ابتدائی تاریخ اور نظم و نثر کی مختصر تاریخ پیش کرنے کے بعد فورٹ ولیم کالج کے تراجم کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد سرسید ان کے رفقاء اور نثری کارنامے بیان کر کے وضاحت کی ہے کہ سرسید کے رفقاء، دبستان دلی سے متاثر تھے۔ علی گڑھ

تحریک میں امید کی کرن ہے جو دبستان دلی میں پائی جاتی ہے علی گڑھ کی تحریر میں رجائیت انداز بیان میں سادگی بے تکلفی، خلوص اور گہرے جذبات پائے جاتے ہیں۔

۱۱۴۔ غلام مصطفیٰ خاں۔ ڈاکٹر:

عبدالحئی تاباں پر ایک نظر

(اردو کراچی، ۵۴، اپریل، ۶۶-۸۳)

عبدالحئی تاباں شعرائے متقدمین میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے دیوان تاباں پر مقدمہ لکھتے ہوئے تاباں کی حشمت سے شاگردی تسلیم کی ہے۔ لیکن تاباں کے حالات، اور حشمت کی استادی کا زمانہ متعین نہیں کیا گیا ہے اس مضمون میں حاتم اور حشمت کی استادی کا زمانہ متعین کیا گیا ہے حاتم اور تاباں کی غزلوں کو ثبوت میں پیش کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ تاباں کے استاد حاتم تھے نہ کہ حشمت۔ حشمت سے آخر آخر میں صرف "حاجت روائی" کے لئے حشمت سے تعلق پیدا کیا۔

۱۱۵۔ فاروقی خواجہ احمد:

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے غیر مطبوعہ خطوط

(نوائے ادب بمبئی ۵۴، اپریل، ۳۵-۴۸)

واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خطوط کے ۹ مجموعوں کے نام، اور جن جن لائبریریوں میں ہیں ان کے پتے واجد علی شاہ کی معزولی کی مختصر داستان اور مختلف خطوط سے اقتباسات پیش کئے ہیں۔

۱۱۶۔ فاروقی خواجہ احمد:

چند نادر خطوط

(آج کل، دہلی ۵۴، اپریل، ۸-۱۲)

غالب، حسین علی خاں، صدر الدین آزردہ، سرور، عزن جان مشتری، سید سلیمان ندوی، اکبر الہ آبادی، واجد علی شاہ، سجاد حسین (اودھ پنچ) اور آل احمد سرور کے کوئی گیارہ نادر خطوط کی نقلیں درج کی ہیں جو اپنے اپنے نامہ نویسوں کے طرز نگارش کو ظاہر کرتے ہیں اور مفید معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

۱۱۷۔ فاروقی خواجہ احمد:

اردو کے مکتوباتی ادب پر ایک نظر

(آج کل دہلی، ۵۴، اپریل، ۴-۷)

اردو خط نویسی کی ابتدا رجب علی سرور نے بے خبر اور غالب سے پہلے کی تھی۔ ان کی حیثیت ایک فرد کی نہیں، ادارے کی ہے۔ ان کے رنگین اور نادر کار اسلوب کا اثر شاہی مراسلات تک سرایت کر گیا تھا۔ لیکن ان کے ہاں تکلفات کے ساتھ سادگی بھی ہے۔ سرور کے خطوط تاریخی معلومات کا گنجینہ بھی ہیں۔ واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے خط ایک الگ دنیا بسائے ہوئے ہیں۔ انھیں سے منظوم خطوط کا سلسلہ جاری ہوتا ہے جو اوروں کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ غالب کی زمانہ شناس اور رنگا رنگ شخصیت اور عصری و ادبی تاریخ خطوں میں اس طرح جھلکتی ہے جیسے آئینے میں جوہر۔ امیر مینائی اور سرسید کے خطوط ان کی طرز فکر کے عکاس ہیں۔ حالی کے ہاں سادگی و بے ریائی ہے مگر ادبی دلکشی کم ہے۔ شبلی کی دلکشی غالب کے بعد نمایاں ہیں۔ مہدی، ریاض اور نیاز فتح پوری رنگینی کے رسیا ہیں۔ جیل کے خطوط میں مولانا محمد علی کی عجیب شان ہے جو ان کا امتیاز ہے۔ سجاد ظہیر کے خطوط بھی خوب ہیں۔

۱۱۸۔ فاروقی نثار احمد:

حامد حسن قادری کے خطوط

(آج کل، دہلی، ۵۴، اپریل، ۲۵-۲۸)

پروفیسر حامد حسن قادری اردو کے محقق اور مورخ ہی نہیں ہیں بلکہ دور کے صف اول کے نقادوں میں ہیں۔ اپنے خطوں کی برجستگی، شگفتگی، اور شوخی، زندہ دلی، روزمرہ و محاورہ اور زبان و بیان کی چاشنی کے سبب اردو کے دور جدید کے مکتوب نگاروں میں سب سے زیادہ لائق احترام ہستی ہیں۔ اس تمہید کے ساتھ خواجہ احمد فاروقی کے نام تین اور خود اپنے نام دو خط ان کے مضمون نگار نے درج کئے ہیں۔ یہ خطوط ان کے دعووں کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔ ان خطوں سے قادری صاحب کی طبیعت اور مزاج پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

۱۱۹۔ فہمی۔ سلیم اللہ:

اگنی بینا

(ماہ نو کراچی، ۴۹ء مئی، ۲۸ – ۲۹)

قاضی نذر الاسلام کے مجموعۂ کلام اگنی بینا کی امتیازی خصوصیات گنائی گئی ہیں۔ اس مجموعہ میں کل بارہ نظمیں ہیں جن میں سے چھ خالص اسلامی ہیں۔ اسلامی نظموں میں فارسی الفاظ بلا تکلف استعمال کئے گئے ہیں۔ مقالے میں ترن بھیری (رجز) اور "باغی" سے اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں۔

۱۲۰۔ کشفی ابوالخیر:

محمد حسن عسکری

(ماہ نو کراچی، ۴۹ء مئی، ۲۳ – ۲۷)

محمد حسن عسکری بیک وقت افسانہ نگار نقاد اور مترجم ہیں۔ مقالے میں ان کی ان مختلف ادبی حیثیتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۲۱۔ کلیم سہسرامی:

بنگالی ادب کا ارتقا اور مسلمان

(ساقی کراچی، ۴۹ء جون، ۴۳ – ۴۵)

بنگلہ ابتدا میں بنگال کے قدیم باشندوں دراوڑوں اور منلوگوں (کدا) کی زبان تھی۔ گوتم بدھ سے قبل باقاعدہ حروف تہجی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ تاہم اس کی ترقی بنگال کے ہندو راجاؤں نہیں بلکہ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں ہوئی۔ ان کی سرپرستی اور محنت سے بنگلہ زبان و ادب نے بڑی نشو و نما حاصل کی بعد میں ہندو ادیبوں کے دوش بدوش مسلمان ادیبوں اور شاعروں نے اس کی ثروت مندی میں زبردست حصہ لیا اور لے رہے ہیں۔

۱۲۲۔ "لاہوتی":

مشکلات اقبال

(فیض الاسلام، راولپنڈی، ۴۹ء، اپریل ۳ – ۴)

اقبال کی ایک مثنوی جو زبور عجم کے آخر میں ہے اور جس کا نام گلشن راز جدید ہے اس پر اب تک کسی نے کام نہیں کیا۔ ضرورت ہے کہ اس پر کام کیا جائے۔ مثنوی کا تعارف اور اس کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

۱۲۳۔ متین سروش:

اردو کے چند گراں مایہ خطوط

(آج کل دہلی ۴۹ء، اپریل، ۵۶ – ۶۲)

دوسرے ادیبوں کے تنہا مجددی اور تنہا مجددی کے دوسرے ادیبوں کے خطوط مع تنہا کے مختصر حالات کے درج ہیں۔ تنہا کا پورا نام سید ممتاز الدین احمد نام تھا مجدد الف ثانی سے عقیدت کے سبب خود کو مجددی لکھتے تھے۔ معاشی زندگی پریشاں کی تھی۔ علوم شرقیہ کی تعلیم بھوپال میں ہوئی۔ کچھ عرصہ علی گڑھ میں انگریزی بھی پڑھی۔ دسمبر ۱۹۴۷ء میں انتقال کیا۔ ان خطوط میں تنہا کے خط ان کی زندگی، سوجھ بوجھ اور علمیت پر دال ہیں۔

۱۲۴۔ مجتبیٰ حسین:

اردو میں بچوں کا ادب

(نگار کراچی، ۴۹ء، شمارہ ۴۴-۴۵، ص ۲۴۲ – ۲۴۶)

بچوں کے ادب کے لازمی اجزا پر نظر ڈالنے کے بعد جب ہم اردو ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں بچوں کے ادب کا بہت کم سرمایہ ہمیں ملتا ہے۔ ایک وجہ اردو ادب کی کم عمری ہے۔ علاوہ بریں وہ دوسرے ادب کی عظمت سے متاثر ہوا اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اس طرف کم توجہ کی ہے۔ پھر اس کے لئے جن جانکاہی، غور و فکر وغیرہ کی ضرورت ہے اس کی طرف ہمارے کسی ادیب نے توجہ نہیں دی۔ تاہم نظیر اکبرآبادی، میر امن، آزاد، حالی کے کارنامے اہم ہیں۔ البتہ اسمٰعیل میرٹھی بچوں کے واقعی ادیب اور شاعر ہیں۔ افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری، راشد الخیری، امتیاز علی تاج بھی بچوں کے ادب کے اچھے خالق ہیں۔ تاہم اقبال ان سے کہیں بلند اور نمایاں ہیں۔

۱۲۵۔ محمد احمد صدیقی: ڈاکٹر:

مینا بازار کا مصنف

(معارف اعظم گڑھ ۴۹ء مئی، ۳۵۸)

کتاب مینا بازار جس کے مصنف کے بارے میں محققین میں اختلاف رائے ہے۔ کہ آیا یہ ظہوری کی ہے یا واضح کی،

ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنی کتاب "ظہوری" اور اس کی تصانیف۔" حسن پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے اس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے ظہوری کی تصنیف نہیں مانتے، مضمون نگار نے مختلف دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ مینا بازار کا مصنف ظہوری ہی ہے۔

۱۲۶۔ محمد بشیر الحق دسنوی:

پچاس سال پہلے کا ایک منظوم رقعہ شادی

(آج کل، دہلی، ۵۴، اپریل، ۲۱-۲۲)

مشہور حکیم عبدالعزیز لکھنوی حکیم محمد یعقوب کے خاندان سے ہیں حکیم محمد یعقوب نے سب سے پہلے سلاطین اودھ کے دربار میں اپنی قدر و منزلت کا سکہ جمایا تھا حکیم عبدالعزیز نے اپنے لائق بیٹے حکیم عبدالرشید کی شادی کے موقع پر ایک منظوم رقعہ جو امی پریس میں چھپا تھا (۱۹۰۰ء) اور لوگوں کے علاوہ دسنہ میں اپنے شاگرد حکیم رشید النبی کے پاس بھی بھیجا تھا مختصر تعارف کے ساتھ یہ رقعہ نقل کیا گیا ہے۔ بعض مصرعے برجستہ اور بامحاورہ ہیں۔ داد کے مستحق ہیں۔

۱۲۷۔ محمد حسن:

پریم چند کا ورثہ

(روح ادب کراچی، ۶ سال ۲ نمبر ۳۴، ۳۷-۱۸۰)

پریم چند نے اردو افسانے اور داستان کے دروازے عام انسان کے لئے کھول دئے ہیں۔ عوام ان کے کردار ہیں۔ متوسط طبقے کے فرد ہونے اور اپنے ماحول کے سبب انھوں نے تصوریت اور اصلاح پسندی اختیار کی۔ فکری حیثیت سے ان کا انداز رومانی ہے۔ لیکن ان کی رومانیت نے انسان دوستی کا روپ اختیار کیا۔ ان کی کہانیاں خیال اور عمل کا ایک خوشگوار امتزاج ہیں۔ مجموعی طور پر زندگی کو ہر طرح انگیز کیا، اور پھر جرأت و ہمت کے ساتھ بھرپور انداز میں پیش کر دیا۔

۱۲۸۔ محمد حسن عسکری:

ادب اور جذبات

(ماہ نو کراچی، ۵۴ مارچ، ۷-۱۱)

ادب یا ادیب کے لئے کسی وقتی جذبہ اور کیفیت کو اہم نہیں سمجھا جا سکتا، نہ ہی اس کی روشنی میں ان کے سلسلے میں رائے دی جا سکتی۔ جذبات کی تہذیب بڑی بات ہے۔ انسان ہر قسم کے سبق آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔ لیکن یہ بات بڑی مشکل سے آتی ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی سے یگانگت کا احساس پیدا کرے جس ادب میں اس قسم کے ذہنی کلچر کی طرف ایک اجتماعی کوشش کے آثار نہ ملتے ہوں وہ دل بہلانے کیلئے تو ٹھیک ہے لیکن انسانوں کی زندگی میں اس کا کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔

۱۲۹۔ میتھیو آرنلڈ:

شاعری میں انتخاب مضامین کا مسئلہ

(ہمایوں لاہور ۵۴، جون، ۳۵۴-۳۵۷)

چونکہ شاعری کی اصل غایت انسانی اعمال کی عکاسی ہے اس لئے شاعری میں اعلیٰ درجے کے فعل کا بلا لحاظ زمان و مکان انتخاب کرنا چاہیئے۔ نوآموز شعرا کو چاہیے کہ وہ شاعری کے بے مثال نمونوں کو اپنے سامنے رکھنے کے بعد ان سے مضمون کی دیانت دارانہ ترتیب و ترکیب سیکھے اور انتخاب مضامین کو اول اہمیت اور اظہار بیان کو ثانوی حیثیت دے (مترجم عبدالعزیز کمال)

۱۳۰۔ ندوی۔ عبدالسلام:

موادِ شعر یعنی موضوع شاعری

(معارف، اعظم گڑھ۔ ۵۴ جولائی، ۴۵۲-۴۶)

موضوعات شاعری یہ ہیں:-

(۱) جذبات کے ساتھ محرکات جذبات کا ذکر

(۲) انسان اور اس کے اوصاف و لطیف جذبات

(۳) متناسب چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنا

اس سلسلے میں معانی و الفاظ میں تناسب قائم رکھنا چاہیئے مقامات کے اوصاف اور ان افعال و اقوال میں جو ان کی طرف منسوب ہیں تناسب قائم کرنا چاہیئے۔

۱۳۱۔ وفا۔ مطیع الحسن:

جرأت کی مثنوی حسن و عشق

(اردو کراچی، ۵۴، اپریل، ۸۴-۱۰۰)

جرأت کی ایک فراموش کردہ مثنوی حسن و عشق کا تعارف

جرأت کا ماحول۔ مثنوی کے حصّہ کا نثر میں خلاصہ۔ اس کی ظاہری خصوصیات زبان و اسلوب وغیرہ معنوی خوبیاں۔ دوسرے مثنوی نگاروں سے تقابل۔

۱۳۲۔ وقار عظیم:
تقسیم کے بعد تین افسانہ نگار
(ماہ نو کراچی، ۴۸ مئی، ۱۵—۴۰)
علی عباس حسینی، محبوب گورکھپوری اور حجاب امتیاز علی کی فنی خصوصیات کے مختصر جائزے کے بعد ان کے ان افسانوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو انھوں نے تقسیم کے بعد لکھے۔

۱۳۳۔ وقار عظیم:
مثنوی زہر عشق
(روح ادب کراچی ۲ سال ۲ نمبر ۴۸—۴۹)
مثنوی کے ادب میں عموماً اور اردو مثنوی کے ادب میں خصوصاً "مثنوی زہر عشق" ایک اونچے مقام کی مالک ہے مرزا شوق اس میں زندگی کو بلند مقام پر نہیں لیجاتے بلکہ اسی کی سطح پر آ کر اس کی پوری عکاسی نہایت چابک دستی سے کرتے ہیں۔ کردار نگاری بھی خوب ہے۔

۱۳۴۔ ہاشمی۔ نصیر الدین:
نصرتی کا سن وفات
(نوائے ادب بمبئی، ۴۸، اپریل،
تذکرۂ محبوب الزمن میں نصرتی کا سن وفات ۱۰۹۵ ہے۔ اور بعد کے تمام لوگوں نے اسی پر بھروسہ کیا۔ سر سالار جنگ کے کتب خانہ کی فہرست مرتب کرتے ہوئے مضمون نگار کو ایک قطعہ ملا جس میں "نصرتی شہید رہے" سے سن وفات ۱۰۸۵ نکلتا ہے۔ اور یہی صحیح ہے۔

۱۳۵۔ ہاشمی نصیر الدین:
جانِ عالم واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے غیر مطبوعہ خطوط
(آج کل دہلی، ۵۴، اپریل ۱۳—۲۰)
کتب خانہ آصفیہ میں "مخزن اسرار سلطانی" نام کی ایک قلمی کتاب ہے۔ سائز (۸×۵) ہے اور ۱۸۳ صفحوں پر مشتمل ہے اس کے مرتب (۱۳۱۹ھ) محمد امتیاز علی خاں نجیب بسپر رستم علی خاں ادیب ہیں۔ ادیب کو صاحب خمخانۂ جاوید لکھنؤ کا مقلد بتاتے ہیں۔
نجیب کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں۔ شروع میں نجیب نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے۔ اس میں بارہ بیگمات کے لکھے ہوئے ۶۷ خطوط ہیں اور خود واجد علی شاہ کے ۱۲ ہیں۔ زیادہ تر خطوط نثر میں ہیں۔ تاہم کچھ منظوم ہیں۔ ان میں زیادہ تر ہجر و فراق کی دل خراش اور سوگوار روداد اور ملنے کی تمنا کا اشتیاق درج ہے۔ عبارت مقفی ہے۔

آرٹ

۱۳۶۔ فرحت اللہ انصاری:
ہمارا فن موسیقی
(شاہراہ، دہلی ۵۴ مئی ۶—۱۰، ۲۶)
ہندوستانی فن موسیقی کے انواع اور تاریخی ارتقا پر تبصرہ کیا ہے۔

۱۳۷۔ عبد اللہ چغتائی۔ ڈاکٹر:
تاج محل آگرہ
(برہان دہلی، ۵۴ جون، ۴۰—۴۵)
حکومت ہند تاج محل آگرہ کا تین سو سالہ جشن منانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس سلسلہ میں تاج محل کی تاریخ اور طرز تعمیر وغیرہ کی مختصر تاریخ۔

معاشرتی حالات

۱۳۸۔ اشک۔ احسن احمد:
مشرقی پاکستان کی عوامی رسمیں
(ماہ نو، کراچی۔ ۵۴ جون، ۴۹—۵۱)
مشرقی پاکستان کی جغرافیائی حالت، وہاں کی شادابی اور ہریالی، وہاں کے رہنے والوں پر اپنے اردگرد اور فضا سے جو طبعی لگاؤ، اور ناتہ ہے اور اس تأثر نے ان میں ایک خاص رومانیت پیدا کر دی ہے وہاں کی مختلف عوامی رسم و رواج "بھات کھاوائی"، "مسلمانی دیوا" (ختنہ)، شادی بیاہ، فصل

سوس وغیرہ پر عوام کس طرح جشن مناتے ہیں پیش کیا ہے۔

۱۳۹۔ عزیزہ میکر:

مصر میں تحریک نسواں

(فنکار کراچی، ۵۴ء شمارہ ۳۳۔۳۴۔۳۵، ص ۲۴۰۔۲۴۵)

فرید وجدی آفندی کی "المرأة المسلمة" اور قاسم امین کی "تحدید المرأة" سے اقتباسات لیتے ہوئے تبصرہ کے ساتھ بتایا ہے کہ اول الذکر رجعت پرستوں، خصوصاً مولویوں کے نقطۂ نظر اور ثانی الذکر روشن خیالی اور عورتوں کے لئے ہمدردانہ رویہ کی حامل ہے۔

تعلیمات

۱۴۰۔ ادارہ:

علم و عمل

قدیم ہندی ادب کی روشنی میں

(فیض الاسلام، راولپنڈی ۵۴ء جون ۳۔۴۴)

قدیم ہندی ادب سے مثالیں دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ وہی علم قابلِ قدر ہے جس پر عمل بھی کیا جائے۔

۱۴۱۔ امرناتھ جھا:

ہندوستان میں تعلیم کا مستقبل

(مسلسل)

(ہندستانی ادب، حیدرآباد دکن، مئی، ۸۔۹)

تعلیمی سلسلہ میں چند باتوں پر فوری توجہ کی ضرورت ہے انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم باقی رکھنا غیر ضروری ہے۔ علاقائی زبانوں کے ایک غیر ملکی زبان کی بھی تعلیم دی جائے یونی ورسٹیوں اور اساتذہ کے اختیارات میں دخل اندازی ہو۔

۱۴۲۔ مگن بھائی ڈیسائی:

اونچی تعلیم کا مادھیم

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴ء جون، ۳۸۸۔۳۹۱)

ہندوستان کی آزادی کے بعد اب یہ چیز صاف ہوتی جاتی ہے کہ یونی ورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہے اور ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ لیکن پہل کون کرے اس سلسلہ میں گجرات یونی ورسٹی نے اقدام کیا اور ریجنل زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا۔ دستورِ ہند کی رو سے ہر ریجنل زبان کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا حق ہے۔ ملک کی تعلیمی، کلچری اور ودیا سمبندھی ترقی لوک شاہی ڈھنگ سے کرنا ہو تو سماج کے سارے تعلیمی ڈھانچے کا ذریعۂ تعلیم ملک کی مہان لوک بھاشائیں ہی ہوسکتی ہیں۔

۱۴۳۔ ہاشمی۔ نصیر الدین:

قدیم اور جدید تعلیم کے

بعض خصوصیات و امتیازات

(برہان دہلی، ۵۴ء جون، ۸۔۱۶)

سب سے پہلے قدیم زمانہ ہند میں طریقہ و طرز تعلیم کی مختصر تاریخ، پھر مسلمانوں کے عہد میں ہندوستان میں مدارس و تعلیم و تعلم کا تذکرہ۔ اور آخر میں موجودہ تعلیم کی آسانیاں و مشکلات، نقائص اور خوبیاں بیان کی ہیں۔

متفرقات

۱۴۴۔ ابوالحسن ندوی،

عتیق الرحمٰن مترجم۔

سفرِ مصر

(الفرقان لکھنؤ ۵۴ء، مئی جون، ۸۵۔۹۶)

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ڈائری کا ترجمہ عتیق الرحمٰن سنبھلی نے کیا ہے۔ مولانا نے مصر میں مختلف مواقع پر تقریریں کی ہیں، اور مصر کے بعض مختصر حالات اور بعض شخصیات سے ملاقات کا ذکر ہے

۱۴۵۔ بھگوان دین:

ارسطو کی مہانتا

(نیا ہند، الہ آباد، ۵۴ء، اپریل ۲۲۴۔۲۳۰)

مضمون میں ان فلسفیوں کی مذمت کی گئی ہے جو ارسطو کے

تنا کا فکر کو موجودہ زمانے کے رجحانات سے جوڑتے ہیں۔ ارسطو اور دوسرے فلسفیوں کے افکار و آرا، کو سمجھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان کے زمانے کے ماحول اور رجحانات کو نظر میں رکھیں اور اس کے بعد حسن و قبح کا فیصلہ صادر کریں۔

۱۴۶۔ تاراچند، ڈاکٹر:

میرا ایران کا سفر

(آج کل دہلی ۵۴ مئی، ۳ ــ ۷)

بذریعہ ہوائی جہاز ایران تک سفر کے حالات نہایت خوبصورت انداز سے بیان کیے ہیں۔ راستہ کی تنگی اور بے آب و گیاہ پہاڑیاں اور میدان اور پھر ایران کے شاداب و زرخیز پہاڑوں اور زمین کا ذکر۔

۱۴۷۔ محمد باقر، ڈاکٹر:

زبان فارسی امروز

(اورینٹل کالج میگزین لاہور ۵۳ء اگست ۱ ــ ۲۴)

فارسی زبان کی موجودہ صورت، اس کے وجوہ اور اس کی خصوصیات پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے اور ضمنی طور پر پاکستان کی فارسی کا بھی ذکر کیا ہے۔

۱۴۸۔ محمد باقر، ڈاکٹر:

ایرانی اخلاق

(نگار کراچی، ۵۴ء شمارہ ۳۴ ــ ۵ ــ ص ۲۶۶ ــ ۲۷۹)

ایران کی انفرادی، خانگی اور مجلسی زندگی سے ایرانی اخلاق کی مثالیں دی ہیں۔

۱۴۹۔ منشی، کے، ایم:

بھارت میں انگریزی کا مستقبل

(آج کل دہلی ۵۴ مئی، ۳۷ ــ ۳۸)

حصول آزادی نے جہاں بہت سے مسائل حل کر دئے ہیں وہاں نئے نئے مسائل بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ انھیں میں زبان کا مسئلہ بھی ہے، ہندی سرعت کے ساتھ انگریزی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ انگریزی کو ہٹانے کے لئے غیر ضروری جوش و خروش ہندی کو فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچائے گا انگریزی کو زندگی کے کسی شعبہ سے جلد ہی نکالنے کی ضرورت نہیں، جوں جوں ہندی ترقی کرے گی خود بخود انگریزی کی جگہ لیتی جائے گی۔

۱۵۰۔ نذیر احمد۔ ڈاکٹر:

فارسی کی تاریخی و تمدنی اہمیت

(نگار لکھنؤ ۵۴ جون، ۲۳ ــ ۲۹)

فارسی قواعد کی آسانی اور اس کی امتیازی خصوصیت شیرینی و لطافت کا ذکر کرنے کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ نہ صرف ایرانی و عربی کلچر کی آمیزش کا بہترین نمونہ ہے بلکہ ہندوستان میں یہ عربی کے مقابلہ میں زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے اسباب بیان کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ فارسی نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن زبان اور طرز معاشرت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں اس لئے فارسی سے بیگانگی خود ہمارے ملک کے مفاد کے خلاف ہے۔

ضروری اطلاع

ادارہ اور نوائے ادب سے متعلق تمام خط و کتابت براہ راست اعزازی ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۹۲۔ ہارن بی روڈ بمبئی ۱ کے پتہ سے کی جائے۔ البتہ رسالہ کی خریداری اور ترسیل زر سے متعلق خط و کتابت ڈائرکٹرس امپوریم لمیٹڈ پیلیس بلڈنگ فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱ کے پتہ سے کی جائے۔

ناشر۔ (مولوی) فضل اللہ فاروقی، مطبع۔ اجمل پریس نیس بلڈنگ تاڑدیو اسپتال بمبئی ۳

[illegible] 1954 [illegible]

[illegible]

NAWA-e-ADAB

A QUARTERLY JOURNAL

OF

THE ANJUMAN-I-ISLAM URDU RESEARCH INSTITUTE

Published Every

JANUARY & APRIL

JULY & OCTOBER

[illegible] Subscription
Inland & Pakistan: Rs. 3/- postage extra.
Foreign: Shilling 8
Price each Copy: Re. 1/-

All remittances to be made to:

The Writers' Emporium Limited

[illegible] BUILDING, SIR PHIROZSHAH MEHTA ROAD, BOMBAY 1.